www.pklibrary.com
مارچ 2021
دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ
ماھنامہ
جاسوسی ڈائجسٹ
کراچی
بانی
معراج رسول
www.pklibrary.com
صفحات 290
قیمت 100 روپے

جاسوسی ڈائجسٹ

MEMBER APNS

CPNE
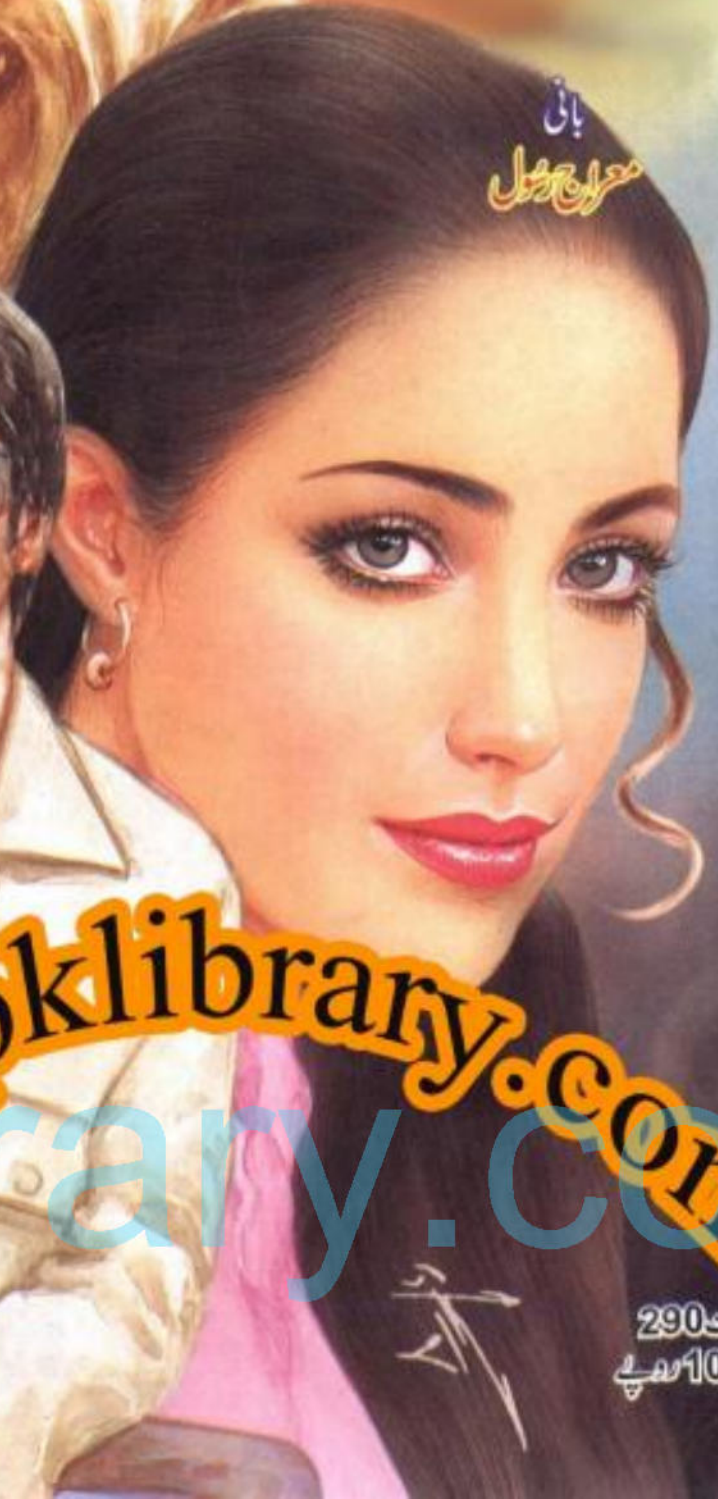
مدیر اعلیٰ
عذرا رسول

مدیر : لبنیٰ خیال

نائب مدیر : ڈاکٹر نعیم اختر

منیجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789

سرکولیشن منیجر
سید منیر حسین
0333-3285269

جلد 51 • شمارہ 03 • مارچ 2021 • زرِسالانہ 1500 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 100 روپے •

خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون: (021) 35895313 E-mail:jdpgroup@hotmail.com

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

عزیزانِ من...... السلام علیکم!

2021ء کا تیسرا شمارہ حاضرِ خدمت ہے۔ دنیا بھر میں کبھی کبھار اور ہمارے ہاں اکثر بااختیار لوگوں کی کرپشن اور لوٹ مار کی کہانیاں میڈیا کی زینت بنتی رہتی ہیں۔ ان کے بارے میں اختلافی بیان بازیاں بھی ہوتی رہتی ہیں لیکن چند روز قبل الیکٹرونک میڈیا کے ذریعے عوام تک پہنچنے والی ایک وڈیو نے پوری قوم کے سر شرم سے جھکا دیے ہیں۔ کہا یہ جا رہا ہے کہ کئی سیاسی جماعتوں کے منتخب ہونے والے اراکینِ اسمبلی نے کروڑوں میں سینیٹ کے انتخابات کے لیے اپنے ووٹ بیچے۔ ان میں زیادہ تعداد حکمراں جماعت کے اراکین کی بتائی جا رہی ہے۔ اس وڈیو کا تعلق 2018ء سے ہے۔ اگر یہ سب درست ہے تو سوچنا چاہیے کہ ہم کہاں کھڑے ہیں۔ عوام کے ووٹ سے منتخب ہونے والے بعض سیاسی اراکین کہاں کہاں اپنی بولیاں لگواتے ہیں۔ سیاست میں کالے دھن کے اس دخل نے بہت سے سوالوں کو جنم دیا ہے۔ جب خریدار کروڑوں خرچ کر کے نشستیں حاصل کرتے ہیں تو وہ اپنی اس سرمایہ کاری سے اربوں بلکہ کھربوں کے فائدے حاصل کرنے کی ٹھوس منصوبہ بندی بھی رکھتے ہوں گے۔ رقم کے عوض اپنے ووٹ بیچنے اور خریدنے والے یہ سیاسی گدھ ہیں جو اس قوم کی ہڈیوں تک کو چوس لینا چاہتے ہیں۔ عوام کو یعنی ہم سب کو سوچنا ہوگا کہ ہم کب تک ایسے ضمیر فروشوں کی بیساکھی بنتے رہیں گے۔ اس بہت بڑے قومی سوال کے ساتھ ہم چلتے ہیں اپنی محفل میں جہاں ملک کے مختلف گوشوں سے آئے مکتوب منتظر ہیں۔

کنول، چنیوٹ سے لکھتی ہیں ”فروری کے جاسوسی ڈائجسٹ کا سرورق کافی اچھا تھا۔ سرورق کی حسینہ کی وجہ سے چار چاند لگ گئے۔ بجلی کے بریک ڈاؤن کی آپ نے خوب کہی کہ پاکستان میں امن رہا جبکہ ترقی یافتہ ممالک میں ایسی صورتِ حال میں ہنگامی حالت ہو جاتی۔ اس کی وجہ ہے نا۔ بریک ڈاؤن ان کے لیے ہنگامی اور بالکل غیر متوقع صورتِ حال ہوتی ہے۔ ہمارے لیے تو یہ بالکل عام سی بات ہے۔ بریک ڈاؤن کے بغیر ہی سارا سارا دن بجلی بند رہے تو اس میں کچھ نیا نہیں تھا سوائے اس کے کہ پورے ملک میں ایک ساتھ ہو گیا۔ چینی نکتہ چینی میں تقریباً سب کے تبصرے ہی شاندار تھے۔ سب سے چھوٹا تبصرہ میرا ہی تھا۔ جس کو کاٹ چھانٹ کے چھوٹا کیا گیا تھا۔ محمد سلیم کرد کی تحریر پُراسرار بنگلا میں منشیات فروشوں کی طرف سے اپنے کاروبار کو جاری رکھنے کے لیے اپنے ہیڈ کوارٹر یعنی پراسرار بنگلے کو بھوت بنگلہ دکھانے کے لیے بہت محنت کی گئی۔ لیکن ایک اسکول ٹیچر کی اتنے تربیت یافتہ لوگوں سے اچھی خاصی فائٹ بیک کچھ ہضم نہیں ہوئی۔ عمران قریشی کی تحریر جواز میں کہانی کے مرکزی کردار کی شادی کو ناکام ہوتے دکھایا گیا ہے اور اس کا اچھا خاصا مضبوط جواز موجود تھا۔ بھلے غلط فہمی ہی سہی لیکن اپنی بہن یا بیٹی کے قاتل کو شوہر یا داماد کی صورت میں کون قبول کر سکتا ہے۔ اور یہی بات ہمارے مرکزی کردار کو سمجھ نہیں آئی۔ اور آخر میں یہ کہنا کہ بیوی سے صلح ہی اس لیے کرنا چاہتا تھا کہ گھر بلا کے طلاق دے سکے۔ اس سے تو ثابت ہوا کہ وہ انسان تھا ہی اسی قابل، اچھا ہی ہوا جو بھی ہوا۔ اچھی کہانی تھی۔ پسند آئی۔ عنائشہ چوہدری کی تحریر غلطی میں سوشل میڈیا کے استعمال کے نقصانات بتانے کی کوشش کی گئی ہے۔ جس سے میں متفق نہیں ہوں لیکن کہانی پر بات کریں تو سامیہ کے اغوا ہونے اور اس کی زندگی تباہ ہونے کا الزام اس کی سوشل میڈیا استعمال کرنے کی غلطی پر ڈالا گیا ہے۔ جبکہ مجرم جرم کرنے والا ہی ہوتا ہے، کوئی اور نہیں۔ بہرحال عنائشہ چوہدری شاید نئی لکھاری ہیں، نام پہلی بار دیکھا۔ اچھی تحریر تھی۔ احسان فراموشی کسی جاپانی کہانی کا ترجمہ لگ رہی تھی نام ہی اتنے طویل اور مشکل تھے کہ کہانی سمجھنی مشکل ہو گئی۔ طاہر جاوید مغل عمران جونیئر کے ساتھ آئے۔ عمران جونیئر بھی بالکل اپنے باپ پر ہی گیا ہے۔ اس بار بھی کہانی اچھی لگی۔ غلام قادر صاحب کی تحریر عشقِ جدید میں دیکھا جائے تو کچھ بھی نیا نہیں تھا۔ وہی پرانا پلاٹ اور موضوعات جو غلام قادر صاحب کی پہچان ہیں۔ کہانی ایک طوائف زادے اور اس کے خاندان کے رہن سہن کے گرد گھومتی ہے۔ لیکن قادر صاحب تک کوئی یہ بات پہنچائے کہ مرکزی کردار یعنی ہیرو کی ایک سے زیادہ شادیاں کرنا کوئی فرض نہیں ہے۔ اس کے بغیر بھی بہت اچھا گزارا ہو سکتا ہے۔ اب اس کہانی میں دوسری شادی کی کوئی منطق کوئی لاجک کوئی سر کوئی پیر نہیں تھا۔ (وہ لاجک کو مانتے کہاں ہیں) بس کیونکہ ایک لڑکی نے ملک سے باہر نکلنے میں ہیرو کی مدد کر دی تو ہیرو صاحب کی محبوبہ نے حاتم طائی کی قبر پر لات مارتے ہوئے اپنے ہیرو سے فرمائش کر دی کہ میرے ساتھ اس سے بھی شادی کر لو۔ دوسری شادی کے بھدے اختتام کے علاوہ کہانی ٹھیک ٹھاک ہی تھی۔ اس بار ابتدائی صفحات پر امجد رئیس کی تحریر قاتل کسوٹی شائع ہوئی ہے۔ امجد رئیس میرے پسندیدہ ترین لکھاریوں میں سے ہیں۔ کیا خوب صورت ترجمہ کرتے ہیں۔ ان کی کہانیوں کا شدت سے انتظار رہتا ہے اور پورا ڈائجسٹ ختم کر کے سب سے آخر میں ان کی تحریر پڑھتی ہوں۔ اس بار بھی ان کی کہانی ہمیشہ کی طرح توقعات پر پوری اتری۔ کہانی میں سسپنس، ایکشن، تھرل سب کچھ ہی تھا۔ ایک خاتون ڈیٹیکٹو لورین کی ازدواجی زندگی کے اتار چڑھاؤ اور ان کے اس کی پروفیشنل زندگی پر اثرات کا احاطہ کرتی خوبصورت تحریر۔ پال بہت ہی کمینہ نکلا۔ اختتام نے بیچ میں بہت مزہ دیا۔ سینے میں ٹھنڈ پڑ گئی۔ پال

اس سے بھی بُرے انجام کا مستحق تھا۔ اس سے اچھا اختتام شاید ممکن نہ ہوتا......''

ظہیر ملک کی ہارون آباد سے داد و تحسین کے ٹوکرے ''فروری کا شمارہ ملا تو سوچا کیوں نا ہم بھی نکتہ چینی کے سلسلے میں شامل ہو جائیں۔ پڑھ تو عرصے سے رہے ہیں لیکن لکھنے کی جسارت کبھی نہیں ہوئی۔ ہر کوئی سرورق کی بات کر رہا ہے کہ سرورق میں جو حسینہ ہے، اس کے کان کی بالی چوری کرنی ہے اس لیے پلان بناتا ہے اب ہم ٹھہرے ملک صاحب، ہم نے کہا بھئی چوری کرنا سخت گناہ ہے۔ بس ہم حسینہ کی منتیں کر سکتے ہیں۔ سرورق بہت ہی خوبصورت تھا۔ بندوق والا آدمی ایسا لگ رہا تھا جیسے ماسک پہن کر کورونا کے خلاف اعلانِ جنگ کر رہا ہو...... خیر ہمیں کیا بے چارے کو مجبوراً بندوق پکڑا دی گئی ہو گی۔ فہرست پر پہنچے تو آنکھیں چندھیا گئیں۔ بھئی اتنے بڑے بڑے ادیب براجمان ہیں۔ ہماری تو ان کے سامنے کوئی حیثیت نہیں۔ آگے بڑھے تو ہمارا چینی نکتہ چینی والوں نے بازو پکڑ لیا اور کہا کہ بھئی بقایا رسالوں میں تو ملک صاحب جاتے ہو یہاں بھی چکر لگا لیا کرو، پھر کیا ہمیں کوئی اتنے پیار سے اپنی طرف کھینچ رہا ہو اور ہم نہ جائیں یہ تو ناممکن ہے۔ مدیرِ اعلیٰ کی پیاری پیاری اور میٹھی باتیں پڑھیں اور ہمارے الیکٹرک نظام کے بارے میں حیرانگی ہوئی۔ یہ اپنے پاؤں پر آپ ہی کلہاڑی مارنے والی بات ہے۔ پہلی دفعہ ایسا پڑھا۔ اس دفعہ کرسیِ صدارت پر چیٹ پٹے تبصرے کے ساتھ راؤ برہان صاحب براجمان تھے۔ بہت اچھے راؤ صاحب بہت ہنسایا آپ نے ویلڈن۔ اس کے بعد بابر عباس صاحب، احتشام الحق، ریاست خان، کنول صاحبہ، محمد قدیر، محمد عثمان صاحب، ماورا عالمگیر صاحبہ، عرفان راجہ صاحب، زارا شاہ صاحبہ، خلیل احمد انجم صاحب، عبدالجبار رومی، انجم فاروق اور رمشا صاحبہ کے تبصرے اپنی مثال آپ تھے۔ تمام مبصرین کے لیے بہت ساری دعائیں۔ امجد رئیس صاحب کا شمار بہترین اُدبا میں ہوتا ہے جن کی تحریریں قارئین کو اپنے سحر میں جکڑ لیتی ہیں۔ اس دفعہ بھی بالکل ایسا ہی ہوا۔ قاتل کسوٹی نے ایسا جکڑا کہ دو گھنٹے مسلسل اس کے سحر سے نہ نکل سکے۔ بہترین سے بھی بہترین کہانی پڑھی اور امجد رئیس صاحب کو بہت سی داد دی۔ اختتام بالکل جیسا میں سوچ رہا تھا ایسا ہی ہوا۔ سیرینا راش آپ کی چال نے تو واقعی ہمیں دوہرا سسپنس دیا۔ دوہری چال بہت ہی کمال کہانی لکھی، وہ کیا کہتے ہیں بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی آخر فیرن چائلڈ کی چال ایلیری کی تیز... نظروں سے بچ نہ سکی۔ اور ان دو ممالک کرنے والیوں کو آخر پکڑ ہی لیا گیا۔ بہت سی دعائیں عمدہ کہانی کے لیے۔ طاہر جاوید مغل صاحب کا نام آئے اور ہم کہانی نہ پڑھیں، یہ تو ناممکن ہے، طاہر صاحب نے اچھا لکھا شروعات پر تھوڑی بہت ہنسی آئی لیکن ہنسی روکتے ہوئے آگے بڑھے۔ در پردہ پڑھی تو پتا چلا اصل ماجرا کیا ہے۔ بہت سی داد قبول کریں پیارے۔ صفحہ پلٹتے ہوئے نظر پڑی میڈیکل غزل پر جو پڑھے بغیر نہ رہ سکے۔ حمیرا اقبال صاحبہ کی حکیمانہ شاعری اچھی لگی۔ تنویر ریاض کی احسان فراموش نام نے ہی اپنی طرف کھینچ لیا اور پڑھنا شروع کیا تو رشک بھی آنے لگا تنویر صاحب بہت ہی کمال لکھا آپ نے۔ احسان فراموش ہماری زندگی میں اسی طرح شامل ہوتے ہیں کہ اگر انہیں نکالنا چاہیں بھی تو نکال نہیں سکتے۔ کہانی کے لیے ڈھیروں داد۔ امجد جاوید صاحب کو خراجِ تحسین پیش کرتے رہیں۔ بہت بہت بہت زبردست سلسلہ وار شاہکار ہے انا گیر۔ اعتراز سلیم وصلی کو بہت مبارکباد۔ آپ کی تحریر شمارے کا حصہ بنی۔ آپ کی تحریر حقیقت آنکھیں نم کر دینے والی ایک بہترین تحریر تھی جس کی کوئی مثل نہیں تحریکِ آزادی کشمیر کے حوالے سے لکھی گئی ایک بہترین تحریر پڑھ کر سر کو فخر سے بلند کیا اور آپ کو داد دیے بغیر رہ نہ سکا۔ حسنِ باطن منظر امام صاحب کی تحریر نے بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا۔ بھئی ہم کیا کریں کہانیاں ہیں ہی اتنی کمال کی! تنقید کرنے کو دل ہی نہیں چاہ رہا بس دل کرتا ہے تعریف ہی لکھی جائیں ان سب کی، (لوگ سمجھیں گے کہ ہم نے تعریفی مکتوب خود لکھوایا ہے، کچھ تو احساس کریں) منظر امام صاحب کی ظاہری حسن و خوب صورتی پر تحریر پڑھ کر بہت اچھا لگا ویلڈن پیارے۔ عائشہ چوہدری صاحبہ آپ کی غلطی تحریر نے پہلے تو سوچنے پر مجبور کیا کہ لکھا کیا گیا ہے آخر پھر سمجھ آگئی تو آپ کو داد دینی پڑی۔ اختتام اچھا کیا بقایا محنت کریں ان شاء اللہ بہتری ہو گی۔ الاؤ کہانی کو ڈاکٹر صاحب آہستہ آہستہ اپنی منزل کی طرف بہترین انداز میں لے جا رہے ہیں زیرِ مطالعہ قسط اپنی مثال آپ تھی۔ عمران قریشی صاحب کے قلم سے نکلی ایک بہترین تحریر نے مزہ دوبالا کر دیا اور ہم نے جواز پڑھتے ہوئے ساتھ چائے بھی بنا لی تاکہ تھوڑی گرماش ملے تو کہانی پر گرما گرم تبصرہ کریں، کبھی کبھی ایسے ہی ہم ایک بات کو طول دینا شروع کر دیتے ہیں جس کا انجام ہمیشہ ہی برا ہوتا ہے اور یہی کچھ سر عمران قریشی نے بیان کیا اپنی مختصری داستان میں، ویلڈن پیارے۔ پُراسرار بنگلا محمد سلیم کرد صاحب کی وحشت و خوف سے بھرپور کہانی نے تھوڑا ڈرایا لیکن ہم بھی پُراسرار بنگلے میں بھوتوں کا جائزہ لیے بغیر نہ رہ سکے۔ بہت بہترین تحریر پیارے۔ آج کی کہانی سرور اکرام صاحب کی پیاری سی مختصر تحریر نے بہت متاثر کیا۔ خصوصی طور پر کہانی کے عنوان کے نیچے جو شعر لکھا گیا تھا، وہ بہت ہی کمال بلکہ لاجواب تھا۔ غلام قادر صاحب کی عشقِ جدید میں مثالی وفاداروں کی کمائل اور نڈھال کر دینے والی عاشقانہ جدوجہد پڑھی، مزیدار تھی، اچھا لکھا لیکن تھوڑا تسلسل قائم رکھا جاتا تو مزید بہتری ہو سکتی تھی۔ فروری 2021ء کے شمارے میں شائع ہوئی آخری کہانی باغی کہ جیتی نے شمارے کے اختتام کو جیسے چار چاند لگا دیے ہوں، بہت ہی پیاری زبردست اور سسپنس سے بھرپور کہانی پڑھ کر مزہ آ گیا۔ پیارے یعقوب بھٹی صاحب بہت ساری داد اور دعائیں قبول کریں کیونکہ بڑی مشکل سے آپ کا حصہ بچا کے رکھا تھا۔ پیچھے ساری کہانیاں بہت ہی زبردست تھیں اب آپ کی باری پہ یہ کہے اور لکھے بغیر نہ رہ سکا۔ پہلی دفعہ فروری کے شمارے میں تبصرہ کر کے بھیج رہا ہوں۔ امید ہے میرے چند الفاظ کو جگہ مل جائے گی ان شاء اللہ۔''

انور یوسف زئی کی اسلام آباد سے بروقت حاضری ''محکمہ ڈاک کی مہربانیوں کی وجہ سے میرے گزشتہ دو تبصرے آپ تک نہ پہنچ سکے۔ بہرحال محفل میں حاضر ہوں۔ لاہور کے راؤ برہان کو اس ماہ کی کپتانی مبارک ہو۔ میری ہم شہری نازو نازنین ایمانے زارا شاہ ذرا

وضاحت کریں گی کہ کیا یہ ایک ہی نام ہے؟ اب کہانیوں کی طرف تو شمارے کی اولین کہانی امجد رئیس کی قاتل کسوٹی اس ماہ کی بہترین قرار پائی۔ امجد رئیس ترجمہ اور تلخیص میں شاعری کا بھی تڑکا لگاتے ہیں جس سے لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ کہانی کی ہیروئن لورین نے پال کی بے وفائی کا خوب بدلہ لیا۔ سلسلے وار کہانی الاؤ کے اختتام کی امید تھی مگر ہیرو صاحب ڈاکٹر سیف طیارہ حادثے میں بھی بچ گئے یعنی کہانی ابھی باقی ہے دوست! یہی حال اناگیر کا بھی رہا۔ علی زین کو ایک چاہنے والی ساوری مل گئی ہے۔ میری مودبانہ گزارش ہے کہ جلد نئی سلسلے وار کہانیاں شروع کریں۔ مقامی کہانیوں میں منظر امام صاحب کی حسن باطن ایک اچھوتی تحریر تھی۔ سرورق کی دونوں کہانیاں عشق جدید اور باغی کٹھ پتلی معیاری تھیں۔ اس بار کارٹون اور کترنیں بھی وافر تھیں۔‘‘ (بہت شکریہ...... آپ کی توقعات پر اترنے کی کوشش جاری ہے)

بینا راجپوت کے اسلام آباد سے جذبات ’’اسلام آباد میں جاسوسی ڈائجسٹ ڈھونڈنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں، پچھلے مہینے ڈھونڈتے ڈھونڈتے تو تاریخ آ گئی اور میں بے چاری چاہ کر بھی ایک دن میں ڈائجسٹ پڑھ کر تبصرہ نہیں لکھ سکتی تھی۔ (معلوم نہیں کیا وجہ ہے نہ ملنے کی) خیر نئے سال پر اپنا نام چینی نکتہ چینی میں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ فروری کا شمارہ کافی تگ و دو کے بعد وقت رہتے ہوئے حاصل کرنے میں کامیاب رہی، سرورق خوب صورت تھا۔ ڈائجسٹ ہاتھ میں آتے ہی چینی نکتہ چینی کی طرف دوڑ لگائی۔ ایمانے زارا شاہ نے اپنے نام کی طرح خوبصورت تبصرہ پیش کیا۔ ملیحہ رمشا آپ بھی راجپوت ہیں، سن کر اچھا لگا۔ مجھے محمد عثمان ذوالفقار، خلیل احمد انجم، احسن زمان اور ملیحہ رمشا کے خطوط پسند آئے اور باقی سب نے بھی اچھا لکھا۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف تو سب سے پہلے جو میں نے کہانی پڑھی، وہ منظر امام کی حسنِ باطن تھی۔ منظر امام صاحب کے قلم نے ظاہری بدصورتی کو بہت خوب صورتی سے بیان کیا، مجھے تحریر کافی پسند آئی۔ (بہت شکریہ) اعتزاز سلیم وصلی کو بہت زیادہ نہیں پڑھا لیکن آزادی کشمیر کے موضوع پر لکھی ان کی یہ تحریر حقیقت کافی دل گداز اور حقیقت کے قریب ترین تھی۔ سرور اکرام کی آج کی کہانی پڑھ کر تو غصہ ہی آ گیا۔ بالکل پسند نہیں آئی البتہ محمد سلیم کرد کی پُراسرار بنگلا شروع سے آخر تک سسپنس اور ایکشن سے بھرپور تھی، پڑھ کے بہت مزہ آیا۔ عمران قریشی نے پچھلے مہینے سونی مونی کے ذریعے ہمیں مغالطے میں ڈالے رکھا اور اس مہینے بھی ایک بے چارے شوہر کی حسرتِ ناتمام کو بڑے چونکا دینے والے انداز میں لے کر آئے۔ جواز ایک چونکا دینے والے اختتام کے ساتھ پُرتجسس کہانی تھی۔ سیر ینا راض کی دوہری چال کوئی خاص تاثر نہیں چھوڑ پائی۔ دونوں حسیناؤں نے تو نیکلس کی خوب حفاظت کر لی لیکن انسپکٹر اور سراغ رساں کا کردار بالکل بوگس لگا جبکہ سارا کیس ایک ناول نگار نے حل کیا۔ طاہر جاوید مغل میرے پسندیدہ ترین قلمکاروں میں سے ایک ہیں لیکن معلوم نہیں کیوں ان کا تخلیق کردہ کردار عمران جونیئر مجھے بالکل متاثر نہیں کر پایا۔ (ایسا تو نہیں جونیئر بھی باکمال ہے) میں زبردستی کوشش کرتی ہوں کہانی پڑھنے کی تو کبھی کامیابی ہوتی ہے اور کبھی ناکام ہو جاتی ہوں۔ اس بار بھی ناکام ہی رہی۔ اس لیے در پردہ کو پیچھے چھوڑتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں تنویر ریاض کی احسان فراموشی کی طرف۔ ایک جنونی شخص کی احسان فراموشی کی کہانی، جس کو سیریل کلر کے طور پر اپنی پہچان بنانی تھی لیکن سوموراا اور ساوا کی نے اس کو تمام جرائم سے باعزت رہا کروا لیا تھا۔ اسی کا انتقام لینے کے لیے اس نے سوموراا کو قتل کر کے ساوا کی پر الزام ڈالنا چاہا۔ ولا کے نقشے نے بھی خوب الجھایا۔ عائشہ چوہدری کی غلطی آج کے دور کے حساب سے ایک سبق آموز کہانی تھی کہ ہم لوگ واقعی واٹس ایپ پر پرائیویسی ایکٹیویٹ کر کے سکون میں آ جاتے ہیں کہ ہمارے سب جاننے والے بھروسا مند ہیں لیکن یہ بھول جاتے کہ موبائل نامی یہ ڈیوائس قابلِ اعتبار نہیں۔ امجد رئیس کی قاتل کسوٹی میرے حساب سے شمارے کی سب سے بہترین کہانی تھی۔ لورین جذبات میں بہہ کر پال کے جرم کو چھپانے کی لغزش کر جاتی ہے جس کا خمیازہ اس کو بھگتنا پڑتا ہے لیکن قدرت اس پر مہربان رہی۔ ابتدا سے انتہا تک سنسنی اور ہنگامہ خیز، بے حد دلچسپ کہانی۔ اب چلتے ہیں سرورق کی پہلی کہانی یعنی عشق جدید کی طرف۔ غلام قادر صاحب نے کہانی کی ابتدا تو اچھے سے کی لیکن اختتام تک جاتے جاتے کہانی حلوہ ہو گئی اور اختتام پر حماد کی ایک ساتھ دو شادیاں کروا کے تو کہانی کا بالکل ہی بیڑا غرق کر دیا۔ البتہ زمینی حقائق کو پس پشت ڈال کر صرف ٹائم پاس کے لیے پڑھیں تو اچھا وقت گزر سکتا ہے۔ (اچھا وقت گزارنے میں کوئی حرج تو نہیں) سرورق کی دوسری کہانی باغی کٹھ پتلی یعقوب بھٹی صاحب چھا گئے اس بار۔ ایکشن اور سسپنس سے بھرپور کہانی۔ کہانی کے مختلف موڑوں نے چونکایا اور اختتام تو بے حد شاندار تھا۔ یعنی سانپ بھی مر گیا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹی۔ اختتام سے لگتا ہے کہ ایک نئی کہانی کا آغاز ہو سکتا ہے۔ (کافی عقل مند ہیں) یعقوب بھٹی جی کے لیے نیک خواہشات۔ قسط وار سلسلے میں پڑھتی نہیں ہوں کہ صبر کا مادہ بہت کم ہے اس لیے انتظار کرنا عذاب لگتا ہے۔ امجد جاوید اور ڈاکٹر عبدالرب بھٹی عمدہ قلمکار ہیں تو عمدہ ہی لکھ رہے ہوں گے۔ اوور آل فروری کا شمارہ ایکشن سے بھرپور لگا۔‘‘ (بہت نوازش)

ریاست خان کی داؤ دخیل میانوالی سے دلداری ’’اس ماہ کا شمارہ بھی کافی تگ و دو کے بعد ملا۔ اس ماہ کا سرورق لاجواب تھا۔ کان میں جھمکا سبز جوڑا اور کمال گیسو ماہ جبین کو کوئی پری وش لگ رہی تھی۔ پیچھے میرا جیسا جوان ماہ جبین کی سیکیورٹی کے لیے کھڑا تھا۔ ساتھ ہی میرے دو تبصرہ نگار دوست ماہ جبین کو پانے کے لیے جدوجہد کر رہے تھے، رومی اور قدیر ذرا سنبھل کے۔ چینی نکتہ چینی میں اداریہ ملکی حالات پر تبصرہ کر رہا تھا۔ یہ اک کڑوا سچ ہے کہ موسمی تبدیلی انسانی زندگی پر بہت اثر کرتی ہے۔ سخت سرد موسم میں غریب لوگ سردی میں ٹھٹھرتے دکھائی دیتے ہیں لیکن ان کو رہائش نصیب نہیں ہوتی وہیں امیر طبقہ اپنی عالی شان کوٹھیوں میں ہیٹر کے سامنے آگ تاپنے کے لیے بیٹھے ہوتے ہیں۔ کتنا فرق ہے دونوں زندگیوں میں...... آپ کی بات بجا ہے، یہ ہمارا حق بنتا ہے کہ ہم اپنے اردگرد ایسے افراد کو دیکھیں اور ان کو چھت مہیا کریں۔ ان کو آرام پہنچائیں، یہی خدمت خلق ہے۔ صدارت کی کرسی پر راؤ برہان براجمان نظر آئے۔ بابر عباس اپنی فیملی کے ساتھ اسکوٹر پر حاضر ہوئے

اور ہاتھ ہلا کے یہ جا وہ جا۔ نئی تبصرہ نگار مس کنول بھی ہیں۔ بہت بہت مبارکباد اور خوش آمدید تبصرہ مختصر لیکن اچھا ہے۔ اگلی بار تھوڑا سائز بڑھائیں۔ قدیر بھائی اتنا منہ بھی نہ کھولا کریں کہ ساتھ والے گھر سے بیٹھی ہوئی مکھی کہیں منہ میں نہ چلی جائے۔ مجھے پتا ہے سردیوں میں مکھیاں نہیں ہوتیں لیکن آپ اگر بڑا سا منہ کھولیں گے تو پھر...... عثمان سب کا شکریہ ادا کرتے نظر آئے اور ایک ہمارا دوسرا فیس بک فرینڈ عثمان اس کے ابھی تک شکوے ختم نہیں ہوئے کہ میرا تبصرہ کیوں نہیں شائع ہوا۔ (جی معلوم نہیں کہاں بھیجا تھا، ہمیں اب تک موصول نہیں ہوا) نازو نازنین بھی بڑی بات ہے، حاضر تھیں۔ مجھے تو لگا تھا کہ ایک تبصرہ بھیجنے کے بعد کم از کم دو، تین ماہ سوئی رہیں گی لیکن حیرت ہے۔ خلیل احمد بھی اپنے جامع تبصرے کے ساتھ حاضر تھے، اچھا تبصرہ تھا۔ رومی بھائی تو آتے ساتھ ہی بھاگنے کی کرتے ہیں۔ کہاں گیا وہ 22 کنال کا تبصرہ اب تو حد ہے۔ (تمام قارئین سے التماس ہے کہ وہ خطوط 6 تاریخ تک بھیج دیا کریں) سب سے پہلے مغل صاحب کی کہانی درپردہ پڑھی عمران جونیئر اور تابش کی ایک اور پیشکش...... یہ سچ ہے کہ یہ چھوٹی چھوٹی کہانیاں اصلی عمران اور تابش کی جگہ نہیں لے سکتیں لیکن ان سے للکار کی یاد میں کی آتی ہے۔ درپردہ بھی زبردست کہانی تھی۔ ماہین جو پچھلی کہانی میں تابش اور عمران سے ناراض تھی اور اسی ناراضگی میں اس نے عمران کو مارا بھی تھا، تابش سے معافی مانگنے آتی ہے درپردہ کہانی عمران کے گرد گھومتی ہے کہ وہ کیسے حاجی فراز کا نام لے کر ایک غریب گھرانے کی لڑکی کی شادی کے لیے 5 لاکھ روپے دیتا ہے۔ درپردہ رہ کر عمران نے بہت زبردست کام کیا۔ منظر امام صاحب بھی جو لکھتے ہیں، کمال لکھتے ہیں۔ حسنِ باطن اس کی مثال ہے۔ احمر جو ایک نئے محلے میں رہنے آتا ہے صبح صبح صغرا کا بھائی شہاب اس کے گھر آجاتا ہے کہ تم نے میری بہن کو چھیڑا ہے حالانکہ احمر نے تو اسے دیکھا بھی نہیں ہوتا۔ احمر صغرا کو جب دیکھتا ہے تو کالے رنگ والی صغرا اسے بہت بدصورت لگتی ہے لیکن جب وہ احمر کا خیال رکھتی ہے تو احمر کے دل کی دنیا ہی بدل جاتی ہے اور اسے وہ کالے رنگ والی بدصورت صغرا، چاند سے زیادہ پیاری لگنے لگتی ہے۔ سچ کہا جاتا ہے کہ حسن باطن میں ہوتا ہے۔ چہرے لاکھ روشن ہوں گر باطن ہی کالا ہو تو کیا فائدہ۔ الاؤ کی سولھویں قسط زبردست رہی۔ سیف سازش کا شکار ہو جاتا ہے اس پر شرطیہ... قتل کا الزام لگتا ہے جس پر اسے قید ہو جاتی ہے وہیں اسے زہر دینے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن وہ بچ جاتا ہے۔ ساری پولیس اس کے خلاف تھی وہیں...... انکوائری آفیسر کی کوششوں سے سیف پر قتل کا الزام ختم ہوتا ہے اور سیف جیل سے رہا ہو جاتا ہے۔ سیف رہا ہونے کے بعد پاکستان جانے کے لیے روانہ ہوتا ہے جہاں اس کا جہاز ہائی جیک ہو جاتا ہے اور بعد میں صحرا میں گر جاتا ہے یہ قسط لاجواب رہی۔ (واقعی لگتا ہے آپ بہت غور سے کہانی پڑھتے ہیں) باغی کٹھ پتلی سرورق کی دوسری کہانی لاجواب تھی۔ ایسی کہانیاں ہی پڑھنے کے لیے ہم حاضر ہوتے ہیں۔ جیری را کا سابقہ آفیسر جو باغی ہو جاتا ہے اور اپنے آفیسروں کو سردرد دیے رکھتا ہے قدم قدم پر حیران کر دینے والی کہانی واقعی سرورق کی شان تھی۔ غلام قادر صاحب کی عشق جدید کہانی کا ویسے تو پلاٹ کچھ کام کا نہیں۔ کہانی ایسے چل رہی ہے جیسے ایک روبوٹ کسی احکامات پر عمل کر رہا ہو۔ کہانی میں بہت زیادہ جھول تھا لیکن اختتام کا سفر کہانی نے بہت اچھا کیا۔ آخر میں ہمارے پیارے رائٹر جناب انوار صدیقی صاحب کی اہلیہ صاحبہ کی وفات کا بہت دکھ ہے اللہ سے دعا ہے اللہ پاک مرحومہ کو جنت نصیب فرمائے اور گھر والوں کو صبرِ جمیل عطا فرمائے، آمین۔''

خلیل احمد انجم، گاؤں دھنی، کھاریاں سے ''یوں تو شمارہ مقررہ وقت پر مارکیٹ میں دستیاب ہوا تاہم چند نامساعد حالات کے پیشِ نظر ٹرین میں دیدارِ یار ہوا کیونکہ بقول شاعر تجھ سے بھی دلنشیں ہیں غم روزگار کے۔ ٹائٹل ہمیشہ کی طرح تحیر و جاسوسیت پر مبنی تھا۔ کہانیوں میں اولین صفحات امجد رئیس کی قاتل کسوٹی سے مزین تھے۔ خوب صورت و دلکش انداز میں لکھی گئی تحریر نے ایکشن، تھرل اور لمحہ بہ لمحہ بدلتے رنگوں اور واقعات کی روانی کی وجہ سے اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ پال کی زندگی اور اسکاٹ کے قتل کے گرد گھومتی لورین کی تھکا دینے والی جدوجہد نے ازحد محظوظ کیا۔ بلاشبہ انتہائی خوب سے خوب تر کہانی تھی۔ اس کے بعد یعقوب بھٹی صاحب کی باغی کٹھ پتلی را کے ایک باغی ایجنٹ کے انتقام پر مبنی تحریر نے اپنے سحر میں سحرزدہ ہونے پر مجبور کر دیا۔ اندازِ تحریر کی فصاحت و بلاغت، لمحہ بہ لمحہ بدلتی منظر نگاری اور روانیِ داستان نے بے حد لطافت و تفریح کا سامان مہیا کیا۔ غلام قادر کی عشق جدید نے بھی بے حد محظوظ کیا۔ باقی کہانیوں میں طاہر جاوید صاحب کی درپردہ میں عمران جونیئر نے خاص لطف اندوز کیا۔ دہری چال، احسان فراموشی، جواز خوب صورت تحاریر پڑھنے کو ملیں۔ باقی تحاریر زیرِ مطالعہ ہیں۔ محفلِ رنگ و بو میں آپ کے فرمودات ملکی حالات اور اندرونی معاملات کے تناظر پر مبنی تھے۔ پڑھ کر دل مسوس کر رہ گئے۔ نامہ محبت کی شمولیت پر شکر گزار ہوں۔ راؤ برہان کو صدارت مبارک۔ بابر عباس صاحب کافی غصے میں دکھائی دے رہے ہیں۔ ریاست خان کے شاہانہ ٹھاٹ اور محمد قدیر کی امید دل کو بھا گئی۔ ایمانے زارا شاہ ہمیشہ کی طرح محفل پر چھائی ہوئی ہیں۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ باقی احباب کے نامے بھی پسندیدگی کی سند پانے میں کامیاب رہے جن میں احتشام الحق حقی، کنول، محمد عثمان ذوالفقار، ماورا عالمگیر، عرفان راجا، عبدالجبار رومی، محمد احسن زمان اور ملحہ، رمشا سرفہرست ہیں۔ اب اس امید کے ساتھ اجازت چاہتا ہوں کہ خاکسار کو ہر دلعزیز شمارہ میں جگہ عنایت فرما کر شکریہ کا موقع دیں گے۔''

ایمانے زارا شاہ، حسین شہر اسلام آباد سے ''فروری کا جاسوسی جلد ہی ہمارے ہاتھوں میں آن پہنچا۔ ہمیشہ ہی ہمیں سرورق کا گلہ رہتا ہے لیکن اس بار سرورق نے فوراً ہی اپنی طرف متوجہ کیا۔ ہم ٹھہرے حسن پرست! لڑکی پیاری تھی۔ نکتہ چینی کی شیریں محفل کا آغاز راؤ برہان کے نیم زدہ تبصرے سے ہوا۔ جی جی نیم زدہ۔ ویسے مبارک باد بنتی ہے۔ اور ہمارا حصہ بھی ہم تک پہنچ جانا چاہیے کیونکہ...... اور پلیز اگلی بار دھواں کم رکھیے گا۔ سانس لینا دوبھر نہ ہو جائے کہیں۔ بابر عباس، ہم باکس پر چڑھیں یا کے ٹو پر۔ آپ کو کیا۔ ریاست خان، مانا ہم عمر

چھپانے کے قائل نہیں مگر آپ پنگوڑے میں سونے والے کاکے نہ بن جائیں۔ روزیا کنول کو جاسوسی میں پہلی بار شمولیت پر دل سے مبارک باد۔ اگلی بار تفصیلی تبصرہ کیجیے گا۔ قدیر ایک بات پھر سب کی کلاس لیتے پائے گئے۔ ہاں جی قدیر...... آپ اسپانسی میں ولیمہ کا کھانا ہی بھجوادیں۔ عثمان ذوالفقار اگر بندہ ایک ہی نام رکھے اپنا تو پھر پہچانا جاتا ہے۔ ایسے تو نہیں ہوتا فیس بک پر کچھ۔ تبصرے میں کچھ۔ اب آتے ہیں اپنے ہی تبصرے پر۔ پہلے ہمارا ارادہ تھا بریک کا لیکن ہم نے سوچا ہے میدان خالی نہیں چھوڑنا چاہیے بلکہ دوسروں کو ناک آؤٹ کر کے میدان میں اکیلے راج کرنا چاہیے اس لیے ہم سب کے سینوں پر مونگ دلتے رہیں گے۔ مونگ تو پسند نہیں، چلیں راجما۔ محمد رمشا بھی جلدی تبصرہ سینڈ کیا کریں پھر کسی نہ کسی لسٹ میں ضرور آئے گا۔ اور علیزے مارشل آرٹس کی ماہر تھی اس لیے غنڈے پچھاڑ دیے۔ اور اتنے خطرناک غنڈے نہیں تھے۔ یہ گلی گلی میں بولنے والے جو ہوتے ہیں نئے نئے بدمعاش بنتے ہیں یا خود کو سمجھنے لگتے ہیں، بس یہ وہی تھے۔ ویسے آج ہم یہ سوال پوچھ ہی نہ لیں اس بار بلیک لسٹ تو نہیں ہے مگر اکثر اوقات ٹنڈو الہ یار کے لوگ بلیک لسٹ میں کیوں پائے جاتے ہیں۔ اس بار چونکہ جاب اور کچھ دیگر مصروفیات کی بنا پر مشکل سے ڈائجسٹ پڑھا۔ سب سے پہلے امجد رئیس کو سیلوٹ۔ ارے...... کیا کمال تراجم کرتے ہیں آپ۔ مزہ آجاتا ہے پڑھ کر۔ قاتل کسوٹی ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالی۔ ون آف دا بیسٹ اسٹوریز۔ یقین کریں یہی دو چار لوگ ہیں جن کی محبت اور انداز جاسوسی سے باندھے ہوئے ہے۔ (یقیناً) شمارے کی دوسری شاندار کہانی ... یعقوب بھٹی کا رنگ باغی کٹھ پتلی شاندار کہانی تھی۔ میں برملا کہوں گی۔ عام سی کہانی کو خاص بنانے کا گُر جانتے ہیں۔ اعلیٰ ریسرچ ورک اور عمدہ اندازِ بیاں۔ بہت زبردست۔ مجھے نہیں معلوم یہ پہلے بھی لکھتے رہے ہیں یا نہیں۔ مگر ان سے گزارش ہے یونہی جاسوسی کا حصہ بنے رہیں۔ (اب تو طویل عرصے سے ہمارے ساتھ ہی ہیں) اور بہت سے نئے لوگوں کے لیے اسٹینڈرڈ سیٹ کریں تاکہ وہ بھی کچھ سیکھیں کہ پرانے موضوع کو منفرد کیسے بناتے ہیں۔ منظر امام نے حسنِ باطن کے ذریعے انسان کی اصل خوب صورتی کو اجاگر کرنے کی کوشش کی۔ ویل ڈن۔ عائشہ چوہدری غلطی کے ساتھ اچھا میسج دینے میں کامیاب رہیں۔ خیر، مغل صاحب کی در پردہ کی نئی قسط اچھی تھی۔ عمران جونیئر کی ماتا جی کون ہیں۔ اب وہ بھی سامنے آجائیں، کیونکہ سب ماضی کے کردار آہستہ آہستہ پردۂ اسکرین پر آتے جا رہے ہیں۔ ہیرو بھائی کے فرزند ارجمند سے گزارش ہے ڈریسنگ سینس اچھی کرے تاکہ ماہین گھاس ڈالے۔ ویسے تھوڑی تبدیلی آرہی ہے۔ حقیقت گھسی پٹی کہانی تھی۔ یعقوب بھٹی کی کشمیر کے پس منظر میں لکھی گئی سلگتے خواب ہی دیکھ لیں۔ کتنی جاندار تھی اور دونوں جانب کے فریقین کا پوائنٹ آف ویو دکھایا گیا بلکہ تیسرے فریق یعنی دنیا کا بھی۔ ویسے اس بار غلطی سے دماغ اور گوگل کا استعمال کر کے سرینگر کے بارے میں درست انفارمیشن لکھی۔ سرینگر کے نام یہ شعر زندگی رہی تو جھیل ڈل کے کنارے ملیں گے جہاں میں تمہیں چنار کی کہانی سناؤں گی، میری آخری محبت کی کہانی، کشمیر کی کہانی۔

ماورا عالمگیر کی آمد رحیم یار خان سے ”وہ سردیوں کی خوشگوار صبح تھی (میرے لیے تو صبح ہی تھی) جب بارہ بجے اٹھ کر چائے کا مگ لے کر اوپر جا رہی تھی تو ثمرہ نے کہا کہ تمہارا ڈائجسٹ آیا ہوا ہے رسالے کا سنتے ہی میرے ذہن میں میری میل آگئی۔ میں فوراً رسالہ اور چائے لے کر چھت پر دھوپ سینکنے کے لیے چلی گئی، نکتہ چینی میں پہنچی تو اپنی میل دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی۔ آپ کے ویلکم پر شکریہ، اب میں پھر اپنی میل کے ساتھ حاضر ہوں۔ قاتل کسوٹی ڈھیر ساری انگریزی فلموں کا مجموعہ معلوم ہو رہی تھی مگر اس کی اچھی بات کی امجد رئیس نے کہانی پر اپنی گرفت مضبوط رکھی۔ در پردہ میں تابی کی روٹین پڑھ کے میں بھی خود کو ہیرو سمجھنے لگی کیونکہ میں بھی دسمبر جنوری میں پنکھا چلا کر سوتی ہوں، سکون سا ملتا ہے۔ خیر طاہر انکل نے خوب انٹرٹین کیا۔ بہت مزے دار اور سبق آموز کہانی تھی جس میں ایک اہم میسج پنہاں تھا۔ منظر امام ہمیشہ سے پسندیدہ رہے ہیں، حسنِ باطن میں بھی پوشیدہ سبق تھا، نہایت ہلکے پھلکے انداز میں بات کو خوب صورتی اور مختصر انداز میں سمیٹا گیا۔ غلطی بھی اچھی تحریر تھی، مستقبل قریب میں یہ سب عام ہو سکتا ہے موبائل بلاشبہ زحمت بنتا جا رہا ہے اگر آپ نہیں چاہتے تب بھی۔ پُراسرار بنگلا دلچسپ تحریر تھی، سرور اکرم کی کہانی نے بہت مزہ دیا، بہت ہنسی آئی۔ لیکن حقیقت نے رُلا دیا۔ کشمیر سے ویسے بھی بہت اٹیچ منٹ ہے، ہماری شہ رگ ہے کشمیر، اس پر مصنف نے جس طرح سے تحریر لکھی، بہت دیر تک اداسی چھائی رہی، رب کائنات سے دعا ہے کشمیر کو جلد از جلد آزادی نصیب ہو۔ آمین۔“

عرفان راجا کی گوجر خان ضلع راولپنڈی سے ذرہ نوازی ”فروری کے شمارے کا سرورق بہتر لگا۔ اداریہ ملکی حالات کا خلاصہ تھا۔ راؤ برہان کو صدارت مبارک۔ دوم پوزیشن پر بابر عباس نظر آئے، سوم پوزیشن احتشام الحق کے حصے میں آئی۔ ریاست خان، کنول، محمد قدیر، عثمان ذوالفقار، ماورا عالمگیر، ایمانے زارا شاہ، خلیل احمد انجم، عبدالجبار رومی، احسن زمان، انجم فاروق اور محمد رمشا سمیت سب کی حاضری اچھی رہی۔ قاتل کسوٹی سسپنس کے دبیز پردوں میں لپٹی عمدہ کہانی تھی۔ لورین کا کردار اچھا لگا۔ جرم کا انجام برا ہوتا ہے۔ پال کا انجام ایسا ہی ہوا۔ در پردہ میں مغل صاحب جگو کو لے آئے۔ لگتا ہے کہ سب کردار سامنے لا کر مغل جی طویل کہانیوں کی طرف آئیں گے۔ کشمیر کے موضوع پر کہانی حقیقت بھارتی سورماؤں کی سیاہ کاریوں کی عکاس تھی۔ اناگیر میں علی زین کا... ماضی سامنے آیا ہے۔ اگر یہ دوسری یا تیسری قسط میں سامنے آتا تو زیادہ مزہ آتا۔ بہرحال کہانی اچھی جا رہی۔ الاؤ میں ڈاکٹر صاحب حادثاتی طور پر انڈیا پہنچ گئے۔ اب وہاں ایکشن ہوگا۔ پُراسرار بنگلا پرانے موضوع کی تحریر تھی لیکن مزہ آیا۔ ماسٹر صاحب کی ہنگامہ آرائی پسند آئی۔ جواز کہانی پڑھ کر لگا کہ سسپنس ڈائجسٹ کی کہانی یہاں لگ گئی۔ پہلا رنگ غلام قادر صاحب کے مخصوص انداز میں لکھا تھا۔ بس درمیانے درجے کی کہانی لگی۔ ویسے ان کے اکثر ہیرو کینیڈا اچھلے جاتے ہیں۔ دوسرا رنگ یعقوب بھٹی کے قلم سے جاندار رہا۔ را کے باغی نے خوب ہنگامہ کیا۔“

محمد عثمان ذوالفقار، ساہیوال سے نیا رولا پا رہے ہیں ''اس بار جاسوسی کا سرورق کچھ دیسی قسم کا تھا۔ ایک طرف کونے پر ایک آدمی نے دوسرے کو ڈنڈے کے ساتھ قابو کیا ہوا تھا اور دوسرا آدمی رولا پا رہا تھا، اور حسینہ بے پروائی سے دوسری طرف دیکھ رہی تھی۔ چینی نکتہ چینی میں کرسیِ صدارت پر براجمان جناب راؤ برہان صاحب جھٹ پٹ سے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر رہے تھے۔ دیکھ لیں آپ کے بعد ہم نے بھی جھٹ پٹ استعمال کر لیا اردو ادب میں...... ہاہاہا۔ باقی کچھ میرے جیسے شریف اور معصوم لوگ بھی اپنی اپنی کوشش سے رولا پانے میں لگے ہیں... اب دیکھتے ہیں کہ ادارہ کس کی سنتا ہے۔ ابتدائی صفحات پر امجد رئیس صاحب کی قاتل کسوٹی کمال کی کہانی تھی۔ لورین نے اپنے شوہر کو بچانے کے لیے پوری کوشش سے رولا پایا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ قانون سے بچنے کے باوجود آخر میں مارا گیا۔ کس نے مارا اس کو چھوڑیں۔ اس بار انا گیر میں ساوری نے علی کے روپ میں موجود آخری دشمن پیروزاں کو مار دیا۔ اور علی کے ماضی کو جاننا چاہا تو علی کے نہ ماننے پر ساوری نے بھی رولا پا دیا۔ بالآخر علی زین کو بتانا پڑا۔ میرے خیال میں علی زین کا ماضی دیر سے سامنے آیا۔ دیکھتے ہیں کہ علی زین آگے کیا رولا پاتا ہے۔ یعقوب بھٹی کی کہانی باغی کٹھ پتلی کمال کی تحریر تھی۔ جس میں را کے ایک سابق ایجنٹ جیری نے رولا پایا ہوا تھا اور بالآخر خفیہ ہاتھوں کی مدد سے رولا پانے میں کامیاب رہا۔ طاہر صاحب کے عمران جونیئر نے بھی در پردہ رولا پانے کی کوشش کی۔ لیکن آخر کار اپنے چاچو کے ہاتھوں بے نقاب ہو گیا۔ سلیم کرد کے پُراسرار بنگلے میں ماسٹر آدم نے اپنے ساتھی کے ساتھ آسیبی بنگلے میں رولا پانے کی کوشش کی اور کئی بار پکڑے جانے کے باوجود اس بنگلے کا راز فاش کر دیا۔ اور مجرموں کو پولیس کے ہاتھوں گرفتار کروا دیا۔ غلام قادر صاحب نے عشق جدید کے ذریعے بازارِ حسن میں کچھ رولا پایا اور آخر میں ہیرو کو دوسرے ملک میں فرار کروا کے اس کی اکٹھی دو، دو شادیاں کروا دیں۔ بڑا خوش نصیب تھا ان کا ہیرو۔ بھٹی صاحب نے بھی اس بار الاؤ میں ہائی جیکروں کے ذریعے تھوڑا بہت رولا پانے کی کوشش کی۔ اور ڈاکٹر سیف کو ریگستان میں پہنچا دیا۔ باقی کہانیاں بھی اچھی تھیں۔ ہم نے اس بار لانگاہ پائین کی پیروی اور فرمان کے عین مطابق خوب رولا پانے کی اپنی ...سی کوشش کی ہے۔ دیکھتے ہیں کہ کون کون سنتا ہے۔ ہاہاہا...... اس بار کے لیے اتنا ہی رولا کافی ہے۔''

محمد اقبال کی کراچی سے نئے سال کی پہلی انٹری ''سوچا تھا کہ نئے سال سے ہر ماہ باقاعدہ تبصرہ ارسال کروں گا لیکن کراچی میں رہنے والوں کی طرح ہم بھی بری طرح الجھے ہوئے تھے اپنے مسائل میں لہٰذا جنوری کے شمارے پر تبصرہ نہ کر سکا لیکن فروری کا جاسوسی ہمارے محفوظ ہاتھوں میں پہنچتے ہی ہم نے پکا عہد کر لیا کہ اس ماہ ضرور تبصرہ کروں گا۔ ٹائٹل فور کلر تھا۔ ٹائٹل حسینہ کو دیکھ کر ایک انار سو بیمار والی مثال یاد آ گئی لیکن یہاں تین بیمار تھے۔ ایک جدید ہتھیار سے لیس اور چہرے پر ماسک بھی لگایا ہوا تھا جبکہ دوسرا ولن تیسرے کے گلے میں گنڈاسا ڈالے زور آزمائی کر رہا تھا اور عالمی ادارہ صحت کی تمام ہدایات کے باوجود ماسک کے استعمال کو ضروری خیال نہیں کیا۔ حسینہ نہ جانے کن خیالوں میں گم تھی۔ بہرحال ٹائٹل مناسب تھا۔ اشتہارات دیکھتے ہوئے فہرست پر نظر ڈالی۔ فہرست پر محنت کی گئی ہے، اچھی لگی۔ اداریے میں بجلی کے بحران اور مسائل کا ذکر ہوا جو مسلسل بڑھ رہے ہیں اور ساتھ ہی یونٹ میں مزید اضافے کی خبریں بھی گردش کر رہی ہیں، اللہ پاک رحم فرمائے، آمین۔ چینی نکتہ چینی میں لاہور کے راؤ برہان چینی کھانے کے مستحق ٹھہرے۔ بہت مبارک ہو۔ تبصرہ اچھا تھا۔ دوسرے نمبر پر بابر عباس اینڈ فیملی کا تبصرہ عمدہ تھا۔ تازو ناز نین ایمانے زارا شاہ کے اندازِ بیان پر کیا لکھوں طویل خط تھا لیکن بوریت نہیں ہوئی۔ سب کچھ تھا اس میں چھیڑ چھاڑ اور کہانیوں پر تبصرے۔ لیکن خواتین کا مورال بلند کرنا بہت پسند آیا۔ مختصر تبصروں کے ساتھ باقی تمام ساتھیوں کے تبصرے بھی اچھے لگے۔ ہلکی پھلکی نوک جھوک مزہ دیتی ہے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے طاہر جاوید مغل کی در پردہ پڑھی۔ مغل صاحب آپ کا بہت شکریہ کہ آپ نے پچھلے سلسلے کے کرداروں پر ہی جاسوسی کے قارئین سے اپنا رشتہ تو بحال کیا۔ آپ سے درخواست ہے کہ جلد ہی ایک اور دھواں دھار سلسلہ شروع کریں، بہت شدت سے انتظار ہے (ہم نے تو کب سے عرضی ڈالی ہوئی ہے) اس کے بعد امجد رئیس کی قاتل کسوٹی شروع کی اور ہمیشہ کی طرح بیچ در بیچ کہانی پتا ہی نہیں چلا کہ کب ختم ہو گئی اور رات آدھی گزرنے کا احساس بھی نہیں ہوا، ویلڈن امجد رئیس صاحب۔ اگلے دن یعقوب بھٹی کی باغی کٹھ پتلی سے شروع ہوئے، واہ کیا بات ہے۔ کہانی میں سب ہی کچھ تھا مزہ آ گیا۔ حسنِ باطن، منظر صاحب کی واہ مزہ آ گیا۔ ان کا جواب نہیں چھوٹی سی کہانی میں کتنا زبردست پیغام ہے۔ امجد جاوید کی انا گیر کی دسویں قسط مناسب تھی۔ عبدالرب بھٹی کی الاؤ کی سولھویں قسط پڑھی، ٹھیک ہی تھی۔ اعتراز سلیم وصلی کی حقیقت متاثر کرنے میں کامیاب رہی۔ غلام قادر کی عشقِ جدید کوئی خاص متاثر نہ کر سکی۔ سرور اکرم کی آج کی کہانی بس ایویں سی تھی۔ عمران قریشی کی جواز بہتر تھی۔ باقی زیرِ مطالعہ ہیں۔''

محمد عثمان خان لاہور سے موصول ہو گئے ہیں، لکھتے ہیں ''فروری کا جاسوسی ڈائجسٹ 25 جنوری کو سلطان نیوز ایجنسی سے لیا۔ سرورق اچھا تھا۔ خطوط میں اپنا خط نہ دیکھ کر بہت افسوس ہوا۔ میں نے پہلی مرتبہ جاسوسی میں خط بھیجا تھا لیکن نہیں چھپا۔ (ملا ہی نہیں تھا) کرسیِ صدارت سنبھالنے پر راؤ برہان کو مبارک باد۔ سب قارئین کے خطوط پسند آئے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے امجد رئیس صاحب کی کہانی قاتل کسوٹی پڑھی۔ طاہر جاوید مغل صاحب در پردہ میں ایک مرتبہ پھر عمران جونیئر کی کہانی لے کر آئے۔ میں ایک بار پھر کہوں گا کہ انہیں خود ختم کیے ہوئے کردار کو دوبارہ کسی اور صورت میں لے کر نہیں آنا چاہیے تھا۔ (کیوں بھئی؟) احسان فراموشی میں دیوار میں موجود نقشے کی سمجھ نہیں آئی۔ حقیقت اعتراز سلیم وصلی کی اچھی کوشش تھی۔ حسنِ باطن منظر امام صاحب کی مخصوص انداز پر مشتمل تحریر پسند آئی۔ غلطی میں عائشہ چوہدری نے اچھا پیغام دیا۔ پُراسرار بنگلا پرانے موضوع پر کہانی تھی کہ مجرمان کسی مکان کو آسیب زدہ ظاہر کر کے اپنے مذموم

مقاصد پورے کرتے ہیں۔ محمد سلیم کردنے پرانے موضوع پر اچھی کہانی لکھنے کی کوشش کی۔ سرورق کی پہلی کہانی عشق جدید اتنی پسند نہیں آئی۔ سرورق کی دوسری کہانی باغی کٹھ پتلی یعقوب بھٹی کی اچھی کوشش تھی لیکن کہانی میں کچھ باتوں کی سمجھ نہیں آئی۔ (رہنے دیں اب......) مجموعی طور پر فروری کا جاسوسی بہترین تھا۔"

بدرالاسلام بدر کی سمجھ داری کا مسئلہ ڈڈیال سے "طویل عرصے بعد دیدارِ جاسوسی ہوا۔ چینی نکتہ چینی میں راؤ برہان صاحب براجمان ہیں، نام اجنبی ہے لیکن شناسا ہو جائیں گے، بابر عباس اینڈ فیملی تو دھمکیاں دے کر نکل گئی غالباً انہوں نے سرورق کو پلٹا نہیں ورنہ جوہر، جوشاندہ ضرور دیکھ لیتے۔ احتشام الحق صاحب، خان صاحب وہی پرانے ٹھاٹ باٹ کے ساتھ تشریف لائے تھے، کنول صاحبہ تو بھیگی بلی بنی رہیں کہ بارش ختم اور ٹھنڈ نکل لو۔ محمد قدیر صاحب کا تبصرہ مفصل تھا، ماورا عالمگیر کی کہانی اچھی لگی، ایمانے زارا شاہ اور اتنا طویل تبصرہ۔ قاتل کسوٹی بہترین کہانی تھی۔ دہری چال میتھ کے سوال کی طرح تھی یعنی کچھ سمجھ نہ آئی۔"

انجم فاروق ساحلی کی لاہور سے دھیمی روانی "فروری کا جاسوسی خوش رنگ اور شوخ ٹائٹل کے ساتھ منظرِ عام پر آیا۔ مناظر ایکشن اور تھرل کی عکاسی کرتے ہوئے اپنی طرف متوجہ کر رہے تھے۔ پہلے دونوں خطوط دلچسپ اور تجزیے سے بھرپور تھے۔ کاغذ کا معیار اس مرتبہ کچھ بہتر ہے اور جلد بندی بھی ٹھیک ہوگئی۔ بال یا دبال کارٹون خوب ہے۔ میڈیکل غزل بھی دلچسپ ہے۔ اقتباسات بھی اچھے تھے۔ خطوط کی محفل اس بار بھی جامع اور مفصل تھی۔ جاسوسی نے کہانیوں کے سب سے زیادہ زاویے متعارف کروائے ہیں۔ حقیقت، حسنِ باطن، در پردہ، آج کی کہانی، باغی کٹھ پتلی خوب ہیں۔ پُراسرار بنگلے کا ماحول اچھا ہے لیکن واقعات زیادہ متاثر نہ کر سکے۔ قاتل کسوٹی زیرِ مطالعہ ہے۔ الاؤ کی قسط متاثر نہ کر سکی۔ کچھ تحریریں ابھی مطالعے سے نہیں گزریں۔"

محمد احسن زمان کی وزیر آباد سے آخری لمحوں میں آمد "سردی اپنے جوبن پر ہے اور ہم جیسے سفید پوش خیالی ڈرائی فروٹ پر گزارا کر رہے ہیں۔ جیسے لوگ خیالی پلاؤ پکا لیتے ہیں۔ مہنگائی تو جیسے گولی کی رفتار سے آسمان کی طرف رواں دواں ہے، جس رفتار سے اس کا سفر جاری ہے جلد ہی یہ کائنات کی وسعتوں کو پالے گی اور مستقبل قریب میں بہت ساری اشیا ہمارے لیے ناپید ہو جائیں گی پھر ہم ان کی تصویریں ہی دیکھ کر دل کو بہلایا کریں گے، چھوڑیں، آیئے زلف کی، رخسار کی باتیں کریں۔ مزاجِ یار کی باتیں کریں۔ مم...... میرا مطلب جاسوسی کی بات کریں، سرورق کے تو واہ کیا کہنے...... اتنا رنگین سرورق بہت عرصے کے بعد جاسوسی کی زینت بنا ہے۔ اس بار راؤ برہان کا تبصرہ پائدان پر سجا ہوا تھا۔ عمدہ لکھا ہوا تھا۔ ریاست خان نے میری موجودگی پر خوشی محسوس کی، مہربانی۔ محمد قدیر صاحب کا تبصرہ بھی اچھا رہا۔ ساہیوال والے عثمان صاحب نے ہمیں صرف نظر کیا، کوئی بات نہیں۔ گوجر خان سے عرفان راجا نے بھی اپنی جگہ خوب بنا رکھی تھی۔ ایمانے زارا شاہ شہر اقتدار سے اپنے مخصوص انداز سے وارد ہوئی تھیں اور کیا خوب ہوئی تھیں بہت عمدہ واہ، واہ تالیاں۔ خلیل انجم کی نامعلوم جگہ سے بزم آرائی بھی اچھی رہی۔ معجہ، رمشا نے بھی اپنی موجودگی کا خوب پتا دیا۔ مجموعی طور پر سرد موسم میں محفلِ دوستاں خوب گرم رہی۔ امجد رئیس کی قاتل کسوٹی بہت ہی شاندار تحریر تھی۔ گرگٹ کی طرح ہر لمحہ رنگ بدلتی کہانی نے ہمارا سر ہی چکرا کر رکھ دیا، ہر لمحہ لگتا تھا کہ لورین اب پکڑی گئی کہ تب پکڑی گئی لیکن ہر بار چکنی مچھلی کی طرح ہاتھ سے پھسلتی رہی۔ دوسرا جب وہ پانی میں پال سے لڑ رہی تھی، بہت عمدہ۔ بہر حال لورین پر قدرت کچھ زیادہ ہی مہربان تھی۔ در پردہ میں وہی عمران جونیئر کی پرانی کہانی سے جڑی کتھا تھی لیکن اس کا سبق عمدہ تھا کہ حق دار کی مدد ایسے کی جائے کہ دوسرے ہاتھ کو بھی خبر نہ ہو۔ کشمیر میں جو کچھ ہو رہا ہے یہ قضیہ تیزی سے اپنے انجام کی طرف رواں دواں ہے جلد ہی ظلم کی اندھیری رات کے بعد آزادی کا سورج طلوع ہوتا نظر آ رہا ہے۔ اعتراز سلیم وصلی کی حقیقت کچھ ایسے ہی اشارے کر رہی تھی۔ منظر امام کی حسنِ باطن ایک اچھی اور دل کو موہ لینے والی تحریر تھی۔ عنائشہ چوہدری کی غلطی آج کل کے ہر گھر کا ماتم تھا۔ کاشف زبیر کی پینٹنگ میں ڈاکٹر عبدالرب بھٹی رنگ بھر رہے ہیں۔ عمران قریشی کی جواز بس ٹھیک تھی۔ یہ بات تو بہر حال درست ہے کہ ازدواجی زندگی دو دھاری تلوار کے مانند ہے۔ کوئی معمولی سی غلطی، کوئی بے جواز بات بھی اچھے بھلے ہنستے بستے گھر کو اجاڑ کر رکھ دیتی ہے۔ سلیم کردی کی پُراسرار بنگلا بالکل پسند نہیں آئی۔ سرور اکرم نے آج کی کہانی پیش کی، بڑی دلچسپ صورتِ حال میں آغاز ہوا لیکن انجام پڑھ کر ہنسی نکل گئی۔ بابا بے نشان نے ایسا تیر چلایا جو سید حا نشانے پر جا لگا اور ساون منہ ہی دیکھتا رہ گیا۔ سرورق کا پہلا رنگ عشق جدید تھا جسے غلام قادر نے تحریر کیا تھا، بہت عمدہ بنت اور قلم کاری کا مظاہرہ کیا گیا تھا۔ جو کبھی لڑائی میں جیت بالآخر سچے جذبے اور نیک نیت کی ہوئی۔ باغی کٹھ پتلی بھی اعلیٰ درجے کی کہانی تھی۔ جسپال سنگھ نے سینے میں ٹھنڈ ڈال دی، بھارتی خفیہ ایجنسی کو خوب آشکارا کیا ان کے ایجنٹ ٹامک ٹوئیاں مارتے رہے اور جیری اپنے ہدف کی طرف چیتے کی طرح بڑھتا رہا گو کہ آنند راؤ نے نمک کا حق ادا کرنے کی مقدور بھر کوشش کی لیکن گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے کے مصداق جیری ان کے سارے کرتوتوں سے واقف تھا لہٰذا وہ دو قدم آگے ہی رہا۔ ٹوبا اور جیری کی گفتگو نے بہت مزہ دیا۔ خصوصاً جب جیری نے اپنی اصلیت آشکارا کی تو میں ٹوبا کی حالت سے بہت لطف اندوز ہوا، رام سری جزیرے پر ہوئی فائٹ نے بہت لطف دیا، جیری نے ٹوبا کو انجام تک پہنچانے کا خوب بندوبست کیا اور انعام میں کیلی کو کروڑوں کے سونے کے ساتھ پالیا، کترنیں اب لگتی کم ہیں یا بھیجنے والے ناپید ہو گئے۔" (جی ناپید ہو گئے ہیں آپ ہی یہ ذمے داری اٹھالیں)

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔

مومنہ کشف، بہاولپور۔ شفیع اللہ، کراچی۔ راحیلہ بھٹی، لاہور۔ فیاض احمد، کراچی۔ شاہین آفریدی، پشاور۔

عہد ساز شخصیت

چند ذروں کو ہی ملتی ہے ضیائے خورشید
چند تارے ہی چمکتے ہیں سحر ہونے تک

جہاں میں قافلے آتے رہتے ہیں مگر مقبولیت اور شہرت کی خوش نصیبی کسی کسی کی زندگی میں آتی ہے۔ معراج رسول صاحب کا شمار بھی ایسے ہی خوش نصیبوں میں ہوتا ہے۔ 1971ء میں کٹھن کاوشوں کا سامنا کرتے ہوئے انہوں نے جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشن کی بنیاد رکھی۔ جو مسلسل سفر کرتے ہوئے ڈائجسٹوں کی دنیا میں سب سے مقبول اور مضبوط ادارے کی صورت اختیار کرتا چلا گیا۔ وہ انقلابی سوچ کے مالک تھے۔ اُن کی سوچ کی کئی جہتیں اور کئی حوالے تھے۔ جس نے ان کے لگائے گئے پودوں کو توانا درختوں میں ڈھالا۔ آج بھی وہ درخت ہرے بھرے اور مشک بُو ہیں...... ہر علاقے کے در و بام ان کی خوشبو سے مہک اور فیضیاب ہو رہے ہیں۔ دیکھا جائے تو معراج رسول صاحب اپنی ذات میں ایک انجمن...... ایک ادارہ تھے۔ ایک ایسی شخصیت جسے پارس کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ کتنے ہی نامور ادیب اور مصنفین گزرے ہیں جو صرف اُن کی جوہر شناس نظروں کی بنا پر اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لائے۔ بہت اعلیٰ اور عمدہ آئیڈیاز کو سوچنا...... خواب دیکھنا...... تخلیق کاری اور کریٹیویٹی ہے مگر اس خواب کو تعبیر کے قالب میں ڈھالنا ان تصورات اور آئیڈیاز کو عمل کے پیرائے میں تراشنا ایک ایسا ہنر ہے جو کم لوگوں کے پاس ہوتا ہے۔ معراج رسول صاحب ایسے ہی یکتائے روزگار تھے۔

وہ صرف پاکستان کے سب سے بڑے ڈائجسٹ کے مالک ہی نہیں تھے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ایک ایسا ادارہ تھے جنہوں نے ایک جانب لکھنے والوں کے لیے آسانیاں پیدا کیں اور دوسری جانب شوقِ مطالعہ پیدا کیا۔ جاسوسی ادب میں اپنے قارئین کا ایک وسیع حلقہ بنایا۔ ان کے ذوق کو بلند کیا۔ اچھی تحریر پر وہ اس طرح خوش ہوتے اور داد دیتے کہ لکھنے والے کا دل خوش ہو جاتا۔ کم گو تھے مگر گفتگو کا ہُنر جانتے تھے۔ پاکستان میں ڈائجسٹوں کی صنعت کو بامِ عروج تک لے جانے میں ان کا نام سرِفہرست رہے گا۔ اُن کا لگایا ہوا پودا آج ایک تناور درخت کی شکل میں ماشاء اللہ پھل پھول رہا ہے۔ ان کی شریکِ سفر مسز عذرا رسول بالکل ان ہی کے مانند اس چمن کی آبیاری کر رہی ہیں۔ یقیناً انہیں بھی ان پر فخر ہوگا۔ پروردگارِ عالم معراج رسول صاحب کے درجات بلند فرمائے اور جس طرح انہوں نے عمر بھر دوسروں کے لیے آسانیاں پیدا کیں...... اللہ تعالیٰ اُن کی آخرت کی منزلیں آسان فرمائے۔ آمین یا ربّ العالمین......
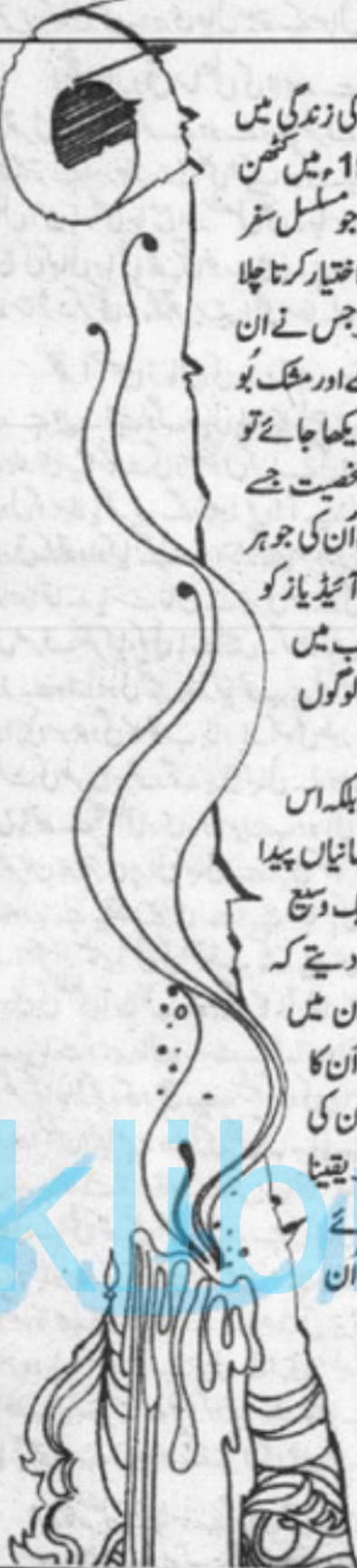
چہرہ چور

نجمہ مودی

زندگی اتفاقات اور حادثات کا مجموعہ ہے... مگر کسی کسی کی زندگی میں ایسے واقعات در آتے ہیں جو نہایت دل دوز ہوتے ہیں... اُن کے رونما ہونے میں کسی انسانی ہاتھ کا عمل دخل نہیں ہوتا... بس قدرت کی ایسی نشانیاں ہوتی ہیں... جنہیں ذہن و عقل سمجھنے اور سلجھانے سے قاصر رہتے ہیں... جاسوسی کے صفحات پر بکھری ایک پرتجسس داستاں... جہاں حسین چہرے اپنی شناخت کھو رہے تھے... کوئی ان دیکھی مخلوق تھی جو معصوم... خوبصورت... دل میں اتر جانے والی صورتوں کو بگاڑ رہی تھی... قدم قدم پر خوف نے پنجے گاڑ لیے تھے... جنم جنم کا پیاسا وجود اپنی پیاس کو بجھانا چاہتا تھا... مگر سمندر نظروں کے سامنے ہوتے ہوئے بھی تشنگی اپنی جگہ قائم تھی...

طاقت و انتقام کی اندھی وحشت جو انسانی وجود کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی

اپنے نکیلے "پنجوں" سے اس خوب صورت لڑکی کے چہرے کا گوشت نوچ، نوچ کر کھاتے ہوئے مجھے بڑا مزہ آرہا تھا۔ چہرے کا نرم، نرم گوشت بڑا لذیذ ہوتا ہے۔ لڑکی جتنی زیادہ خوب صورت ہو، اُس کے چہرے کا گوشت اتنا ہی نرم اور لذیذ ہوتا ہے۔ خون آلود، نرم گوشت کے ساتھ چہرے کی کھال تھوڑی سی بدمزگی پیدا کرتی ہے لیکن میں اسے برداشت کرلیتی ہوں۔ میرے ہاتھ انسانی ہاتھ ہرگز نہیں لگتے۔ میرے ناخن کسی درندے کے ناخنوں کی طرح لمبے اور نکیلے ہیں۔ ہڈیاں پتلی مگر لوہے کی طرح مضبوط ہیں۔ کھردری، موٹی، سیاہ جلد پر تھوڑے سے بال بھی ہیں۔

نکیلے ناخنوں کی وجہ سے میں سارے چہرے کا گوشت آسانی سے نوچ لیتی ہوں۔ صرف آنکھیں چھوڑ دیتی ہوں۔ بغیر گوشت کے چہرے پر شاید یہ آنکھیں دوسرے لوگوں کو کچھ عجیب یا ڈراؤنی لگتی ہوں لیکن مجھے بالکل نہیں لگتیں۔ اس لڑکی کی آنکھیں مجھے بتا رہی ہیں کہ میں اپنے پنجہ نما ہاتھوں سے اس کے چہرے کا گوشت نوچ رہی ہوں تو اسے قطعی کوئی تکلیف نہیں ہورہی، کیونکہ چند لمحے پہلے یہ میرے ہی ہاتھوں مرچکی تھی۔ میری خواہش بھی یہی ہوتی ہے کہ جب میں کسی حسین لڑکی کے چہرے کا گوشت کھاؤں تو اسے کوئی تکلیف نہ ہو کیونکہ اگر وہ حسین تھی تو اس میں اس کا اپنا کوئی قصور نہیں تھا۔

یہ لڑکی اپنے بوائے فرینڈ کے بازو میں بازو پھنسائے بےفکری سے اس سنسان گلی میں جارہی تھی۔ میں نے بوائے فرینڈ پر پیچھے سے اچانک حملہ کیا تھا۔ وہ میرے ایک ہی وار سے اوندھے منہ آگے جاگرا اور بے ہوش ہوگیا۔ وہ مجھے دیکھ بھی نہیں سکا۔ لڑکی نے پہلے اپنے بوائے فرینڈ کی طرف جھک کر دیکھا، پھر پیچھے دیکھنے کے لیے پلٹی۔ مجھے دیکھ کر دہشت سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس نے چیخ مارنے کے لیے منہ کھولا لیکن اس سے پہلے کہ اس کے حلق سے کوئی آواز برآمد ہوتی، میں نے دونوں ہاتھوں، یا یوں کہیے کہ دونوں پنجوں سے اس کا نرخرہ دبوچ لیا۔ میں نے اس کا نرخرہ اُدھیڑ ڈالا۔ وہ کوئی آواز نکالے بغیر مرگئی۔ خوف و دہشت کے تاثرات اس کے چہرے پر نقش ہوکر رہ گئے۔ مجھے ان تاثرات سے سخت نفرت ہے۔ جب مجھے دیکھ کر کسی کے چہرے پر ایسے تاثرات ابھرتے ہیں تو مجھے بہت بُرا لگتا ہے، بہت غصہ آتا ہے۔ بہرحال، اس کے باوجود میں نے لڑکی کے چہرے کا گوشت چباتے اور نگلتے وقت دل ہی دل میں اس سے معذرت کی۔ میں نے اس کے کسی قصور یا جرم کی وجہ سے اسے ہلاک نہیں کیا تھا۔

لڑکی کے بوائے فرینڈ کے کراہنے کی آواز آئی۔ اس کے ایک بازو میں خفیف سی حرکت بھی پیدا ہوئی۔ شاید وہ ہوش میں آرہا تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ اب وہاں سے غائب ہوجانا چاہیے تھا۔ چہرے کے گوشت سے محروم ہونے کے بعد اب لڑکی ذرا بھی حسین نہیں رہی تھی۔ خون میں لتھڑی ہوئی اس کے چہرے کی اونچی نیچی ہڈیوں کے درمیان سے اس کی بےنور آنکھیں گویا مجھے تک رہی تھیں۔ ہونٹوں سے محروم اس کے دانت اب اتنے خوب صورت نہیں لگ رہے تھے جتنے ہونٹوں کی موجودگی میں لگتے ہوں گے۔ میں نے ایک بار پھر دل ہی دل میں اس سے معذرت کی۔ اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ بس، وہ خوب صورت تھی۔ اُسے اتنا خوب صورت نہیں ہونا چاہیے تھا۔

اب مجھے وہاں سے ہٹنا تھا۔ اس منظر سے نکلنا تھا۔ پس منظر میں جانا تھا، لیکن اس سے پہلے مجھے لڑکی کے پرس سے اس کی رقم نکالنی تھی۔ لڑکے کا بٹوا بھی نکالنا تھا۔ رقم کی ضرورت تو سب کو ہوتی ہے۔ مجھے بھی ہوتی ہے۔ میں نے رقم نکال لی۔ اب مجھے یہاں سے چلے جانا چاہیے...... لیکن زیادہ دور نہیں...... میرا خیال ہے، میں یہ سامنے والی بلڈنگ کی چھت پر چڑھ جاتی ہوں۔ چھت پر مجھے کوئی نہیں دیکھ سکے گا لیکن میں وہاں سے جھانک کر، گلی میں سب کو دیکھ سکوں گی۔ اپنے پنجوں اور پیروں کے ناخنوں کی مدد سے مجھے اینٹوں اور بلاکوں کی دیواروں پر چڑھنے میں کوئی مشکل نہیں ہوتی۔

اب میں چھت پر ہوں۔ میں جھانک کر آسانی سے نیچے کا منظر دیکھ رہی ہوں۔ تھوڑی ہی دیر میں سراغ رساں ہیریسن آن پہنچے گا۔ لڑکی کا بوائے فرینڈ جو بے ہوش تھا، اب ہوش میں آچکا ہے۔ وہ اٹھ بیٹھا ہے۔ اپنی گرل فرینڈ کے چہرے کی طرف دیکھ کر اس نے زور کی چیخ ماری ہے۔ اس کے چہرے پر خوف و دہشت ہے۔ مجھے ایسے تاثرات اچھے نہیں لگتے۔ شاید وہ غمزدہ بھی ہے۔ رونے لگا ہے۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے افسوس ہورہا ہے۔ مجھے بھی رونا سا آرہا ہے۔

☆☆☆

پولیس آفیسر اور سراغ رساں ہیریسن نے فون پر دوسری طرف سے اپنے اسسٹنٹ جیکب کی بات سنی اور اسے قے سی آنے لگی۔

''ایسا مت کہو جیکب۔'' وہ کراہنے کے سے انداز میں بولا۔

''مجبوری ہے۔ مجھے آپ کو بتانا پڑ رہا ہے۔'' دوسری طرف سے جیکب نے کہا اور گہری سانس لی۔ ''ایک اور ویسا ہی کیس سامنے آ گیا ہے۔''

''اوہ میرے خدا......'' ہیریسن کے لہجے میں تاسف تھا۔ ''اس بار واردات کہاں ہوئی ہے؟''

جیکب نے اندرونِ شہر کا ایک ایڈریس بتایا۔

''ٹھیک ہے...... میں پہنچتا ہوں۔ اس وقت سڑکوں پر ٹریفک زیادہ نہیں ہوگا۔ جلدی پہنچ جاؤں گا۔'' پولیس آفیسر اور سراغ رساں ہیریسن نے گویا اپنے اسسٹنٹ کو تسلی دی۔ وہ گویا ضد کر کے اب تک شہر سے دور، لانگ آئی لینڈ پر رہائش پذیر تھا جہاں سے بعض اوقات اسے جائے واردات پر پہنچنے میں خاصی دیر لگ جاتی تھی۔ اسے اندرونِ شہر سرکاری قیام گاہ کی پیشکش بھی کی گئی تھی لیکن وہ اس نے قبول نہیں کی تھی۔ اسے اپنا کشادہ اور مضافاتی طرز کا مکان بہت پسند تھا۔ وہ وہیں رہنا چاہتا تھا۔ دوسری طرف مصیبت یہ تھی کہ ان مخصوص قسم کی وارداتوں کی تفتیش اس نے خود فرمائش کر کے اپنے ذمّے لے لی تھی۔ چنانچہ وہ ڈیوٹی پر ہوتا یا نہ ہوتا، ان مخصوص وارداتوں کی اطلاع اسے ہی دی جاتی تھی اور اسے آنا ہوتا تھا۔

اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ شہر سے دور ہونے کے باوجود اسے اکثر جائے واردات پر پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگتی تھی۔ اس تازہ واردات کی اطلاع اسے ملی تو وہ سونے کے لیے لیٹ چکا تھا۔ اس کی بیوی مارتھا برابر میں لیٹی تھی۔ اس نے فون بند کیا تو مارتھا نے اس کی طرف گردن گھما کر غنودگی زدہ آواز میں پوچھا۔ ''پھر وہی کیس؟''

''ہاں۔'' اسے اثبات میں جواب دینا پڑا۔

''اُف خدایا......'' مارتھا نے گہری سانس لی۔ ''آخر یہ سلسلہ کب بند ہوگا؟''

''جب تک میں اس شخص کو پکڑ نہیں لیتا جو یہ سب کچھ کر رہا ہے۔'' ہیریسن نے بوجھل لہجے میں کہا۔

مارتھا نے اس کی طرف کروٹ لی اور پیار سے اس کا بازو تھامتے ہوئے بولی۔ ''مجھے معلوم ہے، ان دنوں تم ایک کڑی آزمائش سے گزر رہے ہو...... لیکن میں تمہارے ساتھ ہوں۔''

''میں جانتا ہوں، تھینکس ڈیئر۔'' اس نے مارتھا کا گال تھپتھپایا۔ اس کے انداز میں پیار بھی تھا اور شکرگزاری بھی۔

وہ بستر سے نکل آیا لیکن بچوں کے کمرے کی طرف نہیں گیا۔ اسے معلوم تھا، وہ اس وقت گہری نیند سو رہے ہوں گے۔ دو منٹ میں تیار ہو کر وہ گھر سے نکل آیا۔ گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہوتے وقت اس نے الوداعی سے انداز میں اپنے فارم ہاؤس ٹائپ مکان پر نظر ڈالی۔ مکان سکوت میں ڈوبا ہوا تھا تاہم اس کے مختلف حصوں میں روشنی نظر آ رہی تھی۔ اس مضافاتی اور دیہی سے علاقے میں سکون کا احساس ہوتا تھا ورنہ گنجان آباد شہری علاقے میں جو کچھ ہو رہا تھا، وہ گویا ہیریسن کو پاگل کر دینے کے لیے کافی تھا۔ جب بھی اس کے ذہن پر حالات کا دباؤ بڑھنے لگتا تھا، وہ اپنی بیوی اور بچوں کا تصور کر لیتا تھا۔ اسے گویا تقویت اور سہارا سا مل جاتا تھا۔ حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے اس میں ایک نئی توانائی سی آ جاتی تھی۔ شہر میں جس قسم کی وارداتیں ہو رہی تھیں، اسے کچھ یوں لگنے لگا تھا جیسے شہر رفتہ رفتہ ایک بہت بڑے پاگل خانے میں بتدیل ہو رہا تھا۔

تازہ ترین وارداتوں نے تو دو کروڑ آبادی کے شہر میں خوف و دہشت کی ایک نئی لہر دوڑا دی تھی۔ نہ جانے وہ کون تھا جو حسین لڑکیوں کے چہرے کا سارا گوشت نوچ لیتا تھا۔ وہ چہرے جنہیں کبھی لوگ مڑ مڑ کر دیکھتے تھے، اتنے بھیانک ہو گئے تھے کہ انہیں دیکھ کر انتہائی سخت دل لوگوں کے بھی رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ پولیس والوں کو آئے دن ایک سے بڑھ کر ایک لرزہ خیز واردات سے واسطہ پڑتا تھا لیکن ان وارداتوں نے ان کی بھی راتوں کی نیندیں اُڑا دی تھیں۔ ادھر سراغ رساں ہیریسن کو نہ جانے کیا سوجھی تھی کہ اس قاتل کو پکڑنے کی ذمّے داری اپنے سر لے لی تھی اور اب یہ گویا اس کی انا کا مسئلہ بن گیا تھا۔ پیشہ ورانہ طور پر بھی اب گویا اس کے مستقبل کا دار و مدار اس کیس میں کامیابی پر تھا۔

یہ وارداتیں تقریباً چار ماہ پیشتر شروع ہوئی تھیں۔ ایک ہفتے میں ایک لڑکی اس درندہ صفت قاتل کا نشانہ بن رہی تھی۔ وارداتوں کا انداز بالکل یکساں تھا۔ پھر چھ وارداتوں کے بعد سکوت چھا گیا۔ تین ہفتے تک جب کوئی ایسی واردات نہیں ہوئی تو سراغ رساں ہیریسن کے دل میں خوش گمانی نے سر اٹھایا کہ شاید قاتل خود کسی وارادت کا نشانہ بن گیا تھا، شاید کسی وجہ سے اس نے یہ ہولناک وارداتیں چھوڑ دی تھیں یا پھر شاید وہ کسی جنگل یا غار میں جا کر طویل نیند سو گیا تھا...... مگر آج اچانک یہ اطلاع آ گئی تھی۔ ساری

خوش گمانی اور امیدیں دم توڑ گئیں۔
ہیریسن نے جب تصور کیا کہ آج اسے پھر ایک بے چہرہ لاش دیکھنی پڑے گی، تو اس کی طبیعت متلانے لگی۔ پھر اسے یہ بھی خیال آیا کہ کل سے اخبارات دوبارہ آسمان سر پر اٹھانا شروع کر دیں گے۔ بیچ میں تین چار ہفتوں کے لیے یہ سلسلہ بند ہو گیا تھا تو ذرائع ابلاغ میں بھی ہلچل دم توڑ گئی تھی لیکن اب پھر نئے سرے سے انہیں وہی موضوع ہاتھ آنے والا تھا۔ اخبارات نے اس نامعلوم شخص کو ''چہرہ چور قاتل'' کا نام دیا تھا جو حسین عورتوں کے چہرے سے گوشت غائب کر کے انہیں بے چہرہ، بے شناخت اور بھیانک بنا دیتا تھا۔ اب اس کا یہی نام مشہور ہو چکا تھا۔

☆☆☆

''بس...... اتنا ہی کافی ہے۔'' سارجنٹ ہیریسن نے لاش کا سرسری سا معائنہ کرنے کے بعد کہا۔
ایک ایسے چہرے کی طرف دیکھنا یقیناً بڑا صبر آزما کام تھا جو کچھ دیر پہلے تک غالباً بے حد حسین رہا ہو گا لیکن اب اس کی جگہ خون اور گوشت کے تھوڑے سے ملغوبے سے لتھڑی ہوئی چند اونچی نیچی بدنمائیاں اور دانت تھے۔ سب سے بھیانک وہ آنکھیں لگتی تھیں جن پر پپوٹے اور پلکیں وغیرہ نہیں ہوتی تھیں۔ ہیریسن کو لگتا تھا جیسے وہ آنکھیں ایک ٹک اسی کی طرف دیکھ رہی ہوں، ان میں ایک سوال، ایک الزام ہو۔ ''تم ہی ہو وہ پولیس آفیسر، جو ہماری حفاظت نہیں کر سکا؟ نہ جانے اب تم ہمارے قاتل کو بھی گرفتار کر سکو گے یا نہیں......''
''یہ ساتویں لاش ہے۔'' اس کے قریب کھڑے جیکب نے کہا۔ عہدے کے اعتبار سے وہ بھی سارجنٹ تھا لیکن ہیریسن سے جونیئر تھا اور ایک طرح سے اس کے اسسٹنٹ کے فرائض انجام دیتا تھا۔ وہ زور، زور سے چیونگم چبا رہا تھا جیسے اپنا غصہ چیونگم پر نکال رہا ہو۔
''گنتی مجھے بھی آتی ہے۔'' ہیریسن نے ہلکی سی ناگواری سے کہا۔ ''یہ بتاؤ، کوئی نئی بات تو سامنے نہیں آئی؟''
''نہیں۔'' جیکب نے جواب دیا۔ ''وہی پرانا طریقۂ واردات ہے۔ نرخرہ درندوں کے سے انداز میں ادھیڑ دیا گیا۔ چہرے کا گوشت نوچ لیا گیا۔ رقم چرا لی گئی۔''
ہیریسن ہلکی سی جھرجھری لے کر رہ گیا۔
اُس نے جب خاص طور پر اس قاتل کو پکڑنے کی ذمے داری اپنے سر لی، اس وقت تک اس طرح کے تین قتل ہو چکے تھے لیکن ہیریسن نے ان میں سے کسی لاش کو نہیں دیکھا تھا۔ اس نے صرف میڈیکل ایگزامنر کے دفتر میں ان کی تصویریں دیکھی تھیں۔ وہ وارداتیں ان علاقوں میں نہیں ہوئی تھیں جو ڈیوٹی کے اعتبار سے اس کی عمل داری میں آتے تھے۔ پھر نہ جانے کیوں اس نے خود ہی آگے بڑھ کر قاتل کو تلاش کرنے کی ذمے داری اپنے سر لے لی تھی۔ وہ خود بھی اس کی وجہ نہیں سمجھ سکا تھا۔
اس نے میڈیکل ایگزامنر کے دفتر میں ''بے چہرہ'' لاشوں کی جو تصویریں دیکھی تھیں، وہ بھی کچھ کم لرزہ خیز نہیں تھیں لیکن اصل لاش کو اپنے سامنے دیکھنا تو کچھ اور ہی طرح کا تجربہ تھا۔ وہ اس وقت اس طرح کی چوتھی لاش دیکھ رہا تھا لیکن اسے اسی طرح نفرت، کراہت اور غصے کی شدت سے جھرجھری سی آ رہی تھی جس طرح پہلی لاش دیکھتے وقت آئی تھی۔ وہ شاید کبھی بھی اس طرح کے ہولناک نظارے سے مانوس نہیں ہو سکتا تھا۔ لاش کے چہرے کی ہڈیوں پر کہیں کہیں گوشت کا ملغوبا سا لگا تھا اور اردگرد سے ابھی تک خون رس رہا تھا۔ ہیریسن نے ان وارداتوں کا سلسلہ شروع ہونے سے پہلے زندگی میں کبھی کسی لاش کو اس حالت میں نہیں دیکھا تھا۔ جیکب بظاہر نارمل نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن ہیریسن کو معلوم تھا کہ اندرونی کیفیت اس کی بھی مختلف نہیں تھی۔
منظر کی تمام تر ہولناکی اور لرزہ خیزی کے ساتھ، ساتھ ہیریسن کو کسی اور چیز کا بھی احساس ہو رہا تھا جسے وہ کوئی نام نہیں دے پا رہا تھا۔ وہ چیز، دل کے کسی گوشے میں بے عنوان خلش کی طرح تھی۔ کبھی اسے لگتا جیسے کہیں بہت دور سے کوئی اسے پکار رہا تھا لیکن اس کی آواز ہیریسن تک نہیں پہنچ پا رہی تھی مگر ایک احساس بہر حال تھا۔ شاید اس احساس نے ہی اسے اس معاملے میں کود پڑنے پر مجبور کیا تھا اور اب یہ احساس اس کے پیروں کی زنجیر بنا ہوا تھا۔ اب شاید وہ چاہتا بھی، تو اس معاملے سے لاتعلق نہیں ہو سکتا تھا۔ اسے کچھ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اس احساس کی پیچیدگی کو سمجھنے کے قابل ہو جائے تو شاید اس معاملے کو بھی سمجھنے میں کامیاب ہو جائے اور قاتل تک بھی پہنچ جائے۔ یوں افسروں کی نظر میں اس کی عزت اور ساکھ بچ سکتی تھی۔ اسے احساس تھا کہ اگر وہ قاتل کو نہ پکڑ پایا اور اس سلسلے کو نہ روک پایا تو اس کی بڑی سبکی ہو گی۔
اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس قاتل کو تلاش کرنے میں اسے محکمے کے دوسرے لوگوں کی مدد حاصل نہیں ہو گی۔ حتیٰ

کہ جیکب بھی شاید دل سے اس کے ساتھ نہیں تھا۔ سب یہی سمجھ رہے تھے کہ شاید "ہیرو" بننے، میڈیا کے ذریعے زیادہ سے زیادہ شہرت حاصل کرنے اور جلد از جلد ترقی پانے کے لیے اس نے خود آگے بڑھ کر یہ کیس ہاتھ میں لیا تھا۔ اگر وہ اب تک اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا ہوتا تو شاید وہ خوش ہوتے لیکن اب وہ میڈیا میں، محکمے میں اور عوام میں جس طرح تنقید کا نشانہ بن رہا تھا، اس کے ساتھی شاید اس سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ سب شاید دل ہی دل میں سوچ رہے تھے۔ "تم نے خود ہی مصیبت مول لی ہے، اب بھگتو۔"

ایک لحاظ سے وہ ٹھیک ہی سوچ رہے تھے۔ وہ بھی چاہتا تو کوئی آسان سی ڈیوٹی پکڑ کے اپنا وقت گزار سکتا تھا مگر وہ لوگ اس بات کو نہیں سمجھ سکتے تھے کہ اس نے شہرت یا ترقی کے لیے اس کیس میں ہاتھ نہیں ڈالا تھا۔ اس کیس میں کوئی بات تھی۔ مگر وہ کیا بات تھی؟ اس کی وضاحت وہ نہیں کر سکتا تھا۔

اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ جائے واردات پر اکیلا کھڑا تھا۔ اس کے قریب کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ جس دوران میں اپنے خیالات میں اُلجھا رہا تھا، اس دوران لاش اٹھائی جا چکی تھی۔ جائے وقوعہ پر شواہد اکٹھے کرنے والے ماہرین لاش کے ساتھ ہی جا چکے تھے۔ جیکب بھی کچھ دور کھڑی، اپنی گاڑی کی طرف چلا گیا تھا۔ اس طویل گلی کے سرے پر ہیریسن تنہا کھڑا رہ گیا تھا۔

مگر نہیں...... وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کی کوئی حس اسے بتا رہی تھی کہ آس پاس کہیں کوئی اور بھی موجود تھا جو اسے دیکھ رہا تھا۔ ہیریسن اسے نہیں دیکھ پا رہا تھا لیکن وہ اس کی موجودگی کو محسوس کر سکتا تھا۔ اس احساس نے ہیریسن کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد سی لہر دوڑا دی اور اس لہر کی وجہ فروری کی اس رات کی ٹھنڈ نہیں تھی۔ اس نے جلدی سے اپنے اردگرد دیکھا۔ کچھ فاصلے پر جو لوگ موجود تھے، ان میں سے کوئی بھی اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ تب اس نے اوپر دیکھا۔

یقیناً وہاں کوئی تھا۔

وہ جس عمارت کے قریب کھڑا تھا، اس کی چھت پر مکمل اندھیرا تھا مگر اس کا دل کہہ رہا تھا، وہاں کوئی تھا جو اسے دیکھ رہا تھا۔ اس احساس نے اس کی ریڑھ کی ہڈی میں جو سرد سی لہر دوڑائی تھی، وہ گویا اس کے پورے وجود میں دوڑ گئی۔ اس کی کوئی حس اسے بتا رہی تھی کہ اس عمارت کی اندھیری چھت پر کوئی بے گھر، آوارہ گرد یا چھوٹا موٹا چور اُچکا نہیں، وہی قاتل تھا جو حسین لڑکیوں کے چہروں کا گوشت نوچ لیتا تھا، اُن کا نرخرہ اُدھیڑ دیتا تھا...... اور وہ چھت سے جھانک کر اسی کو دیکھ رہا تھا۔

ہیریسن نے فیصلہ کیا کہ اسے فوری طور پر جیکب کے پاس جانا چاہیے اور اسے حکم دینا چاہیے کہ جلد از جلد اس بلڈنگ کو سیل کرنے کے انتظامات کرے۔ وہ بڑی عجلت میں اور کچھ گھبراہٹ زدہ سے انداز میں جیکب کی طرف بڑھا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے اسے اپنی کیفیت کا احساس ہوا اور اس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اسے احساس ہوا کہ اسے اپنے آپ کو گھبراہٹ زدہ یا ہیجان زدہ ظاہر نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اسے پُرسکون اور پُراعتماد نظر آنا چاہیے تھا۔

☆☆☆

میں اس اندھیری چھت سے، نہایت آسانی سے سراغ رساں ہیریسن کی آنکھیں دیکھ سکتی ہوں۔ اس بلندی سے بھی اس کی آنکھیں دیکھ کر میں اندازہ کر سکتی ہوں کہ اسے یہاں میری موجودگی کا احساس ہو گیا ہے۔ ویسے ہیریسن کی آنکھیں اچھی ہیں۔ ہلکی بھوری، ان آنکھوں میں سختی نہیں ہے جیسی عام طور پر دوسرے لوگوں کی آنکھوں میں نظر آتی ہے۔ وہ میری طرف ہی دیکھ رہا ہے۔ اس کی آنکھیں کچھ پھیل سی گئی ہیں۔ میرا خیال ہے اسے احساس ہو گیا ہے، میں یہاں، اندھیرے میں اس چھت پر موجود ہوں۔ اب اس نے چھت کی طرف سے نظر ہٹالی ہے۔ وہ اپنے ساتھیوں کی طرف چل پڑا ہے۔ پہلے اس نے تیزی سے قدم بڑھائے تھے مگر اب وہ آہستہ چل رہا ہے۔ شاید وہ اپنے آپ کو پُرسکون ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ میرا خیال ہے، مجھے اب جلدی سے یہاں سے بھاگ جانا چاہیے۔ برابر والی عمارتوں کی چھتیں پھلانگتے ہوئے یہاں سے نکل بھاگنا ذرا بھی مشکل نہیں تھا۔ پھر کسی عمارت کی دیوار سے اتر کر میں یہاں سے دور نکل جاؤں گی۔ مجھے اپنے اوورکوٹ کے کالر کھڑے کر لینے چاہئیں۔ چہرہ اسکارف میں تقریباً چھپا لوں۔ صرف آنکھیں نظر آنی چاہئیں۔ لوگ میرا چہرہ دیکھ کر دہشت زدہ ہو جاتے ہیں۔ روشنی والی جگہوں سے گزرتے ہوئے تو مجھے اپنی ساری احتیاطی تدابیر کرنی پڑیں گی، جو میں ہمیشہ کرتی ہوں۔ روشنی میں مجھے اپنا چہرہ چھپا کر ہی رکھنا چاہیے۔ صرف آنکھیں کھلی رہنی چاہئیں۔ آنکھوں سے لوگ اتنے زیادہ خوف زدہ نہیں ہوتے۔ البتہ اتنا ضرور ہوتا ہے کہ میری آنکھیں دیکھ کر ان کی آنکھوں میں سختی اور نفرت سی

ابھر آتی ہے۔ وہ مجھ سے کنی کترا کر گزرتے ہیں...... لیکن خیر...... مجھے کیا...... مجھے کون سا ان کی کوئی پروا ہے۔

انہی لوگوں کی وجہ سے مجھے روشنی سے نفرت ہو گئی ہے۔ مجھے زیادہ بھیڑ بھاڑ والی جگہوں سے بھی نفرت ہے اور اس علاقے میں اکثر، رات گئے تک بھیڑ بھاڑ ہی رہتی ہے۔ یہاں کئی تھیٹر اور سینما ہاؤس ہیں۔ ایک بار تو میں بھی لوگوں کی نظر بچا کر سینما ہال میں گھس گئی تھی۔ میں نے دیواروں کے ساتھ لٹکے ہوئے بڑے بڑے اور بھاری پردوں کے پیچھے چھپ کر فلم دیکھی تھی۔ اس فلم میں ایک آدمی دکھایا گیا تھا جو چہرے پر نقاب لگا کر اِدھر اُدھر گھومتا پھرتا تھا۔ کبھی کبھی میرا بھی جی چاہتا ہے کہ نقاب پہن کر گھوما پھرا کروں، لیکن مجھے پتا ہے، نقاب کی وجہ سے مجھے مشکوک سمجھ کر جلد ہی کہیں روک لیا جائے گا۔ پھر بڑا مسئلہ ہو جائے گا۔ بہرحال، فلم بڑی دردناک تھی۔ اسے دیکھتے ہوئے میری آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

میں عمارتوں کی چھتیں پھلانگتی ہوئی دور نکل آئی ہوں اور نیچے بھی اتر آئی ہوں۔ طویل گلیوں میں چلتے، چلتے میں دریا کے کنارے والی سڑک پر پہنچ گئی ہوں۔ دریا کے پار اس علاقے کی روشنیاں نظر آرہی ہیں جہاں میں پلی بڑھی تھی۔ میں اب اس علاقے میں بالکل نہیں جانا چاہتی۔ مجھے اس علاقے سے نفرت ہے۔ مجھے تو اس بلڈنگ کی طرف جانا ہے جس کے تہ خانے کا ایک کمرا آج کل میرا مسکن ہے، میرا گھر ہے۔ میں اس کونے پر کھڑی ہو کر کسی ٹرک کا انتظار کرتی ہوں۔ ٹرک کے پیچھے لٹک کر میں آسانی سے گھر پہنچ سکتی ہوں۔

لو...... میں گھر پہنچ بھی گئی۔ میرے کمرے کے بیچ میں، چھت سے ایک ہی بلب لٹکا ہوگا، جس کی روشنی بہت تیز ہوگی۔ میرا کمرا بہت محفوظ ہے۔ وہاں مجھے کسی کی پروا نہیں ہوتی۔ مجھے لگتا ہے جیسے میں اور جینی وہاں ساری دنیا کی نظروں سے محفوظ ہیں۔ کوئی ہمیں نہیں دیکھ رہا۔ جینی وہاں میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ جینی بے چاری تو خود کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ اسے ہر کام میں میری مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ میرے جیسی ہونے کے ساتھ ساتھ اندھی بھی ہے۔ وہ میری سب سے پیاری دوست ہے بلکہ ''سب سے پیاری'' تو شاید میں نے غلط کہہ دیا۔ صرف وہی تو میری ایک دوست ہے۔ ہم دونوں کا ایک دوسرے کے سوا دنیا میں کوئی نہیں۔

وہ جب سے اتفاقاً مجھے ملی ہے، میں نے اسے ساتھ رکھ لیا۔ اسے میری مدد کی ضرورت تھی اور مجھے اس کی رفاقت کی۔ سب کو دنیا میں کسی نہ کسی کے ساتھ، کسی نہ کسی کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ زندگی پہلے ہی بہت تکلیف دہ ہوتی ہے۔ اکیلے رہنے سے اور زیادہ تکلیف دہ ہو جاتی ہے۔ جینی کے اندھی ہونے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ میں اس کے سامنے جاتی ہوں تو اس کے چہرے پر خوف اور دہشت کے تاثرات نہیں ابھرتے۔ مجھے سب سے زیادہ نفرت اسی بات سے ہے۔ کسی کی بھی نظر میرے چہرے پر پڑ جاتی ہے تو وہ دہشت زدہ دکھائی دینے لگتا ہے جیسے اس نے کسی بھوت کو دیکھ لیا ہو۔ اسی لیے مجھے گھر سے باہر، خاص طور پر روشنی میں اپنا چہرہ مختلف ترکیبوں سے ڈھانپ کر رکھنا پڑتا ہے۔ اب تو میں کوشش کرتی ہوں کہ مجھے دن کی روشنی میں گھر سے نکلنا ہی نہ پڑے اور اگر رات میں بھی نکلوں تو روشنی سے بچ کر چلوں۔

اپنے کچن کی کھڑکی سے مجھے جینی کا چہرہ نظر آ گیا۔ اس کا چہرہ سیاہ ہے اور اس پر جھریاں پڑی ہوئی ہیں۔ جھریوں بھری یہ کھال لٹکی ہوئی بھی ہے۔ کمرے میں ٹی وی چل رہا ہے۔ ہمارے کمرے میں ہر وقت ٹی وی چلتا رہتا ہے۔ اس سے جینی کو تنہائی کا احساس نہیں ہوتا۔ میری غیر موجودگی میں بھی اسے لگتا ہے کہ کمرے میں کوئی موجود ہے۔ وہ کبھی کبھی ٹی وی سے باتیں بھی کر لیتی ہے۔ اندھی ہونے کی وجہ سے جینی ٹی وی دیکھ نہیں سکتی مگر سن تو سکتی ہے۔ ٹی وی اس کی بات سن نہیں سکتا مگر وہ سنا تو سکتی ہے۔ اسے میری آمد کا پتا چل گیا۔

''آج تم نے بہت دیر کر دی۔'' وہ منمناتی سی آواز میں بولی۔ اس کی بات شاید ہی کوئی سمجھ سکتا ہو، لیکن میں سمجھ لیتی ہوں۔ میری بات سمجھنے میں بھی شاید لوگوں کو مشکل پیش آتی ہو، لیکن جینی سمجھ لیتی ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی بات اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔

''ہاں...... مجھے دیر ہو گئی۔'' میں نے اپنے پرانے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''بہت محنت کرنا پڑی...... لیکن بہرحال کچھ رقم مل گئی۔ چند دن خرچہ چلتا رہے گا۔''

یکایک مجھے تھکن کا احساس ہونے لگا۔ میرا رونے کو جی چاہ رہا تھا۔ شاید میرا کسی کو قتل کرنے کو دل نہیں چاہتا...... لیکن کیا کروں...... رقم کی ضرورت ہوتی ہے...... اور پھر اندر سے جیسے کوئی طاقت مجبور کرتی ہے۔ اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔ اندر کوئی طاقت ہے جو قتل کرنے پر مجبور کرتی ہے لیکن بعد میں بہرحال افسوس ہوتا ہے۔ یہ افسوس مجھے تھکا دیتا ہے۔ میں سوچتی ہوں...... میں چاہتی ہوں،

یہ مکا بھی ضابطے کے خلاف ہے..... مجھے اصول سکھانے والے کا یہی انجام ہوتا ہے۔

مجھے خوب صورت لڑکیوں کو قتل کرنا بند کر دینا چاہیے۔

''یہ بہت اچھا ہوا، رقم مل گئی۔'' جینی نے خوشی کا اظہار کیا۔

''دراز میں رکھ دو۔''

''وہی کر رہی ہوں۔'' میں نے اسے بتایا۔

ہم نے دراز میں مختلف مالیت کے نوٹوں اور سکوں کے لیے الگ الگ خانے بنا رکھے ہیں۔ اس سے نابینا جینی کو آسانی رہتی ہے۔ میری عدم موجودگی میں جب ڈلیوری بوائز ہمارے آرڈر کے مطابق، کھانے پینے اور ضرورت کی دوسری اشیا لے کر آتے ہیں تو جینی ادائیگی آسانی سے کر دیتی ہے اور اس بات کا خطرہ نہیں ہوتا کہ ڈلیوری بوائے اس کے نابینا ہونے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، اس سے زیادہ رقم ٹھگ لے گا۔

جینی خود کچھ لینے باہر نہیں جاسکتی۔ اس سے ٹھیک طرح چلا نہیں جاتا۔ زیادہ تر وہ لیٹی رہتی ہے۔ بعض اوقات تو اسے اٹھا کر بھی میں ہی بٹھاتی ہوں۔ میں خود بھی نہیں چاہتی کہ جینی باہر جائے۔ لوگ بہت بُرے ہیں۔ اندھوں کو بھی نقصان پہنچانے سے باز نہیں رہتے۔

ایک بار جینی نے دستک سن کر دروازہ کھول دیا تھا۔ دستک دینے والا کوئی بدمعاش اور لٹیرا تھا۔ شاید وہ سمجھتا تھا کہ یہاں ایک اندھی عورت اکیلی رہتی ہے۔ جینی کی قسمت اچھی تھی کہ اس روز وہ گھر میں اکیلی نہیں تھی۔ میں بھی گھر میں تھی لیکن اس وقت باتھ روم میں تھی۔ وہ جینی کو مارنے لگا۔ جینی رونے لگی۔ شاید اس کے رونے کی آواز اور انداز اس بدمعاش لٹیرے کو مضحکہ خیز لگا۔ وہ جینی پر ترس کھانے کے بجائے زور، زور سے ہنسنے لگا۔ وہ جینی کو اور زیادہ مارنے لگا تھا۔ اچھا ہوا کہ عین اس وقت میں باتھ روم سے نکل آئی۔ مجبوراً مجھے اس خبیث کو ہلاک کرنا پڑا۔ اس کی بھی جب مجھ پر نظر پڑی تھی تو وہ دہشت زدہ نظر آنے لگا تھا۔

اُس کے چہرے پر وہی تاثرات آگئے تھے جن سے مجھے نفرت ہے۔ مجھے اس کو ہلاک کرنے میں ایک منٹ بھی نہیں لگا۔ میں نے اسے باتھ ٹب میں ڈال دیا جہاں کچھ دیر تک اس کا خون بہتا رہا۔ اس خبیث کا ساتھی بعد میں اس کی تلاش میں آیا۔ مجھے اس کو بھی ہلاک کرنا پڑا۔ آدھی رات کے بعد میں دونوں کی لاشیں کھڑکی کے راستے باہر لے گئی۔ پہلے میں نے ایک بُرے آدمی کی لاش کو باؤنڈری وال سے باہر پھینکا۔ پھر دوسرے خبیث کی لاش کو پھینکا اور خود بھی باہر کود گئی۔ میں نے ان دونوں کی لاشیں باری، باری لے جا کر دریا میں پھینک دیں جو ہماری بلڈنگ سے زیادہ دور نہیں تھا۔

اس کے بعد پھر کبھی کسی بُرے آدمی نے ہمارے کمرے میں گھسنے کی کوشش نہیں کی۔

''میں رات بھر تمہارا انتظار کرتی رہی ہوں۔'' جینی کی آواز نے مجھے میرے خیالات سے چونکایا۔ ''دراصل مجھے نہانا تھا۔ کیا تم نہانے میں میری مدد کروگی؟''

حالانکہ میں ہر کام میں ہی جینی کی مدد کرتی ہوں۔ پھر بھی وہ پوچھتی ضرور ہے۔ بے چاری بہت مہذب ہے۔ ہر چیز میں تمیز اور ادب آداب کا خیال رکھتی ہے۔

اسے نہلاتے ہوئے میں سراغ رساں ہیریسن کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ مجھے اس کی آنکھیں یاد آرہی

تھیں۔ ان آنکھوں میں نرمی تھی۔ مجھے بہت کم لوگوں کی آنکھوں میں نرمی نظر آتی ہے۔ میرا خیال ہے، مجھے اس آدمی سے بات کرنی چاہیے۔ مجھے لگتا ہے، یہ آدمی میری بات سمجھ سکے گا۔ مجھے اب یہ سلسلہ بند کر دینا چاہیے۔ مجھے حسین عورتوں کو قتل کرنا بند کر دینا چاہیے۔ میں مزید قتل کرنا نہیں چاہتی۔ میرا دل کہتا ہے، ہیریسن میری بات سمجھ سکتا ہے۔

☆☆☆

''آٹھ ہفتوں میں سات لرزہ خیز قتل.....'' سراغ رساں ہیریسن اب تک کی آخری مقتولہ کی تصویر دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ یہ تصویر اس کے قتل سے پہلے کی تھی۔ خاصی بڑی رنگین تصویر تھی۔ مقتولہ کا تعلق کسی حد تک شوبزنس سے تھا اس لیے اس کا ایک ایجنٹ بھی تھا۔ یہ تصویر ہیریسن کو مقتولہ کے ایجنٹ نے ہی فراہم کی تھی۔ وہ ایک حسین لڑکی تھی اور بے جان تصویر میں بھی زندگی سے بھرپور نظر آ رہی تھی۔ ان دنوں وہ ''براڈوے ڈریمز'' نامی ایک تھیٹر ہاؤس میں ڈانسر تھی۔

ایک گہری سانس لے کر اس نے تصویر اپنی میز پر ایک طرف رکھ دی اور سامنے رکھی چھ فائلوں کو اپنی طرف کھسکا لیا۔ ان فائلوں کا تعلق قتل کی پچھلی چھ وارداتوں سے تھا۔ ہر فائل میں ایک قتل سے متعلق تمام تفصیلات اور معلومات تحریری شکل میں موجود تھیں۔ ہر فائل ایک حسین اور جیتی جاگتی لڑکی کی زندگی کا باب آخر تھی۔ ان سب فائلوں کے کاغذات میں کوئی نہ کوئی ایک مشترک نکتہ تھا جو اُن کا تعلق ''چہرہ چور قاتل'' سے جوڑتا تھا۔ وہ نکتہ یہ تھا کہ سب کی سب خوب صورت تھیں، سب کو یکساں انداز میں قتل کیا گیا تھا، سب کے چہرے کا گوشت نوچ لیا گیا تھا۔ ہیریسن فیصلہ نہ کر پایا کہ ان تینوں باتوں کو ایک ہی نکتہ شمار کرے، یا تین الگ الگ نکتے؟ سب قتل شہر کے مختلف علاقوں میں ہوئے تھے۔

اس نے ایک، ایک کر کے، ترتیب سے فائلیں دیکھنا شروع کیں۔ وہ ان کی تصویریں بھی دیکھ رہا تھا۔ نہ جانے کیوں اسے کچھ ایسا لگ رہا تھا، جیسے وہ ان سب کو جانتا تھا۔ پہلی مقتولہ کا نام میری ڈک تھا۔ اس کی عمر صرف بیس سال تھی۔ وہ نیویارک یونیورسٹی میں پڑھتی تھی۔ اسے واشنگٹن اسکوائر پارک میں قتل کیا گیا تھا۔ دوسری کا نام میری شینڈلر تھا۔ وہ ایک کمپنی میں کسی کی سیکریٹری تھی۔ اس کی عمر پچیس سال تھی اور اسے ایک پارک کے اندر قتل کیا گیا تھا۔

ایلن بیلے نامی ایک لڑکی تیسری مقتولہ تھی۔ اس کی عمر بائیس سال تھی اور وہ ایک فوٹوگرافر کی اسسٹنٹ تھی۔ اسے چیلسی کے علاقے کی ایک عقبی گلی میں قتل کیا گیا تھا۔ چوتھی مقتولہ کا نام ہیزل ہاگ تھا۔ تیس سالہ یہ خاتون ایک مصور کے ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرتی تھی۔ اسے سوہو کے علاقے میں ایک خالی مکان کے قریب قتل کیا گیا تھا۔ الزبتھ پائن نامی ایک شادی شدہ اور گھریلو خاتون پانچویں مقتولہ تھی۔ اس کی عمر اٹھائیس سال تھی۔ وہ اس وقت سینٹرل پارک میں جوگنگ کر رہی تھی جب اسے قتل کیا گیا۔ رات کافی گزر چکی تھی اور پارک میں اس وقت تقریباً ویرانی تھی۔ شاید اس خاتون کو رات گئے ہی جوگنگ کے لیے وقت ملتا تھا۔ پچیس سالہ جون پیرن ایک ماڈل تھی۔ وہ بروکلین کی رہنے والی تھی لیکن اسے ایسٹ سائڈ کے علاقے میں قتل کیا گیا تھا۔ وہ اپنی گاڑی میں جس سڑک سے گزر رہی تھی، وہ سنسان پڑی تھی مگر وہ ایک چوراہے پر ریڈ سگنل پر رک گئی تھی۔ اسے اس کی گاڑی سے کھینچ کر نکالا گیا تھا۔

ہیریسن نے ایک گہری سانس لے کر فائل بند کر دی اور ایک بار پھر آخری مقتولہ کی رنگین تصویر اٹھا لی۔ اس کا نام لیز الارنس تھا۔ اکیس سالہ، یہ خوب صورت ڈانسر، دریا کے پار، جرسی سٹی میں رہتی تھی۔ وہ اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ ایک گلی میں داخل ہوئی تھی۔ اسے گلی کے دوسرے سرے تک پہنچنا نصیب نہیں ہوا۔ قتل ہونے والی لڑکیوں میں سے تین کے بال سنہرے، تین کے بھورے اور ایک کے سرخ تھے۔ ان سات لڑکیوں میں صرف ایک بات مشترک تھی کہ وہ سب کی سب حسین تھیں۔ اس کے علاوہ ان میں کوئی چیز مشترک نہیں تھی۔ ان کی عمریں مختلف تھیں۔ وہ شہر کے مختلف علاقوں کی رہنے والی تھیں اور ہر ایک کا قتل ایک مختلف علاقے میں ہوا تھا۔ سب کے پیشے مختلف تھے۔ کیا ان سب کے قتل کی کوئی ایک وجہ ہو سکتی تھی؟

ابھی وہ اس سوال کا کوئی جواب تلاش نہیں کر پایا تھا کہ کمرے میں سارجنٹ جیکب کی اچانک آمد نے اسے چونکا دیا۔ جیکب کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ کوئی امید افزا خبر لے کر آیا ہے۔

''آپ نے ہمیں اس بلڈنگ کو گھیر کر، اس کی چھت کو چیک کرنے کی ہدایت کی تھی۔ آپ کو اگر چھت پر کسی کی موجودگی کا شک تھا تو وہ ٹھیک ہی تھا۔'' جیکب قدرے پُرجوش لہجے میں بولا۔

ہیریسن اپنی کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ''کیا پتا چلا؟'' اس نے اپنے تجسس کو دباتے ہوئے ہموار لہجے میں پوچھا۔

''ہمیں چھت پر خون کے دھبے ملے۔'' جیکب نے بتایا۔

''کس کے خون کے؟'' ہیریسن نے جاننا چاہا۔

''لیبارٹری ٹیسٹ سے پتا چلا ہے کہ وہ مقتولہ ہی کا خون ہے۔'' جیکب نے جواب دیا۔

''انگلیوں کے نشانات...... کوئی بال یا لباس کے ریشے وغیرہ نہیں ملے؟'' ہیریسن نے دریافت کیا۔

''اس سلسلے میں ابھی تک کوششیں ہو رہی ہیں لیکن یہ تو بتائیں، آپ کو خاص طور پر اس بلڈنگ کی چھت کو چیک کرانے کا خیال کیسے آیا؟'' جیکب نے تجسس سے پوچھا۔

''بس یونہی...... ایک خیال آیا تھا، جو خوش قسمتی سے درست نکلا۔'' ہیریسن نے مبہم لہجے میں جواب دیا۔ وہ جیکب کو بتانا نہیں چاہتا تھا کہ جب اس نے سر اٹھا کر عمارت کی چھت کی طرف دیکھا تھا تو کیا محسوس کیا تھا۔ اگر وہ جیکب کو بتاتا کہ اسے کچھ یوں محسوس ہوا تھا جیسے اوپر، اندھیرے میں سے کوئی جھانک کر اس کی طرف دیکھ رہا تھا، تو شاید جیکب اسے اس کا سنکی پن سمجھتا اور جا کر ڈپارٹمنٹ کے دوسرے لوگوں سے اس بارے میں باتیں کرتا اور وہ شاید مل کر، پیٹھ پیچھے اس کا مذاق اُڑاتے۔ اس کیس کے حوالے سے پہلے ہی ڈپارٹمنٹ میں اس کے بارے میں بڑی باتیں بنائی جا رہی تھیں۔ ہیریسن ان باتوں سے بے خبر نہیں تھا۔ وہ دل ہی دل میں ان باتوں پر تاسف محسوس کرتا تھا لیکن اس وقت بہرحال اسے یہ جان کر دل ہی دل میں قدرے طمانیت محسوس ہوئی تھی کہ جائے واردات پر جب اس نے سر اٹھا کر بلڈنگ کی چھت کی طرف دیکھا تھا تو قاتل واقعی وہاں موجود تھا۔ اس کی چھٹی حس نے اسے ٹھیک ہی خبردار کیا تھا کہ چھت سے کوئی جھانک کر اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔

''لیبارٹری سے کوئی ابتدائی رپورٹ آئی؟'' ہیریسن نے دریافت کیا۔

''تمام شواہد پچھلی وارداتوں جیسے ہی ہیں۔'' جیکب نے چیونگم چباتے ہوئے جواب دیا۔ ''مقتولہ اور اس کے بوائے فرینڈ کی رقم غائب ہے۔ لڑکی کا نرخرہ نکیلے پنجوں یا ان سے ملتی جلتی کسی دوسری چیز سے اُدھیڑا گیا۔ چہرے پر دانتوں سے کاٹے جانے کے نشانات بھی پہلے جیسے ہیں۔ دانت غیر انسانی معلوم ہوتے ہیں لیکن چہرے پر جس تھوک کی موجودگی کے شواہد ملے ہیں، وہ انسانی تھوک ہے۔''

اس سے پہلے بھی قتل کی تمام وارداتوں میں مقتولہ کے چہرے پر کاٹے جانے کے نشانات کو غیر انسانی دانتوں کے نشانات قرار دیا گیا تھا تو پولیس چکرا کر رہ گئی تھی۔ لیبارٹری نے اس سلسلے میں اپنے ٹیسٹ کی رپورٹ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ان دانتوں کی تعداد انسانی منہ میں موجود دانتوں سے زیادہ تھی اور وہ انسانی دانتوں سے زیادہ تیز اور نکیلے تھے۔ لیبارٹری کی یہ رپورٹ پڑھ کر کسی پولیس آفیسر کو اپنے لڑکپن میں پڑھی ہوئی ایک ڈراؤنی کہانی یاد آ گئی تھی جس میں قاتل اپنے شکار کا گلا اُدھیڑنے کے لیے منہ میں لگایا ہوا مصنوعی دانتوں کا ایک خاص سیٹ استعمال کرتا تھا۔ اس کہانی میں لیبارٹری رپورٹ نے پولیس کو چکرا کر رکھ دیا تھا۔ وہ شہر بھر کے دندان سازوں کا ریکارڈ چیک کرتی پھرتی رہی تھی۔ اب حقیقی زندگی میں قتل کی یہ وارداتیں شروع ہونے کے بعد بھی یہی ہوا تھا۔ پولیس نے دانتوں کے نہ جانے کتنے ڈاکٹروں اور ڈینٹل لیبارٹریز کا ریکارڈ کھنگالا تھا لیکن انہیں ایسے دانتوں کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا جو اس انداز میں انسانی چہرے سے گوشت اُدھیڑ سکتے۔

ہیریسن کو یہ باتیں یاد آئیں تو وہ جھرجھری لے کر رہ گیا۔ وہ اندازہ لگانے سے قاصر تھا کہ اس معاملے میں کس قسم کی مخلوق ملوث تھی؟ اس بارے میں سوچ سوچ کر وہ اندر ہی اندر اتنی چڑچڑاہٹ کا شکار تھا کہ اسے وہ آوازیں بھی بُری لگ رہی تھیں جو جیکب چیونگم چباتے ہوئے منہ سے نکال رہا تھا۔ جیکب ایک ساتھ دو تین چیونگم منہ میں ڈال لیتا تھا اور انہیں چباتے وقت اس کے منہ سے ہلکی ہلکی آوازیں نکلتی رہتی تھیں۔ پھر وہ چیونگم کے ببل بنا کر انہیں پھاڑتا بھی رہتا تھا۔ ہیریسن کو یہ سب کچھ ناگوار گزرتا تھا لیکن وہ اس کا اظہار نہیں کرتا تھا تاہم آج اس نے اتنا ضرور کہہ دیا۔ ''سگریٹ کی عادت چھوڑنے کے لیے تم نے چیونگم چبانے شروع کیے تھے لیکن اس سے تو اچھا تھا کہ تم سگریٹ نوشی ہی جاری رکھتے۔''

جیکب جواب میں کچھ کہنے لگا تھا لیکن اسی دوران فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ ہیریسن کے بجائے جیکب نے ہی ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھا لیا۔ دوسری طرف سے کوئی آواز سن کر وہ بولا۔ ''یہ پولیس ڈیٹکٹیو ہیریسن کا آفس ہے؟''

ایک لمحے خاموش رہ کر اس نے دوسری طرف سے کچھ سنا، پھر ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر ریسیور ہیریسن کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''تیسری جنس کی کوئی نمائندہ تم سے بات کرنا چاہتی ہے...... یا چاہتا ہے۔''

''تیسری جنس......؟'' ہیریسن نے دہرایا۔ بات

اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

جیکب اٹھ کھڑا ہوا اور دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ”میں آزاد خیال آدمی ہوں۔ اگر تمہاری دوستی تیسری جنس کے لوگوں سے بھی ہے تو میں قطعی بُرا نہیں مناؤں گا اور نہ ہی کسی سے اس بات کا ذکر کروں گا۔“

ہیریسن ناگواری سے اس کی طرف دیکھ کر رہ گیا۔ اس شخص کو اسسٹنٹ کے طور پر اس کے ساتھ نتھی تو کر دیا گیا تھا لیکن سچی بات یہ تھی کہ وہ روز بروز ہیریسن کو زیادہ بُرا لگنے لگا تھا۔ جیکب دروازہ کھول کر باہر جارہا تھا۔ ہیریسن نے اس کی طرف سے توجہ ہٹاتے ہوئے فون پر بات شروع کی۔ ”میں سراغ رساں ہیریسن بول رہا ہوں۔“

”سوری...... میں نے تمہیں ڈسٹرب کیا۔“ دوسری طرف سے آواز آئی۔ وہ واقعی ایک عجیب سی آواز تھی۔ اس کے بارے میں فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ وہ مرد کی آواز تھی یا عورت کی۔ لہجہ اور تلفظ بھی خراب تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا، یقیناً ٹھیک طریقے سے بولنے پر قادر نہیں تھا۔ شاید بولتے وقت اس کے منہ سے رال بھی ٹپکنے لگتی تھی یا پھر اس کے منہ میں اکثر تھوک بھرا رہتا تھا۔ اس طرح کی آواز ہیریسن نے اس سے پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ وہ کون ہوسکتا تھا؟

پھر ایک اور خیال نے اس کے جسم میں سرد سی لہر دوڑا دی۔ اس وقت رات کے تین بجے تھے۔ بہت کم لوگوں کو معلوم تھا کہ اس وقت وہ اپنے دفتر میں موجود تھا۔ فون کرنے والے کو یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟

”کیا میں تمہیں جانتا ہوں؟“ ہیریسن نے دریافت کیا۔

”نہیں۔“ دوسری طرف سے جواب ملا۔ ”لیکن آج رات تم نے سر اٹھا کر مجھے دیکھنے کی کوشش کی تھی مگر اندھیرے کی وجہ سے نہیں دیکھ پائے۔“

ہیریسن کے جسم میں ایک بار پھر سرد سی لہر دوڑی۔

”کیا تم وہی ہو......؟“ اس کے ہونٹوں سے سرسراتی سی آواز نکلی۔ وہ جملہ مکمل نہ کرسکا لیکن دوسری طرف سے بولنے والا یقیناً اس کا سوال سمجھ گیا تھا۔

”ہاں۔“ اس نے سسکی لینے کے سے انداز میں جواب دیا۔ اس سسکی کی تہ میں بے پناہ درد چھپا ہوا تھا۔ اس جواب نے ہیریسن کے اعصاب کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ اس احساس نے اسے اندر سے ہلا کر رکھ دیا کہ اس وقت وہ اس قاتل سے بات کررہا تھا جس کی دہشت پورے شہر پر طاری تھی اور جس کی تلاش میں وہ دیوانوں کی طرح مارا مارا پھر رہا تھا۔ آج اس کا یہ سراغ میسر آیا تھا کہ وہ بہ ذاتِ خود فون پر بات کررہا تھا لیکن فوری طور پر ہیریسن کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کس طرح اس سراغ کو اپنے لیے کارآمد بنائے۔

اس زمانے میں موبائل فون کی آمد کا دور، دور تک پتا نہیں تھا۔ حتیٰ کہ لینڈ لائن فون پر سی ایل آئی کا تصور بھی نہیں تھا۔

ہیریسن نے مضطربانہ انداز میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ جب اسے جیکب کی ضرورت تھی تو وہ جاچکا تھا۔ اب اسے کسی نہ کسی طرح قاتل کو فون پر باتوں میں لگائے رکھنا تھا۔ اس کی آواز سے تو واقعی اندازہ نہیں ہو پارہا تھا کہ وہ مرد تھا یا عورت...... لیکن سردست ہیریسن نے اسے مرد ہی شمار کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ فوری طور پر کچھ سوچ کر وہ اپنا لہجہ پُرسکون رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ”میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔ تمہارے جواب سے مجھے اندازہ ہو جائے گا کہ تم واقعی وہی ہو یا نہیں، جو میں تمہیں سمجھ رہا ہوں اور جس کا تم تاثر دے رہے ہو۔“ ہیریسن نے خاص طور پر اس کے لیے مرد کا صیغہ استعمال کیا تھا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ فون کرنے والا اس کی تصحیح کرتا ہے یا نہیں۔

”ہاں...... پوچھو۔“ دوسری طرف سے بولنے والے نے کسی قسم کی تصحیح کیے بغیر کہا۔

”تم جسے قتل کرتے ہو، چہرے کے علاوہ بھی اس کی کوئی چیز چُراتے ہو؟“ یہ سوال کرتے وقت ہیریسن کے دل کی دھڑکن کچھ تیز ہوگئی۔

”ہاں...... رقم۔“ دوسری طرف سے جواب ملا اور ہیریسن کو یقین ہوگیا کہ وہ حسین لڑکیوں کے قاتل سے ہی مخاطب تھا۔ پولیس ڈپارٹمنٹ نے اس بات کو اخبارات اور دیگر ذرائع ابلاغ سے چھپایا تھا کہ مقتول لڑکیوں کی رقم غائب ہوتی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ شاید اس سراغ کو راز رکھنے سے کوئی فائدہ ہوجائے۔ اس بات سے صرف پولیس ڈپارٹمنٹ، یا پھر قاتل واقف تھا۔

”میں تم سے ایک سوال اور کرسکتا ہوں؟“ ہیریسن بولا۔

”ہاں۔“ دوسری طرف سے بلاتامل کہا گیا۔

”چہرے کا گوشت اتار کر تم اس کا کیا کرتے ہو؟“ یہ سوال ہیریسن نے صرف اور صرف اپنی معلومات کے لیے کیا تھا۔ اس سوال نے اسے کئی راتوں کے دوران دیر تک جگائے رکھا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر قاتل چہرے کا گوشت اتار کر اس کا کیا کرتا تھا؟ کیا وہ اسے کہیں

فریزر میں رکھ دیتا تھا یا کتاب میں رکھ کر چھپا کر لیتا تھا؟ یا پھر وہ اس کا کوئی ماسک بنالیتا تھا، جیسا کہ ہیریسن نے ایک پرانی فلم میں دیکھا تھا۔

اس نے محسوس کیا کہ اس کا سوال سن کر لائن پر دوسری طرف موجود شخص شاید کچھ چڑ سا گیا تھا یا مضطرب ہو گیا تھا۔ اس کے بولنے کے انداز سے ہیریسن کے خیال کی تصدیق ہوگئی۔

''نہیں...... یہ میں نہیں بتا سکتا۔'' اس نے عجیب، اُکھڑے اُکھڑے لہجے میں کہا۔

ہیریسن کو اندیشہ محسوس ہوا کہ کہیں وہ فون بند ہی نہ کر دے۔ وہ جلدی سے پچکارنے والے انداز میں بولا۔

''کوئی بات نہیں...... مت بتاؤ...... میں تو ویسے ہی پوچھ رہا تھا۔''

''تم اس سلسلے کو روکنے میں میری مدد کرو گے؟'' قاتل نے اچانک ہی کچھ اس طرح پوچھا جیسے اپنے سینے پر رکھا ہوا کوئی بوجھ اتار پھینکا ہو۔ ہیریسن کو اس کا سوال سن کر حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔

''ہاں...... ہاں...... ضرور کروں گا۔ میں اس سلسلے کو روکنے میں ضرور تمہاری مدد کروں گا۔ جو بھی میرے بس میں ہوا، وہ کروں گا۔'' وہ سنبھل کر جلدی سے بولا۔

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی پھر قاتل کی آواز ابھری۔ ''تمہیں تو مجھ سے شدید نفرت ہوگی؟ نفرت کرتے ہو نا تم مجھ سے؟''

ہیریسن نے فوری طور پر اس کا جواب نہیں دیا۔ یہ ایک نازک سوال تھا۔ اس کے جواب سے بات بن بھی سکتی تھی اور بگڑ بھی سکتی تھی۔ اس نے چند سیکنڈ سوچا، پھر کہا۔ ''نہیں، مجھے تم سے نفرت نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تم نے اب تک جو کچھ کیا، وہ بہت خراب اور خوفناک حرکتیں تھیں لیکن نہ جانے کیوں میں تم سے نفرت محسوس نہیں کر رہا۔ یہ بات خود میرے لیے بھی حیرت انگیز ہے۔''

ویسے یہ حقیقت بھی تھی۔ ہیریسن نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ وہ اس جنونی قاتل کو گرفتار ضرور کرنا چاہتا تھا اور یہ بھی چاہتا تھا کہ قانون اسے اس کے جرائم کی مناسبت سے سزا بھی دے۔ اس کی سفاکی پر ہیریسن کے دل میں غصہ بھی تھا لیکن وہ اپنے دل کی گہرائیوں کو ٹٹولتا تھا تو اسے وہاں قاتل کے خلاف نفرت نہیں ملتی تھی۔ وہ اس کی وارداتوں کو روکنا چاہتا تھا اور اس کی گرفتاری کی کوششوں کے دوران اگر ہیریسن کو اسے گولی مارنے کی ضرورت پیش آجاتی تو وہ اس سے بھی دریغ نہ کرتا لیکن اس کے دل میں قاتل کے خلاف کوئی ذاتی عناد یا نفرت نہیں تھی۔ اس کے بجائے وہ کچھ یوں محسوس کرتا تھا جیسے قاتل اس سے کچھ کہہ رہا تھا لیکن بہت دور ہونے کی وجہ سے اس کی آواز ہیریسن تک نہیں پہنچ پاتی تھی۔

''شکریہ۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔ ہیریسن کو ایک بار پھر اس آواز کے پیچھے سسکی سی چھپی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس کے بعد قاتل نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ ہیریسن ''ہیلو، ہیلو'' کرتا رہ گیا۔ اس نے دو تین مرتبہ ریسیور پر ہاتھ بھی مارا۔ بڑی مشکل سے اسے یقین آیا کہ سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔ عین اس وقت جیکب دروازے پر نمودار ہوا۔

''کیا ہوا تمہیں؟ کیوں شور مچا رہے ہو؟'' اس نے قدرے بیزاری سے پوچھا۔

''تم جسے تیسری جنس کہہ رہے تھے، وہ ''چہرہ چور قاتل'' تھا...... اس کا فون تھا......'' ہیریسن نے گھٹی گھٹی سی آواز میں غصے سے کہا۔ ''اگر تم یہیں موجود رہتے تو جب میں اُس سے بات کر رہا تھا، اس دوران تم سراغ لگانے کی کوشش کر سکتے تھے کہ وہ کہاں سے بول رہا تھا۔''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔'' جیکب نے بے پروائی سے کہا۔ ''زیادہ امکان یہی ہے کہ وہ کسی پبلک فون بوتھ سے بات کر رہا ہوگا۔'' پھر جیسے جیکب کو کوئی خیال آیا۔ آنکھیں سکیڑ کر بولا۔ ''لیکن تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ چہرہ چور قاتل ہی تھا؟''

''اسے یہ معلوم تھا کہ ہر مقتولہ کی رقم اس کے پرس یا لباس سے نکال لی گئی تھی۔'' ہیریسن نے بتایا۔

''لیکن وہ آواز بدل کر کیوں بول رہا تھا؟'' جیکب اُلجھن آمیز سے لہجے میں بولا۔ ''کیا اسے نہیں معلوم تھا کہ یہ تو اپنی اصل آواز کو چھپانے کا نہایت بھونڈا اور بے وقوفانہ طریقہ ہے؟''

ہیریسن کو اچانک ایک خیال آیا۔ ''ذرا اندازہ لگاؤ کہ اگر کسی کے منہ میں عام انسانوں سے زیادہ بڑے، نکیلے اور زیادہ تعداد میں دانت موجود ہوں تو اس کی آواز کیسی ہو گی؟''

ہیریسن کا یہ سوال سن کر جیکب نے ایک لمحے سوچا اور اس کے چہرے پر زردی سی پھیل گئی۔

☆☆☆

ہیریسن کا وہ پورا دن آفس میں ہی گزرا۔ پورے پولیس ڈپارٹمنٹ میں اس بات کا شور مچ گیا تھا کہ ہیریسن کو

''چہرہ چور قاتل'' کا فون آیا تھا۔ گوکہ ہیریسن کو خود بھی احساس تھا کہ اس میں اس کا اپنا تو کوئی کمال نہیں تھا لیکن پولیس کمشنر نے بھی فون کر کے ہیریسن کو مبارک باد دی۔ شاید پولیس کمشنر اس خیال کے تحت مبارک باد دے رہے تھے کہ خواہ ایک مبہم سا ہی سہی۔ لیکن قاتل کا کوئی سراغ تو سامنے آیا تھا۔ حالات کچھ ایسے تھے کہ سردست یہ سراغ بھی اہم لگ رہا تھا۔ ہیریسن کو اب یہ پچھتاوا ہو رہا تھا کہ اس کال کو ٹیپ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بہرحال کچھ امید سی بندھی تھی کہ شاید اب وہ قاتل تک پہنچ سکیں۔ یہ بات کچھ نہ کچھ اہمیت کی حامل تھی کہ قاتل نے خود اسے فون کیا تھا۔

وہ سات بجے آفس سے نکلا اور جب گھر پہنچا تو آدھا گھنٹا مزید گزر چکا تھا۔ مارتھا نے کھانا تیار کر لیا تھا اور بچوں کو سونے کے لیے تیار کر رہی تھی۔ اس نے دونوں بچوں کو سلیپنگ سوٹ پہنا دیے تھے۔ ہیریسن نے انہیں چومتے ہوئے شب بخیر کہا۔

مارتھا انہیں بیڈ روم میں چھوڑ کر آنے کے بعد بغور ہیریسن کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''کیا تم واقعی اتنے ہی تھکے ہوئے ہو جتنے چہرے سے نظر آ رہے ہو؟''

ہیریسن اس وقت اپنے لیے ڈرنک تیار کر کے اس کی چسکیاں لے رہا تھا۔ اس نے مسکرا کر مارتھا کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی تھکن کو چھپانے کی کوشش کی۔ مارتھا ایک سرو قد اور صحت مند عورت تھی۔ اس کے بال سنہرے اور آنکھیں نیلی تھیں۔ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''اپنے تاثرات بدلنے کی کوشش مت کرو۔ سچ سچ بتاؤ، کیا واقعی بہت تھکے ہوئے ہو؟''

ہیریسن نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور دل ہی دل میں فیصلہ کیا '' مارتھا سچی بات یہ ہے کہ تھکن کے مارے میرا فرش پر ڈھیر ہو جانے کو جی چاہ رہا ہے۔''

مارتھا نے قریب آ کر حوصلہ بڑھانے والے انداز میں اس کے کندھے تھپتھپائے پھر ڈائننگ ٹیبل پر کھانا لگانے میں مصروف ہو گئی۔ ہیریسن بیس گھنٹے بعد واپس آیا تھا۔ اس نے آفس سے دو مرتبہ گھر فون کر کے مارتھا سے بات کی تھی۔ وہ تازہ ترین صورتِ حال سے واقف تھی۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ دفتر میں ہیریسن کو ''چہرہ چور قاتل'' کا فون آیا تھا، جس کی وجہ سے دفتر میں ہلچل مچ گئی تھی اور قاتل کے پکڑے جانے کی موہوم سی امید پیدا ہو گئی تھی۔ ہیریسن نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھنے کے بعد مارتھا نے وہ تذکرہ نہیں چھیڑا۔ وہ اب اس موضوع پر قطعی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کھانا کھانے کے دوران وہ کھویا کھویا سا تھا اور بے دھیانی سے کھانا کھا رہا تھا۔

''کیا تم جاگتی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھ رہے ہو؟'' مارتھا نے گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔ ''کیا سوچ رہے ہو؟''

''میں این کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔'' ہیریسن کی آواز گویا کہیں دور سے آئی۔

''این...... کون این؟'' مارتھا کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں جیسے وہ ذہن پر زور دے رہی ہو۔

''میری بہن۔'' ہیریسن کی آواز اب بھی دھیمی تھی۔

''مگر تمہاری تو کوئی بہن نہیں ہے۔'' مارتھا نے گویا اسے یاد دلایا۔

''ہے تو نہیں...... لیکن تھی۔'' ہیریسن بدستور کھوئے کھوئے سے انداز میں بولا۔

مارتھا کے چہرے پر اب کچھ تشویش کے آثار ابھر آئے۔ وہ بغور ہیریسن کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔ ''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟ میں دس سال سے تمہاری فیملی کو جانتی ہوں۔ جب تمہاری والدہ زندہ تھیں، تب انہوں نے بھی کبھی ذکر نہیں کیا کہ ان کی کوئی بیٹی بھی تھی۔''

''ہم این کے بارے میں کبھی بات نہیں کرتے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میری فیملی کے جو بچے کھچے لوگ رہ گئے ہیں، وہ بھی این کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتے۔ وہ پانچ سال کی عمر میں مر گئی تھی۔

''اوہ...... آئی ایم سوری۔'' مارتھا نے گہری سانس لی۔

''تمہیں افسوس کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس دنیا میں بے شمار لوگوں کے ساتھ ایسا ہوتا ہے۔ وہ جسمانی طور پر کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ ایب نارمل سی تھی۔ اس کے زندہ بچنے کے امکانات ہی بہت کم تھے۔''

مارتھا نے متاسفانہ سے انداز میں سر ہلایا اور گہری سانس لے کر رہ گئی۔

☆☆☆

میں سراغ رساں ہیریسن کی گاڑی کی ڈکی میں چھپ کر اس کے گھر تک آ گئی ہوں۔ اس کے دفتر کی پارکنگ لاٹ میں پہنچ کر اس کی گاڑی کی ڈکی کو کھولنا اور اس میں چھپنا میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا اور اب اسے اندر سے کھولنا

بھی میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اس نے جب یہاں آکر گاڑی روکی تو مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ گھر پہنچ گیا ہے اور اس نے گاڑی گھر کے باہر کھڑی کردی ہے۔ میں نے اس کے بعد بھی کافی دیر انتظار کیا اور ڈکی میں ہی بند رہی۔ احتیاط اچھی چیز ہے مگر میرا خیال ہے، اب مجھے نکل ہی جانا چاہیے۔

چند سیکنڈ کی کوشش کے بعد میں باہر نکل آئی ہوں۔ ہیریسن کا گھر مضافاتی علاقے میں ہے۔ یہاں کی ہوا زیادہ ٹھنڈی ہے...... لیکن ٹھنڈی ہوا مجھے اچھی لگ رہی ہے۔ ڈکی میں تو میرا دم گھٹنے لگا تھا۔ میں بھاگ کر گھر کے سامنے سے ہٹ کر اس کی ایک سائڈ پر آگئی ہوں۔ مجھے گھر کے اردگرد گھوم کر کھڑکیوں وغیرہ سے جھانکنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ گھر کے اندر کا جائزہ لینا چاہیے۔ گھر کے باہر تقریباً اندھیرا ہے۔ گھر کے زیادہ تر حصے میں بھی اندھیرا ہی ہے لیکن کوئی بات نہیں۔ میں تو اندھیرے میں بھی دیکھ سکتی ہوں۔

''اوہ...... اس کمرے میں تو دو چھوٹے چھوٹے بچے سو رہے ہیں۔ میرا خیال ہے، مجھے اس کھڑکی سے ہٹ جانا چاہیے۔ کہیں یہ بچے جاگ نہ جائیں اور رونے نہ لگیں۔ اوہ...... اس کمرے میں تو ہیریسن ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھا ہے۔ سامنے بیٹھی عورت یقیناً اس کی بیوی ہے۔ دونوں کے سامنے کھانے کے برتن سجے ہوئے ہیں مگر وہ کھانا نہیں کھا رہے۔ بس باتیں کیے جا رہے ہیں۔ ہیریسن کی بیوی اچھی شکل صورت کی ہے لیکن ان لڑکیوں جیسی خوب صورت نہیں ہے جو میرے ہاتھوں مر چکی ہیں۔ ڈائننگ ٹیبل پر کھانا دیکھ کر مجھے بھی بھوک لگنے لگی ہے۔

میں درخت کے پیچھے چھپی ہوئی ہوں۔ یہ لوگ اب بھی کھانا نہیں کھا رہے۔ شاید کھا چکے ہیں۔ باتیں کر رہے ہیں۔ ہیریسن ہی زیادہ بول رہا ہے۔ مجھے ان کی آوازیں سنائی نہیں دے رہیں۔ ہیریسن کی آنکھیں واقعی کچھ مہربان آنکھیں دکھائی دیتی ہیں۔ آج میں نے اس سے فون پر بات کی تھی۔ اس کی آواز بھی مہربان آواز تھی۔ اس کی آواز میں بھی نرمی تھی۔ نفرت نہیں تھی۔ میرا خیال ہے، یہ باتوں کو سمجھتا ہے۔ میری بات کو بھی سمجھ لے گا۔ میرا دماغ زیادہ تیز نہیں ہے۔ مجھے اپنی بات سمجھانی نہیں آتی۔ مجھے شاید اس کو اپنی بات سمجھانی نہ پڑے۔ وہ خود ہی سمجھ جائے گا۔ شاید اسے یقین آجائے کہ خوب صورت عورتوں کو قتل کرنے کا یہ سلسلہ میں خود بھی روکنا چاہتی ہوں لیکن یہ مجھ اکیلی کے بس کی بات نہیں ہے۔ کسی کو میری مدد کرنی ہوگی۔ مجھے اپنے آپ پر اختیار نہیں رہتا۔ یوں لگتا ہے جیسے میرے اندر کوئی غیبی طاقت ہے جو مجھ سے یہ کام کراتی ہے۔ مجھے بعد میں اس پر پچھتاوا بھی ہوتا ہے مگر کون میری بات کا یقین کرے گا؟

شاید ہیریسن میری بات کا یقین کر لے۔ آج میں نے کافی وقت اس کے دفتر کی پارکنگ لاٹ میں، اس کی گاڑی کا جائزہ لیتے ہوئے گزارا۔ میں نے اسے کئی بار باہر آتے جاتے دیکھا۔ بہت مصروف لگ رہا تھا۔ شاید اسی لیے اس وقت تھکا تھکا سا لگ رہا ہے۔ اچھا ہوا، آج میں نے ترکیب سوچ لی اور اس کی گاڑی کی ڈکی میں چھپ کر یہاں تک پہنچ گئی۔ پتا نہیں یہ کون سا علاقہ ہے۔

ارے......! سراغ رساں ہیریسن میری ہی طرف دیکھ رہا ہے۔ بالکل اسی طرح، جیسے کل رات اس نے سڑک پر کھڑے کھڑے سر اٹھا کر اس بلڈنگ کی چھت کی طرف دیکھا تھا جہاں میں موجود تھی۔ حالانکہ چھت پر اندھیرا تھا لیکن اس وقت بھی ہیریسن کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے وہ مجھے دیکھ رہا ہو۔ شاید میری طرح اس کی آنکھیں بھی اندھیرے میں دیکھنے کی صلاحیت رکھتی ہوں۔ مجھے اس کی نظر میں نہیں آنا چاہیے۔ ہرگز نہیں آنا چاہیے۔

☆☆☆

ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے ہیریسن کی نظر کھڑکی کے شیشے سے باہر لان کی طرف چلی گئی جہاں درخت بھی تھے۔ وہاں روشنی برائے نام تھی۔ بات کرتے کرتے غیر ارادی طور پر اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ اس کی کسی حس نے اسے احساس دلایا تھا کہ کوئی اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایسا ہی احساس گزشتہ رات اسے اس وقت ہوا تھا جب وہ جائے واردات کا معائنہ کر رہا تھا اور اس نے سر اٹھا کر قریبی عمارت کی چھت کی طرف دیکھا تھا، جہاں اندھیرا تھا۔ اب بھی اسے کچھ ایسا ہی لگا تھا جیسے عقبی لان کے کسی گوشے سے کوئی اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے آنکھیں سکیڑ کر باہر دیکھا لیکن اسے درختوں اور پودوں کے سرمئی ہیولوں کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا مگر وہاں کوئی نہ کوئی ضرور تھا...... یا پھر ''کچھ نہ کچھ'' ضرور تھا۔ وہ اس کی موجودگی کو محسوس کر سکتا تھا۔

آخر وہ رہ نہ سکا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے ان بڑی لائٹس کا سوئچ آن کر دیا جن سے عقبی لان روشن ہو جاتا تھا۔ ان لائٹس کا ایک مین سوئچ اندر بھی تھا۔ اس کے علاوہ الگ الگ سوئچ بھی تھے۔ تمام لائٹس آن ہونے سے پورا لان ہیریسن کو صاف نظر آنے لگا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ بچی

بات تو یہ تھی کہ لائٹس آن کرتے وقت ہیریسن کا دل انجانے اندیشوں سے دھڑک رہا تھا۔ اس کی دعا یہی تھی کہ اسے عقبی لان پر کوئی نظر نہ آئے۔ جب واقعی اسے کوئی نظر نہیں آیا تو اس نے محسوس کیا کہ اس کے اعصاب کو کچھ سکون ملا تھا۔

''مجھے وہم سا ہوا تھا جیسے بیک یارڈ میں کوئی ہے۔'' اس نے مارتھا کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے گویا وضاحت کی۔ ''مگر وہاں کوئی نہیں ہے۔ شاید کوئی چوہا یا بلی ہوگی جو بھاگ گئی۔''

ہے کہ وہ مجھے مرد سمجھ رہا ہے۔ میرے خیال میں میری بہتری اسی میں ہے کہ میں اسے اس غلط فہمی میں مبتلا رہنے دوں۔ ویسے بھی کسی کو اپنی بات سمجھانا میرے بس کی بات نہیں۔

میں جس راستے پر چل رہی ہوں، یہاں بھی اندھیرا ہے۔ مکانات بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ یہ کوئی مضافاتی سا علاقہ معلوم ہوتا ہے۔ سڑک کے دوسری طرف ایک جنگل بھی ہے۔ ارے...... یہ تو ایک پارک آگیا۔ میں پارک میں داخل ہوگئی ہوں۔ پارک ویران پڑا ہے۔ یہاں کوئی نہیں

اس نے لائٹس آن رہنے دیں اور واپس ڈائننگ ٹیبل پر آن بیٹھا مگر کچھ کھانا ایک بار پھر اس کے لیے تقریباً ناممکن سا ہوگیا۔ ایک پریشان کن خیال اچانک ہی اس کے ذہن پر حملہ آور ہوگیا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ چہرہ چور قاتل کسی طرح اس کے گھر تک پہنچ گیا تھا اور جائزہ لے کر چلا گیا تھا؟ اس صورت میں اس کا اگلا شکار مارتھا بھی ہوسکتی تھی۔ وہ دن بھر...... اور کبھی کبھی رات کو بھی صرف بچوں کے ساتھ گھر پر ہوتی تھی۔

''اوہ میرے خدا......'' اس نے دل ہی دل میں اپنے آپ سے کہا۔ ''میرا ذہن پہلے اس امکان کی طرف کیوں نہیں گیا تھا؟''

اس نے فیصلہ کیا کہ صبح اٹھ کر سب سے پہلے حفاظتی الارم سسٹم نصب کرنے والی مقامی کمپنی کو فون کرے گا، ان کے ہاں جو بہترین سیکیورٹی سسٹم دستیاب ہوگا، وہ اپنے گھر میں نصب کرائے گا۔ یہ کام کل ہی جلد از جلد ہوجانا چاہیے تھا۔ اخراجات کی اسے پروا نہیں تھی۔ آج کی رات بہرحال سیکیورٹی سسٹم کے بغیر گزارنی تھی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ آج رات وہ لوڈڈ ریوالور تکیے کے نیچے رکھ کر سوئے گا۔

☆☆☆

بھاگو...... فوراً یہاں سے بھاگو...... ہیریسن یقیناً پچھلے لان کی لائٹس جلانے کے لیے اٹھا ہے۔ اگر یہاں زیادہ روشنی ہوگئی تو وہ یقیناً مجھے دیکھ لے گا۔ خیر...... یہ میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ میں تو بہت تیز بھاگتی ہوں۔ چند سیکنڈ میں وہاں سے دور نکل آئی ہوں۔ یہاں بھی سڑک کے کنارے جھاڑیاں اور درخت ہیں۔ میں ان کے پیچھے چھپ چھپ کر چل سکتی ہوں۔ بہرحال، یہ بڑی حیرت کی بات ہے۔ ہیریسن میری موجودگی کو محسوس کرلیتا ہے۔ میں اس کی طرف دیکھتی ہوں تو اسے پتا چل جاتا ہے کہ کوئی اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اس سے مجھے کچھ اور زیادہ امید ہونے لگتی ہے کہ وہ میری بات سمجھ لے گا۔ ایک اچھی بات یہ

ہے۔ کافی اچھا پارک ہے۔ نہ جانے کیوں، کچھ دیکھا بھالا سا لگ رہا ہے...... ارے...... میں نے اس پارک کو پہچان لیا...... اور پارک کی وجہ سے اس علاقے کو بھی پہچان لیا۔ یہ مونرو کا علاقہ ہے۔ میں اسی علاقے میں تو پیدا ہوئی تھی۔ اس پارک کے سامنے ہی ہمارا گھر تھا...... ہاں...... وہ گھر اب بھی موجود ہے۔ اس کی بناوٹ کچھ بدل گئی ہے اور اب وہ ذرا نیا نیا سا لگ رہا ہے...... لیکن بہرحال...... یہ وہی گھر ہے۔ معلوم نہیں، اب اس میں کون رہتا ہوگا؟

مونرو کوئی اچھا علاقہ نہیں ہے۔ مجھے اس سے نفرت ہے۔ یہاں کے لوگ بہت برے ہیں۔ مجھے اس گھر سے بھی نفرت ہے جہاں میں پیدا ہوئی تھی۔ اس کا رنگ بھی اب بدلا ہوا ہے۔ شاید نیا رنگ کرایا گیا ہے لیکن مجھے یہ اب بھی برا لگ رہا ہے۔ میں اب پارک کی گھاس پر بیٹھ گئی ہوں۔ گھاس برف کی طرح ٹھنڈی ہے۔ پتا نہیں کیوں مجھے رونا آرہا ہے۔ قسمت مجھے ایک بار پھر مونرو کیوں لے آئی؟ مجھے تو یہاں آنے کی کوئی خواہش نہیں تھی۔ ممی جا چکی ہیں۔ معلوم نہیں کہاں جا چکی ہیں۔ سبھی جا چکے ہیں۔ اس گھر میں اب کوئی اور لوگ رہتے ہیں۔ نئے لوگ۔ گھر اپنی جگہ کھڑا ہے۔ میرے گھر والوں میں سے اب کوئی یہاں نہیں ہے۔

روتے روتے میرے آنسو خشک ہوگئے ہیں۔ سامنے والے گھر میں لائٹس آف ہوگئی ہیں۔ ذرا اس کی کھڑکی پر جا کر دیکھتی ہوں، اس گھر میں رہنے والے نئے لوگ کیسے ہیں۔ میں تو اندھیرے میں بھی دیکھ سکتی ہوں۔ کچھ دیر انتظار کرتی ہوں۔ یہ لوگ سو جائیں، پھر جا کر دیکھوں گی۔ میرا خیال ہے، اب یہ لوگ سو گئے ہیں۔ جا کر دیکھتی ہوں...... ہاں...... یہ لوگ سو گئے ہیں۔ مکان کے پچھلی طرف چلتی ہوں۔ پچھلے لان کی طرف تہ خانہ بھی ہے۔ اس کی ایک کھڑکی بھی ہے جو بڑے سے روشن دان جیسی ہے۔ ہاں...... وہ کھڑکی مجھے نظر آگئی۔ اس کے اندر جھانک کر دیکھتی ہوں۔

واہ! ان لوگوں نے تو تہ خانے کو بہت اچھا بنا لیا ہے۔ قالین بھی بچھا ہوا ہے۔ اب یہاں دیوار میں لوہے کا وہ گول کنڈا بھی نہیں ہے جس میں لمبی سی، لوہے کی زنجیر ہوتی تھی۔ اس زنجیر کا دوسرا سرا میرے پاؤں میں بندھا ہوتا تھا۔ میں تقریباً پورے تہ خانے میں پھر سکتی تھی لیکن دروازے تک نہیں جا سکتی تھی۔ باہر نہیں جا سکتی تھی۔ اس روشن دان نما کھڑکی میں لٹک کر باہر دیکھ سکتی تھی۔ باہر بچے کھیلتے کودتے نظر آتے تھے۔ میرا دل چاہتا تھا، میں بھی ان کے ساتھ جا کر کھیلوں کودوں، انہیں دوست بناؤں لیکن ممی نے مجھے منع کر رکھا تھا۔ وہ کہتی تھیں، اگر میں بچوں کے پاس جاؤں گی تو وہ ڈر کر بھاگ جائیں گے۔

اس تہ خانے میں دل بہلانے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ بس، میں زنجیر سے بندھی اِدھر سے اُدھر پھرتی رہتی تھی۔ تہ خانہ ایک بڑے کمرے جیسا ہے۔ پھرتے پھرتے، ایک کونے سے دوسرے کونے تک آتے جاتے تھک جاتی تھی تو ننگے فرش پر بیٹھ جاتی۔ فرش پر ہی سو جاتی، لیکن مجھے نیند بہت ہی کم آتی۔ اب بھی کم آتی ہے۔ پہلے میں اس گھر کے کسی کمرے میں تھی۔ وہاں ٹی وی بھی تھا۔ کھلونے بھی تھے۔ میں نے ٹی وی بھی توڑ دیا۔ کھلونے بھی توڑ دیے۔ ممی کہتی تھیں، میں بہت طاقتور ہوں اور مجھ میں جنگلی پن ہے۔ جانوروں کی طرح۔ مجھے اس کمرے سے بھی باہر جانے کی اجازت نہیں تھی لیکن میں کبھی تالا توڑ کر یا کھڑکی کا شیشہ توڑ کر نکل جاتی تھی۔

پھر مجھے تہ خانے میں بند کر دیا گیا تھا۔ اس تہ خانے کو دیکھ کر مجھے بہت بُری بُری یادیں آرہی ہیں۔ پھر بھی میں اس کھڑکی کے راستے اندر کود گئی ہوں۔ اب مجھے کوئی خوف نہیں ہے۔ یہاں اب کوئی زنجیر نہیں ہے۔ دیوار میں کوئی ہتھکڑی جیسا کنڈا نہیں ہے۔ مجھے اس تہ خانے کو دیکھ کر رونا آرہا ہے۔ میں قالین پر بیٹھی رو رہی ہوں۔ تھوڑی دیر بعد میرے آنسو ایک بار پھر خشک ہو گئے۔ اب مجھے رونا نہیں آرہا، لیکن میرا دل رو رہا ہے۔ آخر ایک روز میں اس تہ خانے سے بھاگنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ دور...... بہت دور چلی گئی تھی۔ پھر بھی لوٹ کر نہیں آئی تھی مگر آج پھر قسمت مجھے یہاں لے آئی ہے۔ پتا نہیں کیوں؟

مجھے اس جگہ سے نفرت ہے۔ میرے دل میں دبی ہوئی نفرت کی آگ پھر بھڑکنے لگی ہے۔ میرا جی چاہ رہا ہے، اس گھر کو آگ لگا دوں۔ میں نے ابھی یہ سوچا ہی تھا کہ تہ خانے کے ایک کونے میں تپائی پر مجھے سگریٹ کا پیکٹ اور ماچس کی ڈبیا رکھی نظر آگئی۔ میں نے دونوں چیزیں اٹھا لیں۔ میں نے ساری سگریٹوں اور ساری تیلیوں کو آگ لگا کر قالین پر پھینک دیا۔ قالین نے فوراً آگ پکڑ لی۔ میں نے اچھل کر روشن دان نما کھڑکی میں ہاتھ پھنسائے اور رینگ کر اس میں سے نکل گئی۔ اب میں دوبارہ سامنے والے پارک میں آبیٹھی ہوں۔ یہاں پہلے ہی کی طرح ٹھنڈ ہے۔ میں تماشے کا انتظار کر رہی ہوں۔

تھوڑی دیر میں تماشا شروع ہو گیا۔ سامنے والے مکان کے ایک حصے سے آگ نکلتی دکھائی دی۔ جلدی ہی شعلے بلند ہونے لگے۔ اس مکان میں رہنے والے باہر آگئے ہیں اور سڑک پر حیران پریشان کھڑے ہیں۔ دوسرے گھروں سے بھی کچھ لوگ نکل آئے ہیں لیکن مجھے یہاں اندھیرے میں، پارک کے پودوں کے جھنڈ کے پیچھے بیٹھے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ البتہ میں ان سب کو، اور اس سارے منظر کو اچھی طرح دیکھ سکتی ہوں۔ مجھے اس مکان کو جلتے دیکھ کر بہت خوشی ہو رہی ہے جس سے مجھے نفرت تھی۔

لو...... وہ پانی کی گاڑیاں بھی گھنٹیاں بجاتی ہوئی آگئیں۔ اب مکان پر پائپوں سے خوب پانی پھینکا جا رہا ہے مگر آگ بجھنے میں نہیں آرہی۔ مکان کا زیادہ حصہ لکڑی کا ہے۔ دھڑا دھڑ جل رہا ہے۔ یہ منظر مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے لیکن نہ جانے کیوں، خود بہ خود میری آنکھوں سے آنسو بھی بہہ رہے ہیں۔ پتا نہیں ممی وغیرہ اب کہاں ہوں گے۔ میرا خیال ہے مجھے اب اس گھر کی طرف چلنا چاہیے جو اس گھر کے بعد میرا ٹھکانا بنا تھا جسے میں نے آگ لگا دی ہے۔ میرے نئے گھر میں جینی میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ بے چاری جینی......!

☆☆☆

ہیریسن کو قاتل کی دوسری فون کال دوسرے ہی روز آگئی۔ اس بار پولیس والوں نے کال آنے کی توقع پر، اس کا سراغ لگانے کے لیے اپنی سی تیاریاں کی ہوئی تھیں۔ ٹیلی فون لائنوں کے ساتھ ٹیپ ریکارڈرز اور کمپیوٹرز منسلک کیے جا چکے تھے۔ ہیریسن نے جیسے ہی قاتل کی آواز پہچانی، اس نے میز کے دوسری طرف بیٹھے ہوئے جیکب کو اشارہ کر دیا۔ جیکب نے فوراً ہیڈ فون کانوں پر چڑھا لیا۔ چاروں طرف احکام جاری ہونے لگے۔ مختلف سمتوں میں لوگوں کی بھاگ دوڑ شروع ہو گئی۔

''مجھے خوشی ہے کہ تم نے دوبارہ فون کر لیا۔'' ہیریسن نے کہا۔ ''میں تمہارے ہی بارے میں سوچ رہا تھا۔''

’’تم میرے مسئلے کو سمجھتے ہونا؟‘‘ قاتل نے اپنے اسی عجیب سے لہجے اور عجیب سی آواز میں پوچھا۔

’’میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔‘‘ ہیریسن نے ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں جواب دیا۔ حقیقت یہی تھی کہ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا، قاتل اسے کیا سمجھانے کی کوشش کررہا تھا۔ اس کے دل اور ذہن میں کوئی بات ضرور تھی جس کے بارے میں شاید وہ چاہتا تھا کہ ہیریسن اسے خود ہی سمجھ جائے۔

’’تمہیں اس سلسلے کو بند کرنے میں میری مدد ضرور کرنی ہے۔‘‘ قاتل نے اپنا مقصد بیان کیا۔

’’میں ضرور مدد کروں گا لیکن مجھے بتاؤ کہ کیسے کروں؟‘‘ ہیریسن نے نرم اور کسی حد تک مشفقانہ سے لہجے میں کہا۔

’’یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم۔‘‘ قاتل کا لہجہ سپاٹ سا تھا۔

اب ان کی گفتگو میں وقفہ سا آگیا۔ ہیریسن قاتل کو بولنے پر مجبور کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن اسے باتوں میں لگائے رکھنا بھی ضروری تھا تاکہ اس کال کا سراغ لگانے کی کارروائی جاری رہ سکے۔

’’کیا تم نے ...... پچھلی رات کسی کو تکلیف پہنچائی؟‘‘ آخرکار ہیریسن نے ہچکچاتے ہوئے پوچھ ہی لیا۔

’’نہیں ...... پچھلی رات میں نے گھر دیکھے ...... بہت سے گھر دیکھے ...... تمہارا گھر بھی دیکھا ...... تمہاری بیوی کو بھی دیکھا۔‘‘ قاتل بولا۔

ہیریسن کو اپنا خون رگوں میں جمتا محسوس ہوا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کی چھٹی حس نے اسے ٹھیک خبردار کیا تھا۔ گزشتہ رات واقعی اس کے عقبی لان پر کوئی موجود تھا۔ وہ کوئی اور نہیں بلکہ ’’چہرہ چور قاتل‘‘ ہی تھا۔

اس نے میز کے دوسری طرف بیٹھے جیکب کی طرف دیکھا۔ جیکب کی آنکھوں میں اس کے لیے تشویش ابھر آئی تھی۔ وہ ہیڈفون کے ذریعے ٹیلی فون پر ہونے والی گفتگو سن رہا تھا۔

’’تم میرے گھر آئے تھے؟‘‘ ہیریسن نے اپنے لہجے سے حیرت کا اظہار کیا۔ ’’پھر تم مجھ سے ملے کیوں نہیں؟ تم نے مجھ سے بات کیوں نہیں کی؟‘‘ ہیریسن حیرت کے ساتھ ساتھ ایک دوستانہ قسم کے شکوے کا تاثر بھی دینے کی کوشش کررہا تھا۔

’’نہیں ...... نہیں ......‘‘ قاتل جلدی سے بولا۔ ’’میں نہیں چاہتا، تم مجھے دیکھو، میں تمہارے گھر سے بھاگ گیا تھا۔ اپنے گھر چلا گیا تھا۔‘‘

’’اپنے گھر ......؟‘‘ ہیریسن نے حیرت سے دہرایا۔ ’’تم مونزو میں رہتے ہو؟‘‘

’’نہیں۔ مجھے مونزو سے نفرت ہے۔ کبھی میں وہاں رہتا تھا۔ بہت پہلے میں مونزو سے بھاگ گیا تھا۔ کبھی واپس نہیں آیا۔ کل میں نے اپنے پرانے مکان کو بھی آگ لگا دی۔ میں دوبارہ کبھی مونزو میں نہیں رہوں گا۔‘‘

’’کل ......؟‘‘ ہیریسن نے حیرت سے دہرایا۔ ’’تم نے کل اپنے پرانے مکان کو آگ لگائی ہے؟‘‘ اس نے رات کے پچھلے پہر کہیں دور سے فائر بریگیڈ کے سائرن کی آواز سنی تھی۔ اس وقت اسے ذرا بھی اندازہ نہیں ہوا تھا کہ آگ کہاں لگی ہوگی اور یہ تو اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ آگ کس نے لگائی ہوگی۔

’’ہاں ...... کل میں نے اس مکان کو آگ لگا دی جس سے مجھے سخت نفرت تھی۔‘‘ قاتل نے کہا اور پھر سلسلہ منقطع ہوگیا۔

ہیریسن نے ریسیور رکھ کر سوالیہ انداز میں جیکب کی طرف دیکھا۔ جیکب نے ایک دوسرے فون کا ریسیور اٹھایا اور کسی سے پوچھا۔ ’’کیا ہمیں کال کا کوئی سراغ ملا؟‘‘

اس نے ایک لمحے دوسری طرف سے کوئی بات سنی۔ پھر ہیریسن کو بتایا۔ ’’لوگ کوشش کررہے ہیں۔ رپورٹ کا انتظار ہے۔‘‘ پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا۔ ’’بولنے والا ذہنی طور پر پسماندہ اور ایب نارمل لگتا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟‘‘

ہیریسن جواب دینے کے بجائے سوچ میں پڑگیا۔ ’’ذہنی طور پر پسماندہ ...... ایب نارمل ......‘‘ یہ الفاظ نہ جانے کیوں اسے کچھ غیرمعمولی سے محسوس ہوئے تھے۔ اس کے ذہن میں گویا ایک قسم کا مدوجزر سا ابھرا تھا۔ کچھ چیزیں ...... کچھ موہوم سی آوازیں ...... کچھ نہایت دھندلی سی یادیں ابھر کر ذہن کی سطح تک آرہی تھیں اور ایک ایسی تصویر سی بن رہی تھی جسے وہ دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔

’’شاید تمہارا خیال درست ہو۔ وہ واقعی ذہنی طور پر پسماندہ اور ایب نارمل ہو۔‘‘ ہیریسن نے سوچوں کی یلغار سے بچنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

’’کیا تمہارے خیال میں اس وجہ سے اُسے پکڑنا کچھ آسان ہوجائے گا؟‘‘ جیکب نے اس کی رائے جاننا چاہی۔ فون کا ریسیور ابھی تک اس کے کان سے لگا ہوا تھا۔ وہ یقیناً دوسری طرف سے کچھ سننے کے انتظار میں بیٹھا ہوا

تھا۔ اس دوران اسے دوسری طرف سے کوئی آواز سنائی دی اور اس کا دھیان اس طرف ہو گیا۔ ہیریسن کو اس کی بات کا جواب نہیں دینا پڑا۔

جیکب نے چند لمحے فون پر کسی کی بات سنی، پھر ریسیور رکھتے ہوئے ہیریسن کی طرف دیکھ کر قدرے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا۔

''کیا ہوا؟'' ہیریسن نے جاننا چاہا۔

''ہمارے لوگ کال کا صرف لوئر ایسٹ سائڈ کے علاقے تک سراغ لگا سکے ہیں۔'' جیکب نے بتایا۔ ''وہاں کچھ نئے ہاؤسنگ پراجیکٹس بن رہے ہیں۔ شاید وہ انہی کے آس پاس سے کسی پبلک فون سے کال کر رہا تھا۔ اگر وہ آدھا منٹ اور بات جاری رکھتا تو ہمیں بالکل صحیح جگہ کا پتا چل جاتا۔''

''مجھے پبلک فون سے کہیں بہتر سراغ مل گیا ہے۔'' ہیریسن بولا۔ ''مجھے قاتل کے پرانے گھر کا پتا چل گیا ہے۔ وہاں سے مزید کچھ نہ کچھ معلوم ہونے کی امید ہے۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا اور کرسی کے پشتے سے اپنا کوٹ اٹھا کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

جیکب بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ غالباً یہی سمجھا تھا کہ اسے بھی ہیریسن کے ساتھ جانا ہے۔ ''ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' اس نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

''ہم نہیں...... صرف میں جا رہا ہوں۔'' اس نے جیکب کی غلط فہمی دور کی۔

''لیکن کہاں؟'' جیکب کے لہجے میں حیرت برقرار رہی۔

''مونرو...... میں مونرو جا رہا ہوں۔'' ہیریسن نے جواب دیا اور دروازہ کھول کر نکل گیا۔ مونرو اسی علاقے کا نام تھا جہاں وہ خود رہتا تھا۔

☆☆☆

مونرو، دریا کے پار ایک مضافاتی علاقہ تھا۔ ہیریسن سب سے پہلے وہاں کے فائر ڈپارٹمنٹ پہنچا۔ وہاں سے اس نے اس مکان کا ایڈریس لیا جس میں گزشتہ رات آگ لگی تھی۔ اس کے بعد وہ ٹاؤن ہال پہنچا جہاں تمام مکانوں کا ملکیتی ریکارڈ موجود تھا۔ جس مکان میں پچھلی رات آگ لگی تھی، اس کے موجودہ مالکان کے نام مسٹر اور مسز اسکاٹ تھے۔ ان کا تقریباً پورا گھر آگ کی نذر ہو گیا تھا۔ ان سے پہلے صرف ایک اور جوڑا اس مکان کا مالک رہا تھا۔ وہ مسٹر اور مسز ٹامس بیکر تھے۔ ہیریسن کی زندگی کا بیشتر حصہ مونرو میں گزرا تھا لیکن وہ کسی بیکر فیملی کو نہیں جانتا تھا۔ اس نے اپنے ذہن کو کھنگالا تو اسے ایک آدمی کا نام یاد آ گیا جو اس کے خیال میں اسے اس علاقے کے ہر پرانے رہائشی کے بارے میں کچھ نہ کچھ بتا سکتا تھا۔ وہ پولیس آفیسر، کیپٹن جیری ہال تھا۔

ہیریسن بلاتاخیر کیپٹن ہال سے ملنے جا پہنچا۔ کیپٹن ہال سے ہیریسن کی آخری ملاقات کو برسوں گزر چکے تھے لیکن اب ملاقات ہوئی تو ہیریسن نے دیکھا کہ کیپٹن ہال کی شخصیت میں کوئی خاص تبدیلیاں نہیں آئی تھیں۔ وہ اب بھی پہلے ہی کی طرح خاصا بھاری بھرکم تھا۔ توند نمایاں تھی۔ بال فوجی انداز میں تراشیدہ تھے۔ گو کہ اب تو اس ہیئر کٹ کا فیشن بھی تھا لیکن کیپٹن ہال پچھلے تیس سال سے اسی انداز میں بال ترشوا رہا تھا۔ پہلی نظر میں وہ کسی ویسٹرن فلم میں دکھائے جانے والے دور اُفتادہ دیہی یا پہاڑی علاقے کا شیرف دکھائی دیتا تھا۔

ان کا ملنے کا انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے ہیریسن برسوں پہلے گاؤں سے رخصت ہونے والا کوئی نوجوان تھا جو شہر جا کر، ترقی کر کے بڑا آفیسر بن گیا تھا اور اب گاؤں میں اپنے پرانے شناسا، چھوٹے آفیسر سے ملنے آیا تھا جو ''وہیں کا وہیں'' اور ''ویسا کا ویسا'' ہی تھا۔ جب رسمی جملوں کا تبادلہ ہو چکا اور تھوڑی بہت پرانی باتیں بھی ہو چکیں تو ہیریسن نے اصل بات شروع کی اور بیکر فیملی کے بارے میں پوچھا۔

''بیکر فیملی......؟'' کیپٹن ہال نے گرم گرم کافی کی چسکی لینے کے بعد کہا۔ ''وہی لوگ جو نارتھ پارک ڈرائیو پر رہتے تھے؟ انہیں بھلا کون بھول سکتا ہے؟ ایک خاتون تھی۔ غالباً مطلقہ تھی۔ اس کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا۔''

ہیریسن نے اب چھوٹا سا ایک رائٹنگ پیڈ اور بال پوائنٹ نکال لیا۔ وہ ہال کا جواب نوٹ کرنے لگا۔ پھر اس نے پوچھا۔ ''لڑکے کا نام کیا تھا؟''

''میرا خیال ہے...... ٹامی تھا۔'' ہال ذہن پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''ہاں...... مجھے یاد آ گیا، ٹامی ہی تھا۔''

''میرا خیال ہے، یہی ہے، جس کی مجھے تلاش ہے۔'' ہیریسن اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''کیا واقعی؟'' ہال نے آنکھیں سکیڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ ''تم 'چہرہ چور قاتل' کے کیس پر کام کر رہے ہو نا؟''

''ہاں۔'' ہیریسن نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلایا۔

نہیں مما...... ڈیڈ صبح سویرے نہیں اٹھے بلکہ بے خوابی میں ٹہلتے ٹہلتے، رات کو اس کرسی پر ڈھیر ہو گئے ہوں گے۔

''اور تمہارا خیال ہے کہ ٹامی بیکر تمہارا مطلوبہ آدمی ہو سکتا ہے؟''

''اس کا امکان ہے۔''

ہیریسن بولا۔ ''تم اس کے بارے میں کیا جانتے ہو؟''

''میں یہ جانتا ہوں کہ ٹامی مر چکا ہے۔'' ہال نے جواب دیا۔

''مر چکا ہے؟'' ہیریسن نے حیرت اور بے یقینی سے دہرایا۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''کیوں نہیں ہو سکتا؟ کیا کوئی مر نہیں سکتا؟'' ہال نے قدرے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ پھر اس نے کمرے کے دروازے کی طرف منہ کر کے اونچی آواز میں کہا۔ ''مرفی! ذرا وہ ٹامی بیکر والے کیس کی فائل لانا۔ میرا خیال ہے، وہ 1984ء کا کیس ہے۔''

''1984ء......؟''

ہیریسن نے دہرایا۔ وہ اور مارتھا ان دنوں شہر میں، کوئنز کے علاقے میں رہ رہے تھے۔ اس وقت تک وہ مونرو میں واپس نہیں آئے تھے۔

''ہاں، یہ اسی سال کا کیس ہے۔'' ہال بولا۔ ''ٹامی بیکر کا قتل بہت ہی ہولناک تھا۔ اس کی عمر اس وقت تیرہ سال ہو گی جب وہ قتل ہوا۔ میرا خیال ہے اس نے خود اپنی موت کو دعوت دی تھی۔''

ہیریسن خاموش بیٹھا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کا ذہن سنسنا رہا تھا۔ اس نے جو اندازے لگائے تھے یا مفروضے قائم کیے تھے، وہ گویا ہوا میں تحلیل ہو گئے تھے۔

تھوڑی دیر میں کیپٹن ہال کا ماتحت مطلوبہ فائل لے کر آ گیا۔ فائل پتلی سی تھی۔ ہیریسن نے اسے کھول کر دیکھا۔ اس میں تھوڑے سے کاغذات تھے۔

''بس..... یہی کل کاغذات ہیں؟'' ہیریسن نے تصدیق چاہی۔

''ہاں۔'' ہال نے جواب دیا۔ ''اس کیس میں زیادہ تفتیش نہیں کرنی پڑی تھی۔ قتل بلاشبہ ہولناک تھا لیکن کیس میں کوئی پیچیدگی نہیں تھی۔ سیدھا سادہ کیس تھا۔ ماں بیٹی گواہ تھیں۔ انہیں معلوم تھا، قتل کس نے کیا ہے۔ فائل کے آخر میں ایک لفافہ بھی منسلک ہے۔ اس میں مقتول کی چند تصویریں ہیں۔''

ہیریسن نے لفافہ فائل سے نکالا اور اس میں سے بڑی بڑی چند بلیک اینڈ وائٹ تصویریں نکالیں۔ تصویروں پر ایک نظر ڈالتے ہی گویا اس کا معدہ اُچھل کر حلق میں آ گیا۔ ''اوہ میرے خدا......'' اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''لڑکے کی لاش بہت بُری حالت میں تھی۔ اس کی بہن نے اسے قتل کیا تھا۔ اس کا نرخرہ اُدھیڑ ڈالا تھا۔ اس کا پیٹ پھاڑ کر آنتیں وغیرہ، سب باہر کھینچ لی تھیں۔''

''بہن نے......؟'' ہیریسن نے بے یقینی سے پوچھا۔

''ہاں۔'' ہیریسن نے تصدیق کی۔ ''وہ کچھ عجیب ڈراؤنی سی مخلوق تھی۔ پیدا ہی عجیب ہوئی تھی۔''

ہیریسن کو اب باقاعدہ چکر سے آنے لگے تھے۔ کمرے کے در و دیوار اور چھت اسے ہلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ خود اپنے بارے میں اسے اندیشہ محسوس ہو رہا تھا کہ کہیں وہ پھسل کر کرسی سے نہ گر پڑے۔

''ڈراؤنی سی مخلوق......؟'' ہیریسن نے دہرایا اور

دل ہی دل میں دعا کی کہ ہال اس کی آواز میں خفیف سی کپکپاہٹ کو محسوس نہ کرے۔ ”کیسی دکھائی دیتی تھی وہ؟“

”مجھے اس کو دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ بھائی کو قتل کر کے وہ فرار ہو گئی تھی۔ اس کے بعد سے کسی نے کبھی اس کی جھلک بھی نہیں دیکھی۔ ویسے اس لفافے میں باقی فیملی کی ایک تصویر موجود ہے۔“ ہال نے بتایا۔

ہیریسن نے تصویروں کو ادھر اُدھر کر کے دیکھا۔ سب سے نیچے فیملی کا ایک گروپ فوٹو موجود تھا۔ یہ تصویر رنگین تھی۔ اس میں چار افراد نظر آرہے تھے۔ ایک عورت اور ایک مرد تھا۔ یہ دونوں افراد کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے، نیچے دو بچے قالین پر بیٹھے تھے۔ ایک لڑکا تھا جس کی عمر دس سال کے قریب معلوم ہوتی تھی۔ دوسری تقریباً آٹھ سال کی لڑکی تھی۔ یہ ایک بالکل عام اور نارمل سی امریکی فیملی کی تصویر تھی جس میں چاروں افراد مسکراتے دکھائی دے رہے تھے۔

تصویر دیکھتے ہوئے ہیریسن کے ذہن میں سوال پیدا ہوا۔ ’اس جوڑے کی سب سے بڑی اولاد کہاں ہے؟ ان دونوں بچوں کی بڑی بہن اس تصویر میں نظر نہیں آرہی۔ یہ تصویر کھنچواتے وقت ان لوگوں نے اسے نہ جانے کہاں چھپا دیا؟‘

”اس لڑکی کا نام کیا تھا جو اس تصویر میں نظر نہیں آرہی؟“ ہیریسن نے کیپٹن جیریمی ہال سے پوچھا۔

”مجھے ٹھیک سے یاد نہیں...... شاید کارلا تھا۔“ ہال نے جواب دیا پھر کچھ سوچ کر کہا۔ ”ان کاغذات میں ایک کاغذ ”مشتبہ افراد“ کے عنوان سے بھی ہوگا۔ وہ دیکھو، اس میں شاید اس لڑکی کا نام بھی ہوگا۔“

ہیریسن نے اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے وہ کاغذ تلاش کر کے اس کا جائزہ لیا اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ہاں...... یہاں اس کا نام کارلا بیکر درج ہے۔ عام طور پر اسے کارلی کہہ کر پکارا جاتا تھا۔“

”اس کا مطلب ہے، اس عمر میں بھی میری یادداشت اتنی بری نہیں۔“ ہال قدرے فاتحانہ انداز میں مسکرایا۔ ”جلد ریٹائر ہونے والا ہوں میں۔“

ہیریسن نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اپنے خیالات میں الجھا ہوا تھا۔ دل ہی دل میں وہ ان کرداروں سے باتیں کر رہا تھا۔ ”کارلی بیکر...... ان لوگوں نے یہ تصویر کھنچواتے وقت تمہیں کہاں چھپایا ہوا تھا؟ کیا تہ خانے میں بند کیا ہوا تھا؟ یا پھر اوپر چھت پر اسٹور میں بند کر کے دروازے کو تالا لگایا ہوا تھا؟ تمہارے بھائی کا تمہارے ساتھ سلوک کیسا تھا؟ کیا اتنا برا تھا کہ تمہاری نظر میں وہ قتل کا مستحق ٹھہرا؟“

ہیریسن نے محسوس کیا کہ شاید اس کا جواب اثبات میں تھا۔

”کارلا کی کوئی تصویر تمہارے ریکارڈ میں نہیں ہے؟“ ہیریسن نے دریافت کیا۔

”نہیں، ایک بھی نہیں ہے۔“ ہال نے جواب دیا۔

ہیریسن کو اس جواب پر حیرت نہیں ہوئی۔

”اس کا کچھ حلیہ تو بتا سکتے ہو؟“ ہیریسن نے ایک موہوم سی امید کے سہارے پوچھا۔

”لڑکی کی ماں نے ہمیں تھوڑا بہت حلیہ بتایا تو تھا لیکن وہ اتنا عجیب اور ڈراؤنا سا تھا کہ ہم نے تحریر نہیں کیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ لڑکی نہیں بلکہ لڑکی کی جسامت کی کوئی مکڑی یا پھر اس سے ملتی جلتی کوئی ڈراؤنی سی مخلوق تھی۔“ اس نے اپنا کافی کا کپ خالی کر کے میز پر رکھتے ہوئے سلسلۂ کلام جوڑا۔ ”اس واقعے کے کچھ عرصے بعد ایک مقامی ڈاکٹر البرٹس سے ملاقات ہوئی شاید تمہیں علم ہو کہ وہ اس علاقے کا سب سے بڑا گائنا کولوجسٹ ہے اور اسے بہت قابل سمجھا جاتا ہے۔ اتفاق سے اس واقعے کا ذکر چھڑ گیا اور کارلا کے حلیے کا بھی ذکر آیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ جس زمانے میں کارلا پیدا ہوئی، اس زمانے میں زیادہ تر بچے اسی کے ہاتھوں میں پیدا ہوئے اور ان میں سے زیادہ تر عفریت نما بچے تھے۔ اس کی کوئی توجیہہ خود ڈاکٹر البرٹس کے پاس بھی موجود نہیں تھی۔ وہ بھی سمجھنے سے قاصر تھا کہ ایک مخصوص مہینے میں ایسے بچے کیوں پیدا ہوئے؟“

کیپٹن ہال ایک لمحے کے لیے پُرخیال انداز میں خاموش رہا۔ اس دوران ہیریسن کو کمرے کے در و دیوار اپنے سامنے ہلکورے لیتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔

”یہ غالباً دسمبر 1968ء کی بات ہے؟“ ہیریسن نے تصدیق چاہی۔

”ہاں...... لیکن تمہیں کیسے معلوم ہے؟“ ہال نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

”یونہی...... بس اندازہ لگایا ہے۔“ ہیریسن نے اپنے اعصاب کے ارتعاش کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”بہرحال ڈاکٹر البرٹس نے بتایا کہ اس نے اور اس کے اسپتال کے عملے نے اس معاملے کو حتی الامکان راز رکھنے کی کوشش کی اور اپنے طور پر اس کا سبب جاننے کی

کوشش کرتے رہے اور اندازے لگاتے رہے کہ آخر ایک ہی مہینے میں اتنے سارے عجیب الخلقت بچے کیوں پیدا ہوئے؟ پرانے زمانے میں چاند یا سورج گرہن ہوتا تھا تو جو عورتیں امید سے ہوتی تھیں، انہیں سختی سے ہدایت کی جاتی تھی کہ وہ باہر نہ نکلیں۔ اندیشہ یہی پایا جاتا تھا کہ ان کے ہونے والے بچے میں کسی قسم کا جسمانی نقص پیدا ہوسکتا ہے۔ ہماری جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو ہم نے یہی نظریہ قائم کیا کہ جس سال یہ ڈراؤنے بچے پیدا ہوئے، اس سال جب یہ عورتیں امید سے تھیں تو یہ بھی کسی ایسی چیز کی زد میں آگئیں جس کا انہیں پتا تک نہیں چلا لیکن وہ چیز، ان کے ہونے والے بچوں پر خوفناک اثر چھوڑ گئی۔ بہرحال اچھی بات یہ ہوئی کہ ایسے بچے صرف دسمبر 1968ء کے دوران پیدا ہوئے اور ان میں سے زیادہ تر کمسنی میں ہی یا پیدائش کے چند دنوں بعد ہی دم توڑ گئے۔ یہ شاید ان کے والدین کے حق میں اچھا ہی ہوا۔“

”ان عجیب الخلقت بچوں میں سے زیادہ تر مر گئے ہوں گے لیکن سارے کے سارے بہرحال نہیں مرے تھے۔“ ہیریسن نے پُرخیال لہجے میں کہا۔

”ہاں لیکن کارلا شاید اب تک مر چکی ہو۔“ ہال نے خیال ظاہر کیا۔ ”عین ممکن ہے اس کا ڈھانچا کسی قریبی جنگل میں پڑا ہو۔“

”ہوسکتا ہے۔“ ہیریسن نے گویا محض اس کا دل رکھنے کے لیے کہا۔ وہ خود اس مفروضے کا سہارا لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ رخصت ہونے سے پہلے اس نے ہال سے، اسی کے دفتر میں اس کیس کے کاغذات کی فوٹو کاپی کرالی۔

☆☆☆

جینی سوگئی ہے۔ میں باتھ ٹب کے قریب لگے ہوئے آئینے کے سامنے کھڑی ہوں۔ ہمارے گھر میں بس یہی ایک آئینہ ہے۔ مجھے آئینے بالکل پسند نہیں ہیں۔ میں تو شاید یہ ایک بھی نہ رکھتی لیکن بھی کبھی آئینے میں خود کو دیکھنے کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ جینی کو تو آئینے کی ضرورت ہی نہیں۔ اس بے چاری کو نظر ہی نہیں آتا۔ میں آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتی ہوں تو مجھے خود بھی بہت بُرا لگتا ہے۔ کیسا ڈراؤنا چہرہ ہے میرا...... چہرے پر بال بھی ہیں۔ بال تو خیر پورے جسم پر ہی ہیں۔ منہ میں گویا دانت ہی دانت بھرے پڑے ہیں۔ نکیلے اور مضبوط دانت، جو خاصے خوفناک لگتے ہیں۔

اسی لیے میں دن کی روشنی میں باہر نہیں جاتی۔ اندھیرا پھیلنے پر باہر نکلتی بھی ہوں تو میرے چہرے کا زیادہ حصہ اسکارف میں چھپا ہوتا ہے۔ بس آنکھیں اور تھوڑی سی پیشانی نظر آتی ہے۔ جسم پر ڈھیلا ڈھالا اوور کوٹ ہوتا ہے جو میرے جسم کے ڈراؤنے پن کو بھی چھپا لیتا ہے۔ میرے بازو لمبے اور سوکھے ہیں۔ مگر ان میں بڑی طاقت ہے۔ میرے ہاتھ، ہاتھوں سے زیادہ پنجے دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں بھی بڑی طاقت ہے۔ عام طور پر لوگ مجھے کم روشنی میں ہی دیکھتے ہیں۔ وہ مجھے مرد ہی سمجھتے ہیں۔ اچھا ہوا ہیریسن بھی فون پر مجھے مرد سمجھا تھا۔ وہ مجھے مرد ہی سمجھتا ہے تو اچھا ہے۔

میں نے آج تک اپنی جیسی کوئی دوسری لڑکی نہیں دیکھی۔ زیادہ تر لڑکیوں کے چہرے اچھے ہی ہوتے ہیں۔ بعض تو بہت ہی خوب صورت ہوتی ہیں۔ مجھے ان کو دیکھ کر بہت غصہ آتا ہے۔ بہت نفرت محسوس ہوتی ہے۔ مجھے ان لوگوں پر بھی بہت غصہ آتا ہے جو اگر میرے چہرے کی ذرا سی جھلک بھی دیکھ لیتے ہیں تو ان کے چہرے پر نفرت یا دہشت نظر آنے لگتی ہے۔ یہ نفرت اور دہشت مجھے بہت بُری لگتی ہے۔ مجھے اپنا گھر یاد آجاتا ہے۔ وہاں بھی مجھے دیکھ کر ہر ایک کے چہرے پر نفرت اور دہشت نظر آنے لگتی تھی۔ اسی لیے مجھے اپنے گھر سے بھی نفرت تھی۔

میں اپنے گھر کو یاد کرنا نہیں چاہتی لیکن نہ جانے کیوں وہ مجھے یاد آجاتا ہے۔ یادیں خود بہ خود دماغ میں گھس جاتی ہیں۔ انہیں نکالنے کی کوشش بھی کرو، تو نکلتی نہیں ہیں۔ میری بہن، ممی کی طرح خوب صورت تھی۔ بھائی شکل صورت میں ڈیڈی پر گیا تھا۔ میں پتا نہیں کس پر چلی گئی۔ میری پیدائش کے بعد ڈیڈی گھر سے چلے گئے تھے۔ پھر کبھی واپس نہیں آئے۔ پتا نہیں میرے ہاتھ، میرے بازو، میرا چہرہ کس پر گیا ہے۔

گھر یاد آتا ہے تو مجھے وہ تہ خانہ بھی یاد آجاتا ہے جہاں مجھے زنجیر سے باندھ کر رکھا جاتا تھا۔ مجھے اپنے گھر سے نفرت تھی لیکن تہ خانے سے تو بہت ہی زیادہ نفرت تھی۔ میں زنجیر کو پوری طاقت سے کھینچتی رہتی تھی لیکن وہ ٹوٹتی نہیں تھی۔ حالانکہ میں بہت طاقتور ہوں بچپن سے ہی طاقتور ہوں۔ تہ خانے میں میرے پاس شروع میں بہت سی چیزیں رکھی گئی تھیں۔ ٹی وی بھی رکھا گیا تھا۔ میں نے سب چیزیں توڑ دی تھیں۔ میں تہ خانے میں نہیں رہنا چاہتی تھی۔ زنجیر میں بندھ کر رہنا نہیں چاہتی تھی۔ میں تو باہر جا کر لان میں، میدان میں، پارک میں جا کر بچوں کے ساتھ کھیلنا چاہتی تھی۔ کوئی مجھے جانے ہی نہیں دیتا تھا۔ میں سب کی منت

کرتی تھی۔

ایک روز جب میری بہن اور ممی کہیں گئی ہوئی تھیں تو میرا بھائی اپنے اسکول کے ساتھیوں کو لے کر تہ خانے کی بڑی سی، روشن دان نما کھڑکی پر آگیا۔ مجھے دیکھ کر پہلے تو ان لڑکوں کے چہروں پر بھی خوف نظر آنے لگا۔ ان کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ان کے چہروں پر وہی تاثرات آگئے تھے جن سے مجھے نفرت تھی۔ مگر پھر وہ تھوڑی دیر کے لیے کہیں چلے گئے۔ دوبارہ آئے تو ان کے پاس لمبی لمبی چھڑیاں اور پتھر تھے۔ وہ مجھے پتھر مارنے لگے۔ پھر میرا بھائی ایک چھڑی دور سے میرے جسم میں چبھونے لگا۔ پیٹ میں، گردن میں، ہر جگہ۔ میں اس چھڑی سے زخمی تو نہیں ہو رہی تھی لیکن میرے اندر بہت تکلیف ہو رہی تھی۔ زنجیر میں بندھی ہونے کی وجہ سے زیادہ دور نہیں جا سکتی تھی۔ چھڑی مجھ تک پہنچ جاتی تھی۔ پتھروں سے بھی مجھے بہت چوٹیں لگی تھیں۔ خون نہیں نکلا تھا لیکن بہت تکلیف ہوئی تھی۔ میں رو رہی تھی لیکن مجھے روتے دیکھ کر سب لڑکے اور زیادہ ہنس رہے تھے۔ میرا بھائی بھی ہنس رہا تھا۔

انہیں بہت اچھا مشغلہ مل گیا۔ اب تو جب بھی ممی اور بہن کہیں باہر جاتیں، بھائی اپنے دوستوں کو لے کر آجاتا۔ وہ مجھے چھڑیاں چبھوتے۔ مجھے روتے اور تڑپتے دیکھ کر ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ مجھے دوسرے لڑکوں سے زیادہ غصہ اپنے بھائی ٹامی پر آتا تھا جو انہیں ساتھ لاتا تھا۔

میں چونکہ اپنی زنجیر توڑنے کی کوششیں کرتی رہتی تھی اس لیے شاید وہ کہیں سے کمزور ہو گئی تھی۔ ایک روز آخر کار زنجیر ٹوٹ ہی گئی۔ کھڑکی میں اس زمانے میں سلاخیں لگی ہوئی تھیں لیکن وہ زیادہ مضبوط نہیں تھیں۔ میں نے انہیں فریم سمیت اکھاڑ لیا۔ باہر نکل کر میں نے فریم کو سلاخوں سمیت دوبارہ کھڑکی میں پھنسا دیا۔ ممی اور سسٹر گھر پر تھیں۔ میرا بھائی ٹامی بھی گھر پر تھا۔ میں نے ان سب کی آوازیں سنی تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ ٹامی مجھے تنگ کرنے اور اذیت پہنچانے کے لیے تہ خانے کی کھڑکی پر ضرور آئے گا۔ وہ اپنے اس مشغلے کے لیے صرف دوستوں کے ساتھ ہی نہیں آتا تھا بلکہ اکیلا بھی آجاتا تھا۔

میں ایک دیوار کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گئی۔ میری امید پوری ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد ہی ٹامی آتا دکھائی دیا۔ وہی لمبی چھڑی اس کے ہاتھ میں تھی جسے میرے جسم میں چبھو کر وہ لطف اندوز ہوتا تھا۔ کھڑکی سے جھانک کر، اور مجھے تہ خانے میں موجود نہ پا کر وہ حیران رہ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اِدھر اُدھر دیکھتا، میں نے پیچھے سے آکر اس کی گردن پکڑ لی۔ میں نے اس کا نرخرہ اُدھیڑ ڈالا۔ وہ مجھے میرے جسم کے اندر تک اذیت دیتا تھا۔ میں نے بھی اسے اندر تک اذیت دینے کے لیے اس کا پیٹ پھاڑ ڈالا۔ اس کے لیے میرے پنجے ہی کافی تھے۔ میں نے اس کی آنتیں وغیرہ کھینچ کر باہر نکال دیں۔ ہر طرف خون ہی خون پھیل گیا۔

ممی اور سسٹر بھی اُس وقت نہ جانے کیسے وہاں پہنچ گئیں۔ وہ بُری طرح چیخنے لگیں۔ ان کے چہروں پر دہشت کے وہی تاثرات تھے جن سے مجھے نفرت ہے۔ میں وہاں سے بھاگ گئی اور بہت عرصے تک بھاگتی ہی رہی۔ اِدھر اُدھر چھپتی رہی۔ مگر مجھے کسی کی مدد کے بغیر زندہ رہنا آگیا۔ پھر مجھے جینی مل گئی۔ وہ نابینا تھی۔ سخت مشکل میں تھی۔ لوگ اس کی مدد کرنے کے بجائے اسے تنگ کرتے تھے۔ میں نے اس کی مدد کی۔ وہ مجھے اپنے گھر لے آئی۔ اس کے پاس ایک بلڈنگ کی بیسمنٹ میں دو کمروں کا گھر تھا۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ رکھ لیا۔ ہم ایک دوسرے کی ضرورت بن گئے۔

میں اس کا ہر کام کرنے لگی۔ وہ بھی کچھ عجیب سی ہے لیکن مجھ جتنی عجیب نہیں۔ اس کی سب سے اچھی بات یہ ہے کہ میں اس کے سامنے ہوتی ہوں تب بھی اس کے چہرے پر دہشت کے آثار ظاہر نہیں ہوتے۔ شاید اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ دیکھ ہی نہیں سکتی۔ وہ تو اندھی ہے۔ اب تو وہ تقریباً ہر کام کے سلسلے میں میری ہی محتاج ہے۔ وہ زیادہ تر لیٹی رہتی ہے۔ اس وقت بھی وہ لیٹی ہوئی ہے۔ میں باتھ روم میں آئینے کے سامنے کھڑی ہوں۔ مجھے کل رات کا منظر یاد آرہا ہے جب میں نے اپنے آبائی مکان کو آگ لگائی تھی۔

وہی مکان جہاں مجھے تہ خانے میں زنجیر سے باندھ کر رکھا جاتا تھا اور میرا بھائی تامس عرف ٹامی اپنے دوستوں کے ساتھ مجھے اذیتیں دینے آتا تھا۔ مجھے پتھر مارنا اور چھڑیاں چبھونا ان کی تفریح تھی۔ کتنا خوش ہوتے تھے وہ۔ قہقہے لگاتے تھے۔ اس مکان کو آگ لگاتے وقت مجھے بڑی خوشی ہوئی تھی۔ مجھے اس مکان سے نفرت تھی مگر اس وقت نہ جانے کیوں مجھے رونا آرہا ہے۔ مجھے خاموشی سے رونا چاہیے۔ کہیں میری سسکیوں کی آواز جینی تک نہ پہنچ جائے۔ وہ سو رہی ہے۔ اس کی آنکھ کھل جائے گی۔ وہ ڈسٹرب ہو گی۔

☆☆☆

”تمہارا مطلب ہے کہ ”چہرہ چور قاتل“ دراصل بیس اکیس سال کی ایک لڑکی ہے؟“ ہیریسن کی بیوی مارتھا نے

حیرت اور بے یقینی سے کہا۔

''وہ کوئی عام لڑکی نہیں ہے۔ عجیب الخلقت ہے۔ اتنی عجیب کہ اسے انسانوں میں شمار کرنا بھی مشکل معلوم ہوتا ہے۔ تعلیم بالکل حاصل نہیں کر سکی۔ اوپر سے ذہنی طور پر پسماندہ اور ایب نارمل بھی ہے۔'' ہیریسن کا لہجہ متاسفانہ تھا۔

وہ کیپٹن ہال سے ملنے کے بعد بھی اندرون شہر نہیں گیا تھا اور موٹر وے میں ہی رہا تھا۔ ٹاؤن ہال سے وہ گھر ہی آ گیا تھا۔ اس کا گھر ٹاؤن ہال سے بمشکل ایک میل کے فاصلے پر تھا۔ اسے معلوم تھا کہ بچے اس وقت اسکول گئے ہوں گے۔ وہ اکیلے میں مارتھا سے اس موضوع پر بات کرنا چاہتا تھا۔ اپنے ساتھی جیکب سے اس سلسلے میں بات کرنا فضول تھا۔ وہ ایک سخت دل اور بے حس آدمی تھا۔ اس کا ذہن اس معاملے کے حساس پہلوؤں تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ مارتھا ایک ذہین اور حساس عورت تھی۔ وہ خالص انسانی نقطہ نظر سے بھی اس معاملے کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لے سکتی تھی۔ اس سے بات کر کے ہیریسن کو اپنے دل کا بوجھ بھی کچھ ہلکا کرنا تھا۔ کیپٹن ہال سے مل کر اسے جو معلومات حاصل ہوئی تھیں، انہوں نے اس کے ذہن کے تاریک گوشوں میں موجود کچھ پرانی اور تکلیف دہ یادوں کو تازہ کر دیا تھا۔

''تمہارا مطلب ہے کہ وہ کوئی عفریت نما مخلوق ہے؟'' مارتھا نے تصدیق چاہی۔

''پیدائشی طور پر تو وہ شاید صرف ظاہری طور پر عفریت نما ہو لیکن بعد میں لوگوں نے...... جن میں شاید اس کے اپنے گھر والے بھی شامل تھے۔ اسے اندر سے بھی عفریت بنا دیا۔ وہ تو خیر جیسی بھی ہے، اپنی جگہ ہے، لیکن میں تم سے کچھ اسی قسم کی ایک اور بچی کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔ اس کا نام این تھا۔'' ہیریسن کے لہجے میں دکھ جھلک آیا۔

مارتھا نے بے اختیار ایک گہری سانس لی اور دھیمے لہجے میں کہا۔ ''تمہاری وہ بہن جس کا تم نے کل تذکرہ کیا تھا؟''

ہیریسن نے اثبات میں سر ہلایا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ تذکرہ اسے تکلیف دے گا۔ اسے اندر ہی اندر اپنے دل سے لہو رستا محسوس ہوگا لیکن اس کے دل پر ایک قسم کا بوجھ بھی تھا جو اسے اتارنا تھا۔ اس نے کبھی کسی سے اپنی اس بہن کے بارے میں بات نہیں کی تھی۔

''وہ دسمبر 1968ء میں پیدا ہوئی تھی۔'' اس نے نہایت دھیمے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ''میں اس وقت نو سال کا تھا۔ این کی تاریخ پیدائش کارلا بیکر کی تاریخ پیدائش سے ایک ہفتے بعد کی ہے۔ اس کا وزن سات پونڈ سے کچھ زیادہ تھا۔ اسے دیکھ کر خوف آتا تھا۔ وہ انسان کے بچے کے بجائے بڑی سی ایک مکڑی معلوم ہوتی تھی لیکن اس میں کچھ جھلک مچھلی کی بھی تھی۔''

اپنی بہن کا سراپا اس کے ذہن کے نہاں خانوں میں اب بھی محفوظ تھا کیونکہ اس نے بچپن میں گھنٹوں، بہت قریب سے اس کا جائزہ لیا تھا۔ اس کا، بچپن کا معصوم ذہن حیرت سے سوچا کرتا تھا کہ اس کی بہن ایسی کیوں پیدا ہوئی ہے۔ اس کی والدہ خوب صورت تھیں۔ والد بھی ہینڈسم تھے۔ خود ہیریسن بھی ٹھیک ٹھاک تھا۔ پھر وہ عجیب و غریب مخلوق کہاں سے آ گئی تھی۔ صرف اس کی آنکھیں کافی حد تک انسان کی آنکھیں معلوم ہوتی تھیں۔ اس کا باقی سارا وجود ڈراؤنا تھا۔ دانت بہت سارے تھے اور نکیلے تھے۔ ان کے اوپر ہونٹ نہیں تھے۔ ناک چپٹی تھی۔ پیشانی ڈھلوان تھی۔ ہاتھ اور پاؤں چمگادڑ کے پروں سے مشابہ تھے۔ جسم پھولا پھولا اور جلد کچھ ایسے رنگ کی تھی جو سرمئی اور جامنی امتزاج معلوم ہوتا تھا۔ یہ رنگ چمکیلا بھی تھا۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ اس کی جلد کا رنگ اس کے خون کے رنگ کی وجہ سے ایسا تھا اور خون کا رنگ اس لیے مختلف تھا کہ اس کے دل میں کوئی خرابی تھی۔ نو سالہ ہیریسن کو اس سے کراہت محسوس ہوتی تھی تاہم وہ اپنے والدین کے سامنے اس کراہت کا اظہار نہیں کرتا تھا۔

چند لمحے بعد اس نے سلسلۂ کلام جوڑا۔ ''ڈاکٹرز نے کہا تھا کہ وہ زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہے گی۔ شاید ایک دو مہینے میں ہی مر جائے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ این زندہ رہی۔ دو سال گزر گئے۔ میرے والد اور ڈاکٹر چاہتے تھے کہ اسے یتیم خانہ ٹائپ کے کسی ادارے میں داخل کرا دیا جائے لیکن والدہ نہیں مانیں۔ وہ اسی طرح لاڈ پیار سے اس کی پرورش کر رہی تھیں جس طرح عموماً زیادہ تر مائیں اپنے نارمل بچوں کی کرتی ہیں۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا جیسے وہ این کے ساتھ اس سے بھی زیادہ محبت کرتی ہیں، جتنی مجھ سے کرتی تھیں۔'' اس کے لہجے میں یاسیت سی آ گئی۔

وہ چند لمحے خاموش رہا تو مارتھا نے یوں اس کا ہاتھ تھپتھپایا جیسے بات جاری رکھنے کے لیے اسے حوصلہ دے رہی ہو۔

''وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مما کی این کے ساتھ

محبت کم ہونے کے بجائے بڑھتی چلی گئی۔'' ہیریسن افسردہ سی مسکراہٹ کے ساتھ مارتھا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''ایسا لگتا تھا جیسے ان کی زندگی میں این کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔ مجھے تو وہ گویا بھول ہی گئی تھیں۔ انہوں نے این کی وجہ سے کسی بھی قسم کی سیر و تفریح کے لیے جانا چھوڑ دیا تھا۔ وہ کچھ دیر کے لیے بھی این کو گھر پر اکیلی چھوڑنا نہیں چاہتی تھیں۔ اگر ڈیڈی کبھی کبھار ضد کر کے انہیں اپنے ساتھ سینما لے جاتے تو مجھے گھر پر رہنا پڑتا اور این کی دیکھ بھال کا فریضہ انجام دینا پڑتا کیونکہ اس سلسلے میں وہ کسی بے بی سٹر پر بھی بھروسا کرنے کے لیے تیار نہیں تھیں۔ اسے لوگوں کی نظروں سے چھپا کر پچھلے بیڈروم میں رکھا جاتا تھا لیکن گھر کی اہم ترین اور مرکزی شخصیت گویا وہی تھی۔ مجھے گویا مما نے بالکل نظرانداز کر دیا تھا۔ شاید اسی لیے کچھ عرصے بعد میں این سے نفرت کرنے لگا تھا۔''

''ہیریسن ڈیئر! تمہیں یہ سب کچھ......'' مارتھا نرم لہجے میں بولی۔ شاید وہ کہنا چاہتی تھی کہ ہیریسن کو یہ ساری باتیں کرنے اور اپنے دل کے زخم کریدنے کی ضرورت نہیں تھی لیکن ہیریسن اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

''میں نے کسی سے یہ ساری باتیں نہیں کیں لیکن آج میں تمہیں سب کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ میرے دل پر بوجھ سا ہے۔ جب میں چودہ سال کا ہوا تو مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے میں پاگل ہو جاؤں گا۔ یہ تقریباً وہی عمر تھی جس عمر میں نامی بیکر اپنی عجیب الخلقت بہن کے ہاتھوں قتل ہوا۔ اس نے تو گویا خود ہی اپنی موت کو دعوت دی تھی۔ میرا معاملہ ذرا مختلف تھا۔ این کو دیکھ دیکھ کر اور مما کی اس کے ساتھ والہانہ محبت دیکھ کر میری ذہنی حالت عجیب رہنے لگی۔'' وہ دیوار کی طرف یوں دیکھ رہا تھا جیسے اس پر ماضی کی فلم چل رہی ہو۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اس کی آواز گویا کہیں دور سے آئی۔ ''میں پہلے اسکول کے ہر ٹیسٹ میں اے گریڈ لیا کرتا تھا۔ میرا بی گریڈ آنے لگا لیکن مما نے اس تبدیلی کو محسوس تک نہیں کیا۔ ان کی اب میری طرف توجہ ہی نہیں تھی۔ اسپورٹس میں البتہ میں ابھی تک اچھا تھا۔ میں دوسرے اسکولوں کی ٹیموں کے ساتھ باسکٹ بال کے مقابلوں میں انعامی کپ جیت کر آتا تو مما اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی بھی زحمت نہ کرتیں۔ البتہ این، جو پانچ سال کی ہو چکی تھی، گھٹنوں کے بل دو قدم چلنے یا لڑھکنے میں بھی کامیاب ہو جاتی تو وہ اس طرح خوشی سے تمتماتے چہرے کے ساتھ، نہایت جوش و خروش سے مجھے اور ڈیڈی کو بتاتیں جیسے این نے کوئی قلعہ فتح کر لیا ہو۔''

ایک لمحے کے لیے خاموش ہو کر اس نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ مارتھا کی طرف دیکھا۔ مارتھا نے ایک بار پھر اس کا ہاتھ تھپتھپایا۔ ''یقین مانو مارتھا...... پانچ سال تک این کی دیکھ بھال کرنے کے دوران ہمارا گھر کباڑ خانہ دکھائی دیکھنے لگا تھا لیکن کسی کو گویا اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی۔ اب میں سوچتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ اس ساری صورتِ حال کی اصل ذمے دار مما تھیں لیکن اس وقت میں صرف چودہ سال کا تھا۔ تقریباً بچہ ہی تھا۔ ظاہر ہے، اس وقت میرے سوچنے کا انداز بالکل مختلف تھا۔ اس وقت مجھے ان سب چیزوں کی ذمے دار این دکھائی دیتی تھی۔ آخر وہ پیدا ہی کیوں ہوئی تھی؟ نہ وہ پیدا ہوتی اور نہ مما میں، یا گھر کی حالت میں یہ سب تبدیلیاں آتیں۔ مجھے اس بات پر بھی غصہ آتا اور شدید نفرت محسوس ہوتی کہ اگر وہ پیدا ہو ہی گئی تھی تو عجیب الخلقت کیوں تھی؟''

وہ ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔ وہ اب اس قصے کے مشکل حصے کی طرف جا رہا تھا۔ وہ الفاظ کا انتخاب نہایت احتیاط سے کرنا چاہتا تھا۔ ''ایک رات ڈیڈی تقریباً زبردستی مما کو اپنے ساتھ اس کمپنی کے ایک ڈنر میں لے گئے جس میں وہ ملازمت کرتے تھے۔ ظاہر ہے، ان کی عدم موجودگی میں این کے لیے ایک بے بی سٹر کے فرائض مجھے انجام دینا تھے۔ مما نے اس کے لیے مجھے بیسیوں ہدایات دیں۔ یہ بھی کہا کہ میں اسے بچوں کی کہانیاں پڑھ کر سناؤں اور اس کے پاس سے ایک لمحے کے لیے بھی نہ ہٹوں۔ ظاہر ہے، میں اس قسم کی ہدایات پر بالکل عمل نہیں کرتا تھا۔ این زیادہ تر چت لیٹی رہتی تھی۔ میں اسے اسی طرح لیٹا رہنے دیتا تھا اور اس کے پاس نہیں بیٹھتا تھا۔ اس کے کمرے میں چھوٹا سا بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی موجود تھا۔ میں وہ آن کر کے خود لاؤنج میں آ بیٹھتا اور بڑے ٹی وی پر اپنی پسند کے پروگرام دیکھتا رہتا۔ تاہم اس رات مما اور ڈیڈی کے جانے کے بعد دوبارہ این کے کمرے میں گیا۔''

اس رات کے مناظر جنہیں اس نے ذہن کے تاریک گوشوں میں دھکیلا ہوا تھا، واضح ہو کر یادوں کے اُفق پر ابھرنے لگے۔ وہ دوبارہ این کے کمرے میں پہنچا تو وہ اسی طرح چت لیٹی ہوئی تھی جس طرح وہ مما اور ڈیڈی کے جانے کے بعد اسے چھوڑ کر گیا تھا۔ اس کا بدنما جسم تھوڑی تک کمبل میں چھپا ہوا تھا۔ اب وہ تقریباً تین فٹ لمبی ہو چکی تھی۔ وہ سردیوں کے دن تھے اور مما اسے گرم کپڑے پہنا

ناظرین! یہ ہے آج کے مقابلے کا بے داغ فاتح

کر گئی تھیں۔ اس کے سر پر، صرف پچھلے آدھے حصے پر روکھے پھیکے اور کھردرے سے بال تھے جو اَب کچھ لمبے ہو چکے تھے۔ ممانے بہت اچھی طرح ان بالوں کی دو چٹیاں بنا کر ان میں ربن بھی باندھے ہوئے تھے۔

ہیریسن کو یاد تھا کہ جب وہ این کے کمرے میں داخل ہوا تھا تو اسے دیکھ کر این کی آنکھوں میں چمک سی آ گئی تھی۔ شاید وہ اسے دیکھ کر خوش ہوتی تھی۔ وہ بول نہیں سکتی تھی اور نہ ہی اس کے چہرے سے تاثرات کا اظہار ہوتا تھا۔ شاید چہرے کی ساخت ایسی تھی کہ اس پر تاثرات آ ہی نہیں سکتے تھے۔ اس کے بازو بھی عجیب انداز میں حرکت کرتے تھے۔ صرف اس کی آنکھوں سے کسی حد تک تاثرات کا اظہار ہوتا تھا لیکن انہیں سمجھنا بھی آسان نہیں تھا۔ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ اس کے پاس دماغ موجود تھا یا نہیں، اور اگر موجود تھا تو وہ کس حد تک کام کرتا تھا۔ کسی کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ این کے اردگرد جو کچھ ہوتا تھا، وہ اسے سمجھتی بھی تھی یا نہیں؟ ہیریسن کی ممی کا دعویٰ تھا کہ این ذہین تھی لیکن ہیریسن کا خیال تھا کہ این کے معاملے میں اس کی ممی ایک قسم کے پاگل پن کا شکار تھیں۔

ہیریسن نے مارتھا کو مزید بتانا شروع کیا۔ ''مجھے اس بات کی پروا نہیں تھی کہ این مجھے دیکھ کر خوش ہوئی تھی یا نہیں۔ مجھے تو اس وقت اس پر شدید غصہ آرہا تھا۔ میں نے اس کے قریب کھڑے ہو کر اس پر بُری طرح چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ شاید وہ میرے تاثرات دیکھ کر اور میری غصیلی آواز سن کر کسمسائی۔ میں اس وقت اسے گالیاں تک دے رہا تھا اور جتنے بھی بدترین الفاظ مجھے آتے تھے، وہ اس کے لیے استعمال کر رہا تھا۔ صرف یہی نہیں، میں ہر بُرے لفظ کے ساتھ ساتھ اس کے جسم میں انگلیاں بھی چبھو رہا تھا۔ انگلیاں میں اس طرح چبھو رہا تھا کہ اسے اذیت تو خوب ہو، لیکن کہیں کوئی نشان نہ پڑنے پائے۔ میں اپنے دل کی بھڑاس تو خوب نکال رہا تھا لیکن اتنی عقل مجھ میں تھی کہ میری حرکتوں کا کسی کو پتا نہ چلے۔'' اس وقت کو یاد کرتے ہوئے، ہیریسن کے چہرے پر اب دکھ اور پچھتاوا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اس کی آواز گویا حلق میں اٹک گئی۔ مارتھا نے قریب ہو کر خاموشی سے اس کا کندھا تھپتھپایا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ ہیریسن کی اندرونی کیفیت کو اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولا۔ ''اسے بدترین القابات سے پکارتے ہوئے میں پوری شدت کے ساتھ اپنی نفرت کا اظہار کرتے ہوئے یہ بھی کہہ رہا تھا کہ آخر وہ پیدا ہی کیوں ہوئی تھی، وہ مر کیوں نہیں جاتی، گھر کا ہر فرد چاہتا ہے کہ تم مر جاؤ، کاش تم پیدا ہوتے ہی مر گئی ہوتیں، تم صرف سرکس میں رکھے جانے کے قابل ہو، چلو اگر پیدا ہوتے ہی نہیں مری تھیں تو اب مر جاؤ، کیوں عذاب کی طرح ہمارے سروں پر نازل ہو گئی ہو۔ اسی طرح کی چیخ و پکار کرتے کرتے آخر کار میں تھک کر خاموش ہو گیا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میری اس ساری چیخ و پکار کے دوران وہ اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے، حیرت اور بے یقینی سے مسلسل میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں بتا چکا ہوں کہ اس کے سارے وجود میں صرف آنکھیں ہی کافی حد تک انسانی آنکھیں معلوم

ہوتی تھیں۔ پھر ان آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ میری باتیں سمجھ رہی تھی۔ میں خاموش ہوا تو اس نے کروٹ لے لی اور دیوار کی طرف منہ کر لیا۔ وہ آسانی سے صرف کروٹ لینے پر قادر تھی۔ جب اس نے دیوار کی طرف منہ کر لیا تو میں اس کے کمرے سے باہر بھاگ آیا اور اپنے کمرے میں جا کر بیڈ پر گر گیا۔'' وہ ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔ اس نے قدرے بے بسی آمیز انداز میں مارتھا کی طرف دیکھا۔ مارتھا کی آنکھوں میں بدستور اس کے لیے ہمدردی تھی۔

''کیا تم نے محسوس کیا کہ تمہارے دل کی بھڑاس نکل گئی تھی؟'' مارتھا نے نرمی سے دریافت کیا۔ ''کیا تم نے خود کو ہلکا پھلکا محسوس کیا تھا؟''

''میرا خیال تھا کہ ایسا ہی ہوگا مگر ایسا نہیں ہوا۔'' ہیریسن کراہنے کے سے انداز میں بولا۔ ''اس کے بالکل الٹ ہوا۔ اپنے بستر پر گر کر میں بھی رونے لگا۔ ایک عجیب قسم کے پچھتاوے...... بلکہ احساسِ جرم نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔ میرے سینے پر گویا کسی نے کوئی بھاری پتھر رکھ دیا۔ این کی بڑی بڑی، آنسو بھری آنکھیں بار بار میرے تصور میں ابھرتی رہیں۔ میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ دوسرے روز جیسے ہی مجھے اکیلے میں اس کے پاس جانے کا موقع ملے گا تو میں اس سے معذرت کروں گا، اسے بتاؤں گا کہ میں نے محض غصے میں وہ ساری بکواس کی تھی اور وہ غصہ کسی اور بات پر تھا، میں نے کہیں اور کا غصہ اس پر نکال کر حماقت کی تھی اور میں اپنی اس حماقت پر شرمندہ تھا۔ آئندہ میں اسے کہانیاں بھی پڑھ کر سنایا کروں گا۔ یہی سب کچھ سوچتے سوچتے نہ جانے کس وقت میں سو گیا۔''

''این نے یقیناً تمہیں معاف کر دیا ہوگا؟'' مارتھا نے خیال ظاہر کیا۔

''مجھے اس سے معافی مانگنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ دوسرے روز صبح امی کے چیخنے کی آوازوں سے میری آنکھ کھلی۔ وہ روتے اور چلاتے ہوئے کہہ رہی تھیں کہ این مر چکی ہے۔ وہ اور ڈیڈی رات گئے ڈنر سے واپس آئے تھے تو این کے کمرے میں جھانک کر ممی نے دیکھا کہ وہ دیوار کی طرف منہ کیے لیٹی تھی۔ ممی یہی سمجھیں کہ وہ سو رہی ہے، لیکن صبح انہوں نے جا کر اسے جگانے کی کوشش کی تو پتا چلا کہ وہ مر چکی ہے۔''

''اوہ میرے خدا......'' مارتھا کے منہ سے نکلا۔ وہ اب ہیریسن کا بازو تھامے ہوئے تھی اور بازو پر اس کی گرفت شاید غیر ارادی طور پر سخت ہو گئی تھی۔

''ظاہر ہے، میں نے اپنے آپ کو اس کی موت کا ذمے دار محسوس کیا۔'' ہیریسن نے بوجھل لہجے میں کہا۔ ''یہ پچھتاوے، یا پھر شاید احساسِ جرم کا وہ بھاری پتھر ہے جو اس وقت سے ہی میرے دل پر رکھا ہوا ہے۔ این کی موت کے بعد سے میں اسی بوجھ کے ساتھ زندگی گزار رہا ہوں لیکن اب تک یہ میری زندگی کا ایک راز ہی رہا ہے۔ آج تک میں نے کسی کو اس راز میں شریک نہیں کیا تھا۔''

''تم نے بتایا تھا کہ اس کا دل بہت کمزور تھا۔'' مارتھا نے گویا این کی موت کی ذمے داری اس کے کمزور دل پر ڈالتے ہوئے ہیریسن کا پچھتاوا کم کرنے کی کوشش کی۔

''ہاں، پوسٹ مارٹم سے بھی ظاہر ہوا کہ اس کا دل جواب دے گیا تھا۔'' ہیریسن کے لہجے میں پچھتاوا اور افسردگی برقرار تھی۔ ''اس کی زندگی کی کمزوری ڈور ممی کی محبت سے بندھی ہوئی تھی۔ میرے بارے میں بھی شاید اسے اندازہ نہیں تھا کہ میں اس سے اتنی نفرت کرتا ہوں۔ میری طرف سے اچانک اتنی زیادہ نفرت کے اظہار نے اس کی زندگی کی ڈور توڑ دی۔ اس کا کمزور دل جواب دے گیا۔ مجھے معلوم ہے کہ میرا یہ خیال جذباتیت کی پیداوار معلوم ہوتا ہے لیکن میں بہرحال کبھی اس سے پیچھا نہیں چھڑا سکا۔ وہ موت کی کھائی کے کنارے پر کھڑی تھی۔ میری نفرت نے اسے اس کھائی میں دھکا دے دیا۔''

''تمہیں ایسا نہیں سوچنا چاہیے۔'' مارتھا لفظوں پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ''تم یا کوئی اور اس کی موت کا ذمے دار نہیں تھا۔ اس کی موت یقیناً طبعی تھی۔ یہ محض ایک اتفاق تھا کہ اسی رات تم اپنے غصے کا اظہار کر بیٹھے تھے۔''

''میں نے بھی بارہا اپنے آپ کو یہی سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ اگر میں اس رات اس پر اتنی چیخ پکار نہ کرتا، تب بھی شاید اس رات اسے مرنا ہی تھا لیکن دل اس دلیل کو قبول ہی نہیں کرتا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سینے پر بوجھ کم ہونے کے بجائے بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ کبھی کبھی تو میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ یہ احساس میرا پیچھا نہیں چھوڑتا کہ اس دنیا سے آخری یاد وہ یہی ساتھ لے کر گئی ہوگی کہ اس کا بھائی کس طرح اس کے سرہانے کھڑا ہو کر، گلا پھاڑ کر اپنی نفرت کا اظہار کر رہا تھا جبکہ وہ شاید اس خوش فہمی اور خوش گمانی میں مبتلا تھی کہ اس کا دراز قد، اسمارٹ اور لائق بھائی خواہ گرمجوشی کا اظہار نہیں کرتا لیکن بہرحال، دل ہی دل میں اس سے

محبت کرتا ہے اور جب ممی گھر پر نہیں ہوتیں تو وہی اس کی حفاظت کرتا ہے، اس کا خیال رکھتا ہے۔ اس کے شاید وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ممی کی غیر موجودگی میں اگر میں اس کا تھوڑا بہت خیال رکھتا بھی تھا یا کوئی چھوٹا موٹا کام کر بھی دیتا تھا تو اس دوران بھی میں اس سے شدید نفرت ہی محسوس کر رہا ہوتا تھا۔ اس کا چھوٹا سا دماغ شاید میرے اندر چھپی ہوئی نفرت کو محسوس کرنے کے قابل ہی نہیں تھا۔''

پھر یک دم ہی گویا ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے۔ ہیریسن پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ شاید وہ آنسو تھے جنہیں وہ برسوں سے روکے ہوئے تھا۔ وہ ایک ہینڈسم اور بارعب پولیس آفیسر تھا۔ اسے خود بھی احساس تھا کہ اس کے بارے میں بھلا کون سوچ سکتا تھا کہ وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو بھی سکتا تھا۔ اس نے آج تک اپنے آپ کو اتنا بے اختیار محسوس نہیں کیا تھا۔ آنسو تھے کہ امنڈتے ہی چلے آرہے تھے۔

''مت بھولو کہ تم اُس وقت صرف چودہ سال کے تھے۔ یہ نادانی اور ناسمجھی کی عمر ہوتی ہے۔'' مارتھا نے اس کا بازو تھپتھپاتے ہوئے ایک بار پھر اسے دلاسا دینے کی کوشش کی۔

''ہاں...... مجھے معلوم ہے۔'' اس نے آنسوؤں سے بھیگی آواز میں کہا۔ ''لیکن میرا دل چاہتا ہے، ایک بار میری وہ عمر...... وہ رات لوٹ آئے۔ میں این کے سامنے خود اپنے منہ پر تھپڑ رسید کروں۔ اتنی شدید نفرت کے اظہار پر اپنے آپ کو سزا دوں۔ مجھے تو این سے معافی مانگنے، اس سے معذرت کرنے کا بھی موقع نہیں ملا۔ میں نے اس کا جتنا دل دکھایا تھا، اگر اس کی تھوڑی سی بھی تلافی کرنے کا موقع مل جاتا تو شاید میرے دل کا یہ بوجھ میرے لیے اتنا اذیت ناک نہ ہوتا......''

وہ ایک بار پھر ہچکیاں اور سسکیاں لے کر رونے لگا۔ مارتھا نے اب اپنا بازو اس کی گردن کے گرد حمائل کرلیا تھا اور اسے بچوں کی طرح پچکارتے ہوئے، تسلیاں دیتے ہوئے چپ کرانے کی کوشش کررہی تھی۔

☆☆☆

میرا پھر کسی کا نرخرہ اُدھیڑنے، کسی کے چہرے سے گوشت نوچنے کو دل چاہ رہا ہے۔ جب یہ خواہش ابھرتی ہے تو بہت تیزی سے اتنی شدید ہوجاتی ہے کہ میرے لیے اس پر قابو پانا ناممکن ہوجاتا ہے۔ مجھے سراغ رساں ہیریسن سے مدد لینی ہی پڑے گی۔ وہ میرے اس مسئلے کو سمجھ لے گا۔ میں جس طرح حسین لڑکیوں کا نرخرہ اُدھیڑ ڈالتی ہوں، ان کے چہرے کا گوشت نوچ لیتی ہوں، کھا جاتی ہوں، مجھے معلوم ہے کہ ہیریسن کو میری یہ حرکتیں پسند نہیں ہیں لیکن میں کیا کروں۔ میں بے اختیار ہوں۔ اسے میری مدد کرنی پڑے گی، لیکن ایسی مدد نہیں، کہ وہ مجھے کسی جیل میں پہنچا دے۔ میں ایک بار پھر کسی کوٹھری میں بند ہونا اور زنجیروں میں بندھنا نہیں چاہتی۔ ہرگز نہیں۔ کسی قیمت پر نہیں۔ میں اب بھی ایسا نہیں ہونے دوں گی۔

اس کے علاوہ بھی مجھے روکنے کا کوئی نہ کوئی طریقہ ہوگا۔ ضرور ہوگا۔ ہیریسن کو وہ طریقہ معلوم ہوگا۔ میرا خیال ہے، میں اسے فون کرلوں۔ اس سے پہلے کہ اندھیرا پھیل جائے، حسین چہرے سڑکوں پر نظر آنے لگیں اور مجھے خود پر اختیار نہ رہے۔ میں ہیریسن سے مدد حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ وہ مجھے روکنے کے لیے ضرور کچھ نہ کچھ کرے گا......

☆☆☆

بچوں کے اسکول سے واپس آنے تک ہیریسن نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ وہ اب خود کو بہت بہتر محسوس کررہا تھا۔ ماہرینِ نفسیات شاید ٹھیک ہی کہتے تھے کہ اپنے دکھوں اور پچھتاوؤں کے بارے میں کسی سے بات کرنے سے دل کا بوجھ ہلکا ہوجاتا ہے۔ اپنی بیوی مارتھا سے اس نے اپنے بچپن کی یادیں، خاص طور پر اپنی آنجہانی چھوٹی بہن کی باتیں پہلی بار شیئر کی تھیں اور وہ محسوس کررہا تھا کہ یہ اس نے اچھا ہی کیا تھا۔ اس کی پژمردگی دور ہوگئی تھی اور اس کے اندر گویا ایک نئی توانائی آگئی تھی۔

وہ کچھ دیر بچوں کے ساتھ کھیلتا رہا۔ پھر مارتھا کا ہاتھ بٹانے کے لیے کچن میں چلا گیا۔ مارتھا نے آج جس طرح توجہ اور ہمدردی سے اس کی باتیں سنی تھیں...... پھر جس طرح اس کی دلجوئی کی تھی اور حوصلہ بڑھایا تھا، اس کی وجہ سے وہ ہیریسن کو پہلے سے زیادہ اچھی لگنے لگی تھی۔ آج ہیریسن کے دل میں اس کی قدرومنزلت اور بڑھ گئی تھی۔

وہ کچن میں داخل ہوا تو مارتھا نے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ''اب کیسا محسوس کررہے ہو؟''

''بہت بہتر۔'' ہیریسن نے بھی مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ اس کا جواب سن کر مارتھا کے چہرے پر قدرے طمانیت آگئی۔ ہیریسن سلاد بنانے میں اس کا ہاتھ بٹانے لگا۔

''تم نے فیصلہ کرلیا ہے کہ اب تمہیں کیا کرنا ہے؟'' چند لمحے کی خاموشی کے بعد مارتھا نے دریافت کیا۔

''ہاں، میں نے سوچا ہے کہ ڈپارٹمنٹ کو تو کارلا بیکر کے بارے میں بتادوں گا لیکن اخبارات کو فی الحال اس کی

بھنک نہیں پڑنے دوں گا۔'' ہیریسن نے جواب دیا۔

''کیوں؟'' مارتھا کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں۔

''اگر وہ لڑکی اتنی ہی عجیب الخلقت ہے اور کسی نے بھی اسے دیکھا ہے، تو ہوسکتا ہے، اس کا تذکرہ اخبارات وغیرہ میں پڑھنے کے بعد وہ پولیس کے پاس پہنچ جائے اور اس کے بارے میں کوئی معلومات یا سراغ مہیا کردے۔''

''ہاں، یہ امکان تو ہے۔'' ہیریسن نے تسلیم کیا۔

''لیکن دوسری طرف ایک بہت خطرناک امکان بھی موجود ہے۔ ہوسکتا ہے اس سے ملتی جلتی شکل کی کوئی اور خاتون کسی کی نظر میں ہو۔ وہ لوگوں کو جمع کرلے اور ہجوم اس بے گناہ عورت یا لڑکی کو مار مار کر، دردناک طریقے سے قتل کر ڈالے۔ اصل مجرم، یا اس کے دھوکے میں کسی بے گناہ کا کسی ہجوم کے ہتھے چڑھ جانا بہت خطرناک ہوتا ہے اور اس کے نتائج لرزہ خیز ہوتے ہیں۔ اگر کارلا بیکر کے بارے میں اخبار والوں کو بھنک پڑ گئی تو وہ اس معاملے کو تماشا بنادیں گے جس کا انجام نہ جانے کیا ہوگا؟''

بات گویا مارتھا کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے غیر ارادی سے انداز میں اس کی تائید میں سر ہلا دیا۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد ہیریسن بولا۔ ''مجھے امید ہے کہ میں خود ہی اپنے طور پر اسے گرفتار کرنے میں کامیاب ہوجاؤں گا۔ میرا دل کہہ رہا ہے کہ وہ خود بھی گرفتار ہونا چاہتی ہے۔''

''کیا واقعی؟'' مارتھا نے بے یقینی سے پوچھا۔

''ہاں۔'' ہیریسن نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''یوں سمجھو کہ یہ بات وہ اپنے انداز میں مجھ سے کہہ چکی ہے۔ میرا خیال ہے اب وہ خود بھی خوب صورت لڑکیوں کو قتل کرنے اور ان کا چہرہ نوچ ڈالنے سے باز آنا چاہتی ہے۔''

مارتھا نے مسکراتے ہوئے قدرے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔ ''تم تو اس طرح کہہ رہے ہو جیسے تم اس کے دل کا حال جانتے ہو؟''

''مجھے کچھ کچھ ایسا ہی محسوس ہورہا ہے۔'' ہیریسن بلاتامل بولا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ خواہ کمزور درجے کا ہی سہی، لیکن میرا اس سے کسی نہ کسی حد تک ذہنی رابطہ قائم ہوگیا ہے۔ باریک سی کوئی نادیدہ تار ہے جو ہم دونوں کے ذہنوں کو جوڑتی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ یہ بھی اسی ماہ کے دوران پیدا ہوئی تھی جب این پیدا ہوئی تھی اور یہ بھی کسی ایسی پراسرار چیز کے اثرات کی وجہ سے عجیب الخلقت پیدا ہوئی تھی جس کی وجہ سے این ایب نارمل اور عجیب الخلقت پیدا ہوئی تھی۔ میری بہن اور کارلا بیکر میں یہ بات مشترک ہے۔ شاید اسی لیے کسی غیبی قوت نے خاص طور پر مجھے اس کیس کی طرف متوجہ کیا تھا اور میں نے خود آگے بڑھ کر اس میں ہاتھ ڈالا تھا۔''

اس نے ہری مرچیں کاٹ کر ایک طرف رکھیں اور پھر مشروم کاٹنے شروع کردیے۔ ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا۔ ''میں جب کارلا بیکر کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا تو اس کی ماں کو تلاش کرکے، اس سے بات چیت کرکے کوئی اندازہ قائم کرنے کی کوشش کروں گا کہ آخر 1968ء کے ایک مخصوص مہینے کے دوران حاملہ ماؤں کے ہاں ایسے ہی بچے کیوں پیدا ہوئے جو ایک دوسرے سے مختلف تو تھے لیکن سب کے سب ڈراؤنے، عجیب الخلقت اور ایب نارمل تھے۔ ایسے بچے صرف مونرو ہی کے علاقے میں، ان خواتین کے ہاں پیدا ہوئے جو یقیناً ایک ہی رات میں امید سے ہوئی تھیں۔ آخر ان پر ایسی کیا چیز اثر انداز ہوئی جو بھی کے بچے عجیب الخلقت پیدا ہوئے؟ یہ ایک معما ہے، اسے حل کرنے کی کوشش ہونی چاہیے۔''

درحقیقت ہیریسن کا یہ سارا تردد کرنے کا ارادہ اس لیے تھا کہ شاید اس کے بعد وہ این کی روح سے بہتر طور پر معافی مانگ سکے۔ وہ این سے اپنے رویے کی معذرت بھی نہیں کرسکا تھا اور وہ اس دنیا سے چلی گئی تھی۔ وہ ہیریسن کے سینے میں پچھتاوے اور ندامت کا بہت گہرا زخم چھوڑ گئی تھی۔

''لیکن کارلا جن لڑکیوں کو قتل کرتی ہے، ان کے چہرے کا گوشت کیوں اتار لیتی ہے؟'' مارتھا کی الجھن اس کی زبان پر آگئی۔

''یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم۔'' ہیریسن نے قدرے بے چارگی سے کہا۔ ''بظاہر تو وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ وہ لڑکیاں بے حد حسین ہوتی ہیں اور کارلا کا چہرہ ڈراؤنا ہے۔''

''چہرے کے گوشت کا وہ کرتی کیا ہے؟'' مارتھا نے دوسرا سوال کر ڈالا۔

''یہ بھی مجھے معلوم نہیں...... اور میں جاننا بھی نہیں چاہتا۔''

شاید مارتھا کوئی اور سوال بھی کرتی لیکن اسی دوران کچن میں موجود فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ ریسیور اٹھانے سے پہلے ہی ہیریسن کی کوئی نامعلوم حس اسے بتا رہی تھی کہ فون کس کا ہے پھر دوسری طرف سے جس انداز میں ہیلو کہا گیا، اس سے ہیریسن کے خیال کی تصدیق ہوگئی۔ اس نے کارلا بیکر کی آواز اور لہجہ پہچان لیا۔

''تم سراغ رساں ہیریسن ہو؟'' دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

''ہاں۔'' ہیریسن نے بلاتامل کہا۔ اسے اس بات پر حیرت نہیں تھی کہ کارلا نے اس کے گھر کا فون نمبر بھی معلوم کر لیا تھا۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔

فون کی تار لمبی تھی۔ ہیریسن فون کچن سے ڈائننگ روم میں لے آیا۔ محض احتیاطاً وہ نہیں چاہتا تھا کہ کارلا سے اس کی گفتگو مارتھا سنے۔

''آج رات میرے اندر کی طاقت کسی کو قتل کرنے کے لیے سخت بے چین ہے۔ مجھے اس پر قابو نہیں رہتا۔ کیا تم آج رات مجھے قتل سے روکنے کی کوشش کرو گے؟'' اس نے یہ سب کچھ عجیب سے تلفظ کے ساتھ، پہلے ہی کی طرح ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں کہا تھا۔

''تم اپنے آپ کو قانون کے حوالے کرنا چاہتی ہو؟'' ہیریسن نے نہایت نرم لہجے میں پوچھا۔

''ہاں...... ہاں۔'' دوسری طرف سے بے تابانہ اور مضطرب لہجے میں کہا گیا۔

''کیا تم پولیس اسٹیشن آکر مجھ سے ملاقات کرسکتی ہو؟ وہی پولیس اسٹیشن جہاں میرا آفس ہے؟'' ہیریسن نے دریافت کیا۔ یہ سوال کرتے وقت نہ جانے کیوں اس کی دھڑکن کچھ تیز ہوگئی۔

''نہیں۔'' یک دم کارلا کے لہجے میں بہت زیادہ چڑچڑاہٹ آگئی۔

''اچھا...... اچھا...... ٹھیک ہے۔'' ہیریسن نے جلدی سے اسے پچکارنے والے انداز میں کہا۔ وہ ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ کارلا اس پہلو کی طرف آتے آتے یک دم بدک جائے۔ ''تم جہاں چاہو، آسکتی ہو۔ جگہ کا انتخاب تم کرلو۔''

''تم اکیلے آؤ گے۔ کوئی تمہارے ساتھ نہیں ہوگا۔'' کارلا نے شاید اپنی پہلی شرط بیان کی۔

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔'' ہیریسن نے بے چون و چرا جلدی سے یہ شرط مان لی۔

''آدھی رات کو وہیں آجاؤ جہاں میں نے پچھلی مرتبہ ایک لڑکی کا چہرہ اس سے چھینا تھا۔ تم اپنے ساتھ گن لا سکتے ہو لیکن کسی دوسرے پولیس والے کو ساتھ مت لانا۔'' کارلا نے اپنی شرائط بیان کیں۔

''ٹھیک ہے۔ میں ایسا ہی کروں گا۔'' ہیریسن نے بلاتامل کہا۔ وہ سردست اس کی ہر شرط تسلیم کرنے کے لیے تیار تھا۔ اس نے بعد میں یہ طے کرنے کا فیصلہ کیا تھا کہ اس کی حکمت عملی کیا ہوگی۔

''تم میری بات سمجھ رہے ہو نا سراغ رساں ہیریسن؟'' کارلا کا پوچھنے کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے وہ ہیریسن کو ذہنی طور پر پسماندہ سمجھ رہی ہو۔

''ہاں کارلا! میں ان باتوں کو تم سے بہتر سمجھتا ہوں۔'' ہیریسن نے بے ساختہ کہا۔

دوسری طرف یک دم ایک تیز سی سانس لی گئی اور ایک لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی پھر پوچھا گیا۔ ''تم کارلا کو جانتے ہو؟''

''ہاں...... کارلا! میں تمہیں جانتا ہوں۔'' اس کے دل میں ایک بار پھر دکھ کا بگولا سا اٹھا اور وہ مجروح سے لہجے میں بولا۔ ''برسوں پہلے تم جیسی میری ایک بہن تھی اور تمہارا مجھ جیسا ایک بھائی تھا۔'' اس کی آواز ٹوٹنے لگی اور گلے میں گویا کوئی گولا سا پھنس گیا۔ وہ خاموش ہوگیا۔

''ٹھیک ہے۔'' اس بار دوسری طرف سے نرم لہجے میں کہا گیا۔ ''تم بات کو سمجھ رہے ہو سراغ رساں ہیریسن! آج رات وہیں آجاؤ جہاں میں نے بتایا ہے۔'' اس کے ساتھ ہی دوسری طرف سے سلسلہ منقطع ہوگیا۔

☆☆☆

''میرا خیال ہے، مجھے اندھیرے میں چھپ کر انتظار کرنا چاہیے۔ سراغ رساں ہیریسن ضرور آئے گا لیکن جس طرح میں نے کہا ہے، اس طرح شاید نہیں آئے گا...... میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ اکیلا آئے لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے ساتھ بہت سے دوسرے پولیس والوں کو بھی لائے گا۔ وہ اِدھر اُدھر چھپ جائیں گے۔ ٹی وی پر میں نے اکثر اسی طرح دیکھا ہے۔ سب کو اپنی حفاظت کی فکر ہوتی ہے۔ ان کے پاس بہت سی گنز ہوتی ہیں۔ حالانکہ ہیریسن کو بہت سے آدمی اور بہت سی گنز لے کر آنے کی ضرورت نہیں۔ صرف ہیریسن اور اس کی گن ہی کافی ہے۔ ہیریسن کو چاہیے کہ مجھے اپنی گن سے گولی ماردے۔ میں اس کے لیے تیار ہوں۔ میرے ہاتھوں قتل کا سلسلہ اب بند ہونا چاہیے۔ میرے ہاتھ سے کسی کو بھی قتل نہیں ہونا چاہیے لیکن میں کیا کروں۔ میں مجبور ہوں۔ میرے اندر کوئی طاقت ہے جو مجھے مجبور کرتی ہے۔ قتل خود بہ خود ہوجاتا ہے۔ مجھے قتل کرنے سے رکنا ہوگا۔ صرف ہیریسن میری مدد کرسکتا ہے۔ وہ اس سلسلے کو روک سکتا ہے۔ وہ بات کو سمجھتا ہے۔ اسے یہ سلسلہ ہمیشہ کے لیے روکنا ہوگا۔ کوئی اور یہ کام نہیں کرسکتا۔ میں خود بھی نہیں کرسکتی۔ صرف ہیریسن کرسکتا ہے۔ وہ مجھے سمجھ گیا

ہے۔ کارلا کو سمجھ گیا ہے۔ ذہین آدمی ہے۔ آج کے بعد شہر میں کوئی اس طریقے سے قتل نہیں ہوگا۔ کیونکہ کارلا اس دنیا میں نہیں رہے گی۔ بدصورت اور ڈراؤنی کارلا...... جسے دیکھ کر لوگوں کے چہرے دہشت سے عجیب سے ہو جاتے ہیں۔ آج کے بعد کسی کا چہرہ ایسا نظر نہیں آئے گا کیونکہ انہیں ڈراؤنی کارلا نظر نہیں آئے گی۔ کارلا بہت دور جا چکی ہوگی۔ اس دنیا سے، بہت دور...... ہمیشہ کے لیے۔ آج کے بعد کسی کو اس کارلا کی جھلک بھی نظر نہیں آئے گی جس کے چہرے سے اسکارف اور سر سے ہیٹ یا ٹوپی ہٹ جائے تو خوف، نفرت اور کراہت سے لوگوں کی شکلیں بگڑ جاتی ہیں۔ آج یہ کہانی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گی۔ اس کہانی کو اب ختم ہو ہی جانا چاہیے۔

☆☆☆

ہیریسن نے فیصلہ کیا تھا کہ اس مہم پر وہ اکیلا جائے گا۔ جائے ملاقات سے آدھے فرلانگ کے فاصلے پر ایک پولیس وین موجود رہے گی۔ اس میں چند مسلح پولیس والے بھی ہوں گے لیکن کسی کو نہیں معلوم ہوگا کہ وہ کس سے، اور کیوں ملنے جا رہا ہے۔ البتہ اس کی پینٹ کی بیلٹ میں کلپ کے ذریعے ایک واکی ٹاکی لٹکا ہوگا۔ اسے اندیشہ تھا کہ اگر اس نے اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ وہ کس مقصد کے تحت اس جگہ جا رہا ہے، تو وہ اس کے منع کرنے کے باوجود، اور موقع محل دیکھے بغیر اس جگہ یلغار کر دیں گے اور کارلا خوف زدہ ہو کر بھاگ جائے گی۔ چنانچہ اس نے جیکب کو بتایا تھا کہ وہ ایک مخبر سے ملنے جا رہا ہے اور پولیس وین محض احتیاطاً ساتھ لے جا رہا ہے۔

کارلا بھی تنہا، صرف اسی کے سامنے سرینڈر کرنا چاہتی تھی۔ شاید وہ بھی اس کی طرف کوئی خصوصی جھکاؤ، اس کے ساتھ کوئی نہایت معمولی اور نادیدہ سا بندھن یا خفیف سا تعلق محسوس کر رہی تھی جو اس نے یہ فرمائش کی تھی۔ ہیریسن کا ارادہ تھا کہ جب وہ کارلا کو ہتھکڑی لگا لے گا تو پھر واکی ٹاکی پر بات کر کے پولیس وین کو اصل جگہ پر بلا لے گا۔

اسے معلوم تھا کہ اس گرفتاری کے بعد اس کی بڑی شہرت ہوگی۔ اخبارات اور دیگر ذرائع ابلاغ اسے ہیرو بنا دیں گے۔ اسے اس شہرت کی قطعی کوئی خواہش نہیں تھی اور نہ ہی وہ ہیرو بننا چاہتا تھا۔ وہ تو صرف اس سلسلے کو روکنا چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ شہری گویا کافی دنوں سے ایک ڈراؤنا خواب دیکھ رہے تھے۔ دوسری طرف خود کارلا بھی یقیناً ایک اذیت سے گزر رہی تھی جو خود اس کے لیے بھی ناقابلِ فہم تھی۔ ہیریسن، شہریوں کو اس ڈراؤنے خواب اور کارلا کو اس لاشعوری اذیت سے نجات دلانا چاہتا تھا۔ اسے کارلا کے بارے میں سوچ کر اس پر ترس بھی آتا تھا۔ ویسا ہی ترس، جیسا اسے اپنی بہن این پر آیا تھا لیکن وہ ترس اسے این پر اس رات کے بعد آیا تھا جس رات وہ آنکھوں میں آنسو لیے خاموشی سے مر گئی تھی۔

اسے صرف ترس ہی نہیں آیا تھا بلکہ اس وقت سے اب تک اس کے لاشعور میں کہیں ایک اذیت ناک قسم کا احساسِ جرم پنجے گاڑے بیٹھا تھا۔ ہیریسن کا تو یہ بھی ارادہ تھا کہ کارلا کی گرفتاری کے بعد وہ کسی نہ کسی این جی او یا سائنسی ادارے کی مدد سے اس معاملے پر ریسرچ بھی کرائے گا کہ آخر وہ کس چیز کے اثرات تھے کہ ایک ہی رات میں کئی ماؤں کی کوکھ میں کارلا اور اس سے ملتے جلتے کئی بچوں کی زندگی کی بنیاد پڑی تھی اور پھر تقریباً نو ماہ بعد انہوں نے ایک ہی مہینے کے دوران میں مختلف دنوں میں جنم لیا تھا؟ سائنس دانوں، ڈاکٹرز اور خاص طور پر گائنا کولوجسٹس کے لیے تحقیق کا یہ ایک نہایت اہم اور سنسنی خیز موضوع تھا۔

ہیریسن کو یقین تھا کہ وہ اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہوگا اور کارلا کی گرفتاری کے علاوہ یہ معما اسی کے ذریعے حل ہوگا۔ اسی یقین کا دامن تھامے وہ اس گلی میں داخل ہوا جہاں وہ ایک ہفتے پہلے اس لڑکی کے قتل کی اطلاع پا کر پہنچا تھا جس کا حسین چہرہ غائب ہو چکا تھا۔ ''چوری'' ہو چکا تھا۔ اس انداز کی وہ ساتویں واردات تھی۔ ہیریسن یہ امید لیے یہاں آیا تھا کہ اس طرح کا آٹھواں قتل اب نہیں ہوگا۔

گلی کے وسط میں پہنچ کر وہ رک گیا۔ اس جگہ اندھیرا تھا۔ اس کے دونوں طرف سال خوردہ اینٹوں والی اونچی عمارتیں تھیں۔ شہر کے ٹریفک کی مدھم سی آواز یہاں تک پہنچ رہی تھی تاہم گلی میں سکوت تھا۔ یہ عقبی گلی تھی اور یہی کارلا سے اس کی جائے ملاقات قرار پائی تھی۔

ہیریسن نے ٹارچ نکال کر روشنی اِدھر اُدھر ڈالی۔ اسے کہیں کوئی نظر نہ آیا۔

''کارلا!'' اس نے پکارا مگر کوئی جواب نہ آیا۔

''کارلا بیکر...... کیا تم یہاں ہو؟'' اس بار اس نے آواز ذرا بلند رکھی۔

اس بار جواب میں سکوت گویا کچھ اور گہرا ہو گیا لیکن چند سیکنڈ بعد کچھ ایسی آواز ابھری جیسے کسی نے کوڑے دان کو گلی کے پختہ فرش پر تھوڑا سا گھسیٹا ہو۔ ہیریسن تیزی سے

اس طرف گھوما۔

اس کے سامنے دس بارہ فٹ کے فاصلے پر ایک دراز قد انسان کا ہیولا ایک کوڑے دان کے قریب موجود تھا۔ اس کا قد ہیریسن سے کم نہیں تھا۔ چھ فٹ دو انچ تو ہوگا..... مگر وہ کارلا بیکر ہی ہوسکتی تھی۔ اس کے مجہول سے وجود پر ایک پرانا اور کئی جگہ سے اُدھڑا ہوا سا، ڈھیلا ڈھالا، میلا اوورکوٹ اور سر پر اونی ٹوپی تھی۔ آدھے سے زیادہ چہرہ اسکارف میں چھپا ہوا تھا۔ صرف اس کی سیاہ آنکھیں نمایاں دکھائی دے رہی تھیں جن میں غیر معمولی چمک تھی۔ اس کے میلے، ڈھیلے ڈھالے اور بدوضع ٹراؤزر پر داغ دھبے نظر آرہے تھے۔

مجموعی طور پر وہ اُن مفلوک الحال، بے گھر انسانوں میں سے ایک دکھائی دے رہی تھی جو اکثر فٹ پاتھ یا ریلوے پلیٹ فارم پر، کونے کھدروں میں بیٹھے یا کبھی کبھی کوڑے دانوں کے آس پاس منڈلاتے دکھائی دیتے تھے۔ اس کے جوتے پھٹے پرانے تھے۔ ہیریسن ساکت کھڑا اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ اس کے ذہن میں کارلا کا یہ تصور نہیں تھا۔

''سراغ رساں ہیریسن کی گن کہاں ہے؟'' کارلا کی تتلاہٹ اور کھرکھراہٹ آمیز آواز سنائی دی جو ہیریسن فون پر بھی سن چکا تھا۔ اب گویا اس امر میں ذرا بھی شبہ نہیں رہا تھا کہ وہ کارلا ہی تھی۔

''گن، ہولسٹر میں ہے۔'' ہیریسن نے جواب دیا۔

''اسے نکال لو... پلیز.....'' کارلا نے فرمائش کی۔

ہیریسن نے بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس نے گن ہولسٹر سے نکال لی۔ ہاتھ میں بھاری پولیس گن..... کی موجودگی سے اسے تقویت کا احساس ہوا۔ سامنے کھڑی کارلا نے بازو پھیلا دیے۔ اوورکوٹ کی ڈھیلی ڈھالی آستینوں کے باوجود ہیریسن کو اندازہ ہوا کہ اس کے بازو عجیب سے زاویے پر مڑے ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھ جو اب تک آستینوں میں تقریباً چھپے ہوئے تھے، باہر آگئے۔ وہ ہاتھ بڑے بڑے، استخوانی پنجوں سے مشابہ تھے۔

''گولی ماردو مجھے۔'' کارلا کی آواز اُبھری۔ لہجے میں تحکم نہیں..... بلکہ ایک قسم کی فریاد تھی۔ اس نے گولی کھانے کے لیے سینہ آگے کردیا تھا۔

ہیریسن کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ وہ اس کے لیے تیار نہیں تھا اور نہ ہی اس کا ایسا کوئی ارادہ تھا۔ گولی چلانے کے بجائے، اس کے جس ہاتھ میں گن تھی، اس میں ہلکی سی کپکپاہٹ آگئی۔

''گولی چلاؤ.....'' اس بار کارلا کی عجیب سی آواز میں قدرے بے تابی تھی۔

''نہیں کارلا.....!'' ہیریسن کے لہجے میں بے بسی تھی۔ ''میں تمہیں نہیں مار سکتا۔ میرے ذہن پر پہلے ہی ماضی کا بہت بوجھ ہے۔ میں یہاں تمہیں مارنے نہیں، صرف گرفتار کرنے آیا ہوں۔ میں نے تمہیں پہلے ہی بتادیا تھا۔''

''نہیں..... تم مجھے گولی مارو۔'' کارلا کے لہجے میں جھنجلاہٹ تھی۔ ''اس سلسلے کو روکنے کا اب یہی ایک طریقہ ہے۔''

''نہیں کارلا..... ہم تمہارا علاج کرائیں گے۔ تمہیں مدد کی ضرورت ہے۔ ہم تمہاری مدد کریں گے۔'' ہیریسن نے اصرار کیا۔

”نہیں چاہیے مجھے تمہاری مدد......“ کارلا عجیب اور پھٹی پھٹی سی آواز میں چلائی۔ اس کے استخوانی اور پنجہ نما ہاتھ مضطربانہ انداز میں کھلنے اور بند ہونے لگے تھے۔ پھر وہ دھیرے دھیرے ہیریسن کی طرف بڑھنے لگی۔ ہیریسن مضطرب ہوگیا۔ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

”دیکھو این......!“ ہیریسن نے گویا ایک بار پھر اُسے سمجھانا چاہا۔

”میں این نہیں، کارلا ہوں۔“ کارلا ایک بار پھر برہمی سے چلائی اور دھیرے دھیرے آگے بڑھتی رہی۔ ”میں سمجھ رہی تھی کہ تم میری بات سمجھتے ہو۔ مگر نہیں...... کوئی میری بات نہیں سمجھتا۔ مجھے اپنے آپ پر قابو نہیں رہتا۔ میں قتل کرنے سے باز نہیں رہ سکتی...... اور مجھے کسی جیل میں نہیں رہنا ہے۔ میں زندگی میں دوبارہ کبھی کسی قید خانے میں نہیں رہوں گی۔ میں کہہ رہی ہوں۔ تم مجھے گولی ماردو۔“

وہ اب ہیریسن کے بالکل قریب پہنچ چکی تھی۔ اس کے ہاتھ تشنجی سی کیفیت میں کھل رہے تھے اور بند ہورہے تھے۔ ہیریسن نے پھیکی سی مسکراہٹ میں اپنی گھبراہٹ کو چھپانے کی کوشش کی۔

”ہاں، مجھے معلوم ہے تم کارلا ہو۔ میرے منہ سے غلطی سے این نکل گیا...... دیکھو...... تم میرے ساتھ چلو...... سب ٹھیک ہوجائے گا۔“ وہ بولا۔

”کچھ ٹھیک نہیں ہوگا۔ کچھ ٹھیک نہیں ہوگا۔ تم بھی میری بات نہیں سمجھے۔“ کارلا کا انداز اب بڑبڑانے کا سا تھا۔ پھر اس کا ہاتھ بجلی کی سی تیزی سے حرکت میں آیا۔ دوسرے ہی لمحے ہیریسن کی گردن اس کی گرفت میں تھی۔ ہیریسن کو یوں لگا جیسے اس کا نرخرہ کسی آہنی شکنجے میں پھنس گیا ہو اور نکیلی کیلیں اس میں پیوست ہوئی جارہی ہوں۔ دوسرے ہی لمحے اس کا نرخرہ اُدھیڑا جاچکا تھا۔ بھل بھل کر کے خون اس کی گردن سے اُبل پڑا اور کارلا کے پنجہ نما ہاتھوں کو بھگونے لگا۔

چند لمحے بعد کارلا نے اسے چھوڑ دیا اور وہ کسی ایسے جانور کی طرح بھد سے زمین پر گر پڑا جسے کھڑے کھڑے ذبح کردیا گیا ہو۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں اور اسی حالت میں ساکت ہوگئی تھیں۔ ٹارچ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی اور اب اس کی روشنی کسی اور زاویے پر جارہی تھی۔

کارلا چند سیکنڈ سر جھکائے اس کے بے جان وجود کو دیکھتی رہی۔ اس کے انداز کو متاسفانہ کہا جاسکتا تھا۔

”مجھے اب چلنا چاہیے۔“ کارلا نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔ ”آس پاس اس کے ساتھی ضرور کہیں چھپے ہوں گے۔ شاید وہ آتے ہی ہوں گے۔ وہ بھی مجھے گولی مارنے کے بجائے پکڑ کے لے جائیں گے اور کسی جیل میں بند کردیں گے۔ مجھے اب کہیں قید نہیں ہونا ہے۔“

وہ زقند بھر کے اسی عمارت کی دیوار تک پہنچی جس پر وہ پہلے بھی چڑھ چکی تھی۔ اس کی سال خوردہ اینٹوں کے درمیان پڑجانے والے چھوٹے بڑے گڑھوں میں پنجے اور پاؤں پھنسا کر وہ کسی بلی کی طرح دیوار پر چڑھنے لگی۔

اسی دوران چار باوردی پولیس والے دوڑتے ہوئے وہاں آن پہنچے۔ جیکب ان میں آگے آگے تھا۔ ان کے ہاتھوں میں ریوالور تھے۔ جیکب کے ہاتھ میں فلیش لائٹ بھی تھی۔ کچھ دور وین میں بیٹھے بیٹھے انہیں احساس ہوا تھا کہ وہاں کوئی گڑبڑ تھی اور وہ واکی ٹاکی پر ہیریسن کی ہدایات کا انتظار کیے بغیر یہاں دوڑے چلے آئے تھے۔ فلیش لائٹ کی روشنی میں انہوں نے ہیریسن کی لاش دیکھی تو ان کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ اس کی اُدھڑی ہوئی گردن سے ابھی تک خون بہہ رہا تھا اور سڑک پر پھیل رہا تھا۔

پھر جیکب نے فلیش لائٹ کی روشنی میں دیوار پر انسان نما کسی مخلوق کو چڑھتے دیکھا۔ جیکب نے پے در پے تین فائر کیے۔ زوردار دھپ کی آواز کے ساتھ وہ مخلوق پیٹھ کے بل سڑک پر آگری اور وہیں ساکت ہوگئی۔ انہوں نے قریب جاکر اس کا جائزہ لیا تو انہیں دہشت کی ایک نئی لہر سے واسطہ پڑا۔ انسان نما اس مخلوق کے ہاتھ اور بازو خون میں لتھڑے ہوئے تھے اور وہ خون یقیناً ہیریسن ہی کا تھا۔

چند لمحے وہ سب متاسفانہ سے انداز میں لاشوں کا جائزہ لیتے رہے۔ پھر جیکب بوجھل لہجے میں بولا۔ ”میں نے ہیریسن سے کہا بھی تھا کہ ہمیں ساتھ ہی رکھے۔ ہم یہیں کہیں آس پاس چھپ جاتے......“

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اس کے ساتھیوں میں سے ایک کی آواز ابھری۔ ”وہ بھلا ہمیں کیوں ساتھ لاتا۔ اسے تو اکیلے ہی ہیرو بننے کا شوق تھا۔“

رات کے گمبھیر سناٹے میں دھیمی ہوا کی سسکیاں سی سنائی دے رہی تھیں...... بالآخر خوف و دہشت اور قتل و خون میں ڈوبی داستاں اپنے اختتام کو پہنچی تھی۔

❖❖❖

کوئی ایک غم... کب پہاڑ اور ایک چنگاری کب بھڑکتے ہوئے شعلے کی صورت اختیار کرلے... کچھ کہا نہیں جا سکتا... مگر اس کی زندگی میں غم کا پہاڑ آچکا تھا... وہ اس کے نیچے دبنے کے بجائے اسے سر کرنے کا خواہش مند تھا... نیت نیک ہو تو راستے بنتے چلے جاتے ہیں... مقصد کے حصول تک اس کی راہیں ہموار ہوتی چلی گئیں...

ایک جعل سازی کی ہر جسارت کے ساتھ جلی مہک سے پیچ و خم

حسام بٹ

کایا پلٹ

زندگی ہر قدم ایک آزمائش ہے۔ اس امتحان گاہ میں بعض ایسے نازک مقامات بھی آتے ہیں جب انسان اِدھر اُدھر کے درمیان سوالیہ نشان بن کر رہ جاتا ہے۔ ان فیصلہ کن لمحات میں کسی حتمی نتیجے تک رسائی حاصل کرنے کے لیے دل اور دماغ میں سے کسی ایک کی پکار کو نظر انداز کر کے دوسرے کی آواز پر لبیک کہنا لازم ٹھہرتا ہے۔ وہ بھی اپنی حیات کے ایک ایسے ہی پُرخطر ڈرامائی موڑ پر کھڑا تھا۔

''بتاؤ، اتنی ایمرجنسی میں مجھے کیوں بلایا ہے؟''

دانیال نے ساحرہ سے پوچھا۔
وہ دونوں اس وقت ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ساحرہ نے اسے یہاں آنے کو کہا تھا اور دانیال دوڑا چلا آیا تھا۔ اس کے سوال کے جواب میں ساحرہ نے گہری سنجیدگی سے کہا۔
''میں تم سے ایک بہت ہی ضروری بات کرنا چاہتی ہوں۔''
ویٹر کو چائے اور سینڈوچ کا آرڈر دینے کے بعد دانیال نے استفسار کیا۔ ''کیا یہ ضروری بات فون پر نہیں ہو سکتی تھی؟''
''ہو تو سکتی تھی مگر یہ ہماری زندگی کا نہایت ہی اہم فیصلہ ہے۔'' ساحرہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''ہم چھ سات ماہ سے مل رہے ہیں اور اس دوران میں ہم اتنے زیادہ قریب آچکے ہیں کہ اب جدائی یا دوری کا تصور بھی محال ہے......''
دانیال نے ٹٹولتی ہوئی نظر سے ساحرہ کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا اور پوچھا۔ ''یہ خیال تمہارے ذہن میں کیسے آیا کہ ہم ایک دوسرے سے جدا ہونے والے یا پھر دوری پر جانے والے ہیں؟''
دانیال گزشتہ سات ماہ سے ساحرہ کے ساتھ محبت کا ناٹک کر رہا تھا اور اس کھیل کے پیچھے اس کا ایک خاص مقصد پوشیدہ تھا لیکن ساحرہ، دانیال کی نیت کو جانتی تھی اور نہ ہی اس کی اصلیت سے واقف تھی اسی لیے وہ اپنی محبت میں سنجیدہ اور خالص تھی۔
''اس خیال کی وجہ سکندر بھائی ہیں۔'' ساحرہ نے بتایا۔ ''انہیں اچانک میری شادی کی فکر ہونے لگی ہے۔ وہ میرے لیے رشتہ تلاش کرنے کی مہم میں لگے ہیں۔''
سکندر بھائی، دانیال کا باس تھا۔ یہ شخص دہری شخصیت اور دہرے کاروبار کا مالک تھا۔ اس کا ایک بزنس دنیا کو دکھانے کے لیے تھا، مثبت، باوقار اور صاف ستھرا۔ وہ ریئل اسٹیٹ کا کنگ مانا جاتا تھا۔ اس نے شہر کے پوش ایریا میں اپنی کمپنی ''لکی اسٹیٹ'' کا آفس بنا رکھا تھا اور آن ریکارڈ، دانیال اسی عالی شان آفس سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ دانیال کی آفیشل جاب تھی اور ساحرہ کی معلومات بھی یہیں تک محدود تھیں۔
''تم سکندر صاحب کی اکلوتی بہن ہو......'' دانیال نے کہا۔ ''ہر بھائی کو اپنی جوان بہن کی شادی کے لیے فکر مند ہونا ہی چاہیے۔ اس میں پریشانی والی کون سی بات ہے۔ تم اتنی ٹینشن کیوں لے رہی ہو؟''
جب ساحرہ نے کوئی خاص بات کرنے کے لیے دانیال کو یہاں بلایا تھا تو اس کے ذہن میں کئی طرح کے خیالات اُبھرے تھے اور ریسٹورنٹ کی جانب آتے ہوئے وہ اسی بارے میں سوچتا رہا تھا کہ کہیں اس کا کوئی راز ساحرہ کے ہتھے تو نہیں چڑھ گیا...... وہ اپنی منزل کے انتہائی نزدیک پہنچ چکا تھا اور اس مقام پر وہ کسی اَپ سیٹ کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا لیکن جب ساحرہ نے اپنی شادی کا تذکرہ چھیڑا تو اس نے اطمینان کی سانس لی کہ یہ اس کی نظر میں ایک فضول اور آؤٹ آف سلیبس موضوع تھا۔ اس نے ساحرہ سے شادی کے بارے میں، ایک لمحے کے لیے بھی غلطی سے بھی نہیں سوچا تھا۔
''میں سیریس ہوں دانیال......'' وہ شاکی نظر سے اسے گھورتے ہوئے بولی۔ ''اور تم میری بات کو مذاق میں لے رہے ہو۔ یہ ہم دونوں کے مستقبل کا سوال ہے دانیال......!''
''تم ٹھیک کہہ رہی ہو ساحرہ۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''بتاؤ، تمہارے ذہن میں کیا چل رہا ہے؟''
دانیال سنجیدگی سے اس کی جانب متوجہ ہوا تو اس نے کہا۔ ''میں آج بھائی سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ انہیں بتانا چاہتی ہوں کہ میں تمہیں پسند کرتی ہوں اور تم بھی مجھ سے بے پناہ محبت کرتے ہو لہٰذا ہم شادی کے خواہش مند ہیں...... وغیرہ۔''
''اس امر میں تو کسی شک کی گنجائش نہیں کہ ہم ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں۔'' دانیال نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ہماری ایک دوسرے کے لیے محبت اور چاہت مثالی ہے لیکن......''
دانیال نے جملہ ادھورا چھوڑا تو ساحرہ نے بے تابی سے پوچھا۔ ''لیکن کیا؟''
''میں تمہارے بھائی کی کمپنی میں کام کرتا ہوں، ان کا ایک معمولی سا ملازم ہوں۔'' دانیال نے ساحرہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اور تم ان کی اکلوتی بہن ہو۔ ہم دونوں کے بیچ جو معاشی اور معاشرتی تفاوت ہے، وہ ہمارے ملن کی راہ میں رکاوٹ کھڑی کر سکتا ہے۔ مجھے نہیں امید کہ سکندر بھائی تمہاری بات سننے کے بھی روادار ہوں گے۔''
''حقیقت تو یہی ہے جو تم نے بیان کی ہے دانیال۔''

ساحرہ نے معتدل انداز میں کہا۔ ''لیکن تمہیں بالکل اندازہ نہیں کہ بھائی مجھ سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ آج تک انہوں نے میری ہر چھوٹی بڑی فرمائش پوری کی ہے۔ وہ کسی بھی قیمت پر مجھے دکھی نہیں دیکھ سکتے۔ میں انہیں اس پوائنٹ پر بھی راضی کرلوں گی، یہ سب تم مجھ پر چھوڑ دو۔''

ساحرہ اپنے بھائی کے اس بھیانک روپ سے واقف نہیں تھی جو سکندر کی شخصیت کا منفی پہلو تھا۔ انتہائی مکروہ، سفاک اور انسانیت دشمن کردار۔ وہ ایک طاقتور ڈرگ ڈیلر تھا یعنی موت کا سوداگر...... اور اس انڈر ورلڈ بزنس میں دانیال، سکندر کا ایک انتہائی قابل بھروسا ساتھی بلکہ دستِ راست کی حیثیت کا حامل تھا۔ ''لکی اسٹیٹ'' والی معمولی سی جاب دانیال کا کور تھی۔ جس طرح ساحرہ اپنے بھائی کے گھناؤنے بزنس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی، ویسے ہی سکندر بھی اپنی بہن اور دانیال کے افیئر سے متعلق بے خبر تھا اور دانیال، سکندر کو اس وقت تک اس معاملے سے بے خبر ہی رکھنا چاہتا تھا جب تک اس کا مشن پورا نہ ہو جاتا۔ وہ عظیم مشن جس میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے وہ ساحرہ کو محبت کا لولی پاپ چوسا رہا تھا۔

''ٹھیک ہے، میں نے سب کچھ تم پر چھوڑ دیا۔'' وہ بہ دستور ساحرہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ''تم اپنے بھائی سے جو بھی اور جس بھی انداز میں کہنا چاہتی ہو، میں تمہیں فری ہینڈ دیتا ہوں لیکن اس کام کے لیے آج کا دن مناسب نہیں ہے۔''

''اس کا کیا مطلب ہوا......؟'' ساحرہ نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

دانیال جس مقصد کی خاطر پچھلے آٹھ دس ماہ سے سکندر کے ساتھ چسپیدہ تھا، اس کی تکمیل کے لیے صرف دو دن رہ گئے تھے۔ اسی لیے وہ اپنے مقصد کے حصول کی راہ کو کھوٹا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اگر سکندر، ساحرہ کی محبت والی اسٹوری سُن کر بھڑک اٹھتا یا دانیال کی طرف سے محتاط ہو جاتا تو بنا بنایا کھیل بگڑ سکتا تھا اور دانیال اپنی منزل کے اتنا قریب آجانے کے بعد ایسی کوئی غلطی کرنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔

''مطلب بالکل سیدھا اور سادہ ہے ساحرہ......'' موقع محل کی مناسبت سے وہ ایک معقول جواز پیش کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ چاند کی آخری تاریخیں چل رہی ہیں۔ آج جمعرات ہے۔ اتوار کی شام نیا چاند آجائے گا۔ میں نے سنا ہے، چاند کی آخری تاریخوں میں کسی اہم کام کی شروعات نہیں کرنا چاہیے ورنہ وہ کام الٹا پڑ جاتا ہے۔''

''ہاں، ایسا میں نے بھی سنا ہے۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''اگر کسی کام کی داغ بیل چاند کی ابتدائی تاریخوں میں ڈالی جائے تو مقصد لازمی پورا ہوتا ہے۔''

''اسی لیے میرا مشورہ تو یہی ہے کہ ہماری محبت کے حوالے سے تم پیر کے بعد کسی دن اپنے بھائی سے بات کرو۔'' وہ سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ''ان تین چار دنوں میں کوئی قیامت نہیں آجائے گی۔ شادی بیاہ کے معاملات ایسے نہیں ہوتے کہ سکندر بھائی دو چار روز ہی میں تمہارے لیے کسی دولھا کا بندوبست کردیں گے۔ آخر تم ان کی ''ون اینڈ اونلی'' سسٹر ہو۔ ان کے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ وہ تمہارے لیے لڑکے کا انتخاب کرتے ہوئے ہزار بار نہیں بلکہ لاکھ بار سوچیں گے۔''

''میں انہیں زیادہ سوچنے کا موقع نہیں دوں گی۔'' ساحرہ نے پُرعزم لہجے میں کہا۔ ''آنے والے پیر ہی کو ان سے بات کرتی ہوں۔''

''صرف بات ہی نہیں کرنا بلکہ سکندر بھائی کو اس رشتے کے لیے راضی بھی کرنا ہے جو کہ کوئی آسان کام نہیں ہے ساحرہ......!''

''تم دیکھتے جاؤ......'' وہ چٹکی بجاتے ہوئے مضبوط لہجے میں بولی۔ ''میں کس طرح اس مشکل کام کو آسان بناتی ہوں۔''

''میں اتنی دیر سے تمہیں ہی تو دیکھ رہا ہوں ساحرہ......'' وہ جذبات سے معمور آواز میں بولا۔ ''پتا نہیں، تم نے مجھ پر کون سا جادو پھونکا ہے۔ تمہارے سوا مجھے کوئی دوسرا نظر ہی نہیں آتا۔''

''میرے دل و دماغ کی بھی کچھ ایسی ہی کیفیت ہے دانیال......'' وہ اس کے ہاتھ تھامتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''ہماری محبت ضرور کامیاب ہوگی۔''

''ان شاء اللہ'' دانیال نے کہا۔

''ان شاء اللہ'' کہہ کر انسان اپنی کوشش کا گلا گھونٹ ڈالتا ہے یا یہ کہ اگر کوشش کرنے کی نیت نہ ہو تو ان الفاظ کا سہارا لیا جاتا ہے۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ متذکرہ بالا الفاظ کی کوئی اہمیت نہیں۔ ان الفاظ کی اہمیت، حرمت اور افادیت اپنی جگہ قائم و دائم ہے مگر افسوس اس بات کا ہے کہ نیک نیت انسانوں کا دنیا میں کال پڑ گیا ہے۔ ہم عموماً ایسے بابرکت الفاظ کا استعمال نظریۂ ضرورت کے تحت، دوسروں کو

دھوکا دینے کے لیے کرتے ہیں جو مس یوز کے زمرے میں آتا ہے اور سراسر غلط بھی ہے جیسا کہ اس وقت دانیال کر رہا تھا۔ ساحرہ سے اس کی محبت اس مشن کا حصہ تھی جس میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے وہ کئی ماہ سے محنت کر رہا تھا اور اب صرف دو دن کا انتظار باقی تھا...... ہفتے کی شام میں دو دن ہی تو رہ گئے تھے۔

☆☆☆

دو سال پہلے تک دانیال، فرہاد ہوا کرتا تھا جو کہ اس کا اصل نام تھا پھر ایک حادثے نے اسے فرہاد سے دانیال بننے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کی زندگی دانیال بننے سے پہلے، اپنی مخصوص رفتار سے رواں دواں تھی۔ تین افراد کی اس فیملی کے جیون میں سکھ ہی سکھ بھرا ہوا تھا۔ دانیال کی تعلیم بس واجبی سی تھی لیکن اس کے ہاتھ میں ہنر تھا۔ وہ ایک بہترین تجربہ کار، کار مکینک تھا۔ شہر کے ایک معروف گیراج میں وہ دل لگا کر کام کر رہا تھا۔ گیراج کا مالک گلزار خان اس کی قابلیت اور دیانت داری سے بہ خوبی واقف تھا اس لیے وہ دانیال کو اس کی محنت سے بڑھ کر معاوضہ دیا کرتا تھا۔ دانیال خود تو زیادہ لکھ پڑھ نہیں سکا تھا لہٰذا وہ چاہتا تھا کہ اس کا چھوٹا بھائی تیمور اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے بڑا آدمی بنے۔ دانیال کا والد حامد علی ایک سرکاری محکمے سے ریٹائر ہو کر آرام و سکون کی گھریلو زندگی گزار رہا تھا۔ دانیال کی والدہ کئی سال پہلے گلے کے سرطان میں مبتلا ہو کر اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملی تھی۔ شگفتہ کی بیماری ایسی موذی تھی کہ زندگی کے آخری سالوں میں اس نے بڑی اذیت دیکھی تھی۔

دانیال ستائیس کے قریب پہنچ چکا تھا لیکن اس نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔ تیمور کو تابناک مستقبل دینا اس نے اپنا نصب العین بنا لیا تھا۔ وہ گلزار خان کے گیراج میں انتھک محنت کر رہا تھا تاکہ اس کے برادرِ خرد کی اعلیٰ تعلیم کے راستے میں کبھی کوئی معاشی رکاوٹ کھڑی نہ ہو جائے۔ انسان اپنے انداز اور اپنی خواہش سے مجبور ہو کر سوچتا ہے مگر ہوتا کیا ہے، اس بارے میں وہ دعوے سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ دانیال نے تیمور کے سنہرے مستقبل کے حوالے سے جو سوچ رکھا تھا اس کے حصول کی خاطر وہ تن دہی سے جدوجہد کر رہا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایک روز اس کے سپنوں کا کانچ محل چکنا چور ہو جائے گا۔

تیمور نے جب اپنی عمر عزیز کے بیسویں سال میں قدم رکھا تو ایک اندوہناک واقعے نے دانیال کی دنیا کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا۔ تیمور شہر کے ایک نامور کالج کا اسٹوڈنٹ تھا۔ وہ پڑھائی میں بھی تیز تھا اسی لیے وہ ایک اچھے کالج میں تھا مگر ان تمام اچھائیوں کو ڈرگز کی لت نے ملیامیٹ کر دیا۔ وہ کب سے ڈرگز لے رہا تھا، اس کا صحیح طور پر پتا نہ چل سکا مگر جب ایک روز وہ ''اوور ڈوز'' ہو کر موت کے منہ میں چلا گیا تو تب انکشاف ہوا کہ یہ علت اسے کالج لائف ہی سے لگی تھی۔

حامد علی جوان بیٹے کی حسرت ناک موت کا صدمہ برداشت نہ کر سکا اور اس نے چارپائی پکڑ لی۔ حامد علی نے صاف شفاف زندگی گزاری تھی۔ کسی بھی حوالے سے کوئی شخص اس پر انگلی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ بے داغ کردار کے مالک لوگ کچھ زیادہ ہی حساس اور نازک ہوتے ہیں۔ حامد علی کے لیے یہ خیال ہی روح فرسا تھا کہ اس کا لختِ جگر ڈرگز لیتا تھا۔ وہ لگ بھگ ایک ماہ تک بیڈ سے لگا، یہ سوچ سوچ کر اپنا خون جلاتا رہا کہ اس کی تربیت بے اثر کیوں ہو گئی؟ اس نے اپنی اولاد کو اس معاشرے کا ایک مفید اور قابلِ فخر انسان بنانے کے لیے جو محنت اور مشقت کی تھی، وہ رائگاں کیوں گئی؟ تیمور نے تاریک راہوں کی مسافرت کیوں اختیار کی؟ یہ عمر اس کے اس طرح دنیا سے اٹھ جانے کی تو نہیں تھی...... وغیرہ۔

حامد علی کے ذہن میں اٹھنے والے ان سوالات کے جوابات اسے نہ مل سکے اور بہ فرضِ محال کوئی اس کے ہر سوال کا جواب دے بھی دیتا تو اس سے تیمور کو واپس نہیں آنا تھا۔ جانے والے بھلا کب لوٹ کے آتے ہیں۔

ایک، ڈیڑھ ماہ میں حامد علی بھی اپنے لختِ جگر کے غم میں چل بسا۔ چھوٹے بھائی اور پھر باپ کی موت نے دانیال کو اندر باہر سے توڑ کر رکھ دیا۔ اس امر میں کسی شک کی گنجائش نہیں تھی کہ تیمور کے صدمے نے حامد علی کو موت کے منہ میں دھکیلا تھا اور یہ حقیقت بھی روزِ روشن کے مانند عیاں تھی کہ تیمور کی ہلاکت کی ذمے دار منشیات تھی۔ گویا دانیال کی ہنستی بستی زندگی کو ویران کرنے والے دشمن کا نام تھا...... ڈرگز۔

دانیال گیراج کے کام سے بچ رہنے والے وقت کو منشیات اور منشیات فروشوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے میں صرف کرنے لگا پھر ایک ایسا وقت بھی آیا کہ گیراج کے کام پر اس کی توجہ ماند پڑنے لگی۔ اس کی تحقیق اور تفتیش کا مرکز و محور نشہ آور اشیا اور ان کا کاروبار کرنے والے افراد تک محدود ہو کر رہ گیا۔ تب اس پر انکشاف ہوا کہ یہ زہریلی وبا گلی کوچوں سے نکل کر تعلیمی مراکز کا رخ کر

چکی ہے۔ مختلف اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ڈرگز کو پہنچانے کا کام زور و شور سے جاری تھا۔ ہر تیسرا، چوتھا نہ سہی مگر ہر دسواں، گیارہواں اسٹوڈنٹ اس موذی مرض میں مبتلا ہو چکا تھا۔ جب دانیال نے ایسی خطرناک معلومات حاصل کر لی تھیں تو کیا صاحبِ اختیار اور صاحبِ اقتدار اس سفاک حقیقت سے بے خبر تھے؟ ہرگز نہیں۔ بہت سے لوگوں نے سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی اپنی آنکھیں بند کر رکھی تھیں، زبانوں پر تالے ڈال رکھے تھے۔ نوجوان تعلیم یافتہ نسل اخلاقی، ذہنی اور جسمانی دلدل میں کس تیزی سے دھنستی چلی جا رہی تھی، اس کی کسی کو پروا نہیں تھی۔ دانیال نے یہ پروا کرنے کا بیڑا اٹھا لیا۔

اس نے اپنے آپ سے عہد کر لیا تھا کہ وہ نشے کی لعنت کے خلاف جہاد کرے گا۔ اس نے اسی جنگ کو اپنا مقصدِ حیات بنا لیا۔ اس کے آگے پیچھے کوئی نہیں تھا جس کی اسے فکر ہوتی۔ وہ گیراج میں کام کر کے اتنا کما لیتا تھا جو اس کی گزر بسر کے لیے کافی تھا۔ وہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے اس نئے کام میں جُت گیا۔

جلد ہی دانیال کو اندازہ ہو گیا کہ یہ اتنا آسان نہیں جتنا اس نے سمجھ لیا تھا۔ اس گھناؤنے کاروبار کی جڑیں بہت دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ کینسر کے خوفناک مرض کے مانند اس عفریت نے نوجوان نسل کی غالب اکثریت کو کسی نہ کسی انداز میں اپنے خون آشام پنجوں میں جکڑ رکھا تھا۔ اس سلسلے میں گلی محلے اور فٹ پاتھیا قسم کے ڈرگز سپلائی کرنے والے چھوٹے موٹے جرائم پیشہ افراد سے اس کی جھڑپیں بھی ہوئیں جس کے نتیجے میں اس کی ایک شناخت بن گئی اور یہ شناخت بڑی شرمناک تھی۔ پولیس کی نظر میں، منشیات فروشوں نے دانیال کو ڈرگز سپلائر مشہور کر دیا۔

دانیال ہاتھ پاؤں کا مضبوط تھا۔ موٹر مکینکی نے اسے سخت جان اور جفاکش بھی بنا دیا تھا لہٰذا جو بھی منشیات فروش اس کے ہتھے چڑھا، دانیال نے طبیعت سے اس کی دھلائی کر ڈالی تھی۔ اسی کے نتیجے میں ان لوگوں نے دانیال کو بھی اپنا بھائی بند مشہور کر دیا تھا۔ دانیال کو اس بات کا تو اندازہ ہو چکا تھا کہ ان سڑک چھاپ منشیات فروشوں کا دھندا کسی نہ کسی طور پولیس والوں کے تعاون ہی سے چلتا ہے۔ جب دو تین بار مار پیٹ کے بعد اسے حوالات یاترا کی ''سعادت'' نصیب ہوئی تو یہ معاملہ اور بھی کھل کر اس کے سامنے آ گیا۔ ڈھکے چھپے الفاظ میں اسے باور کرایا گیا کہ جو بھی کرنا ہے، کرو مگر ہمارا حصہ ہمیں پہنچاؤ ورنہ ہم تمہیں حوالات میں پہنچاتے رہیں گے۔

جہاں دس لوگ بُرے ہوتے ہیں وہاں ایک آدھ اچھا انسان بھی موجود ہوتا ہے جس کی موجودگی سے ان دس افراد کی برائی زیادہ نمایاں دکھائی دینے لگتی ہے۔ ایسے ہی ایک پولیس والے سے دانیال کی ملاقات ہو گئی۔

انسپکٹر اعظم شاہ کو اس تھانے میں تعینات ہوئے چند ماہ ہی ہوئے تھے جب دانیال ایک بار پھر دنگا فساد اور مار پیٹ کے الزام میں تھانے پہنچ گیا۔ اس مرتبہ بھی نقضِ امن کے علاوہ منشیات فروشی کا ٹھپا اس کے ساتھ لگا ہوا تھا۔

ایک رات حوالات میں بند رکھنے کے بعد تھانہ انچارج اعظم شاہ نے اسے اپنے کمرے میں بُلا لیا۔ اس وقت ان دونوں کے سوا کمرے میں اور کوئی موجود نہیں تھا۔

''بیٹھ جاؤ۔'' انچارج نے اپنی میز کی دوسری جانب رکھی کرسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قدرے نرم لہجے میں کہا۔

دانیال ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ یہ تھانے دار دانیال کو بہت مختلف لگا تھا۔ اس کے انداز میں عام تھانے داروں والی سختی بلکہ بے حسی نہیں پائی جاتی تھی۔ وہ سلجھا ہوا ایک کریم النفس انسان تھا۔

''فرہاد! میں نے تمہارے ریکارڈ کا جائزہ لیا ہے۔'' اعظم شاہ اس کے چہرے پر نگاہ جما کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''تم مہینے، دو مہینے میں سرکاری مہمان نوازی کا لطف اٹھانے یہاں آتے رہتے ہو اور وہ بھی ایک جیسے الزامات کے ساتھ...... لڑائی بھڑائی...... منشیات فروشی، بلوا، بلوا، جبکہ تم ایسے لگتے نہیں ہو۔''

''آپ کا اندازہ بالکل درست ہے سر۔'' دانیال (فرہاد) نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں ہر اس چیز کے خلاف ہوں جس کے الزام میں مجھے گرفتار کر کے یہاں لایا جاتا ہے۔''

''انٹرسٹنگ......!'' اعظم شاہ کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک پیدا ہوئی۔ ''میں تمہاری کہانی سننا چاہتا ہوں، تمہاری اصلیت جاننا چاہتا ہوں۔''

''کسی تھانہ انچارج کو میں نے پہلی بار اپنی ذات میں دلچسپی لیتے دیکھا ہے۔''

''تو پھر شروع ہو جاؤ۔'' اعظم شاہ نے توانا لہجے میں کہا۔ ''میں صرف سچ سننا چاہتا ہوں۔''

''میرے پاس سچ کے سوا کہنے کے لیے اور کچھ ہے بھی نہیں سر......'' دانیال نے ٹھوس انداز میں کہا۔

آئندہ آدھے گھنٹے میں دانیال نے انسپکٹر اعظم شاہ کو بلاکم و کاست اپنے حالات سے آگاہ کر دیا۔ اعظم شاہ نے پوری توجہ سے دانیال کی بپتا سنی اور اس کے خاموش ہونے پر جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔

"تم کام کے آدمی ہو لہٰذا تم سے کام کی بات ہو سکتی ہے۔"

اعظم شاہ کے پُراسرار انداز نے دانیال کو اُلجھن میں ڈال دیا۔ اس نے متذبذب لہجے میں کہا۔ "میں کچھ سمجھا نہیں سر......؟"

"تمہاری طرح میرے دماغ میں بھی ایک خاص قسم کا کیڑا کلبلاتا رہتا ہے فرہاد۔" اعظم شاہ نے پُرخیال انداز میں کہا۔ "سچائی کی سربلندی اور جھوٹ کے خاتمے کا کیڑا لیکن میں ابھی تک اس مشن میں چھوٹی موٹی جزوی کامیابیاں ہی حاصل کر پایا ہوں کیونکہ پولیس ڈپارٹمنٹ میں مجھے اپنے اوپر اور نیچے کوئی ایسا آدمی نہیں ملا جس پر میں آنکھیں بند کر کے بھروسا کر سکوں۔ گزشتہ پانچ سال میں یہ میرا ساتواں ٹرانسفر ہے۔ مجھے زیادہ عرصے تک کسی ایک تھانے میں ٹک کر کام نہیں کرنے دیا جاتا۔ میرے کام کرنے کے انداز سے محکمے کے دوسرے لوگوں کو تکلیف ہونے لگتی ہے۔ "نہ کھاؤ اور نہ کھانے دو" کی پالیسی بھلا کس کو پسند آئے گی؟ میرے کہنے کا یہ مقصد نہیں کہ آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔ یقیناً پولیس ڈپارٹمنٹ میں بھی معدودے چند فرض شناس پولیس آفیسر موجود ہیں لیکن اسے میری بدقسمتی سمجھ لو کہ ابھی تک مجھے اپنے کسی ہم خیال کے ساتھ کام کرنے کا موقع نہیں ملا۔"

"آپ کی باتیں وزن دار ہیں سر اور میں آپ سے مکمل اتفاق کرتا ہوں۔" دانیال نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ "لیکن میں سمجھ نہیں پا رہا کہ آپ یہ سب مجھے کیوں بتا رہے ہیں؟"

"اس لیے کہ مجھے تمہارے اندر وہ شخص نظر آ رہا ہے جو میرے کندھے سے کندھا ملا کر چل سکتا ہے۔" اعظم شاہ نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "میں کافی عرصے سے کسی ایسے ہی بندے کی تلاش میں تھا۔ نڈر، جی دار، اچھائی کا علم بردار، برائی کے خلاف برسرِپیکار اور خانگی ذمے داریوں سے کلی طور پر مبّرا...... یہ ساری خصوصیات تمہارے اندر موجود ہیں۔ جو کام میں یونیفارم میں رہتے ہوئے نہیں کر سکتا، وہ سب کچھ تم کسی کی پروا کیے بغیر بہ آسانی کر سکتے ہو۔ تم ایک فلی لوڈڈ ہینڈ گن ہو۔ بس، تمہارا ٹریگر دبانے والا کوئی ہونا چاہیے۔ مجھے نہیں معلوم......" لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر اُمید بھری نظر سے دانیال کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"میں نہیں جانتا کہ اس تھانے میں کتنا عرصہ ٹک سکوں گا۔ اگر تم میرا ساتھ دو تو ہم دونوں مل کر برائی کے خاتمے کے لیے کوئی بڑا قدم اٹھا سکتے ہیں۔ میں یونیفارم میں اور تم سادہ لباس میں رہ کر۔ ایک بات ذہن میں رکھنا فرہاد کہ یہ گفتگو صرف ہم دونوں کے بیچ ہی رہنا چاہیے۔ اگر تم پیٹ کے ہلکے ثابت ہوئے تو نقصان ہی اٹھاؤ گے۔"

اعظم شاہ کے آخری جملے سے ایک خاموش تنبیہ جھلکتی تھی۔ دانیال نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "سر! میں زبان کا دھنی اور پیٹ کا مضبوط ہوں۔ میں ایک عمیق اور مبسوط سینے کا مالک ہوں۔ آپ کے راز کو راز رکھنے کے لیے میں اپنی جان تک دے سکتا ہوں۔" بات کے اختتام پر دانیال خاصا جذباتی ہو گیا تھا۔

اعظم شاہ نے معتدل انداز میں کہا۔ "ہاں، میں جانتا ہوں کہ تمہاری گردن تو کٹ سکتی ہے مگر زبان نہیں کھل سکتی۔ اگر مجھے تم پر بھروسا نہ ہوتا تو میں یہ حساس موضوع تمہارے سامنے چھیڑتا ہی نہیں۔ میں نے تمہارے اندر کچھ دیکھا ہے تو یہ گفتگو کر رہا ہوں نا......"

"تو پھر بتائیں سر......" دانیال نے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔ "کام کا آغاز کہاں سے کرنا ہے؟"

"تنے سے "بسم اللہ" کر کے جڑ پر "فاتحہ" پڑھنا ہے۔" اعظم شاہ نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"آسان الفاظ میں سمجھائیں سر......" دانیال نے منت آمیز لہجے میں کہا۔

"تمہاری طرح میں بھی موت کے سوداگروں کے خلاف ہوں۔" اعظم شاہ نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "ڈرگ ڈیلرز اپنی منفعت کے لیے اس قوم کے نوجوانوں کی رگوں میں زہر بھر رہے ہیں۔ نشے کے عادی افراد کی تعداد میں جتنا اضافہ ہوگا، ان ضمیر فروشوں، غلیظ باطن معاشرتی ناسوروں کی آمدنی بھی اتنی ہی تیزی سے بڑھے گی۔ منشیات کی وبا کسی قدآور، تنومند درخت کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ تم نے ابھی تک اس مہلک درخت کے پتوں اور ٹہنیوں ہی سے نبردآزمائی کی ہے جبکہ میں اس زہریلے درخت کے تنے سے گہری واقفیت رکھتا ہوں اور میری خواہش ہے کہ میں اس تنے کے نیچے سینڈھ لگا کر اس کی جڑوں تک پہنچوں اور پھر اس تن آور خبیث درخت کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دوں۔"

"آپ کی بات میری سمجھ میں آرہی ہے سر۔" دانیال نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی بھی پیڑ کے پتوں اور شاخوں کی تراش خراش سے اس کی صحت اور مضبوطی میں اضافہ ہی ہوتا ہے۔ اگر اس درخت کو صفحۂ ہستی سے مٹانا مقصود ہو تو پھر اسے جڑ سے اکھاڑ کر پھینکنا ضروری ہو جاتا ہے۔"

"اس زہریلے درخت کے تنے کا نام ہے سکندر بھائی۔" اعظم شاہ نے انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔ "اس شہر کا سب سے بڑا ڈرگز ڈیلر۔ اس غلیظ بزنس میں کوئی اس کا ہم پلا تو کیا، اس کا پاسنگ بھی نہیں ہے لیکن اس کی حیثیت ایک فرنٹ مین کی سی ہے۔ وہ منشیات کا پروڈیوسر نہیں ہے بلکہ یہ ذلالت کہیں اور سے اس کے پاس پہنچتی ہے۔ وہ اس نشیلی موت کو مہنگے داموں تھوک کے حساب سے خریدتا ہے پھر شہر کے چھوٹے منشیات فروشوں میں ڈسٹری بیوٹ کر کے اس دھندے میں لگائی ہوئی اپنی رقم کو چوگنا کر لیتا ہے، یعنی چار سو فیصد منافع کے ساتھ۔ دنیا کے کسی اور کاروبار میں اس قدر پرافٹ مارجن ممکن نہیں ہے۔" وہ سانس ہموار کرنے کی غرض سے متوقف ہوا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"سکندر نے اپنے اس گھناؤنے روپ کو دنیا والوں کی نگاہوں سے چھپا کر رکھا ہوا ہے۔ لوگ اس کے معزز چہرے کو جانتے ہیں۔ وہ اس شہر کا ایک کامیاب بزنس مین ہے۔ اسے رئیل اسٹیٹ بزنس کا کنگ مانا جاتا ہے۔ فرض کرو، اگر کسی طرح سکندر بھائی کو آہنی سلاخوں کے پیچھے پہنچا بھی دیا جائے تو یہ اس گمبھیر مسئلے کا حل نہیں ہے فرہاد...... یہ تو ایسا ہی ہوگا کہ موذی درخت کا تنا کاٹ کر پھینک دیا جائے مگر اس کی زہریلی جڑوں کو زیرِ زمین موجود رہنے دیا جائے۔ سکندر کے منظرِ عام سے ہٹ جانے کے بعد اس کی جگہ پر کسی اور کمینے شخص کو تعینات کر دیا جائے گا۔ یعنی جڑوں کو ایک نیا تنا مل جائے گا۔ وہ اسی تنے کی "صحت اور تندرستی" کے لیے اسے مضرِ صحت زہریلی خوراک پہنچانا شروع کر دیں گی اور منشیات فروشی کا یہ مکروہ دھندا بغیر کسی تعطل کے جاری وساری رہے گا۔"

"آپ اس منحوس درخت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا عزم رکھتے ہیں۔" دانیال نے اعظم شاہ کے خاموش ہونے پر کہا۔ "اس سلسلے میں آپ کا منصوبہ کیا ہے؟"

"میں تمہیں نہایت ہی صفائی کے ساتھ سکندر کے سیٹ اَپ میں داخل کرنا چاہتا ہوں۔" اعظم شاہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "سکندر کے منشیات کے دھندے میں ہمارا ایک مخبر پہلے سے موجود ہے لیکن وہ نچلے درجے پر کام کر رہا ہے۔ ڈرگز کی ڈیلنگ کے معاملات تک اس کی رسائی نہیں ہے۔ یہ کام سکندر اپنے دستِ راست سرفراز کے ذریعے کرتا ہے اور سرفراز کو توڑنا ممکن نظر نہیں آتا۔ سکندر اپنے اس رائٹ ہینڈ سرفراز پر اندھا اعتماد کرتا ہے۔ میرے منصوبے کے مطابق، تمہیں سکندر کے گینگ میں گھس کر سرفراز کے مقام تک پہنچنا ہے۔ اگر ایسا ہو جاتا ہے اور یقیناً ایسا ہی ہوگا تو پھر ہمارا کام آسان ہو جائے گا۔"

"سر! میں جاننا چاہوں گا کہ سکندر کے گینگ میں میرا داخلہ کس طرح ممکن ہو پائے گا؟" دانیال نے پوچھا۔ "میں آپ سے مکمل تعاون کے لیے تیار ہوں۔ بس، یہ سوال میں نے اپنی تسلی کے لیے کیا ہے۔"

"یہ تمہارا حق ہے فرہاد۔" اعظم شاہ نے رسان بھرے لہجے میں کہا۔ "میں تمہیں سمجھاتا ہوں۔"

دانیال ہمہ تن گوش ہو گیا۔

اعظم شاہ نے ایک کاغذ پر کچھ لکھا پھر اس کاغذ کو دانیال کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اس پرچے کو تم اپنے لباس میں کہیں چھپا لو۔ میں نے تمہیں ایک فلیٹ کا ایڈریس اور ایک فون نمبر لکھ کر دیا ہے۔ اس کے بارے میں تمہیں میں بعد میں بتاتا ہوں۔"

دانیال نے اس کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے مذکورہ پرچے کو تہ کر کے اپنے لباس میں ایک محفوظ جگہ پر رکھ لیا۔ اعظم شاہ نے اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

"میں تمہارے خلاف منشیات فروشی اور غنڈا گردی کا ایک سنگین مقدمہ بنا رہا ہوں اور کل صبح تمہیں عدالت میں پیش کر کے تمہارا سات دن کا ریمانڈ حاصل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ "کوشش" کا لفظ میں نے اس لیے استعمال کیا ہے کہ ایسا ہو نہیں سکے گا۔ عدالت پہنچنے سے پہلے ہی تم ایک اے ایس آئی کو شدید زخمی کر کے پولیس کی تحویل سے فرار ہو جاؤ گے......"

"مگر سر......!" وہ بے یقینی سے انسپکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "یہ سب ہوگا کیسے؟"

"میں بتا رہا ہوں نا......" اعظم شاہ نے سرزنش کرنے والے انداز میں کہا۔ "تم بیچ میں نہ بولو اور میری بات کو توجہ سے سنتے جاؤ۔"

"سوری سر!" دانیال معذرت خواہانہ انداز میں

بولا۔ ''اب میں قطع کلامی کی جسارت نہیں کروں گا۔''

''اے ایس آئی یعقوب اس تھانے کا سب سے زیادہ بدعنوان پولیس اہلکار ہے۔'' اعظم شاہ نے معتدل انداز میں کہا۔ ''اگر تم فرار کی کوشش کے دوران میں، یعقوب کے پیٹ میں ایک دو گولیاں اتار دو گے تو مجھے ازحد خوشی ہوگی۔ ایک کرپٹ انسان کو اذیت میں مبتلا دیکھ کر یقیناً تمہیں بھی کافی سکون محسوس ہوگا...... ہیں نا؟''

اعظم شاہ نے آخری جملے کے بعد چونکہ سوالیہ نظر سے دانیال کی جانب دیکھا تھا لہٰذا لب کشائی اس پر واجب ہوگئی تھی۔ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جلدی سے بولا۔

''یس سر...... بہت زیادہ۔''

''ایک حد تک میں تمہاری مدد کروں گا اور دوسری حد تک تمہیں نہایت ہی پھرتی کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔'' اعظم شاہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سلسلۂ کلام کو آگے بڑھادیا۔ ''میں تمہیں ایک معقول رقم اور ہتھکڑی کی چابی کے علاوہ یعقوب کی چند کمزوریوں سے آگاہ کروں گا اور تم اس کی انہی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، اس کے سروس پسٹل پر قبضہ کر کے اسے شدید زخمی کرنے کے بعد فرار ہو جاؤ گے۔ تم نے پولیس کی تحویل سے نکلتے ہی لوگوں کے ہجوم میں شامل ہو کر پہلی فرصت میں اپنی ہتھکڑی کو کھولنا ہے اور کوئی رکشا پکڑ کر اس ایڈریس پر پہنچ جانا ہے جو میں نے لکھ کر تمہیں دیا ہے۔ وہ ایک خالی فلیٹ ہے۔ میں تمہیں اس کی چابی بھی دے دوں گا۔ اتنا کر لو گے نا......؟''

''بالکل کر لوں گا سر۔'' وہ پورے تیقن سے بولا۔

''ویری گڈ۔'' اعظم شاہ نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

دانیال پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''اور وہ فون نمبر کس کا ہے سر......!''

''وہ میرا اسپیل نمبر ہے۔'' اعظم شاہ نے بتایا۔ ''مجھے اُمید ہے کہ اس فلیٹ پر تمہیں کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ میں کل کسی وقت تم سے خود ہی ملاقات کروں گا اور آگے کی منصوبہ بندی کے بارے میں تمہیں تفصیلاً بتاؤں گا۔ یہ نمبر میں نے کسی ہنگامی صورتِ حال کے لیے دیا ہے۔ اگر کسی ناگہانی سے پالا پڑ جائے تو تم مجھے میسج یا کال کر سکتے ہو۔ مجھے یقین ہے، تم میری بات سمجھ گئے ہو گے؟''

دانیال نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''جی سر...... سمجھ گیا۔''

''ٹھیک ہے۔'' اعظم شاہ نے سرسری انداز میں کہا۔ ''میں تمہیں دوبارہ حوالات میں بند کر رہا ہوں۔ کل صبح سے پہلے میں اپنے حصے کا کام کر دوں گا۔ اس کے بعد تمہارا کام شروع ہوگا...... آل دی بیسٹ۔''

دانیال ممنونیت بھری نظر سے اسے تکنے لگا۔

☆☆☆

دانیال ''ہمتِ مرداں، مددِ خدا'' کے فلسفے پر یقین رکھتا تھا۔ اس کے اندر ہمت کی کمی تھی اور نہ ہی جرأت کا فقدان۔ جس شخص کے پاس ہارنے کے لیے کچھ نہ ہو اس کے اندر بہادری خود بخود آ جاتی ہے۔ احساسِ زیاں انسان کو کمزور بنانے کا سب سے بڑا سبب ہے اور دانیال سود و زیاں سے بے نیازی حاصل کر چکا تھا۔ اس کے پیچھے رونے والا کوئی نہیں تھا۔ اس کے پاس صرف اپنی ایک جان تھی اور وہ اپنی اس اکلوتی متاع کو نشے کی لعنت کے خلاف جہاد کرتے ہوئے، لٹانے کے لیے ہمہ وقت تیار تھا۔

ان دونوں نے جو سوچا تھا وہ بہ خیر و خوبی انجام پا گیا۔ دانیال ہتھکڑی سے نجات حاصل کرنے کے بعد اعظم شاہ کے بتائے ہوئے ایڈریس پر پہنچ گیا تھا۔ یعقوب سے چھینے ہوئے سرکاری پسٹل کو اس نے جائے فرار پر ہی پھینک دیا تھا۔ اگلے روز دوپہر میں اعظم شاہ اس سے ملنے آ گیا۔ وہ اپنے ساتھ ایک تازہ اخبار بھی لایا تھا۔ اس نے مذکورہ اخبار دانیال کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

''فرہاد! تم تو خاصے فیمس ہو گئے ہو۔''

آج کے تمام اخبارات میں فرہاد نامی ایک منشیات فروش کے فرار کی خبر شائع ہوئی تھی جو تھانے سے کورٹ جاتے ہوئے ایک اے ایس آئی کو شدید زخمی کر کے انسانوں کی بھیڑ میں غائب ہو گیا تھا۔

''یہ تو ہو گیا سر۔'' دانیال نے سوالیہ نظر سے انسپکٹر کی طرف دیکھا۔ ''اب آگے کیا کرنا ہے۔ آپ کس طرح مجھے سکندر بھائی کے گینگ میں پلانٹ کریں گے؟''

''میری بات دھیان سے سنو گے تو سب سمجھ میں آ جائے گا۔'' اعظم شاہ نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ''آئندہ دو ماہ میں، میں تمہیں ایک خطرناک جرائم پیشہ شخص اسٹیبلش کر دوں گا۔ تم اپنا شناختی کارڈ، ڈرائیونگ لائسنس اور دیگر آئی ڈیز میرے حوالے کر دو گے۔ میں نامعلوم افراد کی سنگین وارداتوں کو تمہارے کھاتے میں ڈالتا جاؤں گا۔ جب جائے وقوعہ سے تمہاری ذات سے متعلق کوئی آئی ڈی ملے گی تو خود بہ خود وہ واردات تمہارے نام پر رجسٹر ہو

جائے گی۔ دیکھتے ہی دیکھتے تم جرائم کی دنیا میں ایک قدآور شخص کی حیثیت حاصل کرلو گے۔ اس کے بعد تمہیں سکندر بھائی کے گینگ میں داخل کیا جائے گا اور وہ بھی اسی کے آدمیوں سے ایک خوں ریز جھڑپ کے بعد۔ اس جھڑپ کا بندوبست ہمارا وہی مخبری کرے گا جو وہاں پہلے سے موجود ہے۔ میرا اشارہ مخبر جمال کی جانب ہے۔''

''آپ دو ماہ میں جب مجھے ایک مجرم کی حیثیت سے اسٹیبلش کررہے ہوں گے، اس دوران میں، میں کیا کروں گا؟'' دانیال نے ایک اہم سوال کیا۔

''تم اسی فلیٹ میں قیام کرو گے اور اپنی صحت و تندرستی کا خاص خیال رکھو گے۔'' اعظم شاہ نے معتدل انداز میں کہا۔ ''میں گاہے بہ گاہے تم سے ملنے آتا رہوں گا۔ تازہ اخبار اور مختلف میگزین تم تک پہنچتے رہیں گے۔ تم نے مختلف قسم کی گنز کے بارے میں اپنی معلومات کو توانا بنانا ہے اور جرائم کی دنیا کے رنگ ڈھنگ کو اپنی ذات میں شامل کرنا ہے۔ میں تمہیں گن چلانا بھی سکھا دوں گا۔ تمہیں ایک سرٹیفائڈ کرمنل کا روپ دھارنا ہے فرہاد تاکہ سکندر بھائی تمہیں سر آنکھوں پر بٹھائے اور ہمارا کام آسان ہو جائے۔''

''سر! آپ کی پلاننگ زبردست ہے۔'' دانیال نے تعریفی نظر سے اعظم شاہ کی جانب دیکھا۔ ''میں آپ کی توقعات پر پورا اُترنے کی کوشش کروں گا۔ بس، آپ مجھے اتنا بتا دیں کہ اس فلیٹ میں، میں کس حیثیت سے دو ماہ گزاروں گا؟''

''تم ایک فری لانس رائٹر ہو اور اپنے کسی نئے ناول کی تخلیق کے لیے یہاں قیام پذیر ہوگئے ہو۔'' اعظم شاہ نے کہا۔ ''قلم کار لوگ دوسروں سے زیادہ گھلتے ملتے نہیں ہیں لہٰذا کوئی تمہیں ڈسٹرب نہیں کرے گا اور نہ ہی تمہاری لاتعلقی اور خشک مزاجی کا بُرا منائے گا۔ شاعر اور ادیبوں کو جھکی اور کھسکے ہوئے سمجھا جاتا ہے۔ تمہارا رائٹر ہونا تمہیں خاصا محفوظ اور پُرسکون رکھے گا۔ میں تمہارے لیے ایک سیل فون بھی لے کر آیا ہوں تاکہ کسی ایمرجنسی کی صورت میں تم مجھ سے رابطہ کرسکو۔ ویسے مجھے نہیں امید کہ کبھی ایسی کوئی سچویشن پیدا ہوگی۔ میں نے اس فلیٹ کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔''

''مجھے تو یہ سب کسی انگلش موی کے جیسا لگ رہا ہے۔'' دانیال نے کہا۔ ''ایکشن اور سسپنس سے بھرپور، انتہائی سنسنی خیز......''

''کوئی موی ہو یا ڈراما، اس کی انسپائریشن سوسائٹی ہی سے ملتی ہے۔'' اعظم شاہ نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''انسان کے مختلف روپ ہیں اور مختلف کردار۔ اس کی سرگزشت پاکیزہ بھی ہے اور سسپنس و جاسوسی سے بھرپور بھی لہٰذا ہر انسان کو اپنا کردار خوش اسلوبی سے نبھانا چاہیے۔''

''سر! آپ پولیس والے کم اور فلسفی زیادہ لگتے ہیں۔'' دانیال نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''تم نے ٹھیک پہچانا۔'' اعظم شاہ نے ٹھوس انداز میں جواب دیا۔ ''اسی لیے میں پولیس ڈپارٹمنٹ میں مس فٹ ہوں، خیر......'' لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک افسردہ سانس خارج کی پھر دانیال کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''پہلے میرے ساتھ صرف میری قسمت تھی اور اب تمہارا نصیب بھی نتھی ہوگیا ہے۔ ہوپ فلی ہمارا یہ جوائنٹ وینچر کامیابی سے ہمکنار ہوگا۔ تمہیں کچھ پوچھنا تو نہیں؟''

دانیال نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''نو سر۔''

آئندہ دو ماہ کے اندر اعظم شاہ کی خفیہ کوششوں سے دانیال شہر کا ایک خطرناک کرمنل مشہور ہوگیا۔ اس کے نام یعنی فرہاد کے ساتھ ''موسٹ وانٹڈ'' کا لیبل بھی لگ گیا تھا۔ اسی دوران میں اعظم شاہ نے اس کی ایک نئی آئی ڈی بھی تیار کروالی جس کے مطابق وہ دانیال تھا...... ایک کمرشل فری لانس رائٹر۔ شناختی کارڈ، پاسپورٹ اور دیگر دستاویزات دانیال ہی کے نام سے بنوائی گئی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی دانیال (فرہاد) نے اپنے حلیے اور اسٹائل میں بھی نمایاں تبدیلیاں کرلی تھیں۔ وہ اس معاشرے کا دانیال نامی ایک معزز شہری بن چکا تھا اور پولیس کو ہسٹری شیٹر فرہاد کی تلاش تھی جو دانیال کے اندر پناہ گزیں تھا۔

دو ماہ بعد اعظم شاہ کی ہدایت پر جمال نے سکندر بھائی کے آدمیوں کے ساتھ دانیال کی مڈبھیڑ کا بندوبست کر دیا اور پھر خود ہی جاکر سکندر کے دستِ راست سرفراز کو بتایا کہ دانیال دراصل وہی فرہاد ہے جس نے پچھلے کچھ عرصے سے قانون اور اس کے رکھوالوں کو ناکوں چنے چبوا رکھے ہیں۔

سرفراز کے ذریعے یہ سنسنی خیز خبر سکندر بھائی تک پہنچ گئی۔ فرہاد نے کس طرح پولیس کو تگنی کا ناچ نچا رکھا تھا، یہ بات سکندر اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ جرائم کی دنیا میں پائے جانے والے ایسے ہیروں کا قدرداں تھا۔ اس نے دانیال

کے ساتھ میٹنگ فکس کرنے کے لیے سرفراز کو خصوصی ہدایات جاری کردیں۔

☆☆☆

وہ دونوں سکندر بھائی کے ایک خفیہ محفوظ ٹھکانے پر ایک دوسرے کے سامنے صوفوں پر بیٹھے تھے۔ یہ ایک انتہائی اہم ون ٹو ون ملاقات تھی۔ سکندر کی متاثر کن شخصیت دانیال کو مرعوب نہ کرسکی کیونکہ سکندر کا گھناؤنا کردار اسے ازبر تھا تاہم اس نے اپنے چہرے کے تاثرات اور بدن کی کسی جنبش سے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ اپنے دل و دماغ میں سکندر کے لیے نفرت کا ایک عظیم طوفان چھپائے پھرتا ہے۔

رسمی علیک سلیک کے بعد سکندر نے دانیال کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم کب فرہاد سے دانیال بن گئے، مجھے پتا ہی نہیں چلا۔ بہرحال، دیر آید درست آید۔ میں بہادر لوگوں کی بہت قدر کرتا ہوں اور جو قانون کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے فن سے واقف ہوں اور پولیس کے ساتھ آنکھ مچولی جن کی سرشت میں شامل ہو، انہیں تو میں دل سے لگا کر رکھتا ہوں اور تم ایک ایسے ہی انسان ہو۔ تم نے میرے بندوں پر ہاتھ ڈال کر اپنی جی داری کو ثابت کردیا ہے۔''

''بھائی! یہ سب میں نے ایک خاص مقصد کے تحت کیا تھا۔'' دانیال نے سہمنے کی جاندار اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

''ہوں۔'' سکندر نے ٹٹولتی ہوئی نظر سے اسے گھورا پھر معنی خیز انداز میں استفسار کیا۔ ''تو تمہارا وہ مقصد پورا ہوا؟''

''جی بھائی! اسی لیے تو میں اس وقت آپ کے سامنے بیٹھا ہوں۔'' دانیال نے سپاٹ آواز میں کہا۔ ''میں نے صرف آپ کا نام سنا تھا اور میرے دل میں آپ سے ملنے کی شدید خواہش تھی مگر آپ تو عید کے چاند سے بھی زیادہ نایاب ہیں۔ میں نے آپ تک رسائی حاصل کرنے کی جو بھی کوشش کی وہ بارآور نہ ہوسکی۔ بالآخر، آپ کی نگاہ میں آنے کے لیے مجھے ناٹک کرنا پڑا۔ میں بلاوجہ آپ کے بندوں سے بھڑ گیا تھا۔''

''نہ صرف بھڑ گئے تھے بلکہ انہیں اچھا خاصا دھو بھی ڈالا تم نے......'' سکندر قطع کلامی کرتے ہوئے ٹھوس انداز میں بولا۔ ''چار کے مقابلے میں ایک...... مجھے تمہارا یہ ناٹک اچھا لگا۔ تم میری نگاہ ہی میں نہیں بلکہ دل میں بھی اُتر چکے ہو مگر پھر بھی مجھے تمہاری حاضر دماغی اور قابلیت کو تو چیک کرنا ہی پڑے گا۔''

بات کے اختتام پر سکندر نے ایک گن نکال کر دانیال پر تان لی۔ یہ سکندر کی ایک غیر متوقع اور فوری حرکت تھی لیکن دانیال نے ذرا سی بھی گھبراہٹ یا حواس باختگی ظاہر نہیں کی اور پُراعتماد لہجے میں بولا۔

''فور فائیو کیلی بر، نائن انٹو نائنٹین ایم ایم، لانگ سلائڈ گن ودھ ڈوئل پورٹ ایبل بیرل، میڈ ان آسٹریا مگر پاکستان کی ایمونیشن مارکیٹ میں اس کی خرید و فروخت پر پابندی۔ یقیناً یہ ہینڈ گن کسی اسمگلر نے آپ کو گفٹ میں دی ہے۔''

''ونڈرفل...... تم نے تو مجھے حیران کردیا ہے۔'' سکندر اش اش کر اٹھا۔ ''میں تمہیں فرہاد کہوں یا دانیال؟''

''فرہاد تو کب کا ختم ہوچکا بھائی۔'' دانیال نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اب تو میں اول آخر دانیال ہی ہوں۔''

''دانیال!'' سکندر دلچسپی بھری نظر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے مستفسر ہوا۔ ''تم اس ہینڈ گن کی ہلاکت خیزی سے کماحقہ، واقف ہو، پھر بھی...... پھر بھی تمہارے چہرے پر خوف کا شائبہ تک دکھائی نہیں دے رہا...... کیوں، آخر کیوں؟''

آخری جملہ ادا کرتے ہوئے سکندر نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی گن کو دو تین بار خطرناک انداز میں حرکت بھی دی تھی۔ دانیال نے اطمینان بھرے انداز میں تاریخ ساز جواب دیا۔

''بھائی! آپ کے سامنے میرے تجربے کی وہی حیثیت ہے جو کسی پہاڑ کے مقابل رائی کے دانے کی اوقات...... بس، اتنا ہی عرض کروں گا کہ محبت کے بغیر دل، بیٹری کے بغیر سیل فون اور کلپ کے بغیر گن کس کام کی؟ آپ کی گن لوڈ نہیں ہے بھائی۔ اس کا میگزین نکلا ہوا ہے۔ اب یہ محض بغیر دستے کے کسی آہنی ہتھوڑے کے مانند ہے۔''

سکندر بے ساختہ اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ ''آؤ، میرے گلے لگ جاؤ۔'' اس نے جذبات سے مغلوب آواز میں کہا۔ ''تم نے میرا دل جیت لیا ہے۔ آج سے تم میرے بزنس کا حصہ ہو...... میرے خاص الخاص آدمی۔''

دانیال اور انسپکٹر اعظم شاہ نے مل کر جو منصوبہ بنایا تھا، یہ اس سلسلے کی ایک بڑی کامیابی تھی۔ سکندر نے دانیال کو

اس طرح اپنے ساتھ جوڑ لیا کہ بظاہر اس کا ڈرگز کے بزنس سے دور، دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ دنیا دکھاوے کے لیے سکندر نے اسے رئیل اسٹیٹ کے کاروبار میں ملازم رکھ لیا تھا اور کیش کی ڈیلنگ کا شعبہ اس کے سپرد کر دیا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ ''لکی اسٹیٹ'' کے عالی شان آفس میں بیٹھ کر وہ در پردہ سکندر کے خصوصی مشنز میں حصہ لیا کرتا تھا۔

آٹھ دس ماہ کی اَن تھک محنت نے دانیال کو سکندر کی آنکھ کا تارا بنا دیا تھا۔ اس دوران میں دانیال نے اپنی جان جوکھم میں ڈال کر سکندر کو کئی بڑی کامیابیاں بھی دلوائیں۔ لوہا گرم ہو چکا تھا اور چوٹ لگانے کا وقت آن پہنچا تھا۔ اعظم شاہ نے ایک ایسا پولیس مقابلہ ''منعقد'' کرایا جس میں سکندر کے دستِ راست سرفراز کی عبرت ناک موت واقع ہو گئی۔ اگلے ہی روز دانیال نے اس ویکنسی کو پُر کر دیا۔ اب وہ سکندر کا رائٹ ہینڈ بن گیا تھا، اس کے بیش تر رازوں کا امین اور اس کا سب سے زیادہ قابلِ بھروسا ساتھی۔

دانیال نے اس مشن کو بہ خیر و خوبی پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے دوطرفی جدوجہد کی تھی۔ یعنی ایک سمت اس نے کمال ہوشیاری سے سکندر کو شیشے میں اتار لیا تھا تو دوسری جانب وہ سکندر کی اکلوتی چھوٹی بہن ساحرہ کو اپنی محبت کے جال میں پھنسانے میں بھی کامیاب ہو گیا تھا۔ ساحرہ کا اکثر ''لکی اسٹیٹ'' کے آفس میں آنا ہوتا تھا اور وہ اپنے بھائی کے صرف اسی رئیل اسٹیٹ بزنس سے واقفیت رکھتی تھی۔ ساحرہ کو اپنی محبت کے دام میں لانے کا، دانیال کا ایک خاص مقصد تھا اور وہ یہ کہ وہ سکندر کی گھریلو مصروفیات اور انتہائی نجی معاملات پر بھی کڑی نگاہ رکھنا چاہتا تھا۔ چھ سات ماہ کی ملاقاتوں میں دانیال نے اچھی طرح یہ جان لیا تھا کہ سکندر اپنی اکلوتی بہن کو بے پناہ چاہتا تھا اور سب سے اہم بات یہ کہ ساحرہ، سکندر کی دولت، بزنس اور جائداد کی اکلوتی وارث تھی۔ سکندر نے شادی کا بکھیڑا نہیں پالا تھا اور دور و نزدیک اس کا کوئی اور عزیز بھی موجود نہیں تھا لہٰذا سکندر کے بعد اس کا سب کچھ ساحرہ ہی کے حصے میں آنا تھا۔

دانیال کو دولت کا لالچ نہیں تھا۔ وہ تو ایک کاز کے ساتھ جڑا ہوا تھا اور مطلب براری کے لیے وہ ساحرہ کو محبت نگری میں سنہرے مستقبل کے حسین خواب دکھا رہا تھا۔ ساحرہ، دانیال کی نیت سے واقف تھی اور نہ ہی وہ اس کی اصلیت کو جانتی تھی۔ محبت میں ریاکاری کا کوئی عمل دخل نہیں۔ ساحرہ بھی ہر قسم کے سود و زیاں سے بے نیاز ہو کر بس، محبت کیے چلے جا رہی تھی۔ اس محبت میں ساحرہ کے خلوص کو شک کی نگاہ سے دیکھنا کسی گناہِ کبیرہ سے کم نہیں تھا۔

اس دوران میں دانیال مسلسل اعظم شاہ کے ٹچ میں بھی تھا۔ اس نے سکندر کے گینگ میں وہ مقام حاصل کر لیا تھا جس کی ان دونوں نے مل کر منصوبہ بندی کی تھی۔ بس، اب اس دن کا انتظار تھا جب اس ڈرامے کا کلائمیکس .... کیا جاتا تھا اور پھر وہ دن آ گیا۔

دانیال، سکندر کے لیے سونے کا انڈا دینے والی مرغی تھی لہٰذا اس نے دانیال کے لیے ایک متوسط علاقے میں رہائش کا معقول بندوبست کر رکھا تھا۔ ایک رات اس نے اعظم شاہ کو فون کیا۔

''سر! آج سے چار روز بعد ہفتے کی شام ایک میگا ڈرگز ڈیل ہونے والی ہے۔ افغانستان کی ایک پارٹی براؤن شوگر (ہیروئن) کی بھاری مقدار لے کر یہاں پہنچ رہی ہے۔ میری معلومات کے مطابق، یہ وہی لوگ ہیں جن سے سکندر منشیات خریدتا ہے۔ وہ کل تین افراد ہوں گے جن میں اس گروہ کا سرغنہ ارجن بھی شامل ہے۔ باقی دو افراد کے نام قدیر اور نجیب ہیں۔ ہماری طرف سے میں اور سکندر جائیں گے۔ ہمارے پاس بریف کیس میں چار لاکھ یو ایس ڈی کی خطیر رقم ہو گی یعنی سو ڈالرز مالیت کے نوٹوں والے چالیس بنڈل ...... ہر بنڈل میں دس ہزار امریکی ڈالرز۔''

''یہ تو واقعی خاصی تگڑی رقم ہے۔'' اعظم شاہ نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''چار لاکھ یو ایس ڈی کا سیدھا سیدھا مطلب ہے، چھ کروڑ پاکستانی روپے اور یہ کم بخت سکندر چھ کروڑ روپے کی منشیات سے چار گنا یعنی چوبیس کروڑ بنا لے گا۔''

''نہیں بنا سکے گا سر......'' دانیال نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ہم اس کے آڑے آئیں گے۔ سکندر اور اس کے پرائیویٹ باپ ارجن کو چھاپنے کا اس سے اچھا موقع پھر کبھی ہاتھ نہیں آئے گا۔ چار لاکھ امریکی ڈالرز، بھاری مقدار میں براؤن شوگر اور دو کمینے جب آپ کے ہاتھ لگیں گے تو ہمارا مشن مکمل ہو جائے گا اور آپ کی ترقی تو پکی ہے سر......''

''تم نے اس ڈرگز ڈیلر کا نام ارجن بتایا ہے۔'' اعظم شاہ نے پوچھا۔ ''کیا وہ ہندو ہے؟''

''ہاں، بنیادی طور پر وہ انڈین ہندو ہے لیکن ایک طویل عرصے سے وہ کابل میں سیٹل ہے۔'' دانیال نے بتایا۔ ''اس کے پاس انڈیا اور افغانستان کی دہری شہریت ہے۔ وہ منشیات کے دھندے میں کافی عرصے سے ہے اور

اپنے گروہ کا سرخیل ہے۔ سکندر طویل مدت سے اس کے ساتھ کاروبار کررہا ہے۔ دونوں کے بیچ اعتماد کا رشتہ قائم ہے۔''

''ٹھیک ہوگیا ہے۔'' اعظم شاہ نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔ ''اب یہ بھی بتا دو کہ ہفتے کی شام یہ میگا ڈیل کہاں پر ہونے والی ہے؟''

''ڈاک یارڈ کے ایک دور افتادہ ویران حصے میں۔'' دانیال نے بتایا۔ ''میں ہفتے کی صبح آپ کو صد فیصد درست لوکیشن بھیج دوں گا۔''

''تم، سکندر، ارجن اور اس کے دو ساتھی قدیر و نجیب......'' اعظم شاہ نے کہا۔ ''یعنی اس ڈرگز ڈیل میں کل پانچ افراد شرکت کریں گے؟''

''یس سر! بالکل ایسا ہی ہے۔'' دانیال نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے پُرشوق انداز میں کہا۔ ''اگر اس پروگرام میں کوئی چھوٹی بڑی تبدیلی ہوئی تو میں آپ کو آگاہ کردوں گا۔''

''اوکے ڈن!'' اعظم شاہ نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''میں ''آپریشن سٹرڈے ایوننگ'' کی تیاری کرتا ہوں۔ تمہیں ایک کام کرنا ہوگا۔''

''جی سر! بتائیں......؟''

''اپنی حفاظت......!'' اعظم شاہ نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''نہ تم دونوں خالی ہاتھ ڈاک یارڈ پہنچو گے اور نہ ہی ارجن اینڈ کمپنی نہتے وہاں آئیں گے۔ یہ ایک سو بیس ملین روپے کی میگا ڈیل ہے یعنی ساٹھ ملین روپے، چار لاکھ امریکی ڈالرز کی شکل میں اور ساٹھ ملین روپے کی براؤن شوگر المعروف بہ ہیروئن...... اتنے بڑے ''خزانے'' کی حفاظت کے لیے ہر شخص پوری طرح لوڈ ہوگا۔ تم میری بات سمجھ رہے ہونا......!''

''اچھی طرح سمجھ رہا ہوں سر......'' دانیال نے یقین دلانے والے انداز میں کہا۔ ''میں جانتا ہوں، پولیس کی ریڈ سے ڈاک یارڈ کا وہ خاموش اور سنسان حصہ فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھے گا۔ آپ میری فکر نہ کریں سر۔ یہ مشن میرے لیے بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ مجھے اپنی جان کی کوئی پروا نہیں......''

''مگر مجھے تمہاری جان کی بہت زیادہ پروا ہے دانیال......'' اعظم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ابھی ہم نے ساتھ مل کر اور بہت ساری مہمات کو سر کرنا ہے۔''

''تھینک یو سر۔'' دانیال نے تشکرانہ انداز میں کہا۔ ''آپ کی اپنائیت جینے کا حوصلہ دیتی ہے۔ آپ نے میری زندگی کو ایک مقصد دے دیا ہے۔ ان شاء اللہ! ہم آخری سانس تک معاشرتی لعنتوں کے خلاف برسرِپیکار رہیں گے۔''

''ان شاء اللہ!'' اعظم شاہ نے تہِ دل سے کہا۔ ''کل کسی وقت تم مجھے اپنا پاسپورٹ دے دینا۔ میں اپنے ٹریول ایجنٹ سے کہہ کر تمہارا یو اے ای کا ویزا لگواتا ہوں۔ تم اتوار یا پیر کو دبئی روانہ ہو جاؤ گے۔ مشن کی کامیابی کی خوشی میں یہ تمہارا ہالیڈے ٹرپ ہوگا۔''

''جو آپ کا حکم سر۔'' دانیال نے فرماں برداری سے کہا۔

اس کے بعد وہ دونوں ہفتے کی شام والے آپریشن کی جزئیات پر گفتگو کرنے لگے۔ وہ اپنی منزل کے انتہائی نزدیک پہنچ چکے تھے۔

☆☆☆

رات کے دس بجے دانیال کے سیل فون کی گھنٹی بجی۔ وہ اس وقت اپنی رہائش گاہ پر تھا اور بستر پر دراز آج شام کے واقعات پر غور وفکر کررہا تھا۔ اس نے سیل فون اٹھایا تو یہ ساحرہ کی کال تھی۔ اس نے کال پک کرلی۔

''ہیلو......'' دانیال نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

دوسری طرف سے ساحرہ کی گھبرائی ہوئی آواز ابھری۔ ''دانیال...... تم اس وقت کہاں ہو؟''

''اپنے گھر پر ہوں۔'' وہ اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''تمہاری آواز سے پریشانی جھلک رہی ہے، سب خیریت تو ہے نا؟''

''میرا دماغ کام نہیں کررہا......'' وہ بے بسی سے بولی۔

''آخر ہوا کیا ہے۔'' دانیال نے پوچھا۔ ''کچھ بتاؤ تو......؟''

''میں سکندر بھائی کے لیے بہت فکرمند ہوں۔'' وہ اضطرابی لہجے میں بولی۔ ''انہوں نے آٹھ بجے گھر آنے کا وعدہ کیا تھا اور اب دس بج رہے ہیں۔''

دانیال جانتا تھا کہ ساحرہ کا بھائی اب کبھی اس سے ملنے والا نہیں۔ اس نے خود اپنی آنکھوں سے سکندر کی پیشانی میں ہوا دان بنتے دیکھا تھا مگر وہ یہ حقیقت ساحرہ کے سامنے بیان نہیں کرسکتا تھا۔

''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ساحرہ......'' وہ تشفی آمیز انداز میں بولا۔ ''سکندر صاحب ایک بزنس مین

ہیں۔ ہوسکتا ہے وہ کسی میٹنگ میں پھنس گئے ہوں۔ تم انہیں کال کرو۔''

''اس کی میں کئی بار کوشش کر چکی ہوں بلکہ میں انہیں مسلسل کال کرنے میں لگی ہوئی ہوں مگر ان کا نمبر سوئچڈ آف آرہا ہے۔'' ساحرہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اور جہاں تک کسی میٹنگ میں پھنسنے کا تعلق ہے تو مجھ سے زیادہ ان کے لیے کچھ بھی اہم نہیں ہے۔ وہ مجھ سے کیا ہوا وعدہ پورا کرنے کے لیے اپنا لاکھوں کا کاروباری نقصان کر سکتے ہیں۔''

''اوہ...... پھر تو واقعی تشویش کی بات ہے۔'' دانیال نے مصنوعی ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''میں لگ بھگ پانچ بجے ''لکی اسٹیٹ'' سے نکلا تھا۔ اس وقت سکندر صاحب آفس میں موجود نہیں تھے۔ وہ لنچ کے بعد کسی ضروری کام کا کہہ کر آفس سے روانہ ہوگئے تھے۔ وہ کب واپس لوٹے اس کا مجھے علم نہیں۔ تم ایک کام کرو۔'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''تم غنی صاحب سے ان کے بارے میں معلوم کرو۔''

غنی صاحب ''لکی اسٹیٹ'' کے انتظامی امور کو دیکھتے تھے۔ ساحرہ نے بتایا۔ ''میں غنی صاحب اور منصور صاحب سے پوچھ چکی ہوں۔ ان کے مطابق آفس بند ہونے تک بھائی واپس نہیں آئے تھے۔''

منصور صاحب اکاؤنٹس کو مینیج کیا کرتے تھے۔ ''لکی اسٹیٹ'' کے معاملات سکندر کے بعد تین افراد کے ہاتھوں سے چلتے تھے۔ دانیال، غنی اور منصور۔ باقی دو کی جانب سے مایوس ہونے کے بعد ساحرہ نے دانیال کو فون کیا تھا۔ اس کی فکرمندی کے جواب میں دانیال نے کھوکھلی آواز میں کہا۔

''آخر وہ جا کہاں سکتے ہیں......؟''

''دانیال! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔'' ساحرہ نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ ''دماغ میں برے برے خیال آرہے ہیں۔ کیا تم ابھی میرے پاس آسکتے ہو؟ میں بڑی شدت سے تمہاری ضرورت محسوس کر رہی ہوں۔''

خود کے رچائے ہوئے ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے دانیال نے ساحرہ کی سراسیمگی کے جواب میں چٹانی لہجے میں کہا۔ ''ڈونٹ وری میں آرہا ہوں......''

ساحرہ کی طرف جاتے ہوئے دانیال مسلسل آج شام والے واقعے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ڈاک یارڈ کے اس دورافتادہ ویران حصے میں رونما ہونے والے خونی منظر کی جزئیات اس کے ذہن میں تازہ تھیں۔ آج دوپہر میں دانیال اور انسپکٹر اعظم شاہ نے شام والے آپریشن کا لائحہ عمل تیار کرلیا تھا۔ جب سے دانیال، اعظم شاہ سے ملا تھا، اسی کے اسکرپٹ کے مطابق کام کررہا تھا۔ اس نے دل وجان سے اعظم شاہ کو اپنا گرو مان لیا تھا اس لیے اس نے انسپکٹر کے پیش کردہ منصوبوں پر جرحی سوالات کرنا چھوڑ دیے تھے۔ وہ اعظم شاہ پر اندھا اعتماد کرنے لگا تھا۔ اس ملاقات میں اعظم شاہ نے شام والے آپریشن کے ذیل میں دانیال کو یہ ہدایات دی تھیں۔

''میں وقت سے پہلے ہی ڈاک یارڈ کے اس حصے میں اپنی پوری طاقت کے ساتھ خفیہ موجود رہوں گا۔ جب تم لوگ ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے ہو کر ڈرگز اور رقم کا تبادلہ کرنے لگو تو تم نے نہایت ہی پھرتی کے ساتھ ارجن اور اس کے دونوں حواریوں کو شوٹ کر دینا ہے۔ اس کے بعد کے معاملات میں سنبھال لوں گا۔''

''اوکے سر......!'' دانیال نے اطاعت مندی سے کہا تھا۔

اس وقت دانیال یہی سمجھا تھا کہ اعظم شاہ پولیس فورس کے ساتھ اس مشن میں شامل ہوگا لیکن وقت نے کچھ اور ہی ثابت کیا تھا۔ وہاں جو کچھ پیش آیا وہ دانیال کی توقعات کے برعکس تھا۔

اعظم شاہ کے اسکرپٹ کے مطابق دانیال نے بجلی کی سی تیز رفتاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے چشم زدن میں یکے بعد دیگرے ارجن، قدیر اور نجیب کے سینوں کو عین دل کے مقام پر چھید ڈالا تھا۔ وہ تینوں اپنی آنکھوں میں حیرت بھری الجھنیں لیے زمین بوس ہوگئے تھے۔ اسی لمحے دانیال کے کانوں نے سکندر کو سٹپٹائی ہوئی آواز میں کہتے سنا۔

''دا...... نیال یہ یہ...... تم نے کیا...... کر دیا......؟''

''میں بتاتا ہوں......'' اعظم شاہ نے تاریکی سے نمودار ہوتے ہوئے کرخت لہجے میں کہا۔

سکندر نے ایک جھٹکے سے گردن موڑ کر اپنے پیچھے دیکھا کیونکہ اعظم شاہ کی آواز اس کے عقب ہی سے ابھری تھی۔ ایک گن بردار پولیس والے پر سکندر کی نگاہ پڑی تو اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ قبل اس کے کہ سکندر کے منہ سے ایک لفظ بھی خارج ہوتا، اعظم شاہ نے اس کی پیشانی

کے وسط میں ایک گولی اتار دی تھی۔ سکندر بھی کٹے ہوئے شہتیر کے مانند موت کے تین سوداگروں سے تھوڑے فاصلے پر جا گرا تھا۔

''...... یہ سب کیا ہے سر......؟'' دانیال نے متوحش نظر سے اعظم شاہ کی طرف دیکھا۔

وہ گمبھیر آواز میں بولا۔ ''خس کم، جہاں پاک۔''

دانیال بس اتنا ہی کہہ سکا۔ ''آپ درست فرما رہے ہیں سر......''

آئندہ چند سیکنڈ میں اعظم شاہ نے اپنے غیر سرکاری اور دانیال والے پسٹل کو اچھی طرح صاف کرنے کے بعد دانیال کا پسٹل سکندر کے ہاتھ میں تھما دیا اور اپنا پسٹل نجیب کے ہاتھ میں پکڑا دیا یعنی سکندر اور نجیب کی لاشوں کے ہاتھوں میں۔ اس کرائم سین اور آلات قتل پر پائے جانے والے فنگر پرنٹس سے یہی ثابت ہوتا کہ سکندر نے فائرنگ کر کے ارجن، قدیر اور نجیب کو موت کے گھاٹ اتارا تھا اور جواباً نجیب کی چلائی ہوئی گولی نے سکندر کی زندگی کا چراغ گل کر دیا تھا۔

''تم اب نکلو یہاں سے......'' اعظم شاہ نے دانیال کی طرف دیکھتے ہوئے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ''میں اس سچویشن کو ہینڈل کرنے کے لیے پولیس فورس کو یہاں بُلا رہا ہوں۔ تم سے میں کل کسی وقت ملاقات کروں گا۔''

کوئی سوال کیے بغیر دانیال وہاں سے چلا آیا تھا۔

ساحرہ کی جانب سفر کے دوران میں تین گھنٹے پہلے والے خونیں مناظر دانیال کے ذہن میں ڈوب اُبھر رہے تھے۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ڈاک یارڈ کے اس حصے میں ایسی کسی صورتِ حال سے اس کا واسطہ پڑ سکتا ہے۔ وہ ایک بات جانتا تھا کہ یہ سب اعظم شاہ کی پلاننگ کا حصہ تھا اور اسی بات کا اسے اطمینان تھا کیونکہ اسے اعظم شاہ کی ذات پر پورا بھروسا تھا۔

اس عالی شان بنگلے میں صرف وہی دونوں بھائی بہن رہائش پذیر تھے اور اب محض ساحرہ...... جب دانیال وہاں پہنچا تو اس نے ساحرہ کو بہت پریشانی کے عالم میں دیکھا۔ یہ معاملہ تھا ہی ایسا، پھر وہ بھلا کیسے پریشان نہ ہوتی۔ ابھی ساحرہ حقیقتِ حال سے آگاہ نہیں تھی۔ دانیال اس وقت کا تصور کر کے بے چین ہو گیا جب ساحرہ کو اپنے بھائی جان کی المناک موت کی خبر ملتی۔ اس کے بعد تو ساحرہ کو سپردِ عذاب ہو جانا تھا۔

وہ کافی دیر تک اسے تسلی دلاسے دیتا رہا۔ اس کے ساتھ ہی سکندر کی تلاش کی مہم بھی جاری رہی۔ جہاں بھی سکندر کے پائے جانے کا امکان تھا، وہاں فون کھڑکائے گئے اور گھریلو ملازمین کو بھی اِدھر اُدھر دوڑایا گیا لیکن نتیجہ صفر کے برابر ہی برآمد ہوا۔ سکندر صحیح معنوں میں زیرو ہو چکا تھا لہٰذا اسے جس بھی شے سے ضرب دی جاتی، جواب زیرو ہی آنا تھا۔

رات گیارہ بجے کے بعد دانیال نے کہا۔ ''ساحرہ! ہمیں سکندر صاحب کی گمشدگی کی رپورٹ درج کروا دینا چاہیے۔''

اس کی تجویز ساحرہ کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ دونوں قریباً نصف شب متعلقہ تھانے پہنچ گئے۔ پولیس والوں کے متعدد سوالات کے بعد سکندر کی پُراسرار گمشدگی کی رپورٹ درج کرا دی گئی۔ وہ لوگ تھانے سے نکلے تو ساحرہ نے منت بھرے لہجے میں کہا۔

''دانیال! تم میرے ساتھ گھر چلو۔ جب تک بھائی کا کچھ پتا نہیں چل جاتا، میں تمہیں جانے نہیں دوں گی۔''

''ساحرہ! میں ہر خوشی اور غم میں تمہارے ساتھ کھڑا ہوں۔'' دانیال نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''حوصلہ رکھو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تھانے والوں نے اپنا کام شروع کر دیا ہے۔ ان شاء اللہ! بہت جلد سکندر صاحب کی اچھی خبر مل جائے گی۔''

''تھینک یُو دانیال......'' ساحرہ نے غم سے بوجھل آواز میں کہا۔

وہ پوری رات دانیال نے ساحرہ کی معیت میں، اس کے بنگلے پر گزاری۔ اس نے تھانے سے نکلتے ہوئے تسلی میں جو کچھ کہا تھا، وہ اس کی روح کے لیے سوہان بن گیا۔ ''ساحرہ! میں ہر خوشی اور غم میں تمہارے ساتھ کھڑا ہوں۔'' یہ تسلی بھرے الفاظ دانیال کی زبان ہی سے نکلے تھے جن کا حقیقت سے دور کا بھی ناتا نہیں تھا۔ وہ تو اپنی مطلب برآری کی خاطر اسے محبت کا فریب دے رہا تھا، گویا وہ اس کی محبت کا مذاق اڑاتا آیا تھا۔ پچھلے سات ماہ سے وہ جس ساحرہ کو جانتا تھا، وہ اب والی ساحرہ سے بہت مختلف تھی۔ اس نے ہمیشہ ساحرہ کو خوشی سے چہکتے دیکھا تھا اور اس وقت وہ غم کا پہاڑ نظر آ رہی تھی اور اس پہاڑ نے بہت جلد حزن و ملال کے ماؤنٹ ایوریسٹ میں بدل جانا تھا۔ سکندر کی حسرت ناک موت کو منظرِ عام پر آنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔

''کیا میں واقعی ساحرہ کے ساتھ کھڑا ہوں؟'' یہ سوال رہ رہ کر رات بھر دانیال کے ضمیر پر تازیانے برساتا رہا۔ اوپر سے ساحرہ کی رونی صورت...... وہ بنیادی طور پر

کوئی دھوکے باز انسان نہیں تھا۔ اس نے ایک مقصد کے حصول کی خاطر ساحرہ کو محبت کا فریب دیا تھا اور اب یہی فریب اس کے اندرون کو زہریلے ڈنک مار رہا تھا۔ یہ اس کے ضمیر کی ملامت تھی یا اس کے احساس کی ندامت اور یا پھر ساحرہ کی محبت کا اعجاز...... اس کا دل رفتہ رفتہ ساحرہ کے لیے موم ہونے لگا اور صبح جب سکندر کی موت کی خبر عام ہوئی تو ساحرہ کے لیے اس کے دل و دماغ میں ایک پاکیزہ اور معزز مقام وجود پا چکا تھا۔

یہ محترم مقام کسی قسم کی انسانی ہمدردی کا رہین منت نہیں تھا بلکہ دانیال کی مفروضِ محبت نے مقسوم محبت کا روپ دھار لیا تھا۔ وہ ساحرہ کی چاہت میں گرفتار ہو گیا تھا۔

☆☆☆

اتوار کے ہر چھوٹے بڑے اخبار میں ڈاک یارڈ والے واقعے کی خبر موجود تھی۔ الفاظ کے چناؤ کے معمولی فرق سے، اس سنسنی خیز خبر کا مضمون اور مفہوم کچھ اس طرح تھا......

''گزشتہ رات کے ابتدائی حصے میں، شہر کے ساحلی علاقے ڈاک یارڈ میں، دو گروہوں میں خوف ناک تصادم۔ وقوعہ پر چار لاشیں پڑی ملی ہیں جن میں سے ایک شہر کے معروف رئیل اسٹیٹ پراپرٹی کنگ سکندر کی لاش ہے۔ باقی تین افراد کی تاحال شناخت نہیں ہو سکی۔ پولیس کے مطابق، یہ لینڈ مافیا کی سنگین کارروائی ہے۔ مزید معلومات کے لیے تفتیش جاری ہے۔''

اس خبر میں چار لاکھ یو ایس ڈی کا ذکر تھا اور نہ ہی براؤن شوگر کی بھاری مقدار کا تذکرہ۔ یہ ٹھیک ہے کہ ارجن اور اس کے دو ساتھیوں قدیر اور نجیب کی شناخت نہیں ہو پائی تھی۔ وہ سر دست ''نامعلوم افراد'' تھے لیکن ڈالرز سے بھرا ہوا بریف کیس اور پاؤڈر (ہیروئن) سے بھرا ہوا سوٹ کیس ندارد کیوں ہو گیا؟ دانیال جب کرائم سین سے رخصت ہوا تھا تو سکندر، ارجن، قدیر اور نجیب کی لاشوں کے علاوہ منشیات کی بھاری مقدار اور ایک کثیر رقم کے کرنسی نوٹ بھی وہاں موجود تھے۔ پہلی مرتبہ اس کے ذہن میں اعظم شاہ کی ذات کے حوالے سے شک نے سر ابھارا۔

''کہیں یہ اس پولیس انسپکٹر کی کوئی گہری چال تو نہیں؟ اس نے نہایت ہی چالاکی سے میرا استعمال کیا اور سارا مال غنیمت سمیٹ کر چلتا بنا۔ اس اخباری خبر میں کہیں بھی اعظم شاہ کا نام شامل نہیں جبکہ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ اس آپریشن کے ہیرو کی طرح ابھر کر سامنے آئے گا۔''

دانیال نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ پولیس والے کی دوستی بھی بُری اور دشمنی بھی بُری۔ تو کیا اعظم شاہ پر بھروسا کر کے اس نے اپنی زندگی کی سنگین غلطی کی تھی؟

وہ پہلی فرصت میں اعظم شاہ سے ملنا چاہتا تھا۔ اس نے انسپکٹر کو کال کی تو پتا چلا، دوسری جانب بھی ملاقات کی آتش بھڑکی ہوئی ہے۔ اسی شام وہ دونوں ایک ساحلی کافی ہاؤس میں، ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر کی گمبھیر خاموشی کے بعد اعظم شاہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میں جانتا ہوں، میرے بارے میں تین سوالات نے تمہارے دماغ کو خاصا زہریلا بنا رکھا ہے۔ تم میری نیت کو میلی نگاہ سے دیکھنے پر مجبور ہو گئے ہو۔''

''نہیں سر...... ایسی تو...... کوئی بات نہیں......''

دانیال بیچ میں بول پڑا۔ ''آپ خواہ مخواہ ہی...... مجھ پر شک کر رہے ہیں۔''

''اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں دانیال۔ یہ سب انسانی نفسیات کے عین مطابق ہے۔ تمہاری جگہ اگر کوئی اور بھی ہوتا تو وہ بھی اسی انداز میں سوچتا۔'' اعظم شاہ نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''مجھے اپنی بات پوری کرنے دو۔ پھر تمہارا ذہن ہر شک سے اور میرا دامن ہر شکن سے پاک ہو جائے گا۔''

''جی سر......'' دانیال نے کمزور سی آواز میں کہا۔

''تمہارا سوال نمبر ایک...... میں نے اس آپریشن کا کریڈٹ کیوں نہیں لیا اور ڈرگز کی ایک میگا ڈیل کو لینڈ مافیا کی چپقلش کے کھاتے میں کیوں ڈال دیا......؟'' اعظم شاہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''سوال نمبر دو...... میں نے براؤن شوگر کی اس بھاری مقدار کے ساتھ کیا، کیا؟ اور سوال نمبر تین...... چار لاکھ امریکی ڈالرز کی خطیر رقم کہاں گئی......؟''

دانیال ندامت بھری نظر سے اعظم شاہ کو دیکھتا رہا۔

اعظم شاہ نے پوچھا۔ ''اور کچھ......؟''

دانیال نے نفی میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

''میں تمہارے پہلے سوال کا جواب اسی کافی ہاؤس میں دوں گا۔'' اعظم شاہ نے معتدل انداز میں کہا۔ ''دوسرے سوال کا جواب تمہیں نیٹی جیٹی کے پُل پر پہنچنے کے بعد ملے گا اور تیسرے سوال کے جواب کے لیے تمہیں میرے ساتھ، میرے اس فلیٹ پر جانا ہوگا جہاں ایک فری لانس رائٹر کی حیثیت سے تم دو ماہ تک قیام کر چکے ہو۔'' اس نے لمحاتی توقف کر کے ایک آسودہ سانس خارج کی پھر سپاٹ آواز میں بولا۔

"دانیال! مجھے ہیرو بننے کا کبھی شوق نہیں رہا۔ انسان کو اس دنیا میں دوسرے انسانوں کی خدمت کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے اور اس نیک فریضے کی انجام دہی کے لیے انسان کا ہیرو ہونا ضروری نہیں ہے۔ یہ ہے تمہارے پہلے سوال کا جواب۔ آؤ اب ہم نیٹی جیٹی چلتے ہیں۔"

وہ دونوں کافی ہاؤس سے نکلے اور اعظم شاہ کی کار میں بیٹھ کر نیٹی جیٹی کی جانب روانہ ہو گئے۔ پل کے ایک ویران اور پُرسکون کونے پر اعظم شاہ نے گاڑی روک دی اور ڈکی کھول کر دانیال کو اندر جھانکنے کے لیے کہا۔

دانیال نے اس کی ہدایت پر عمل کیا تو ڈکی میں اسے وہی سوٹ کیس رکھا دکھائی دیا جس میں ارجن کروڑوں روپے کی ہیروئن بھر کر لایا تھا۔ اعظم شاہ نے مذکورہ سوٹ کیس کو کھول کر دانیال کو اطمینان دلایا کہ اندر نشیلا پاؤڈر جوں کا توں موجود ہے۔

اعظم شاہ نے منشیات کے اس ذخیرے کو دانیال کی مدد سے سمندر برد کرنے کے بعد ہاتھ جھاڑتے ہوئے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔

"اگر اس براؤن شوگر (ہیروئن) کو قبضے میں لے کر قانون کے حوالے کر دیا جاتا تو اس امر کا امکان تھا کہ کوئی بدعنوان سینئر پولیس آفیسر اس ضبط شدہ منشیات کا کچھ حصہ یا پوری کی پوری لاٹ ہی اڑا کر نسبتاً سستے داموں مارکیٹ میں فروخت کر کے کروڑوں نہیں تو لاکھوں روپے ضرور کما لیتا۔"

"اس قسم کی بدعنوانی کے بارے میں، میں نے بھی سنا ہے سر......" دانیال نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

اعظم شاہ نے اس کے اظہارِ خیال کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے خواب ناک لہجے میں کہا۔ "آؤ فلیٹ پر چلتے ہیں تاکہ تمہیں تیسرے سوال کا جواب بھی مل جائے۔"

واپسی کے سفر میں گاڑی کے اندر گہری خاموشی چھائی رہی۔ اعظم شاہ چپ چاپ ڈرائیو کرتا رہا اور دانیال سوچوں میں گم گاڑی کے باہر دیکھتا رہا۔ فلیٹ پر پہنچنے کے بعد اعظم شاہ نے چار لاکھ یو ایس ڈی سے بھرا ہوا بریف کیس کھول کر دانیال کے سامنے رکھ دیا اور ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔

"یہ رہا تمہارے تیسرے سوال کا جواب......!"

بے ساختہ دانیال کے منہ سے نکلا۔ "سر! کیا اب آپ ان کرنسی نوٹوں کو کچن میں لے جا کر نذرِ آتش کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں......؟"

"نہیں...... ہرگز نہیں!" وہ پوری قطعیت سے بولا۔ "منشیات کی طرح دولت کوئی لعنتی شے نہیں ہے۔ اگر یہ صحیح ہاتھوں میں رہے تو اس کے استعمال سے انسان اور انسانیت کا بھلا ہوتا رہتا ہے۔ اس رقم پر صرف ہم دونوں کا حق ہے کیونکہ ہم انسانیت کی خدمت کا ہنر جانتے ہیں۔ دو لاکھ ڈالرز تمہارے اور دو لاکھ ڈالرز میرے......" تھوڑی دیر کو رک کر اعظم شاہ نے ایک اطمینان بھری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"میں نے تمہارے پاسپورٹ پر یو اے ای کا ویزا لگوا دیا ہے۔ آنے والے دنوں میں جب تمہارا موڈ ہو، دبئی روانہ ہو جاؤ۔ اگر تم چاہو گے تو میں تمہارے دو لاکھ ڈالرز کو دبئی بھی ٹرانسفر کروا سکتا ہوں یا تم جیسا کہو......"

"سوری سر......!" دانیال نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں اس رقم میں سے ایک ڈالر بھی نہیں لے سکتا۔ میں نے جو کچھ کیا، اس میں میرا کوئی لالچ یا غرض شامل نہیں تھی اس لیے میں اپنے جذبے کی کوئی چھوٹی یا بڑی قیمت وصول نہیں کر سکتا۔"

"یہ تمہاری کسی جاب کا معاوضہ نہیں ہے دانیال۔" اعظم شاہ نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "تم اس رقم کو اپنے عظیم کارنامے کا انعام سمجھ سکتے ہو۔"

"آئی ایم رئیلی ویری سوری سر......!" دانیال اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے مستحکم لہجے میں بولا۔ "میری منزل دبئی نہیں، بلکہ پیارا پاکستان ہے اور جہاں تک انعام کا معاملہ ہے تو...... وہ گزشتہ رات مجھے مل چکا......"

"یہ تم کس قسم کی باتیں کر رہے ہو......؟" اعظم شاہ نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔ "میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا؟"

"میں آپ کو سمجھا نہیں سکتا سر......" دانیال نے جذب کے عالم میں کہا۔ "میری تو خود بہت دیر سے سمجھ میں آیا ہے۔ یہ رقم آپ ہی رکھیں اور اپنے حساب سے اسے انسانیت کی بھلائی کے لیے استعمال کریں، میں تو چلا......"

بات کے اختتام پر دانیال جانے کے لیے پلٹا تو اعظم شاہ اسے شک زدہ نظر سے تکنے لگا۔ اس کی سمجھ میں یہی آیا کہ دانیال کا دماغ چل گیا ہے ورنہ دو لاکھ یو ایس ڈی (تین کروڑ روپے) کو کوئی ہوش مند یوں ٹھکرا کر نہیں چلا جاتا...... بے وقوف، عقل کا اندھا......!

لذتِ آشنائی انسان کو دو جہانوں کی دولت سے بیگانہ کر دیتی ہے۔ ساحرہ کی محبت نے دانیال کی کایا پلٹ دی تھی۔ عام طور پر اس کیفیت کو بے وقوفی اور عقل کا اندھا پن ہی کہا جاتا ہے۔

❖❖❖

خواہش

جمال دستی

خواہش کے بغیر کسی انسان کا تصور نہیں کیا جا سکتا... ہر شخص میں کسی نہ کسی قسم کی خواہش کا بسیرا رہتا ہے... بعض انہیں پورا کرنے کے لیے انتہا تک چلے جاتے ہیں... ایک ایسی ہی کہانی... جس میں اپنی خواہش کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے ایک منصوبہ ساز کا چوکس دماغ فعال تھا...

ریستوران میں بہت رش تھا۔ میگھن لوگوں کے ہجوم میں راستہ بناتی ہوئی تیزی سے وارن کی طرف بڑھی۔ انہیں ایک دوسرے کو دیکھے ہوئے چار مہینے ہو گئے تھے جب میگھن نے اسے اخبار چھوڑنے پر مجبور کیا۔ اس کی فیملی سو سال سے یہ اخبار نکال رہی تھی اور وارن کو بھی وہاں کام کرتے ہوئے تقریباً پچاس سال ہو چکے تھے۔ وہ توقع کر رہی تھی کہ وارن پُرسکون ہوگا اور اپنی ریٹائرمنٹ سے لطف اندوز ہو رہا ہوگا۔ لیکن اس کا حلیہ اور ماتھے کی شکنیں

کچھ اور ہی کہانی سنا رہی تھیں۔

اس کی میز کی طرف جاتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ وارن نے اسے لنچ پر کیوں مدعو کیا ہے۔ اس نے اپنے آپ کو ذہنی طور پر صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کیا اور دل میں دعا مانگنے لگی کہ کوئی خیر کی خبر ہو۔

''ہیلو انکل وارن۔'' اس نے مدھر آواز میں کہا پھر اس نے جھک کر اس کے گالوں کا بوسہ لیا۔ وارن کے بدن سے سبز ٹماٹروں اور لیونڈر کی ملی جلی خوشبو آرہی تھی۔

''کسی نے ہمارے دفتر میں بم رکھنے کی اطلاع دی تھی۔'' میگھن نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم اس پر یقین کر سکتے ہو کہ کوئی اخبار کے دفتر میں بم رکھے گا؟''

وہ اپنے اخبار پر اس دھمکی کے ممکنہ اثرات کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح اخبار کی شہرت میں اضافہ ہوگا جو اس کے لیے باعث مسرت تھا۔ اس کے برعکس وارن متفکر دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے اپنی سفید گھنی بھویں اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''کیا سب لوگ خیریت سے ہیں؟''

''ہاں۔'' میگھن بولی۔ ''پولیس کا کہنا ہے کہ یہ کسی نے مذاق کیا ہے لیکن یہ کل کے اخبار کی بڑی سرخی ہوگی۔ ہم نے پہلے ہی اسے اپنی ویب سائٹ پر ڈال دیا ہے۔''

''یہ کوئی خوشی کی بات نہیں ہے۔'' وارن نے کہا۔

''یہ تمہارا کہنا ہے۔''

''کیا فون کرنے والے نے اس دھمکی کی کوئی وجہ بتائی؟''

''ہاں لگتا ہے کہ اسے ریستوران پر ہونے والے ہمارے تبصرے پسند نہیں آرہے۔''

''کیوں؟'' وارن نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

چھ ماہ قبل میگھن نے باپ کے انتقال کے بعد اخبار کا انتظام سنبھال لیا تھا۔ اس نے اخبار کی بقا کے لیے کچھ غیر معمولی سخت فیصلے کیے جن میں سے ایک وارن کو ریٹائرمنٹ پر مجبور کرنا تھا۔ اس کی جگہ اس نے ریستوران پر تبصرہ لکھنے کی ذمے داری ایسے دو افراد کو سونپ دی جو جدید رجحانات اور خیالات رکھتے تھے۔ اس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا۔ اخبار کی اشاعت اور آن لائن اشتہارات میں اضافہ ہوگیا۔ قارئین نے ان چبھتے ہوئے تبصروں کو پسند کیا۔ یہ وارن کے تعریفی تبصروں سے بالکل مختلف تھے جو وہ گزشتہ پچاس سال سے لکھ رہا تھا۔

شاید میگھن کا باپ اس کے طریقوں کو پسند نہ کرتا لیکن وہ جانتی تھی کہ وہ اس کے مقصد کی حمایت کرے گا۔ اس کا اخبار شہری حکومت پر کڑی نظر رکھتا تھا۔ لہٰذا اس کی مقبولیت برقرار رکھنے کے لیے ہر قدم اٹھانا ضروری تھا۔

ویٹر ایک ٹرے میں کئی پلیٹیں اور ڈرنک لے کر آیا۔

''یہ ہماری خاص ڈشز ہیں۔ اُمید ہے کہ تمہیں پسند آئیں گی۔''

''کیا آج کا یہی مینیو ہے؟'' میگھن نے پوچھا۔

''نہیں۔'' وارن بولا۔ ''میں نے کچھ اشتہا آور چیزیں منگوائی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تم انہیں بھی پسند کرو گی۔''

میگھن نے قیمے کا ایک گولا اٹھایا اور اسے ساس میں ڈبو کر منہ میں رکھ لیا۔

اس نے سوچا کہ وارن ٹھیک کہہ رہا ہے۔ کھانا واقعی لذیذ تھا۔ اس نے خوشی خوشی کھانا کھایا۔ اس دوران وہ لائبریری میں مجوزہ توسیع کے بارے میں بھی گفتگو کرتے رہے۔ اس نے جونہی کھانا ختم کیا تو وارن نے پوچھا۔ ''تمہیں سب چیزیں پسند آئیں؟''

''بہت زیادہ۔'' میگھن نے جواب دیا۔

وارن نے سر ہلاتے ہوئے اپنی جیب سے ایک کاغذ نکالا۔ ''میں یہی توقع کر رہا تھا اس لیے مجھے یقین نہیں آیا کہ جو کچھ اس تبصرے میں لکھا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے وہ عبارت پڑھنا شروع کر دی۔ اس میں بڑے بے رحمانہ انداز میں ریستوران کے کھانوں پر تنقید کی گئی تھی۔ اس نے تحریر ختم کرنے کے بعد کاغذ دوبارہ تہ کر کے جیب میں رکھا اور بولا۔ ''یقیناً تمہارا باپ اس پر شرمندہ ہوتا۔ صرف شرمندہ ہی نہیں بلکہ حیرت زدہ بھی۔''

تو اس لیے وارن نے اسے لنچ پر مدعو کیا تھا۔ اسے شرمندہ کرنے کے لیے۔ بہر حال میگھن پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اسے یہ تبصرہ پسند آیا اور یاد بھی تھا تاہم وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ اسی ریستوران کے بارے میں تھا۔ یہ اس کے ایک نئے تبصرہ نگار آئن نے لکھا تھا جسے لفظوں کے استعمال میں مہارت تھی اور جب انہوں نے تبصرہ اخبار کی ویب سائٹ پر پوسٹ کیا تو اشتہارات کا ڈھیر لگ گیا۔

میگھن نے ریستوران میں چاروں طرف نگاہ دوڑائی اور بولی۔ ''لگتا تو نہیں کہ اس سے ان کے کاروبار پر کوئی اثر پڑا ہو۔ تقریباً تمام میزیں بھری ہوئی ہیں۔''

''وہ تبصرہ حقیقت سے بہت دور تھا۔''

''جہاں تک ڈیڈی کا تعلق ہے تو وہ یہ سوچ کر خوش

ہوتے کہ میں اخبار کو بچا رہی ہوں۔''
''جبکہ تم اسے تباہ کر رہی ہو۔'' وارن نے غصے سے کہا۔ اس کی آواز نیچی لیکن لہجہ تلخ تھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور میگھن کو ڈر لگنے لگا کہ کہیں اس کا بلڈ پریشر نہ بڑھ جائے۔ وہ اس سے بحث نہیں کرنا چاہ رہی تھی لیکن اپنے موقف پر قائم تھی۔
''اسی لیے تم نے مجھے لنچ پر بلایا تھا؟'' اس نے نرمی سے کہا۔ ''تاکہ میری سوچ میں تبدیلی لاسکو لیکن یہ ممکن نہیں۔ مجھے افسوس ہے انکل وارن۔ میں وہی کر رہی ہوں جو مجھے کرنا چاہیے۔ اس کے علاوہ یہ سب کچھ ایک تفریح ہے اور ہر کوئی یہ جانتا ہے۔''
''میں نہیں سمجھتا کہ اس ریستوران کا مالک بھی یہ جانتا ہے کیونکہ تم جب سے یہاں آئی ہو وہ تم پر نظریں جمائے ہوئے ہے۔''
میگھن نے گھوم کر دیکھا یہ جاننے کے لیے کہ وارن ٹھیک کہہ رہا ہے پھر واپس اپنی پوزیشن پر آ گئی۔ ''میرا خیال ہے کہ میں نے تمہیں پہلے بھی اس بارے میں بتایا تھا۔'' وارن نے کہا۔ ''ایک اچھا تبصرہ وہ ہوتا ہے جو کھانے، ماحول، سروس اور قیمت کے بارے میں کیا جائے۔ تم سخت ہوئے بغیر بھی اپنی ایماندارانہ رائے کا اظہار کر سکتی ہو یا پھر تمہارے نئے ملازمین اسے تفریح کا نام دے کر تم سے جھوٹ بول رہے ہیں۔''
میگھن خاموش ہو گئی۔ وہ جانتی تھی کہ وارن ٹھیک کہہ رہا ہے۔ لیکن وہ یہ جانتی تھی کہ پرانے انداز کے تبصروں سے نہ تو اخبار کی اشاعت بڑھ سکتی ہے اور نہ ہی اشتہارات میں اضافہ ہو سکتا ہے۔
وارن آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ ''تم اس کا حل نکال سکتی ہو۔ یہ کام شیری کو دے دو، وہ ہوشیار اور قابل ہے۔''
شیری اس اخبار میں دس سال سے کام کر رہی تھی اور اس نے صرف موت کی خبریں یا کسی ساتھی کے چھٹیوں پر جانے کی وجہ سے فیچر لکھے تھے لیکن اس نے نمونے کے طور پر ریستوران پر جو تبصرے لکھے، وہ بالکل وارن کے لکھے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ ایسے خشک تبصرے پچاس سال سے شائع ہو رہے تھے۔
''معذرت چاہتی ہوں۔'' شیری اس انداز میں نہیں لکھ سکتی جو ہم چاہتے ہیں، کیوں نہ ہم کسی اور موضوع پر بات کریں۔ تمہارے باغ کا کیا حال ہے؟ تمہیں ٹانگوں کی تکلیف کی وجہ سے مشکل ہوتی ہو گی۔ کیا اس سال تمہیں اچھی پیداوار کی امید ہے یا اب بھی کیڑوں اور خرگوشوں سے لڑ رہے ہو؟''
''میں تمہاری طرح باغ کے لیے فکرمند نہیں ہوتا۔'' وارن کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ''تم بہت بدل گئی ہو میگھن، تم صرف پیسوں کے بارے میں سوچتی ہو، لوگوں کے لیے نہیں۔ تمہاری سوچ ٹھیک نہیں ہے۔''
وہ ناراض ہوتے ہوئے بولی۔ ''یہ ٹھیک بات نہیں۔''
''اوہ ہاں، ایسا ہی ہے۔ مجھے تمہارے ساتھ کھانا کھانے کی کوئی خواہش نہیں ہے جبکہ تم میری باغبانی پر گفتگو کر رہی ہو۔ میری تو بھوک ہی ختم ہو گئی ہے۔''
وہ میگھن کو خالی پلیٹوں کے ساتھ چھوڑ کر لنگڑاتا ہوا چلا گیا۔
ایک ہفتہ بعد بم رکھنے کے بجائے موت کی دھمکی ملی جب آئن نے گو چانا کوس کے کھانوں کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ فون پر ملنے والی اس دھمکی نے میگھن کو پریشان کر دیا اور اس نے آئن کے منع کرنے کے باوجود پولیس کو اطلاع دے دی۔ اس کے نتیجے میں سراغ رساں ٹیلی فورڈ اور آئن کے درمیان میگھن کے دفتر میں ایک میٹنگ ہوئی۔
''اس میں کوئی شک نہیں کہ کوئی شخص مجھے اس کام سے روکنے کے لیے خوف زدہ کر رہا ہے۔'' آئن نے کہا۔
''میں یہ نہیں کہہ رہا کہ تم اپنا کام نہ کرو۔'' ٹیلی فورڈ نے کہا۔ ''لیکن کیا تم اپنا ہاتھ ہلکا نہیں رکھ سکتے؟ جب تک کہ ہم اس شخص کو پکڑ نہ لیں۔'' وہ اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ''تم یہ سمجھ کر اپنے آپ کو محفوظ مت سمجھنا کہ یہاں کئی ایسے پاگل ہیں جو بھونکتے ہیں لیکن کاٹتے نہیں۔ یہ شخص تمہیں واقعی کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے۔ یہ دھمکی بڑی واضح ہے اور یہ کال بھی اسی شہر سے کی گئی ہے۔''
آئن نے نفی میں سر ہلایا جیسے وہ سراغ رساں کی تجویز سے متفق نہ ہو۔ ٹیلی فورڈ نے مدد کے لیے میگھن کی طرف دیکھا لیکن وہ بھی اس کا ساتھ دینے کے لیے آمادہ نہیں ہوئی۔
''مجھے افسوس ہے مسٹر ٹیلی فورڈ۔'' میگھن نے کہا۔ ''اگر ہم ہاتھ ہلکا رکھیں گے تو یہ اس شخص کی جیت ہو گی۔ ہم اس طرح اپنے آپ پر کوئی پابندی نہیں لگا سکتے، ہم چاہتے ہیں کہ تم اس کیس کو حل کرو۔''
''ہم اس پر کام کر رہے ہیں، ہم نے اخبار کے دفتر

اور تمہارے اپارٹمنٹ پر پولیس کا گشت بڑھا دیا ہے۔'' وہ آئن کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ہمارے آدمی اس شخص کا کھوج لگانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس دوران تم محتاط رہو اور اس کے علاوہ کسی اور کی مخالفت نہ کرو۔ کم از کم اس ہفتے بالکل نہیں۔''

ٹیلی فورڈ کے جانے کے بعد میگھن نے آئن سے کہا۔ ''اب کیا کہتے ہو؟''

''میں پیچھے نہیں ہٹوں گا۔''

''مجھے یہی امید تھی۔ اب تمہارے ایجنڈے پر کیا ہے؟''

''گزشتہ ماہ لاطینی سی فوڈ کا افتتاح ہوا ہے۔ انہیں مچھلیاں اور دوسرے سمندری جانور حاصل کرنے کے لیے کافی وقت مل چکا ہے۔ اس میں کوئی ابہام نہیں ہے، میں ایک دفعہ وہاں جا چکا ہوں اور آج رات دوبارہ جاؤں گا۔''

''کیا یہ ریستوران بھی گوچاناکوس کے مالک کا ہے؟''

آئن نے کندھے اچکا دیے۔ ''اگر اس کے ساتھ تمہارا کوئی ذاتی مسئلہ ہے تو تمہیں پیچھے ہٹ جانا چاہیے۔ میں کوئی تنازع نہیں چاہتی۔''

''ایسی کوئی بات نہیں۔ میں نے ناکوس کے ریستوران کے بارے میں کچھ باتیں سنی تھیں اس لیے میں ان کی تصدیق کرنے کے لیے وہاں گیا تھا اور لاطینی ریستوران نیا ہے۔ اس لیے وہاں جانا بھی ضروری تھا۔''

''ٹھیک ہے لیکن تمہیں محتاط رہنا ہوگا۔'' میگھن نے کہا۔ ''اور اگر تمہیں وہاں کی کوئی ڈش پسند آ جائے تو تم اپنے تبصرے میں اس کا حوالہ دے سکتے ہو۔''

آئن کھڑا ہو گیا اور پلکیں جھپکاتے ہوئے بولا۔ ''ہو سکتا ہے کہ یہ ایک اچھی تفریح ہو؟''

چار دن بعد آئن کی موت واقع ہو گئی۔ اس نے مرنے سے پہلے ایک تبصرہ لکھا تھا جس میں لاطینی ریستوران کے کھانوں پر شدید تنقید کی گئی تھی۔ اس پر قارئین کا ردِعمل سامنے آیا۔ چند ایک نے آئن کی بے رحمی کا مذاق اڑایا... کچھ پر غشی طاری ہو گئی۔ اس کے بعد اخبار کو مزید دھمکیاں ملیں۔ چند ایک نے دعویٰ کیا کہ وہ اخبار کے دفتر کو بم سے اڑا دیں گے اور کچھ نے آئن کے اپارٹمنٹ کو آگ لگانے کی دھمکی دی۔

میگھن کا خیال تھا کہ یہ دھمکیاں زبانی جمع خرچ سے زیادہ کچھ نہیں لیکن اسے اس وقت شدید صدمہ پہنچا جب آئن اپنے گھر مردہ پایا گیا۔ اسے زہر دیا گیا تھا لیکن اس کی نوعیت معلوم نہ ہو سکی۔ سراغ رساں ٹیلی فورڈ نے گوچاناکوس کے مالک اور شیف دونوں سے پوچھ گچھ کی لیکن کوئی گرفتاری عمل میں نہیں آئی۔

آئن کی موت کے بعد ریستوران پر تبصرہ لکھنے کی ذمے داری کارلٹن کو دی گئی اور جب میگھن نے اسٹاف کو بتایا کہ اب کارلٹن ہی ریستوران پر تبصرہ لکھے گا تو سب نے اس اعلان کا خیر مقدم کیا۔ کارلٹن بھی اس ذمے داری کو نبھانے کے لیے پُرعزم نظر آ رہا تھا۔

چند روز بعد آئن کی آخری رسومات ادا کی گئیں۔ اس میں آئن کے والدین، بھائیوں اور دیگر رشتے داروں کے علاوہ اخبار کے عملے کے سبھی لوگ موجود تھے۔ ان میں پروڈکشن، سرکولیشن، اشتہارات، گرافک آرٹسٹ، فوٹوگرافرز، ایڈیٹرز اور تمام رپورٹرز شامل تھے۔ اگر اخبار نقصان میں چلا گیا تو یہ سب لوگ بے روزگار ہو جائیں گے اور آئن ایسا نہیں چاہتا ہوگا۔

سروس کا آغاز دعاؤں سے ہوا۔ اس کے بعد پادری نے مرنے والے کی مدح سرائی کی اور اس کے لیے دعائیہ کلمات ادا کیے پھر آئن کی ماں اور اس کے بہترین دوست نے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ اس کے بعد کارلٹن کا نمبر آیا۔ اس نے حاضرین پر ایک نظر ڈالی اور آئن کے کام کے بارے میں اپنی رائے دیتے ہوئے کہا۔ ''اس نے کبھی کسی کی پروا نہیں کی اور جو محسوس کیا وہی لکھا۔'' یہ کہتے ہوئے اس کے رخسار سرخ ہو گئے اور آواز میں تیزی آ گئی۔ ''لہٰذا میں بھی اس کی تقلید کروں گا۔ آئن کی قربانی رائگاں نہیں جائے گی۔''

کارلٹن کے خیالات سُن کر میگھن پریشان ہو گئی لیکن وہ اس سے پسپا ہونے کے لیے نہیں کہہ سکتی تھی۔ اشتعال انگیز تبصرے اس کے منصوبے کا حصہ تھے۔ جب وہ پارکنگ لاٹ کی طرف جا رہی تھی تو پیچھے سے کسی نے اس کا نام لے کر آواز دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وارن لنگڑاتا ہوا اس کے پاس آ رہا تھا۔

''تمہیں یہاں دیکھ کر مجھے حیرت ہو رہی ہے۔'' میگھن نے کہا۔ ''کیونکہ آئن کے بارے میں تمہارے خیالات کچھ اچھے نہیں تھے۔''

''مرنے والے کو خراجِ عقیدت پیش کرنا ایک عام رسم ہے۔'' وارن نے کہا۔ ''اس بے وقوف لڑکے نے ابھی جو کچھ کہا، میں تم سے اس بارے میں بات کرنا چاہ رہا تھا۔''

''کارلٹن۔''

''تم اسے ایسا کرنے کی اجازت نہیں دے سکتیں۔'' وارن نے کہا۔''اس کی زندگی کو بھی خطرہ ہو سکتا ہے۔''

''میں اس بارے میں پوری طرح باخبر ہوں۔'' میگھن نے دیکھا کہ سراغ رساں ٹیلی فورڈ اس علاقے کا بغور جائزہ لے رہا ہے جیسے وہ سوگواروں میں قاتل کو تلاش کر رہا ہو، کیا وہ یہاں ہو سکتا ہے؟

''کارلٹن سمجھ دار اور خطرات سے واقف ہے اگر وہ خطرہ مول لینا چاہتا ہے تو میں اسے منع کرنے والی کون ہوتی ہوں؟''

''تم اس کی باس ہو۔'' وارن نے کہا۔''ان لوگوں کا خیال رکھنا تمہارا فرض ہے۔''

میگھن نے نفی میں سر ہلا دیا۔ وہ اپنا فرض بخوبی جانتی تھی۔

وارن کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔''ٹھیک ہے کم از کم مجھے اتنی اجازت دو کہ میں اس لڑکے کو بتا سکوں کہ صحیح تبصرہ کس طرح لکھا جاتا ہے۔''

''نہیں۔''

''تبصرہ کرنا ایک فن ہے۔ اسے کھیل مت سمجھو۔'' وارن گھوما اور لنگڑاتا ہوا چلا گیا۔ جب وہ اپنی کار کے قریب پہنچا تو شیری اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے سوری کہا اور کار میں بیٹھ گئی۔

میگھن کو امید تھی کہ شیری اسے پُرسکون کر سکتی ہے۔ ان کے درمیان اس وقت دوستی قائم ہوئی جب چند سال قبل شیری نے وارن کی بہن کی موت پر تعزیتی مضمون لکھا تھا۔

دو دن بعد کارلٹن نے اخبار میں تبصرہ لکھا۔ وہ ''ناٹ یور ماماز پلیس'' میں کھانا کھانے گیا تھا۔ یہ ریستوران برسوں سے شہر میں قائم تھا۔ اس نے بڑی بے رحمی سے اس ریستوران کے کھانوں پر تنقید کی تھی اور یہاں تک لکھ دیا کہ اس ریستوران کو کسی امریکی شیف کی خدمات حاصل کرنی چاہئیں جسے کھانا بنانا آتا ہو ورنہ ان ڈشز کو تو کوئی بھوکا شخص بھی ہاتھ لگانا پسند نہیں کرے گا۔

اس تبصرے کو پڑھ کر آئن کی روح خوشی سے جھوم اٹھی ہو گی اور اخبار کی ویب سائٹ پر اسے دیکھ کر پڑھنے والے پاگل ہو جاتے۔ میگھن کو بھی یہ تبصرہ بہت پسند آیا۔ وہ اسے مبارک باد دینا چاہ رہی تھی کہ استقبالیہ پر بیٹھی لڑکی نے اسے فون پر مطلع کیا۔''میڈم! ایفی ٹاروک تم سے ملنا چاہتی ہے۔ وہ کچھ برہم نظر آ رہی ہے۔''

''تم نے ٹھیک کہا۔ میں واقعی برہم ہوں۔'' میگھن نے فون پر اس عورت کی آواز سنی۔''تم اسے بتا دو کہ میں اس سے فوراً ملنا چاہتی ہوں۔ خیر چھوڑو، میں خود دیکھ لیتی ہوں۔''

''میڈم! تم وہاں نہیں جا سکتیں۔'' استقبالیہ کلرک کی آواز آئی۔

میگھن نیوز روم میں آئی تو اس کا سامنا ایفی سے ہو گیا۔ وہ ایک بڑی عمر کی عورت تھی۔ میگھن نے اسے کئی برس پہلے چیمبر آف کامرس کی میٹنگ میں دیکھا تھا۔ تاہم حالیہ دنوں میں وہ اس طرح کے اجتماعات میں شرکت سے گریز کرتی رہی تاکہ ناراض لوگوں سے سامنا نہ ہو۔

ایفی آندھی اور طوفان کی طرح نیوز روم میں داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک زرد رنگ کی پلیٹ تھی جس پر کیک کا ایک بڑا ٹکڑا رکھا ہوا تھا۔

اسے آتا دیکھ کر میگھن نے کہا۔''مسز ٹاروک، تم میرے دفتر میں کیوں نہیں آئیں؟''

''تمہارا دفتر؟ تم سمجھتی ہو کہ میں چائے پینے یہاں آئی ہوں؟ میں جاننا چاہتی ہوں کہ تم میرے خلاف کیوں ہو؟ میرے کھانوں میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ تم دیکھ سکتی ہو کہ یہ کیک کتنا مزے دار ہے۔''

اس نے کیک کی پلیٹ میگھن کی طرف بڑھائی جو اچانک ہی پیچھے ہٹ گئی تھی جب اسے احساس ہوا کہ نیوز روم میں خاموشی چھا گئی تھی۔ وہاں موجود تمام لوگ اسی کو دیکھ رہے تھے۔

''مجھے یقین ہے کہ یہ کیک خوش ذائقہ ہو گا لیکن بعض اوقات چیزیں توقعات پر پوری نہیں اترتیں اور تھوڑی بہت اونچ نیچ ہو جاتی ہے۔ ہر کوئی اپنی صلاحیت کے مطابق کام نہیں کرتا۔''

''نان سینس، تمہارا تبصرہ نگار کہاں ہے؟'' ایفی نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔''میں جانتی ہوں وہ یہیں ہے۔ تم نے اسے کہاں چھپا رکھا ہے؟''

میگھن نہیں جانتی تھی کہ اس وقت کارلٹن کہاں ہو گا لیکن اسے امید تھی کہ وہ کہیں دور چلا گیا ہے۔

''مسز ٹاروک، تمہیں پُرسکون ہونے کی ضرورت ہے۔''

''تمہارے مشورے کا شکریہ۔ تم اسے نہیں چھپا سکتیں، میں کسی نہ کسی طرح اسے ڈھونڈ لوں گی۔''

''میڈم اگر تم آرام سے بات نہیں کر سکتیں تو پلیز

یہاں سے چلی جاؤ ورنہ میں سیکیورٹی کو بلاتی ہوں۔"
"جہنم میں جاؤ۔" الفی نے باہر جانے سے پہلے وہ کیک میگھن کے منہ پر مار دیا۔ وہ اپنی جگہ پر حیران و ششدر کھڑی رہ گئی۔ اس سے پہلے کبھی نیوز روم میں ایسا واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ شیری اس کے لیے تولیا لے کر آئی اور بولی۔ "تم اسے استعمال کر سکتی ہو، یہ بالکل صاف ہے۔ میں ہر روز ایک نیا تولیا لے کر آتی ہوں۔"
"شکریہ۔" میگھن نے اپنے چہرے سے کیک صاف کیا۔ اس کے ذائقے سے ہی وہ سمجھ گئی کہ کارلٹن نے بالکل صحیح تبصرہ کیا تھا۔
الفی نے دھمکی دی تھی کہ وہ کارلٹن کو نہیں چھوڑے گی۔ اس کو ذہن میں رکھتے ہوئے میگھن نے سراغ رساں ٹیلی فورڈ سے ایک اور میٹنگ کی۔ اس میں کارلٹن اور رپورٹر جینا بھی شریک ہوئی۔
"اب کیا ہوا؟" ٹیلی فورڈ نے پوچھا۔
میگھن نے اسے پوری بات بتا دی جس پر ٹیلی فورڈ نے کہا کہ وہ الفی سے بات کرے گا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے کارلٹن پر زور دیا کہ وہ اتنا سخت تبصرہ نہ کیا کرے۔ آئن کی طرح کارلٹن نے بھی دعویٰ کیا کہ وہ ان دھمکیوں سے خوف زدہ نہیں ہوگا۔ اس کے برعکس میگھن کے ذہن میں کچھ اور خیالات تھے لیکن اس نے ان کا اظہار نہیں کیا۔
"کیا تمہارے پاس کوئی اور اطلاع ہے کہ آئن کی موت کیسے واقع ہوئی؟"
ٹیلی فورڈ نے کہا۔ "ہاں، اسے انتہائی مہلک کاربو فوران زہر دیا گیا تھا۔"
"کاربو...... یہ کیا ہے؟" میگھن بولی۔
"کیا تم اس کی وضاحت کر سکتے ہو؟" جینا نے کہا۔
"یہ کیڑے مار دوا ہے۔" ٹیلی فورڈ نے بتایا۔
"گزشتہ بیس سال سے اس پر پابندی ہے لیکن ماضی میں یہ برسابرس تک استعمال ہوتی رہی۔ اس لیے شاید اب جنگلی چوہوں کو مارنے کے لیے اس کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ دوسرے ملکوں سے بھی اسمگل ہوتی ہے۔ اسے بھنگ کے کھیتوں میں استعمال کیا جاتا ہے اور بعض اوقات کسان اسے شکار خور جانوروں مثلاً بھیڑیے وغیرہ کو بھگانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔"
کارلٹن نے بھویں چڑھاتے ہوئے کہا۔ "کیا آئن کو یہ محسوس نہیں ہوا کہ وہ کوئی ایسی چیز کھا رہا ہے جس میں زہر شامل ہے؟"

"نہیں، اس کا کوئی ذائقہ یا بو نہیں ہے۔ اس لیے برائے کرم کوئی ایسی چیز نہ کھانا جو کسی انجان جگہ سے آئی ہو۔"
"یہ کیسے ممکن ہے، میں تو مختلف ہوٹلوں میں کھانا کھاتا ہوں تاکہ اس پر تبصرہ کر سکوں۔"
"کیا تم سمجھتے ہو کہ ریستوران والے سب کے سامنے کارلٹن کو زہر آلود کھانا دیں گے؟"
"اس کا امکان تو نہیں۔" ٹیلی فورڈ نے کہا۔ "لیکن تمہارا دوست مر چکا ہے اس لیے کچھ بھی غیر متوقع نہیں۔"
دو دن بعد جینا نے میگھن کو فون کیا۔ اس وقت صبح کے چھ بج رہے تھے۔
"اتنی صبح فون کرنے پر معذرت چاہتی ہوں۔"
"کیا ہوا؟ خیریت تو ہے؟" خوف کی لہر میگھن کے جسم میں دوڑ گئی۔
"میں کارلٹن کے بارے میں بتانا چاہتی ہوں۔" جینا کی آواز میں لرزش تھی۔ "آئن کی موت کے بعد کارلٹن نے اپنی بہن سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ہر رات سونے سے پہلے اسے اپنی خیریت بتانے کے لیے فون کرے گا لیکن گزشتہ شب اس نے فون نہیں کیا تو اس کی بہن پریشان ہوگئی اور اس نے پولیس والوں پر زور دیا کہ وہ اس کے اپارٹمنٹ کا دروازہ توڑ دیں۔ وہاں انہیں کارلٹن مردہ حالت میں ملا۔ تم تفصیلات نہیں جاننا چاہو گی لیکن لگتا یہی ہے کہ اسے بھی وہی زہر دیا گیا ہے۔"
"اوہ میرے خدا۔" میگھن نے تکیے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "کیا پولیس کو کوئی سراغ ملا؟"
"نہیں، ابھی میں ویب سائٹ کے لیے خبر لکھ رہی ہوں۔ اسے بھیجنے کے بعد میں مزید معلومات کے لیے ٹیلی فورڈ سے رابطہ کروں گی۔"
"اگر کوئی نئی بات معلوم ہو تو مجھے بھی بتانا۔"
"ضرور بتاؤں گی۔"
میگھن اس روز اپنی میز پر لاتعلق بنی بیٹھی رہی۔ وہ کسی کام پر توجہ نہیں دے پا رہی تھی۔ دو ہفتے سے بھی کم وقت میں اس کے دو تبصرہ نگار قتل ہو چکے تھے۔ وارن کی کہی ہوئی باتیں اس کے دماغ میں گردش کر رہی تھیں۔ وہ غیر محتاط ہوگئی تھی اور اس کی قیمت اس کے ملازمین ادا کر رہے تھے۔ وہ نیوز روم میں گئی جہاں جینا اپنے کمپیوٹر پر کام کر رہی تھی۔
"تمہیں کچھ معلوم ہوا؟"

''ٹیلی فورڈ نے ایلفی اور اس کے کچھ ملازمین سے پوچھ گچھ کی ہے لیکن کوئی خاص بات معلوم نہیں ہوئی۔ اس کے علاوہ میری بھی کارلٹن کے کچھ پڑوسیوں سے گفتگو ہوئی ہے۔ انہوں نے اس کا ذکر اچھے انداز میں کیا لیکن انہوں نے بھی کچھ نہیں دیکھا اور نہ ہی کچھ سنا۔ مجھے آف دی ریکارڈ معلوم ہوا ہے کہ پولیس والے کارلٹن کے فون سے یہ جاننے کی کوشش کر رہے ہیں کہ گزشتہ رات وہ کہاں کہاں گیا تھا اور اس کے اپارٹمنٹ سے ایک گندی پلیٹ ملی ہے جو کارلٹن کی باقی پلیٹوں سے مختلف ہے لیکن وہ نہیں جانتے کہ وہ کہاں سے آئی ہے۔''

میکھن سر ہلاتے ہوئے بڑبڑائی۔ ''بے وقوف لڑکا۔'' پھر وہ وارن کو فون کرنے کے لیے اپنے دفتر چلی گئی۔

گزشتہ تین ہفتوں کے دوران اس نے وارن سے جتنی بات کی، وہ شاید مہینوں میں نہ کی ہو۔ کیونکہ اس کا باپ اس پر بہت انحصار کرتا تھا۔

''صبح بخیر میکھن، کیا حال ہیں؟'' وارن نے پُرسکون لہجے میں پوچھا۔ شاید اسے کارلٹن کی موت کا علم نہیں ہوا تھا۔

''بالکل ٹھیک ہوں انکل وارن...... میں دیکھنا چاہتی تھی کہ تم کیا کر رہے ہو۔ مجھے اچھا نہیں لگا جس طرح ہم نے تدفین کے بعد گفتگو ادھوری چھوڑ دی تھی۔''

''مجھے بھی۔'' وارن نے کہا۔ پس منظر میں کسی ساز کے بجنے کی آوز سنائی دی۔ وارن نے ایک گہری سانس لی پھر دوسری، اس کے بعد ایک اور۔

میکھن کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ ''انکل وارن! تم ٹھیک تو ہو؟''

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''دراصل ڈاکٹر نے مجھے اپنے غصے کو کنٹرول کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ اس لیے میں ذہنی دباؤ سے بچنے کے لیے سانس لینے کی مشقیں کر رہا ہوں۔''

''پھر تو تمہیں اخبار بھی نہیں پڑھنا چاہیے۔''

''میں نے اخبار نہیں پڑھا۔'' وارن کی آواز میں سختی آگئی۔ ''لاعلمی سے بڑھ کر دنیا میں کوئی چیز بُری نہیں سوائے قتل کے۔ میرے خیال میں یہ سب سے بُری بات ہے۔ کیا ایسا نہیں ہے؟''

''تو تم نے سن لیا۔''

''ہاں، مجھے معلوم ہوگیا ہے۔'' اس نے ایک اور گہری سانس لی۔ ''میں جانتا ہوں کہ تم اخبار کی آمدنی بڑھانے کے لیے اس طرح کے تبصرے شائع کر رہی ہو تاکہ تم اخبار کی اشاعت جاری رکھ سکو لیکن میکھن لوگوں کو

تکلیف اور زندگیوں کو خطرے میں ڈالے بغیر بھی اخبار کی اشاعت بڑھانے اور اشتہارات حاصل کرنے کے اور بھی کئی طریقے ہیں۔ میں کام پر واپس آنا اور دوبارہ تبصرہ لکھنا چاہتا ہوں تاکہ تمہاری مدد کر سکوں۔'' پس منظر موسیقی رک گئی۔ ''معاف کرنا، مجھے ایک دوست سے ملنے جانا ہے لیکن تم میری پیشکش پر غور کرنا، خدا حافظ۔''

میگھن نے کئی گھنٹوں تک اس کے سوا... کچھ نہیں سوچا۔ شاید وارن ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ ممکن ہے کہ اس نے ہی غلط راستے کا انتخاب کیا ہو۔

اس نے اخبار میں جانے والی تمام خبریں دیکھیں اور اسے کارلٹن کی موت کی خبر مل گئی۔ شیری نے تمام ضروری تفصیلات لکھ دی تھیں۔ اس نے شیری کو نیوز روم میں داخل ہوتے دیکھا تو فون کر کے اسے اپنے دفتر میں بلا لیا۔

''تم نے کارلٹن کی موت کی خبر بہت اچھے طریقے سے لکھی ہے۔ اور اس کے حالاتِ زندگی اور شخصیت کا مکمل احاطہ کیا ہے۔''

شیری کے چہرے پر ایک اُداس مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ''شکریہ، خوش قسمتی سے مجھے اس کے والدین سے گھر پر ملنے کا موقع مل گیا۔ فون پر تفصیل سے بات نہیں ہو سکتی لیکن کسی کے لیونگ روم میں بیٹھ کر ہم اس کے بارے میں بہت کچھ جان سکتے ہیں۔'' وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''میرا خیال ہے کہ مجھے اپنا کام شروع کر دینا چاہیے کیونکہ مرنے والوں کے بارے میں خبریں آنے کا سلسلہ بھی نہیں رکتا۔'' پھر وہ جلدی سے بولی۔ ''اوہ معاف کرنا، مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔''

میگھن نے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ میں نیوز روم میں ہونے والے بے ہودہ مذاق کے بارے میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ ہمیں اس سے نمٹنا ہوتا ہے۔''

شیری نے تائید میں سر ہلایا اور جانے لگی پھر اچانک ہی مڑ کر بولی۔ ''میں جانتی ہوں کہ اخبار کو بچانے کے لیے ریستوران پر ہونے والے تبصرے تمہارے لیے کتنے اہم ہیں۔ اگر تم اس سلسلے میں میری مدد لینا چاہو تو میں اب بھی اس میں دلچسپی رکھتی ہوں۔''

''شکریہ شیری! جب تک وارن واپس نہیں آ جاتا، میں جانتی ہوں کہ وہ ایسا چاہتا ہے اور اب جو کچھ ہوا، اس کے بعد میرا خیال ہے کہ وہ واپس آ سکتا ہے۔''

''وارن نے تمہیں یہ بتایا ہے؟''

''وہ اس بارے میں بات کرتا رہتا ہے کہ ان غیر مہذب تبصروں کی وجہ سے اخبار کی ساکھ کس طرح متاثر ہو رہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر تم کہو گی تو وہ واپس آ جائے گا۔''

اس کے جانے کے بعد میگھن بک شیلف پر گئی جہاں کئی فریم شدہ تصویریں رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے ان میں سے ایک تصویر اٹھائی۔ جس میں وہ اپنے باپ کے ساتھ نیوز روم میں کھڑی ہوئی تھی۔ کیا وہ بھی یہی سوچتا ہوگا کہ اس نے اخبار کی ساکھ خراب کر دی ہے جبکہ وہ سمجھتی تھی کہ تبصروں کا نیا انداز بہت دلچسپ ہے جس سے نہ صرف اخبار بلکہ ریستوران کو بھی شہرت مل رہی ہے۔ گوکہ بہت سے ریستوران مالکان اس سے متفق نہیں تھے۔

میگھن نے ایک چھوٹی فریم شدہ تصویر اٹھائی جس میں وہ وارن کے ساتھ تھی۔ بے چارہ وارن۔ اسے وارن سے ہمدردی محسوس ہونے لگی۔ اس نے اس اخبار میں ڈیڈی کے شانہ بشانہ برسوں کام کیا تھا پھر ڈیڈی کے مرنے کے بعد وارن کو ملازمت سے برطرف کر دیا کیونکہ وہ اس کے سپاٹ اور پھیکے تبصروں سے مطمئن نہیں تھی۔ اس طرح وارن کے پاس اس کے باغ کے علاوہ کوئی مصروفیت نہ رہی، اس کے بیوی بچے نہیں تھے اور نہ ہی کوئی خاندان ماسوائے چند دوستوں کے۔ اس کے ریٹائرمنٹ کے بعد میگھن نے ایک دفعہ بھی اس کی خیریت نہیں پوچھی تھی کہ وہ کس حال میں ہے اور اس پر کیا گزر رہی ہے۔

اس نے پلکیں جھپکائیں اور وارن کے باغ میں بنے ہوئے اس شیڈ کے بارے میں سوچنے لگی جس میں وہ اپنے اوزار اور بیج رکھتا تھا۔ اور کیڑے مار دوا بھی۔

کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ اس نے اپنا پرس اٹھایا۔ اسے یہ چیک کرنے کے لیے جانا تھا۔ اس نے وارن کے ڈرائیو وے میں کار کھڑی کی اور عقبی دروازے کا رخ کیا جو اس کے دوست اور رشتے دار استعمال کرتے تھے۔ اس نے دروازے پر دستک دی جب کوئی جواب نہ آیا تو ناب گھمائی، دروازہ کھل گیا۔

''انکل وارن۔'' اس نے گھر میں قدم رکھتے ہوئے آواز لگائی۔ کچن سے سڑے ہوئے کیلوں جیسی بُو آ رہی تھی۔ اس نے دوبارہ زور سے پکارا۔ ''انکل وارن! میں میگھن ہوں۔ تم سے بات کرنی ہے، پلیز باہر آؤ۔''

اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ اس نے دیکھا کہ وارن کاؤنٹر کے پیچھے فرش پر پڑا ہوا ہے۔ اس کے منہ سے رال بہہ رہی تھی۔ اسے زور دار قے ہوئی تھی۔

''اوہ میرے خدا۔'' اس نے جھک کر وارن کی نبض

دیکھی اور نو گیارہ کو فون کر دیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ ''انکل وارن! ٹھیک ہو جاؤ پلیز۔''

اس نے سنک کے اوپر لگا ہوا کیبنٹ کھول کر وارن کا منہ صاف کرنے کے لیے ٹشو پیپر نکالا اور اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ٹشو کے رول کے برابر میں دو بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک بوتل میں کاربو فوران پاؤڈر کی شکل میں دوسری میں مائع حالت میں تھا۔

میگھن کا دل ٹوٹ گیا جب اسے احساس ہوا کہ وہ صحیح تھی۔ وارن نے ہی آئن اور کارلٹن کو قتل کیا تھا اور اب اسے دل کا دورہ پڑ گیا تھا جیسا کہ اس کے ڈاکٹر کو ڈر تھا۔ اسے شدت سے اپنے جرم کا احساس ہوا ہو گا یا پھر اس نے زہر لے لیا؟

تھوڑی دیر میں طبی عملہ اور ٹیلی فورڈ بھی آ گئے۔ میگھن نے انہیں پوری صورت حال بتائی اور وارن کو فوری طور پر اسپتال منتقل کر دیا گیا۔ ٹیلی فورڈ کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے میگھن کے ذہن پر ایک بوجھ تھا۔ یہ سب اس کی غلطی کی وجہ سے ہوا۔ اگر وہ وارن کو ریٹائر ہونے پر مجبور نہ کرتی اور اخبار کو بچانے کے لیے کوئی اور راستہ اختیار کرتی تو یہ نوبت نہ آتی۔

اس کی نظر وارن کے باغ پر گئی جو پہلے کے مقابلے میں چھوٹا لگ رہا تھا پھر اس نے شیڈ کی جانب دیکھا جس میں وارن کیڑے مار دوا رکھتا تھا۔ یہ جگہ اس کے مکان سے کافی دور تھی۔ وارن کو عرق النسا کا عارضہ تھا اور یہ اس کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ ٹانگ کی تکلیف کی وجہ سے اتنی دور چل کر آسکتا۔ اسے یاد آیا کہ چند ہفتے قبل لنچ کے دوران وارن نے بتایا تھا کہ اس نے باغ کی دیکھ بھال کے لیے کسی آدمی کی خدمات حاصل کر لی ہیں۔ وہ ریلنگ تک چلتی ہوئی گئی اور اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کرنے لگی۔

''جینا نے مجھے بتایا ہے کہ تمہیں کارلٹن کے اپارٹمنٹ میں ایک پلیٹ ملی تھی جو اس کی نہیں ہے۔''

''یہ آف دی ریکارڈ ہے۔'' ٹیلی فورڈ نے کہا۔

''میں جانتی ہوں۔'' میگھن اس کی طرف مڑتے ہوئے بولی۔ ''کارلٹن بے وقوف نہیں تھا، وہ کسی ایسے فرد کا دیا ہوا کھانا نہیں کھاتا جس پر اسے بھروسا نہ ہو۔ جس کسی نے بھی اسے زہر دیا وہ اس کا کوئی جاننے والا ہو گا اور وہ وارن کو نہیں جانتا تھا۔ کوئی وارن کو پھنسا رہا ہے۔''

''کون؟''

ایک کار ڈرائیو وے میں آ کر رکی۔ جینا اور شیری دوڑتی ہوئی پورچ کی طرف آئیں۔ ''ہم نے سنا ہے کہ یہاں ایمبولینس آئی تھی؟'' جینا نے کہا۔ ''انہوں نے کاربو فوران کا بتایا ہے، کیا ہوا تھا؟''

''وارن تو ٹھیک ہے؟'' شیری نے پوچھا۔

''وہ مر گیا ہے۔'' میگھن نے کہا۔

''کیا اسے قتل کیا گیا ہے؟'' جینا نے پوچھا۔

''یہ نہیں ہو سکتا۔'' شیری دوڑتی ہوئی آئی اور میگھن سے لپٹ گئی۔

''اوہ، ایسا ہو سکتا ہے۔'' میگھن نے سوچا۔ اسے شیری کے بدن سے سبز ٹماٹر کے پودوں اور لیونڈر کی ملی جلی مہک آ رہی تھی۔ وارن کے باغ میں یہ پودے لگے ہوئے تھے جس کی وجہ سے وارن کے جسم سے بھی یہی بو آتی تھی۔

بے چاری شیری جو تبصرہ نگار بننا چاہ رہی تھی لیکن آئن اور کارلٹن کی وجہ سے اس کی یہ خواہش پوری نہیں ہوئی اور اب وارن نے واپس آنے کی پیشکش کر دی تھی۔ شیری کی رسائی وارن کے شیڈ تک تھی۔ وہ بہ آسانی وہاں تک چل کر جا سکتی تھی اور گھر میں بنا ہوا زہر ملا کھانا آئن، کارلٹن اور وارن کو دے سکتی تھی۔ ان سب نے کسی شک و شبے کے بغیر وہ کھانا کھا لیا کیونکہ انہیں شیری پر بھروسا تھا۔

اگر میگھن کوئی عام سی جذباتی عورت ہوتی تو وہ اسی وقت شیری کا گلا گھونٹ دیتی لیکن اس کے بجائے وہ بولی۔ ''ایسا لگتا ہے کہ وارن نے ہی آئن اور کارلٹن کو زہر دیا ہے۔''

جینا کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ ''مجھے یہی اندیشہ تھا۔'' شیری نے کہا۔ ''اس کے شیڈ میں زہر بڑی مقدار میں موجود ہے اور وہ شدت سے اخبار میں واپس آنے کا خواہش مند تھا تاکہ دوبارہ تبصرہ نگار کی ذمے داری سنبھال سکے۔ وہ کئی مہینوں سے یہ بات کہہ رہا تھا۔''

''میں حیران ہوں۔'' میگھن بولی۔ ''کیونکہ وہ مجھ سے کہتا رہتا تھا کہ تمہیں تبصرہ نگاری کی ذمے داری دے دوں۔''

''کیا اس نے ایسا کہا؟'' شیری کے لہجے میں اشتیاق تھا۔

میگھن نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اوہ اچھا، مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے گو کہ اس وقت یہ بات کرنا مناسب نہیں۔''

''بالکل۔'' میگھن دانت پیستے ہوئے بولی۔ عام طور پر رپورٹر کسی سے کچھ اگلوانے کے لیے خود خاموش رہ کے اور دوسرے کو بولنے کا موقع دیتے ہیں لیکن میگھن میں اتنا صبر نہیں تھا۔ وہ اس ڈرامے کو ختم کرنا چاہتی تھی۔ ''تم جانتی ہو کہ

وارن نے آج سے پہلے واپس آنے کی پیشکش نہیں کی تھی جب اسے معلوم ہوا کہ کارلٹن کی موت کی وجہ سے ہم مشکل میں ہیں تو اس نے یہ بات منہ سے نکالی۔ تم آج صبح یہاں تھیں اور تم نے وارن کو فون پر مجھ سے باتیں کرتے ہوئے سنا۔''

''تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔'' شیری نے مسکراتے ہوئے کہا لیکن وہ کچھ گھبرا گئی تھی۔ ''میں صبح کارلٹن کے والدین کا انٹرویو کر رہی تھی۔''

میگھن نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''تم کسے بے وقوف بنا رہی ہو۔ میں اس کاروبار میں پلی بڑھی ہوں اور جانتی ہوں کہ ایک انٹرویو میں کتنا وقت لگتا ہے۔ تمہارے پاس یہاں رکنے اور وارن سے ملنے کے لیے کافی وقت تھا کیونکہ تم خود تبصرہ نگار بننا چاہتی تھیں۔ اس لیے یقیناً تمہیں اس کی پیشکش اچھی نہیں لگی ہوگی۔''

''نہیں۔'' شیری نے ٹیلی فورڈ اور جینا کی طرف باری باری دیکھا۔ جب دونوں میں سے کوئی بھی اس کا دفاع کرنے کے لیے آگے نہیں بڑھا تو وہ بولی۔ ''اس کے علاوہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم خود کہہ چکی ہو کہ وارن نے ہی ان دونوں کو قتل کیا تھا اور تمہیں اس کے کچن کے سنک کے نیچے کاربوفوران کی بوتلیں ملی تھیں۔''

''میگھن نے کبھی بوتلوں کا تذکرہ نہیں کیا۔'' ٹیلی فورڈ نے کہا۔ ''تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ بوتلیں کہاں تھیں؟ اور تم یہ کیسے جانتی ہو کہ وارن کے شیڈ میں کیا ہے؟''

شیری کا منہ کھل گیا۔ ''میں...... تم میرے الفاظ گھما رہے ہو، مجھے وکیل کو بلانا ہوگا۔''

ٹیلی فورڈ نے ہتھکڑی نکالتے ہوئے کہا۔ ''ضرور بلاؤ۔''

جب وہ اسے کار کی طرف لے جانے لگا تو جینا نے میگھن پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

''میں سوچ بھی نہیں سکتی کہ شیری اتنی فریبی اور خطرناک ہوگی۔''

''میں بھی ایسی ہی ہوں۔'' میگھن نے کہا۔ ''گو کہ آئن اور کارلٹن کے معاملے میں مجھ سے تاخیر ہوگئی لیکن وارن بچ گیا۔''

''کیا مطلب؟''

''میں نے جھوٹ بولا تھا۔ جب وہ اسے اسپتال لے گئے تو وہ زندہ تھا۔ چلو دیکھتے ہیں کہ وہ کیا کررہا ہے۔ اس طرح تمہیں لکھنے کے لیے ایک زبردست کہانی مل جائے گی۔''

دو دن بعد میگھن اور ٹیلی فورڈ اسپتال میں وارن کے پاس موجود تھے۔ اس کے گال گلابی ہو رہے تھے اور رویہ بھی بہتر لگ رہا تھا۔ البتہ اسے یہ حیرانی ضرور تھی کہ اسے اس عورت نے مارنا چاہا جسے وہ دوست سمجھتا تھا۔

''میں نے بھی اسے اتنا غصے میں نہیں دیکھا۔'' وارن نے کہا۔ ''جب اس نے سنا کہ میں دوبارہ کام پر جانا چاہ رہا ہوں تو اس نے مجھ پر دھوکا دہی کا الزام لگا دیا۔ اسے تبصرہ نگار بننے کی شدت سے خواہش تھی اور وہ موت کی خبریں لکھنے سے تنگ آ چکی تھی۔ اسی لیے جس روز تمہیں دفتر میں بم رکھنے کی دھمکی ملی، اس نے مجھے مجبور کیا کہ تمہارے ساتھ لنچ کروں۔''

میگھن کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ دھمکی شیری نے دی تھی۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ میگھن کسی نئے تبصرہ نگار کی تلاش میں ہے لیکن میگھن اتنی آسانی سے ڈرنے والی نہیں تھی۔

''وہ چاہتی تھی کہ میں اس کی تعریف کروں۔'' وارن نے کہا۔ ''تاکہ وہ تبصرے لکھ کر لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جائے۔''

''اب اس کی یہ خواہش پوری ہوگئی ہے۔'' ٹیلی فورڈ نے کہا۔ ''بم رکھنے کی دھمکی ایک برنر فون سے دی گئی تھی جو ہمیں اس کے اپارٹمنٹ سے ملا ہے اور کارلٹن کے گھر سے ملنے والی سفید پلیٹ بھی شیری کی ہی تھی۔''

''ایسی ہی ایک اور پلیٹ تمہیں میرے ڈش واشر سے مل جائے گی۔'' وارن نے کہا۔ ''شیری نے مجھے اس میں بنانا بریڈ دی تھی جو میں نے تھوڑا سا چکھنے کے بعد پھینک دی۔''

''بہت اچھا کیا ورنہ تم بھی مر جاتے۔'' میگھن نے کہا۔

''جس شخص نے پچاس سال تک ریستوران کے کھانوں پر تبصرہ کیا ہو۔ وہ یہی کرے گا۔'' وارن نے کہا۔ ''بریڈ کا ذائقہ اچھا تھا لیکن شکل اچھی نہیں تھی۔ وہ بہت خشک اور دانے دار تھی۔''

میگھن نے قہقہہ لگایا اور بولی۔ ''انکل وارن! جب تمہاری طبیعت ٹھیک ہو جائے تو میں تمہیں شہر کے بہترین ریستوران میں لے جاؤں گی۔ اس کے بعد تم کام پر واپس آجاؤ، میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمہاری ہر بات سنوں گی۔''

وارن نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اب تم سمجھ گئی ہو۔ میں نے کئی ہفتوں بعد ایک اچھی خبر سنی ہے۔''

میگھن اسے کیا بتاتی کہ وہ اپنے دو ساتھیوں سے محروم ہونے کے بعد یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہوئی۔

❖❖❖

کھوٹ

محمد تسلیم کرد

دو انسانوں کے درمیان پہلے تعلق کے بعد دوسرا مرحلہ اعتماد و اعتبار کا ہوتا ہے... اس کے بعد یہی تعلق داری کا رشتہ مزید استوار ہوتا چلا جاتا ہے... سفر کے دوران ملنے والے دو اجنبیوں کی اچانک ملاقات کا احوال...

نیت میں کھوٹ اور دل میں بغض رکھنے والوں کا شرانگیز ملاپ

بھوک کے گدھ آسمان پر بے چینی سے منڈلا رہے تھے۔ سخت گرمی میں غضب کی پیاس اور نقاہت سے قاسم کی جان لبوں پر آ گئی تھی۔ اس کے بے جان قدموں میں مزید آگے بڑھنے کی سکت نہیں تھی۔ وہ لڑکھڑا کر اپنی جگہ پر ٹھہر گیا۔

''کاش کہ میری گن راستے میں کھوئی نہ ہوتی تو تم میں سے ضرور کسی ایک کو مار کر اُس کے خون سے میں اپنی پیاس بجھاتا۔'' سر پر دائرے کی صورت میں منڈلاتے

گدھوں کی طرف نگاہ اٹھاتے ہوئے قاسم حسرت بھرے انداز میں بڑبڑایا۔ ہر طرف تپتا ہوا صحرا تھا۔ جابجا پستہ قامت بدنما جھاڑیاں نظر آرہی تھیں۔ قاسم کو پانی اور ٹھنڈی چھاؤں کی بڑی طلب تھی لیکن دور، دور تک سوائے بدنما اور بے سائبان جھاڑیوں اور ریت کے گرم ٹیلوں کے اور کوئی شے نظر نہیں آرہی تھی۔

قاسم پر مصیبتوں کا در اُس وقت کھل گیا تھا، جب ڈکیتی کی رقم کے معاملے پر اس کا تصادم اپنے گینگ سے ہوا تھا جس کے نتیجے میں تین ساتھی اس کے ہاتھوں لقمۂ اجل بن گئے۔ موقع پر وہ رقم اٹھا کر فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ پولیس اور اپنے خونخوار گینگ کی دسترس سے وہ فوری طور پر دور نکل جانا چاہتا تھا۔ اس وقت رات کے گیارہ بج رہے تھے جب وہ بائیک پر قصبے سے کافی دور ویرانے اور تاریکی کی طرف نکل آیا تھا۔ کچی اور دشوار گزار راہوں پر بائیک پر آگے کا سفر ناممکن تھا۔ بائیک کو ایک محفوظ جگہ پر چھپانے کے بعد وہ نوٹوں سے بھرا ہوا بیگ سنبھالتا ہوا ٹارچ کی روشنی میں پیدل ہی آگے کے سفر کے لیے نکلا۔ دراصل اسے پولیس سے زیادہ اپنے گینگ سے خوف تھا جو نہ صرف ایک خونخوار گینگ تھا بلکہ پولیس کی نسبت قاسم کے بارے میں پوری طرح معلومات رکھتا تھا۔

قاسم نے چھپنے کے لیے ایک نئے اور مختلف مقام کا انتخاب کیا تھا جو قصبے سے کافی فاصلے پر واقع تھا۔ اسے مصمم یقین تھا کہ گینگ اور پولیس دونوں کو گمان تک بھی نہیں گزرے گا کہ وہ کہاں روپوش ہوگیا ہے۔ پیدل کا یہ سفر طویل اور کٹھن ضرور تھا لیکن محفوظ بھی تھا۔ قاسم کے اندازے کے مطابق صبح سورج طلوع ہونے کے وقت وہ گاؤں پہنچے گا جو اس کی منزل تھی۔ اس طرح وہ نوٹوں سے بھرا ہوا بیگ اور لوڈڈ گن سنبھالتا ہوا ایک طاقتور ٹارچ کی روشنی میں مخصوص رفتار سے آگے بڑھتا رہا۔ ہر طرف گہری خاموشی کا راج تھا۔ قاسم کو ویرانے کی کسی چیز کا خوف نہ تھا۔ گینگ اور پولیس کا ڈر جنگل کے ہر خوف پر حاوی تھا۔ مسلسل ایک گھنٹا چلنے کے بعد وہ پہاڑی سلسلے میں داخل ہوگیا۔ وہ بائیس سال کا ایک چست اور چالاک پیشہ ور مجرم تھا۔ سنگلاخ اور دشوار گزار راہیں اس کے دم خم کے سامنے کوئی خاص حیثیت نہیں رکھتی تھیں۔ تقریباً دو سال قبل جب وہ ایک معمولی نوعیت کا چور تھا۔ ایک عام واردات کے بعد وہ دن کی روشنی میں یہ راستہ استعمال کر چکا تھا۔ تاریک رات میں اس وقت اس کے پاس روشنی کا ذریعہ صرف ایک ٹارچ تھی۔

آدھی رات کے وقت جب وہ پہاڑوں کے درمیان سفر کر رہا تھا اچانک اسے احساس ہوگیا کہ وہ راستہ بھٹک گیا ہے۔ وہ ایک جگہ پر رک گیا اور اصل راستے کا تعین کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اندازے کے مطابق ایک طرف چل پڑا مگر ایک آدھ گھنٹے کے سفر کے بعد ایک دفعہ پھر اسے راہیں نامانوس سی محسوس ہونے لگیں۔ قاسم کو پوری طرح احساس ہوگیا کہ وہ بھٹک چکا ہے، وہ رکا نہیں، اجنبی راہوں پر اس امید پر چلتا رہا کہ شاید آگے کہیں اصل راستہ اسے مل جائے لیکن مایوسی اور بیزاری نے جلد اسے آگھیرا۔ اسے اجنبی راہوں پر بار بار یہ احساس ستا رہا تھا کہ وہ اصل راستے سے کافی دور ہٹ چکا ہے، وہ اضطراری کیفیت میں پُرپیچ اور نامانوس راستوں پر اندھا دھند چلتا رہا۔ اسی دوران ایک بلند جگہ پر چڑھنے کی کوشش میں گن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور لڑھکتی ہوئی ایک گہری کھائی میں جا گری۔ قاسم نے گن کی تلاش میں ٹارچ کی روشنی کھائی میں ڈالی۔

''اوہ...... اسے بھی ابھی مجھ سے کھونا تھا؟'' جب اس کی نگاہیں کافی گہری کھائی میں پڑی ہوئی اپنی گن پر پڑیں تو وہ ملال سے بول اٹھا۔ خاصی حد تک خطرناک اور مشکل کھائی سے گن کو کسی رسی وغیرہ کے سہارے کے بغیر حاصل کرنے کی کوشش کرنا جان کی بازی لگانے کے برابر نظر آرہا تھا۔ وہ کافی دیر بیٹھا رہا اور گن کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا رہا۔

''لعنت ہو......'' آخر وہ بیزاری کے عالم میں بولا اور نوٹوں سے بھرے ہوئے بیگ کو اچھی طرح سنبھالتا ہوا اٹھا۔ قاسم اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ بے منزل راہوں پر گامزن ہے مگر اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ نامعلوم راہوں پر سفر کرتے کرتے آخر رات بیت گئی اور مشرق کی طرف دن کی پہلی کرن نمودار ہونے لگی۔

''یہ میں کس طرف نکل آیا؟'' وہ پہاڑی پر کھڑا ہلکی روشنی میں دور، دور تک کا جائزہ لیتے ہوئے کفِ افسوس سے بڑبڑایا۔ دراصل وہ ایک غیر معروف علاقے کی طرف نکل آیا تھا، جہاں دور، دور تک کسی انسانی آبادی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ ایک طرف پہاڑ اور دوسری طرف صحرا کے سوا کچھ نہیں تھا۔ سورج نکلنے کے ساتھ ساتھ گرمی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اب تک کے سفر کے دوران میں قاسم دم لینے کے لیے ایک دو بار رکا تھا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے

چمک رہے تھے اور وہ تھکا ہوا تھا۔ گہری خاموشی میں ڈوبے ہوئے غیر معروف جنگل سے نکلنے کے لیے قاسم نے خود کو پوری طرح تازہ دم رکھنے کے لیے ستانے کا فیصلہ کیا۔ اس کے پاس پینے کے لیے پانی تھا نہ کھانے کے لیے کوئی چیز۔ بھوک تو البتہ نہیں تھی لیکن پیاس اسے ضرور محسوس ہو رہی تھی جو ابھی قابلِ برداشت تھی۔

قدرے ٹھنڈی جگہ پر فروکش ہونے کے بعد وہ اٹھا اور ڈکیتی سے حاصل ہونے والی رقم سے بھرا بیگ سنبھالتا ہوا ایک طرف چل پڑا۔ ستانے کے دوران قاسم نے آئندہ سفر کے لیے ایک سمت کا تعین بڑی سوچ کے بعد کیا تھا۔ پہلے کی نسبت وہ خود کو خاصا تازہ دم محسوس کر رہا تھا لیکن چڑھتے ہوئے سورج کے ساتھ ساتھ گرمی کی شدت میں بتدریج اضافہ ہو رہا تھا۔ بالآخر پہاڑی سلسلہ ختم ہو گیا اور بھدی جھاڑیوں سے بھرا بڑا صحرا سامنے رہ گیا۔ قاسم بدستور چلتا رہا۔ صبح سے دوپہر ہو گئی، اسے بُری طرح پیاس ستانے لگی اور اسے ہولناک صحرا میں آگ برساتے ہوئے سورج سے سر چھپانے کے لیے ٹھنڈی چھاؤں کی اشد ضرورت پیش آ گئی تھی۔ کوئی ایسا پیڑ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا جو اپنے بلند چھتے کے تلے اسے سورج کی جھلسا دینے والی گرمی سے محفوظ رکھتا۔

قاسم کے پاس سیل فون تھا۔ اسے دو سال پہلے کے سفر سے تجربہ حاصل ہو چکا تھا کہ اس ویران اور بیاباں علاقے میں دور، دور تک کوئی بھی سروس کام نہیں کرتی۔ بعد میں اگر کوئی موبائل ٹاور آس پاس کہیں نصب بھی کیا گیا ہو گا اس حوالے سے قاسم کو مطلق علم نہیں تھا، وہ احتیاط کے پیشِ نظر کسی سے بھی رابطہ کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن اب صحرا کی حدت میں پیاسا بھٹکتے ہوئے اس کی حالت لحہ بہ لحہ غیر ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے دگرگوں حالات سے تنگ آ کر اس امید سے سیل فون جیب سے نکالا کہ شاید اس ویرانے میں سگنل مل پائے مگر اسکرین پر دونوں کنکشن کے خانے سگنل سے خالی دیکھ کر اسے مایوسی ہوئی۔ وہ اب پچھتا رہا تھا کہ جب وہ پہاڑی بلندیوں پر تھا تو وہاں پر ٹرائی کیوں نہیں کیا۔ باقی دنیا سے رابطے کے لیے شاید وہاں کہیں سے سروس حاصل ہوتی۔ پہاڑی سلسلہ خاصا پیچھے رہ گیا تھا۔ اب اس میں اتنا دم خم کہاں تھا کہ سگنل ڈھونڈنے کے لیے دوبارہ پہاڑیوں کی طرف لوٹتا۔ نوٹوں سے بھرا ہوا بیگ اب اسے وزنی اور اضافی بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔ اسے دو گھونٹ پانی کی ضرورت تھی۔ نوٹوں سے بھرا ہوا بیگ اپنی وقعت کھو رہا تھا۔ غضب کی پیاس سے قاسم کے حلق میں کانٹے چبھنے لگے تھے اور پیر من، من بھر کے محسوس ہو رہے تھے۔ ایک آدھ قدم بمشکل اٹھانے کے بعد وہ جان بہ لب نوٹوں سے بھرے ہوئے بیگ کے ساتھ صحرا کی تپش زدہ زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کی ڈبڈباتی آنکھیں نیلے افق پر منڈلاتے ہوئے بھوکے گدھوں کے غول پر جمی ہوئی تھیں۔

☆☆☆

''ابھی میری جان میں کچھ سانسیں باقی ہیں...... مر جاؤں تو میری لاش پر دعوت اُڑانا۔'' کسی لاش کے مانند پڑے قاسم نے سر پر منڈلاتے ہوئے بھوکے گدھوں کی طرف دیکھتے ہوئے نحیف آواز میں کہا اور پھر زمین سے سر اٹھا کر سیدھا بیٹھ گیا۔ عین اسی وقت اس کی ڈبڈباتی نگاہیں دو ہیولوں سے دوچار ہوئیں تو وہ قدرے چونک سا گیا اور آنکھیں پھاڑ کر سامنے دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ ان کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا اور وہ دونوں لہراتے ہوئے سیدھے قاسم کی طرف چلے آ رہے تھے۔

''یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں؟ میرے گروہ کے لوگ یا پولیس یا عام قسم کے مسافر؟'' قاسم سوچنے لگا۔ ''تپتے صحرا میں بھوکا پیاسا تڑپ تڑپ کر مر جانے اور بھوکے گدھوں کی خوراک بننے سے پولیس کے ہاتھوں گرفتار ہونا ہزار درجہ بہتر ہے۔ یہ میرے گروہ کے لوگ اگر نکل گئے تو؟...... موت اس سے بھی ہزار گنا اذیت ناک ہو گی۔'' یہ سوچ کر اس کا دل کانپ اٹھا۔ اسے اپنے گروہ کی سفاکی کا اچھی طرح اندازہ تھا۔ ایک دفعہ پھر قاسم چونک اٹھا۔ اب ہیولے کم فاصلے پر واضح انداز میں نظر آ رہے تھے۔ ان کے خدوخال اور حلیے ان کے ہر بڑھتے قدم کے ساتھ مزید واضح تر ہوتے جا رہے تھے۔ ایک نوجوان لڑکا جس کے ساتھ نوجوان لڑکی تھی، قاسم کی طرف چلے آ رہے تھے۔ دونوں اپنے ہاتھوں میں کچھ چیزیں بھی سنبھالے ہوئے تھے جس میں سے پانی کی ایک بوتل بھی لڑکے کے پاس نظر آ رہی تھی۔ یہ سب دیکھ کر قاسم نے سکھ کا سانس لیا۔

''آپ کون ہو اور کہاں جا رہے ہو؟'' وہ جب قریب پہنچے تو لڑکے نے سوال کیا۔

''پانی...... پانی۔'' جواب دینے کے بجائے قاسم نے نقاہت بھری آواز میں پانی مانگا۔

''لگتا ہے بے چارہ بھٹکا ہوا پیاسا کوئی مسافر ہے...... ایک دو گھونٹ پانی اسے پلاؤ تاکہ اس کا حلق تر ہو جائے۔'' لڑکی نے ترحم بھری نگاہوں سے قاسم کی طرف

دیکھتے ہوئے لڑکے سے کہا۔
''ہمارے پاس بھی پانی ختم ہوتا جارہا ہے۔ چلو ایک دو گھونٹ آپ بھی پی لو...... بقیہ پانی چشمے تک پہنچنے کے دوران استعمال ہوتا رہے گا۔'' لڑکے نے بوتل سے ڈھکنا ہٹانے کے بعد بوتل کا دہانہ قاسم کے خشک لبوں سے لگاتے ہوئے کہا۔
بوتل میں نصف سے بھی کم پانی تھا۔ پیاس کی شدت سے دہکتے سینے میں جب گھونٹ، گھونٹ پانی اترنے لگا تو قاسم کو فرحت اور طمانیت کا احساس ہونے لگا۔ وہ سارا پانی اپنے حلق میں انڈیلنے کے درپے تھا لیکن اجنبی نوجوان نے بوتل اس کے منہ سے ہٹالی۔
''طبیعت کچھ سنبھل گئی؟'' کچھ دیر بعد نوجوان نے قاسم سے پوچھا۔
''اتنا بھی شکر ہے خدا کا۔'' قاسم نے اثبات کے انداز میں کہا۔ تشنگی اب بھی خاصی تھی لیکن چند گھونٹ پانی خشک حلق میں اتارنے کے بعد قاسم کی حالت کسی حد تک بہتر ہوگئی تھی۔
''تو چلیں اب چشمے کی طرف...... وہاں صاف اور ٹھنڈا پانی بھی پی لیں اور ساتھ نہادھو بھی لیں۔'' نوجوان نے قاسم سے کہا۔
''چشمہ؟...... یہاں؟'' چشمے کا ذکر سن کر حیرت اور خوشی کے عالم میں قاسم بول اٹھا۔
''یہاں صحرا میں نہیں...... وہاں پہاڑی پر......'' نوجوان نے دور پہاڑوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
''کتنا وقت لگے گا؟'' قاسم نے استفسار کیا۔
''پہلے ہمیں یہاں سے جنوب کی طرف سفر کرنا ہوگا پھر مغرب کی طرف پہاڑ کے گرد گھومتے ہوئے پہاڑ کے درمیان واقع چشمے تک پہنچنا ہوگا۔ اس وقت ہماری جو حالت ہے اس کو مدِنظر رکھا جائے تو ڈھائی سے تین گھنٹے کا وقت لگے گا۔'' نوجوان نے بتایا۔
''اوہ...... اس قدر طویل سفر! مجھ سے تو چلا نہیں جائے گا۔'' قاسم اداسی سے بولا۔
''مجھے اس ویرانے میں پہلے بھی دو تین دفعہ سفر کرنے کا اتفاق ہو چکا ہے...... پورے علاقے میں صرف وہ واحد پانی کا چشمہ ہے اور ہمارے پاس اس وقت پانی کی صرف اس قدر مقدار بچی ہے۔'' آخر میں نوجوان نے قاسم کے سامنے پلاسٹک کی بوتل لہراتے ہوئے کہا جس کی تہ میں چند گھونٹ کے برابر پانی صاف نظر آرہا تھا۔
''کوشش کروں گا۔'' قاسم نے بوتل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''ہم لوگ جارہے ہیں۔ باقی آپ کی مرضی۔'' نوجوان نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھاتے ہوئے کہا جہاں مردار خور گدھ بے قراری کے ساتھ منڈلا رہے تھے۔ قاسم نوجوان کی بات کا مفہوم سمجھ گیا اور قوت مجتمع کرتے ہوئے بیگ سمیت اٹھا۔ تینوں بڑی سست روی کے ساتھ قدم اٹھانے لگے۔ وہ دونوں بھی تھکے ہوئے نظر آرہے تھے اور آپس میں باتیں بھی کررہے تھے جبکہ قاسم خاموشی کے ساتھ ان کے پیچھے چلا جارہا تھا۔ اس طرح تینوں چلتے، کبھی ٹھہرتے ہوئے گھونٹ بھر پانی حلق سے اتارتے بالآخر تین گھنٹے کے مشکل ترین سفر کے بعد پانی کے چشمے پر پہنچ گئے۔ دو چٹانوں کے درمیان تیزی سے نکل کر روانی سے بہتا ہوا قدرتی چشمے کا صاف پانی نیچے موجود ایک قدرتی کوزے میں مسلسل بھرتا اور چھلکتا جارہا تھا۔
یہ سب اپنے سامنے پاکر ہانپتے کانپتے قاسم کی آنکھوں میں بے پناہ مسرت کی لہر دوڑنے لگی۔ گویا اسے اپنے کندھے پر لٹکے ہوئے بڑے نوٹوں سے بھرے بیگ سے بھی ایک بیش بہا خزانہ مل گیا ہو اور موجودہ حالات میں حقیقت بھی یہی تھی۔ بیگ کو ایک طرف رکھ کر گھونٹ گھونٹ کا پیاسا قاسم پانی کی طرف لپکا۔ بھرتے اور چھلکتے ہوئے کوزے کے کنارے بیٹھ کر دونوں ہتھیلیوں کا کٹورا بھر، بھر کر ٹھنڈا اور میٹھا صاف پانی اپنے حلق سے اتارنے لگا۔
جرائم پیشہ قاسم کو یوں گمان ہورہا تھا جیسے وہ دونوں ہاتھوں سے ایک بڑا خزانہ لوٹ رہا ہو۔ ایک ایسا بڑا اور قیمتی خزانہ جس کے سامنے سیم و زر والے خزانے کی کوئی اوقات نہ ہو، قاسم کا رُواں رُواں توانا ہورہا تھا۔ وہ دونوں بھی قدرت کی اس عظیم نعمت سے پوری طرح فیض یاب ہورہے تھے۔
ٹھنڈے میٹھے پانی سے سیراب ہونے کے بعد قاسم اور وہ نوجوان کوزے میں اتر کر نہانے لگے جبکہ لڑکی نے منہ ہاتھ دھونے پر اکتفا کیا۔ پانی پینے، نہانے اور دھونے کے بعد وہ تینوں تازہ دم ہوگئے۔ اس وقت وہ تینوں ایک پہاڑی ٹیلے کے سائے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ چشمے کی طرف آتے ہوئے راستے میں نوجوان نے قاسم کے پوچھنے پر بتایا تھا کہ اس پورے علاقے میں دور، دور تک کوئی بھی موبائل سروس کام نہیں کرتی۔
''ہمیں آپ کے بارے میں کچھ علم ہے اور نہ آپ کو

ہمارے بارے میں۔'' نوجوان، قاسم سے مخاطب ہوا اور قاسم اس کی بات کا مفہوم فوراً سمجھ گیا۔

''ہاں، واقعی اب تازہ دم ہونے کے بعد اخلاقی طور پر تعارف ضروری ہے۔ آپ لوگ نہ ہوتے تو میں کب کا مر چکا ہوتا۔ آپ لوگوں کا مجھ پر بڑا احسان ہے۔'' آخر میں قاسم احسان مندانہ انداز میں بولا۔ نوٹوں سے بھرا ہوا بیگ اس کے پاس پڑا ہوا تھا اور وہ دونوں اس کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ آتشِ پیاس بجھانے اور نہا دھو کر تازہ دم ہونے کے بعد قاسم ان دونوں کی طرف پوری طرح متوجہ ہو گیا تھا۔

''میرا نام شکیل ہے اور میرا تعلق یہاں سے دور مغرب کی طرف پڑنے والے ایک قصبے سے ہے۔'' قاسم اپنی اصل شناخت چھپاتے ہوئے بول رہا تھا۔

''ویرانے کو عبور کرتے ہوئے اپنی منزل کی سمت جا رہا تھا کہ راستہ بھٹک گیا، غضب کے درجۂ حرارت میں انجانی راہوں پر بھٹکتے ہوئے شدید پیاس سے میری جان لبوں پر آ گئی، میں اس بنجر اور خشک علاقے میں موت کو گلے لگانے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو گیا تھا۔ میری قسمت اچھی تھی کہ بروقت آپ لوگ آ پہنچے۔ ورنہ میری لاش پر بھوکے گدھ دعوت اُڑا رہے ہوتے۔''

''میں شعیب اور یہ میری ساتھی نازیہ ہیں..... دراصل ہماری منزل بھی وہی ہے جو آپ کی ہے۔'' نوجوان تعارف کراتے ہوئے بولا۔

''ہم لوگ راستہ بھٹک نہیں گئے تھے بلکہ سیدھا گاؤں کی طرف جا رہے تھے۔ عجلت میں ہمیں صرف ایک بوتل پانی اپنے ساتھ لینے کا موقع ملا۔ شدید گرمی میں دشوار گزار راہوں پر طویل پیدل سفر کے لیے صرف ایک بوتل پانی دو انسانوں کے استعمال کے لیے ناکافی تھا۔ ابھی آدھا سفر باقی پڑا تھا کہ بوتل میں آدھے سے بھی کم پانی رہ گیا۔ مجھے علم تھا کہ اس خشک و بنجر علاقے میں ایک چشمہ بھی کہیں پایا جاتا ہے۔ ہم پانی حاصل کرنے کے لیے اس طرف آ نکلے اور صحرا میں آپ کو پڑے دیکھا۔ شاید اس سب میں قدرت کا عمل دخل پوشیدہ تھا کہ ہم آپ کی مدد کر سکیں۔'' شعیب نے کہا۔

''میں تو اپنا راستہ کب کا بھٹک چکا ہوں۔ شرافت کا راستہ ترک کر کے جرائم کا راستہ اختیار کر چکا ہوں..... مگر دنیا والے سیدھے اور کشادہ راہوں پر کہاں چلنے دیتے ہیں۔'' قاسم من ہی من میں بولا۔

''ایسے راستوں کو خاص کر دنیا کی نظروں سے چھپ کر سفر کرنے والے استعمال کرتے ہیں۔'' شعیب معنی خیز انداز میں بولا۔ اس کے پاس بیٹھی ہوئی نازیہ یہ سن کر ذرا جھینپ سی گئی اور سامنے موجود قاسم کو یوں گمان ہوا جیسے شعیب نے اس کے من کی بات سن لی ہو۔

''میں دوٹوک بتا دینا چاہتا ہوں کہ نازیہ میرا پیار ہے اور ہم ایک دوسرے کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتے اور دنیا والے ہمیں ایک ساتھ دیکھنا نہیں چاہتے۔ گھر سے فرار ہو کر ہم گاؤں جانا چاہتے ہیں اور پھر گاؤں سے نکل کر شہر کی طرف...... تاکہ باقاعدہ طور پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک ہو سکیں۔ اپنے علاقے سے گاؤں تک کا موٹر گاڑیوں سے سفر ہمارے لیے انتہائی خطرناک ہے۔ نازیہ کے سخت گیر بھائیوں کے غیظ و غضب سے بچنے کے لیے ہمیں یہ مشکل راستہ اختیار کرنا پڑا..... گاؤں ہماری عارضی منزل ہے، جہاں میرا دور کا ایک مہربان رشتے دار رہتا ہے اور اس وقت ہم جہاں موجود ہیں، یہاں سے اب بھی گاؤں کا فاصلہ کافی ہے۔ ہمیں رات کے وقت اپنا بقیہ سفر طے کرنا ہو گا۔ فی الحال سورج ڈوبنے تک ہمیں آرام کرنا ہے۔'' شعیب نامی نوجوان نے ویران اور بنجر علاقے میں نازیہ نامی ایک نازک اندام لڑکی کے ساتھ اپنے مشکل سفر کی اصل وجوہات کے بارے میں آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

'یعنی کہ میں اور شعیب نام کا یہ نوجوان اس وقت ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔' قاسم سوچنے لگا۔ 'ایک زر کے ساتھ بھاگ رہا ہے تو دوسرا زن کے ساتھ۔'

کچھ دیر کے لیے خاموشی طاری رہی۔ قاسم دونوں کی طرف پوری طرح متوجہ تھا۔ جوڑا مثالی تھا۔ نازیہ سرخ و سفید رنگت والی ایک خوب صورت لڑکی تھی۔ شعیب کی دوٹوک باتوں کے نتیجے میں اس وقت اس کے خوب صورت چہرے پر دوڑتی ہوئی حیا کی تپش نے اس کے رخساروں کی رنگت میں مزید سرخی بھر دی تھی۔ شعیب بھی خوبرو اور چوڑے سینے والا نوجوان تھا۔

''اس کا مطلب یہ ہے کہ میں اپنے اصل راستے سے کافی حد تک دور ہٹ چکا ہوں۔'' قاسم نے سکوت توڑتے ہوئے کہا۔

''جنگل کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے سے بچنے کے لیے، صرف راستے پر انحصار کرنا ضروری نہیں ہوتا۔ اپنی منزل کی درست نشاندہی کے لیے کسی چیز کو سامنے رکھنا لازمی ہوتا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں نا، دور دھندلاہٹ میں کھڑی ایک

پہاڑی چوٹی نظر آرہی ہے سامنے۔ یہاں سے چوٹی ہماری منزل کی نشاندہی کررہی ہے جو پہاڑ کے دامن میں واقع ہے۔ بشرطیکہ ہم اس کے رخ پر سفر کرتے چلے جائیں۔ منزل خودبخود ہمارے قریب ہوتی چلی جائے گی۔'' شعیب نے جنوب مشرق کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا، جہاں دور حدِنگاہ ایک چوٹی کھڑی نظر آرہی تھی۔ جواباً قاسم نے سراثبات میں ہلانے پر اکتفا کیا۔

کچھ ہی دیر میں وہ دونوں آرام کرنے کی غرض سے پہاڑی ٹیلے پر چڑھنے کے بعد دوسری طرف اتر کر قاسم کی نگاہوں سے اوجھل ہوگئے۔ قاسم نے موبائل سیٹ میں وقت دیکھا۔ چار بج رہے تھے۔ گرمیوں کا ایک طویل دن تھا۔ سورج غروب ہونے میں اب بھی خاصا وقت پڑا ہوا تھا۔ ٹیلے کے سائے میں قاسم نے نوٹوں سے بھرے ہوئے بیگ کا تکیہ بنا کر اس پر سر رکھ لیا۔ وہ خاصا تھکا ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد ہی وہ نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

☆☆☆

مغرب کی طرف جھکتے ہوئے سورج کی تیز کرنوں نے ٹیلے کے سائے پر غلبہ حاصل کرنا شروع کیا۔ چہرے پر تیز تپش کے احساس سے قاسم کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اٹھا اور کچھ دیر بعد چشمے کے ٹھنڈے پانی سے منہ ہاتھ دھو کر واپس اپنی جگہ پر آگیا جہاں بیگ پڑا ہوا تھا۔ وہ اب خاصی حد تک خود کو تازہ دم محسوس کررہا تھا لیکن اب اسے بھوک کا احساس ستا رہا تھا۔ اس نے کل رات سے کچھ نہیں کھایا تھا۔

''خالی پیٹ بقیہ سفر کیسے طے ہوگا۔ شاید ان لوگوں کے پاس کھانے کی کوئی چیز موجود ہو۔'' قاسم سوچنے لگا۔ نوٹوں سے بھرا ہوا بیگ اس کے سامنے سپاٹ جگہ پر رکھا ہوا تھا۔ جس کی خاطر وہ اپنے گروہ سے تصادم کا مرتکب ہو چکا تھا۔ رقم پر ایک تسلی کی نگاہ ڈالنے کے لیے اس نے بیگ پر پڑے ہوئے چھوٹے سے تالے میں چابی ڈالی۔

ٹیلے کی دوسری طرف شعیب اور نازیہ بھی نیند لینے کے بعد بیدار ہوگئے تھے۔ ان کے پاس کھانے کے لیے بسکٹ کے چند پیکٹ تھے۔ وہ دونوں چشمے پر منہ ہاتھ دھونے اور قاسم جس نے اپنا نام انہیں شکیل بتایا تھا کے ساتھ سفر کی تیاری کے لیے چٹان کی طرف بڑھے۔ شعیب آگے تھا اور نازیہ اس کے پیچھے تھی۔ شعیب تیزی کے ساتھ چٹان پر چڑھا۔ عین اس دوران اپنی پشت سے بے خبر نیچے موجود قاسم نے بیگ کی زپ بڑی تیزی کے ساتھ پوری طرح کھول دی۔ اندر موجود کرارے نوٹوں کے بے ترتیب بنڈل جھلکنے لگے۔ ایک ہلکی نگاہ ڈال کر قاسم نے پل بھر میں زپ دوبارہ بند کی لیکن بیگ کے اندر موجود نوٹوں پر نہ صرف اس نے ایک نگاہ ڈالی بلکہ چٹان پر موجود شعیب کی نظریں بھی بیگ کے اندر کرارے نوٹوں پر پڑیں۔ وہ ایک لمحے کے لیے اپنی جگہ پر ٹھٹک کر رہ گیا۔ اس سے قبل کہ قاسم اس کی موجودگی اپنے عقب میں چٹان پر محسوس کرتا، وہ فوراً پیچھے کی طرف پلٹا۔ چٹان پر چڑھتی ہوئی نازیہ، شعیب کو اچانک واپس پلٹتا دیکھ کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ اس سے قبل کہ وہ واپس پلٹنے کی وجہ پوچھتی، شعیب نے فوراً اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر چپ رہنے کا اشارہ کیا اور پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر بڑی تیزی سے دوبارہ اس کے ساتھ نیچے آگیا۔

''ہمارا ساتھی ایک جرائم پیشہ شخص ہے۔'' شعیب سرگوشی کے انداز میں بولا۔

''وہ کیسے؟'' نازیہ چونکتے ہوئے آہستگی سے بولی۔

''اس کے پاس... نوٹوں سے بھرا بیگ ہے۔ قصبے سے گاؤں تک کا سفر دوسرے راستے پر آسانی کے ساتھ گاڑی پر بھی طے کیا جاسکتا ہے جس طرح ہم لوگ دنیا کی نظروں سے چھپ چھپا کر گاؤں تک پہنچنے کے لیے یہ دشوار گزار ویرانہ پیدل طے کررہے ہیں۔ یہ شخص بھی یقیناً گاؤں تک بحفاظت پہنچنے کے لیے دشوار گزار راہوں کو متبادل کے طور پر استعمال کررہا ہوگا۔ چنانچہ ہمیں اس کے سامنے اب ایسی کوئی بات ظاہر نہیں کرنا جس سے اسے شک گزرے کہ ہم اس کی اصلیت سے واقف ہو چکے ہیں۔ اس کے ساتھ پہلے جیسا برتاؤ روا رکھنا ہوگا۔'' شعیب نے آنکھیں پھاڑتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا۔ دراصل کرارے نوٹوں کی چکاچوند سے اس کی آنکھیں خیرہ ہوگئی تھیں۔ حرص و لالچ کی ایک لہر اس کی آنکھوں میں ہلکورے لے رہی تھی۔

دوسری طرف قاسم کو یوں گمان گزرا تھا کہ جیسے اس کی پشت پر کھڑے ٹیلے پر کوئی موجود تھا جس وقت اس نے رقم پر ایک نگاہ ڈالنے کے لیے بیگ کھولا تھا۔ بیگ بند کرنے کے بعد اس نے پیچھے کی طرف گردن گھما کر ٹیلے پر دیکھا تو وہاں کسی کو موجود نہ پایا۔ اسے وہ اپنا وہم سمجھا اور دو پریمیوں کے انتظار میں بیٹھا رہا۔

''گاؤں کس کے پاس جارہا ہے۔'' نازیہ سوچتے ہوئے بولی۔

''یہ سوال ہمیں اس سے پہلے کرنا چاہیے تھا۔ اب اس قسم کی کوئی بات اس کے سامنے چھیڑی گئی تو وہ ہوشیار ہو جائے گا۔ کیونکہ مجھے خدشہ ہے کہ کہیں اس نے چٹان پر

میری موجودگی کو محسوس نہ کرلیا ہو۔ ویسے بھی میں گاؤں کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں رکھتا کہ وہاں کس طرح کے لوگ رہتے ہیں۔'' شعیب نے کہا۔

''یہ شخص مسلح بھی ہوگا؟'' نازیہ تشویش سے بولی۔

''صاف بات ہے...... ایک کثیر رقم کے ساتھ کوئی جنگل و بیاباں میں سفر کررہا ہو، وہ ہرگز کوئی عام مسافر نہیں ہو سکتا۔ ایسے لوگوں کا غیر مسلح ہونا ناممکنات میں سے ہوگا۔'' شعیب نے کہا۔

''کاش کہ مجھے اس وقت پتا چلتا اس کے پاس ایک کثیر رقم ہے جب وہ پیاسا مر رہا تھا۔ میں ایک گھونٹ پانی بھی اسے ہرگز نہ پلاتا۔'' شعیب نے دل ہی دل میں حسرت سے سوچا۔ اس کے ذہن میں جزئیات کے ساتھ ایک پلان ترتیب پا رہا تھا۔

''وہ جو بھی کوئی ہو، ہمیں اس سے کیا، ہمیں صرف اس کے ساتھ گاؤں تک جانا ہے۔'' نازیہ بولی۔

''ہاں، تمہاری بات درست ہے۔'' شعیب سوچتے ہوئے بولا۔

اپنے پریمی محسنوں کے انتظار میں بیٹھا قاسم سوچ و فکر میں مستغرق تھا۔ قاسم کا گینگ خطرناک مجرموں پر مشتمل انتہائی سفاک گینگ تھا جس کا سربراہ ایک جلاد قسم کا انسان تھا جس کے نزدیک انسانی زندگی کی کوئی اوقات نہ تھی۔ قاسم کو یقین تھا کہ گینگ اس کے خلاف چین سے ہرگز نہیں بیٹھا ہو گا۔ پوری قوت کے ساتھ اسے ڈھونڈ رہا ہوگا۔ قاسم کو خدشہ لاحق ہوا کہ وہ اس کے پیچھے کہیں اس غیر معروف ویرانے میں نہ ٹپک پڑیں اور بیچ راستے میں اسے دھر کر بُرے انجام سے دوچار نہ کردیں۔ ایسا سوچ کر اس پر خوف حاوی ہوتا جا رہا تھا اور اس وقت کو پچھتا رہا تھا جب گینگ کے تین اہم کارندے اس کے ہاتھوں لقمۂ اجل بن گئے تھے۔

''ہاں بھئی، تیار ہو گئے ہو؟'' سوچوں میں غلطاں قاسم کی سماعت سے جب شعیب کی آواز ٹکرائی تو وہ چونک اٹھا۔

''جی ہاں، میں تیار ہوں۔ آپ لوگوں کا منتظر ہوں۔'' قاسم نے سنبھلتے ہوئے کہا اور اس کی توجہ چٹان سے اترتے ہوئے دونوں پریمیوں کی جانب مبذول ہوگئی۔

''اب ہمیں اپنے درمیان آپ، آپ کی یہ رٹ ترک کرنا ہوگی۔'' شعیب بے تکلفانہ انداز میں بولا۔ شعیب کے ساتھ چٹان سے اترتی ہوئی نازیہ کے شادابی چہرے پر جب قاسم کی نگاہیں ٹھہریں تو ایک دم اس کے من میں ایک

پیاری بیوی

وہ کار میں موٹروے پر چلا جا رہا تھا کہ ایک پولیس افسر نے تعاقب کرکے اسے ایک جگہ روک لیا۔

''ہاں جناب...! کیا مسئلہ ہے؟ کیوں روکا ہے مجھے؟''

''یہاں رفتار کی حد ساٹھ ہے... آپ اسّی کی رفتار پر جا رہے تھے۔''

''ہرگز نہیں... میں پچاس پر گاڑی چلا رہا تھا۔''

''اوہ ڈارلنگ!'' مسافر کی بیوی نے دخل اندازی کی۔ ''تم پورے سو کی رفتار پر گاڑی اڑا رہے تھے۔''

مسافر نے اپنی بیوی کو خشم ناک نظروں سے گھورا۔

افسر نے کہا۔ ''اور تمہاری گاڑی کی عقبی لائٹ بھی ٹوٹی ہوئی ہے جو حادثے کا سبب بن سکتی ہے۔''

''اوہ... مجھے علم نہیں کہ وہ کب اور کیسے ٹوٹی۔''

''میں پچھلے تین ہفتوں سے تمہیں بتا رہی ہوں۔'' بیوی ایک بار پھر بولی۔ ''لیکن تمہارے پاس لائٹ بدلوانے کا وقت ہی نہیں ہے۔''

''اور تم نے سیٹ بیلٹ بھی نہیں باندھی ہوئی ہے۔'' افسر نے قدرے توقف کے بعد الزامات کی فہرست میں اضافہ کیا۔

''تم بائیک سے اترے تو میں نے بیلٹ کھولی تھی۔'' مسافر نے مدافعانہ لہجے میں کہا۔

''نہیں ڈارلنگ... تم کبھی بیلٹ نہیں باندھتے۔ یہ تمہاری عادت بن گئی ہے۔'' بیوی بولے بغیر نہ رہ سکی۔

''بکواس بند کرو۔'' مسافر مڑ کر اپنی بیوی پر غرایا۔ ''ورنہ میں تمہارا منہ توڑ دوں گا۔''

''کیا آپ کے شوہر آپ سے ہمیشہ اسی طرح بات کرتے ہیں؟'' افسر نے عورت سے پوچھا۔

''نہیں۔'' جواب ملا۔ ''بس نشے میں ہوتے ہیں تو ذرا غصہ دکھانے لگتے ہیں۔''

کراچی سے عروج عارف کی تحریر

مسرور کن جذبہ انگڑائی لینے لگا۔ اعصاب پر حاوی خوف و اندیشوں کی کیفیت جیسے اس جذبے کے سامنے مٹی کے ڈھیر کی صورت زمین بوس ہونے لگی۔ بے اختیاری کے عالم میں قاسم کی نظریں متحرک نازیہ کے چہرے پر ٹھہری گئیں۔ ابتر حالات کے سبب شاید قاسم پہلے حسن کی تپش سے بیگانہ تھا۔ اس کی نیت میں کھوٹ آنے لگا۔ خوبرو نازیہ کو پانے کے لیے اتفاق سے قاسم کے ذہن میں بھی شعیب کے خلاف ایک خطرناک منصوبہ بڑی تیزی کے ساتھ ترتیب پانے لگا۔

''نہیں قاسم یہ تیرے محسن ہیں۔'' قاسم کو اندر سے کچوکا لگا۔ مگر قاسم ایک عادی مجرم تھا۔ جرائم اس کی سرشت میں شامل تھے۔ ضمیر کی آواز کو دبانے کا وہ عادی ہو چکا تھا۔

''محسن ہیں تو کیا ہوا؟'' وہ بے حسی کے ساتھ من ہی من میں بولنے لگا۔

''نازیہ تو ویسے بھی گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی ہے۔ اسے میں حاصل کرلوں تو اس میں کیا حرج ہے، میں حسن و جمال میں بھی شعیب سے کسی طرح کمتر نہیں ہوں اور ایک خوش حال زندگی گزارنے کے لیے میرے پاس کافی دولت بھی ہے۔ بس شعیب کا کام تمام ہونے کی دیر ہے، نازیہ کو مجھے اپنانے کے سوا کوئی راستہ نظر نہیں آئے گا۔''

''ہاں بھئی، کیا سوچ رہے ہو، یہ لو کچھ پیٹ میں اتارو۔'' نازیہ کے فتنہ انگیز حسن کے سحر میں اُلجھے ہوئے قاسم کی سماعت سے شعیب کی تیز آواز ٹکرائی تو وہ ایک دفعہ پھر چونکے بنا نہیں رہ سکا۔

''ہاں، ہاں خالی پیٹ میں کچھ اتارنا لازمی ہے۔'' وہ ہچکچاتے ہوئے شعیب کی طرف متوجہ ہوا اور پاس آتے ہوئے شعیب کے ہاتھ میں پکڑے بسکٹ کے پیکٹ لیے۔

''تب تک ہم منہ ہاتھ دھو کر واپس آتے ہیں۔'' شعیب نے کہا اور پھر وہ دونوں چشمے کی طرف بڑھے۔

''یہ ایک ٹک مجھے دیکھ رہا تھا۔'' نازیہ بولی۔

''اس میں کسی کا کیا قصور ہے، تمہارا حسن ہی ایسا قیامت خیز ہے کہ اچھے اچھوں کا ایمان بھی ڈگمگا جائے اور یہ ہے ایک جرائم پیشہ انسان......'' شعیب تعریفی انداز میں بولا۔

''کسی کا مجھے گھورنا، تم کو بُرا نہیں لگتا؟'' نازیہ معصومیت سے بولی۔

''ہاہاہا...... تمہارے جیسی پری وش لڑکی کے بجائے پھر مجھے کسی چیل جیسی ڈراؤنی صورت لڑکی کا انتخاب کرنا ہوتا جس پر ایک لمحے کے لیے بھی کسی کی نظر ٹکنا مشکل ہو جاتا......'' شعیب قہقہہ لگاتے ہوئے شرارت بھرے انداز میں بولا۔

''دیکھ لینے دو اسے ابھی...... کہاں کب تک یہ گھورتا رہے گا۔'' شعیب دل ہی دل میں بولا۔ شعیب نے قاسم کے خلاف اپنے خطرناک عزائم کے بارے میں نازیہ کو آگاہ کرنا بالکل ضروری نہیں سمجھا تھا۔ وہ نازیہ کی رگ رگ سے واقف تھا جو اسے نہ صرف باز رکھتی بلکہ بُرا بھلا بھی کہتی۔

''گاؤں پہنچنے کی دیر ہے پھر اس سے ہماری جان چھوٹ جائے گی۔'' قاسم سنجیدہ انداز میں بولا۔

''خاکم بدہن راستے میں کہیں تمہیں مار کر مجھے اٹھا کر نہ لے جائے۔'' نازیہ تشویش سے بولی۔

''ہم بھی ہاتھ پیر رکھتے ہیں، وہ ایک ہے اور ہم دو۔ اور ہم چوکنا بھی رہیں گے۔'' شعیب نے پانی کے چھینٹے منہ پر مارتے ہوئے برجستگی سے کہا۔

قاسم ایک منٹ میں بسکٹ اپنے خالی پیٹ میں اتار چکا تھا۔

''آجاؤ شکیل بھائی۔'' اسے چشمے کی طرف سے شعیب کی آواز سنائی دی۔ وہ اٹھا اور اس نے بیگ اپنے کندھے سے لٹکا لیا تھا۔ اس وقت سورج پوری طرح ڈوب چکا تھا اور ویران و بیابان جنگل پر تاریکی کی سیاہ چادر بتدریج پھیلتی جارہی تھی۔ قاسم نے جیب سے مختصر مگر طاقتور ٹارچ نکالی، فی الحال اسے آن کیے بغیر اپنے ہاتھ میں رکھا اور کچھ دیر بعد وہ ان دونوں کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ ایک دوسرے کے خلاف یکساں شیطانی خیالات ذہن میں لیے وہ ایک دوسرے کے ارادوں سے یکسر بے خبر تھے۔

''ایسا گھناؤنا قدم اٹھانے کے بارے میں سوچو بھی مت قاسم یہ تیرے محسن ہیں، یہ اگر نہ ہوتے تو تیری انتڑیاں چیل اور گدھ نوچ رہے ہوتے۔'' قاسم کے اندر پھر ایک لہر سی اٹھی۔

''نازیہ تو ویسے بھی اپنے گھر کی دہلیز پھلاند چکی ہے۔ کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا پڑتا ہے، اور میں کوئی ایسا نیک انسان بھی کہاں ہوں۔ ایک سفاک لٹیرا جس کے ہاتھ بے گناہ انسانوں کے لہو سے رنگے ہوئے ہیں۔ ایک دھبا اور پڑ جائے کیا حرج ہے۔'' قاسم نے تاویل پیش کی اور پوری یکسوئی کے ساتھ اپنے منصوبے کے بارے میں غور کرنے لگا۔

تاریکی پوری طرح پھیل چکی تھی، تینوں ٹارچ کی روشنی کی مدد سے اب آگے بڑھ رہے تھے۔ قاسم کی بے اختیار نگاہیں وقفے وقفے سے نازیہ کے حسین سراپا پر پھسل

رہی تھیں جو اس سے ذرا فاصلے پر شعیب کے قریب رہتے ہوئے خراماں انداز میں چل رہی تھی۔ شعیب کا سارا دھیان اپنے منصوبے پر مرکوز تھا۔

☆☆☆

وہ ایک عام سا سفری بیگ تھا جو قاسم کے کندھے سے جھول رہا تھا مگر اس میں پچپن لاکھ کے قریب نقدی موجود تھی۔ سنگلاخ چٹانوں کے درمیان تینوں خاموشی سے چل رہے تھے۔ دن کی نسبت رات خاصی سرد تھی مگر دشوار گزار راہوں پر سفر نے تینوں کو جلد نڈھال کر دیا۔

''کچھ دیر کے لیے ستا لیتے ہیں۔'' نازیہ جو دونوں سے زیادہ تھکی ہوئی تھی، بے صبری سے بولی۔

''ذرا کچھ دور جا کر ستا لیں گے۔ وہ جگہ کافی ہوادار بھی ہے۔'' شعیب نے کہا۔ اپنے منصوبے پر عمل پیرا ہونے کے لیے اس نے وہ جگہ پہلے ہی اپنے ذہن میں طے کر لی تھی۔ چند منٹ چلنے کے بعد وہ شعیب کی رہنمائی میں چٹان پر چڑھنے لگے۔ کچھ دیر بعد ہی وہ ہوادار جگہ پر آگئے۔ قاسم کو بھی اپنے منصوبے پر عمل پیرا ہونے کے لیے ایسی جگہ کی تلاش تھی۔ ہوا خوب تیز چل رہی تھی۔ آلودگی سے پاک فضا میں آسمان کی وسعتوں میں ستارے بڑے دلکش انداز میں ٹمٹما رہے تھے۔ تھوڑی دیر قبل قاسم سرسری انداز میں جگہ کا جائزہ لے چکا تھا۔ ایک طرف ذرا دوری پر بلندی کا اختتام نظر آرہا تھا۔ ٹارچ کی تیز روشنی میں وہ اندازہ لگا چکا تھا کہ نیچے گہری کھائی ہوگی۔ یہ سب پا کر قاسم کو آئندہ اپنے منصوبے پر عمل پیرا ہونا سہل ہوتا ہوا نظر آنے لگا۔

'موقع اچھا ہے۔ اتفاقاً سب کچھ میری سوچ کے عین مطابق طے ہو رہا ہے۔ نازیہ کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوگی کہ شعیب کے ساتھ پیش آنے والے حادثے کی اصل وجہ کیا تھی۔' قاسم سوچنے لگا۔ جو میں بتاؤں گا، وہ مان جائے گی۔

''تم لوگ دم لینے کے لیے یہاں آرام سے بیٹھو۔ میں ذرا آگے جا کر ستا لوں۔'' قاسم نے کہا اور کنارے کی طرف قدم اٹھانے لگا۔

''کچھ گھونٹ پانی کے لے لو۔'' شعیب نے پانی کی بوتل کا ڈھکنا کھولتے ہوئے کہا۔

''پہلے تم لوگ پی لو۔ میں کچھ دیر بعد پیتا ہوں۔'' قاسم نے اپنے منصوبے کے مطابق کنارے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' شعیب مختصراً بولا۔ اسے بھی اپنا منصوبہ آسان ہوتا ہوا نظر آرہا تھا۔

''میں بھی تو یہی چاہتا ہوں کہ تم کنارے کی طرف جا مرو...... جہاں سے نیچے ایک گہری کھائی تمہاری قبر بننے کی منتظر ہے۔ نازیہ کو بھی پتا نہیں چلے گا کہ اتفاقی حادثہ تھا یا قصداً ایک واردات تھی۔'' حرص و لالچ کے ہاتھوں بری طرح جکڑا ہوا...... شعیب شیطانی انداز میں سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

کنارے پر بیٹھا ہوا قاسم پوری تیاری سے اٹھا...... نوٹوں سے بھرا ہوا بیگ اس نے ایک طرف رکھ دیا تھا۔ ستانے کے دوران ٹارچ کی روشنی میں وہ نیچے کھائی کا جائزہ پوری طرح لے چکا تھا۔ واردات کے لیے اسے کسی ایسے موقع اور مقام کی تلاش تھی۔ آسمان پر چمکتے دمکتے ستاروں کی بے حد ہلکی روشنی جنگل و بیاباں پر پھیلی ہوئی دبیز تاریکی کا سینہ چیرنے سے معذوری ظاہر کر رہی تھی۔ قاسم نے ٹارچ آف کر کے جیب میں رکھ لی۔ اب اسے روشنی نہیں تاریکی چاہیے تھی اور ان دونوں کی طرف بھی تاریکی چھائی ہوئی تھی اور تاریکی میں لپٹی ہوئی خاموشی بھی چھائی ہوئی تھی۔

''شاید قربت کے لیے تاریکی کو ضروری سمجھا ہو۔'' قاسم دل میں بولا۔ ''قربت کے چند آخری لمحے پوری طرح گزار لو پریمیو!'' قاسم ایک دفعہ پھر دل میں بولا۔ اٹھا اور اچٹتی نگاہ نیچے پڑے ہوئے نوٹوں سے بھرے...... بیگ پر ڈالنے کے بعد ایک دفعہ پھر اندھیرے میں ڈوبے ہوئے پریمیوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''بس...... تھوڑی دیر کی بات ہے، زن بھی میری ہو جائے گی۔'' قاسم سوچنے لگا۔

گاؤں کی درست سمت کی شعیب نے نشاندہی کی تھی۔ اب قاسم کو ذرا دھڑکا نہیں تھا کہ وہ کسی رہنمائی کے بغیر گاؤں کا راستہ بھٹک سکتا ہے۔

''ہاں بھئی...... پانی پلاؤ۔'' قاسم نے ہانک لگائی۔

☆☆☆

شعیب کا سارا دھیان قاسم کی طرف تھا۔ نازیہ کے ساتھ اس وقت وہ محض رسمی طور پر لگا بیٹھا تھا۔ قاسم کی آواز پر وہ فوراً نازیہ کے پاس سے کھڑا ہو گیا اور ٹارچ کے پاس رکھی ہوئی پانی کی بوتل اٹھا لی۔

''ٹھہرو...... میں آرہا ہوں۔'' وہ قاسم سے مخاطب ہوا۔ اس کے چہرے کے عضلات تن گئے اور ہاتھوں میں ہلکی لرزش بھی پیدا ہو گئی۔ تاریکی میں اس کی اضطرابی کیفیت نازیہ

اور فاصلے پر کھڑے ہوئے قاسم کی نگاہوں سے اوجھل تھی۔

”تم یہاں بیٹھی رہو۔“ آخر میں وہ نازیہ سے مخاطب ہوا اور پانی کی بوتل اٹھائے کنارے کی طرف قدم اٹھانے لگا جہاں قاسم موجود تھا۔

قاسم ایک عادی مجرم تھا۔ کسی کو موت کے گھاٹ اتارنا اس کے لیے ایک معمولی کام تھا۔ وہ کب کا کھلم کھلا شعیب کا صفایا کر چکا ہوتا لیکن اس طرح اسے نازیہ کی یقینی نفرت کا ڈر تھا۔ چنانچہ اس نے رات کی تاریکی میں چوری چھپے بزدلانہ انداز میں شعیب کا کام تمام کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ پُرسکون انداز میں پوری تیاری کے ساتھ پہاڑی کے کنارے ایستادہ تھا۔ شعیب نے پہلی فرصت میں قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اسے اپنی طبیعت کا اندازہ تھا۔ تاخیر شش و پنج میں مبتلا رکھ کر اقدام اٹھانے کا موقع گنوانے کا موجب ٹھہر سکتی تھی۔

دونوں کے درمیان اب ایک آدھ قدم کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ اپنا اپنا قدم اٹھانے کے لیے دونوں کے پاس محض چند پل باقی تھے۔ وہ ایک دوسرے کو ہیولوں کی صورت میں نظر آ رہے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کی بُری نیت سے قطعاً بے خبر تھے مگر ایک دوسرے کے خلاف بیک وقت جارحانہ قدم اٹھانے کے لیے پوری طرح تیار تھے۔ تاریکی میں دونوں کے ہاتھ بیک وقت ایک دوسرے کی طرف بڑی تیزی کے ساتھ حرکت میں آئے۔ دونوں کو ایک ساتھ دھکا لگا۔ چہرے پر حیرت اور یقینی موت کے خوف کا تاثر لیے شعیب چیختا ہوا نیچے گہری کھائی میں گرتا چلا گیا۔ دھکا کھاتا قاسم فوراً..... نیچے کھائی میں نہیں گرا بلکہ لڑکھڑاتے ہوئے کنارے پر ڈھیر ہو گیا۔ لیکن ایک خطرناک جگہ پر گرنے کے بعد اسے سنبھلنے کا موقع کہاں ملتا۔ قلابازی کھاتا ہوا وہ بھی حیرت اور خوف کے عالم میں نیچے گہری کھائی میں گرتا چلا گیا۔

☆☆☆

پُرسکوت فضا میں اچانک بلند ہوتی ہوئی چیخ سے نازیہ چونک اٹھی۔ ”کیا ہوا شعیب؟“ وہ تشویش بھری آواز میں پوچھے بنا نہیں رہ سکی۔

مگر دوسری طرف سے اسے کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ سوائے مختلف قسم کی آوازوں کے جو چند سیکنڈ کے لیے اس کی سماعت سے ٹکرا کر تھم گئیں۔ وہ بروقت سمجھ نہ سکی کہ چیخ کے فوراً بعد یہ آوازیں کیسی تھیں..... وہ اپنے پاس رکھی ہوئی ٹارچ ہاتھ میں پکڑ کر تیزی سے اٹھی اور دوسرے لمحے ٹارچ کی روشنی سامنے ڈالی۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ دونوں غائب تھے۔ سامنے صرف بیگ پڑا ہوا نظر آ رہا تھا۔

”شعیب کہاں ہو تم لوگ......؟“ وہ گھبرائی ہوئی آواز میں پکارنے لگی اور کنارے کی طرف بڑھنے لگی۔

”اچانک اس طرح تم لوگ کہاں غائب ہو گئے ہو؟“ وہ خوف اور تشویش سے چیخنے لگی۔ مگر ہر سُو بدستور خاموشی طاری رہی۔ کچھ ہی دیر میں وہ نوٹوں سے بھرے ہوئے بیگ کے پاس پہنچ گئی، جہاں تقریباً تین چار فٹ کے فاصلے پر نیچے گہری کھائی تھی۔ وہ کچھ اور آگے بڑھی اور ایک خدشے سے ٹارچ کی روشنی کھائی میں ڈالی۔ نیچے کا ہولناک منظر دیکھ کر اس کی آنکھیں خوف اور دہشت سے پھیل گئیں۔

”نہیں......نہیں یہ سب کیسے ہو سکتا ہے؟“ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ سب کچھ ایک ڈراؤنا خواب محسوس ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر قبل دو جیتے جاگتے انسان، اب نیچے گہری کھائی میں خون میں لت پت بے حس و حرکت ایک دوسرے کے قریب پڑے نظر آ رہے تھے۔ نازیہ کے حواس اتنی جلدی یہ حقیقت ماننے کے لیے آمادہ نہیں تھے۔

”دونوں اکٹھے کیسے گر گئے؟“ یہ سوچ کر نازیہ کا ذہن ماؤف ہونے لگا۔

”کیا ہوا تھا تم لوگوں کو......تم لوگ نیچے کیوں گر گئے......شعیب......شعیب اٹھ کے میرے پاس آؤ۔“ نازیہ صدمے کی کیفیت میں پاگلوں کی طرح چلائی۔

مگر نیچے پتھروں پر پڑے ہوئے شعیب اور قاسم زندگی کی ہر حس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آزاد ہو چکے تھے۔ خاصی بلندی سے نکیلے سفاک پتھروں پر گرتے ہی دونوں کی موت موقع پر واقع ہو چکی تھی۔

”دیکھو نا شعیب میں اوپر اکیلی کھڑی ہوں، مجھے رات کی تاریکی اور جنگل کی خاموشی میں تنہائی کا احساس کاٹ کھانے کو آ رہا ہے......جلدی آ جاؤ میرے پاس، ہمیں صبح تک گاؤں پہنچنا ہے۔“ رات کی تاریکی میں ایک جنگل و بیاباں میں گہرے صدمے کی وجہ سے نازیہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھی تھی۔ اب وہ جنگل میں اکیلی بھٹک کر مرنے کے لیے رہ گئی تھی اور اس کے پاس نیچے بیگ میں موجود لاکھوں روپے کی نقدی گزرتے وقت کے ساتھ موسم کی سختیوں کے اثر سے کھلے آسمان تلے برباد ہونے کے لیے رہ گئی تھی۔

❖❖❖

خوفناک حادثہ

تنویر ریاض

کچھ لوگ روزمرہ کے اُمور بڑے طریقے اور سلیقے سے نمٹاتے ہیں... رفتہ رفتہ یہی عادتیں اور خصلتیں بچوں میں منتقل ہوتی چلی جاتی ہیں... ایک عام گھریلو عورت کی زندگی کے معمولات... اس کی غیر موجودگی میں بھی تمام کام اسی طرح انجام پذیر ہورہے تھے...

نامعلوم قاتل کی تلاش میں سرگرداں سراغرساں کی ذہنی قلابازیاں......

اگر وہاں خون نہ ہوتا تو یہی لگتا کہ وہ عورت کسی ریس میں شامل ہے اور دوڑنے کی تیاری کررہی ہے۔ لیزا ایبل اپنے کچن میں دو کپ بورڈ کے درمیان کولھوں پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی بائیں ٹانگ کم وبیش سیدھی اور دائیں ٹانگ گھٹنوں پر سے اندر کی جانب مڑی ہوئی تھی۔ اس نے جمپ سوٹ پہن رکھا تھا۔ پیروں میں سفید ٹینس شوز تھے۔ جن پر جگہ جگہ خون کے دھبے نظر آرہے تھے جو خشک ہوکر سیاہ ہوچکے تھے۔ اس کے سنہرے بال پیچھے کی جانب پونی

ٹیل کی شکل میں بندھے ہوئے تھے۔ اس کی ٹھوڑی بائیں جانب اور گال لکڑی کے تختے پر ٹکا ہوا تھا اور آنکھیں بند تھیں اور اس کے نیچے فرش پر خون جمع ہو گیا تھا جبکہ اس کے اردگرد کا فرش بے ڈھنگے طریقے سے صاف کر دیا گیا تھا۔

''اس کا گلا کاٹا گیا ہے۔'' لوموںڈ نے کہا۔

''ہاں۔'' پیتھالوجسٹ جیکولین ایمر بولی۔ ''بائیں جانب جبڑے کے بالکل نیچے گہرا زخم ہے۔ چاقو کا پھل اندر تک چلا گیا۔''

''کوئی ایسا زخم جس سے مزاحمت ظاہر ہوتی ہو؟''

''ہمیں ایسا کوئی زخم نظر نہیں آیا۔''

''کوئی ایسی علامت کہ کسی نے اسے روکا ہو؟''

''فی الحال ہم یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔''

''تمہارا پہلا تاثر کیا ہے؟''

''ایسا لگتا تو نہیں ہے۔''

''باقی خون کہاں گیا؟'' سراغ رساں سارجنٹ سلیٹر نے پوچھا۔

''فرش کا بقیہ حصہ صاف ہے۔ کیا کسی نے اس کی صفائی کی ہے؟''

ایمر نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''کسی نے سوپ اور پانی کا استعمال کیا ہے۔ جس کسی نے یہ کام کیا وہ بہت جلدی میں تھا اور اس کے قدموں کے نشان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی چھوٹا بچہ ہے۔''

لوموںڈ نے کہا۔ ''اس کا اتا پتا معلوم کرو۔''

☆☆☆

فریز ربیل، انٹرویو روم میں دو عورتوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ ان میں ایک سوشل ورکر اور دوسری اسپیشلسٹ آفیسر تھی۔ وہ تینوں لکڑی سے بنی ہوئی گڑیوں سے کھیل رہے تھے۔

''وہ آدمی کہاں تھا؟'' ڈپٹی سارجنٹ مولی گن نے پوچھا۔

''یہاں۔'' چھوٹے لڑکے نے کہا۔ اس نے ایک گڑیا اٹھائی اور اسے میز پر چلاتا ہوا دور لے گیا۔

''کیا وہ گھر میں آیا تھا؟''

''وہ کھڑکی میں کھڑا تھا۔''

دونوں سراغ رساں شیشے سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ لوموںڈ نے کہا۔

''ہم ایک منٹ کے لیے اندر چلتے ہیں۔''

''کیا اس کی اجازت ہے؟'' سلیٹر نے پوچھا۔

''بالکل اجازت ہے۔ میں انچارج ہوں، آؤ۔''

جب وہ دونوں انٹرویو روم میں داخل ہوئے تو مولی گن نے انہیں غصے سے دیکھا اور سوشل ورکر کا بھی منہ بن گیا۔

''ہائے دوست۔'' انسپکٹر نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔

دو اجنبیوں کو دیکھ کر بچے نے ایک غیر مانوس آواز نکالی اور سوشل ورکر کے سینے میں منہ چھپا لیا۔

''میرا خیال ہے کہ ہم بعد میں بھی یہ کام کر سکتے ہیں؟'' مولی گن نے کہا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

لوموںڈ نے خوش خلقی سے سر ہلایا۔ ''بالکل، معاف کرنا، ہم نے تمہیں ڈسٹرب کیا۔ بعد میں آ جائیں گے۔''

باہر آنے کے بعد سلیٹر نے کہا۔ ''میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ ہم نے ایسا کیوں کیا؟''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''میں نہیں جانتا کہ تم اس لڑکے سے کیا جاننے کی توقع کر رہے تھے۔ یہ کام ان عورتوں کو ہی کرنے دو۔''

''میں اس سے کچھ جاننے کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ اس کے باوجود مجھے بہت کچھ معلوم ہو گیا۔''

''مثلاً؟''

''یہی کہ وہ مردوں سے خوف زدہ ہے۔ چلو ہم اس کے باپ سے بات کرتے ہیں۔ شاید وہ اس کھڑکی والے آدمی کے بارے میں کچھ بتا سکے۔''

☆☆☆

نیل بیل انٹرویو روم میں خاصا مضطرب نظر آ رہا تھا۔ وہ بار، بار اپنے ہاتھوں کو دیکھتا۔ انہیں کھولتا اور بند کر دیتا۔

''کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہ سلسلہ کتنی دیر چلے گا؟'' اس نے پوچھا۔

''جب تک ہم تم سے سوالات کرتے رہیں گے۔'' سلیٹر نے کہا۔ ''میں ایک بار پھر تم سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس روز دوپہر میں تمہاری کیا نقل و حرکت تھی؟''

بیل نے ایک گہری سانس خارج کی۔ وہ پستہ قد، گنجا اور اکھڑ مزاج شخص تھا۔ ''میں اس روز صبح میں مال سپلائی کر رہا تھا۔''

''اوہ تو تم کاروبار کرتے ہو؟'' لوموںڈ نے پوچھا۔

''میں حیران ہوں کہ میں نے اس سے پہلے یونیک پنیر کا نام نہیں سنا۔''

''یہ بکری کے دودھ سے بنی ہوئی پنیر کے لیے ایک

خوب صورت نام ہے اوراس کی بہت مانگ ہے۔ گھروں، سُپر مارکیٹ، ریستوران، کافی شاپ ہر جگہ اسے پسند کیا جاتا ہے۔''

''اور تمہیں اس کی فروخت سے کافی فائدہ ہوتا ہے؟''

''تم نے میرا گھر دیکھ لیا ہے۔'' بیل نے ترش ہو کر جواب دیا۔

سلیٹر نے کہا۔''سپلائی کا کام ختم ہونے کے بعد تم نے کیا کیا؟''

''میں لنچ کرنے کے لیے دوپہر سے ذرا پہلے گھر آیا۔ میرے پاس لیزا اور فریزر کے لیے ایک سوپ کا پیالہ، تھوڑی سی بریڈ اور پنیر تھا۔ ہم مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے رہے۔ میں نے اسے اپنی ڈرائیو کے بارے میں بتایا۔ وہ اپنی ایکسرسائز پر جانے کی تیاری کررہی تھی اور ہمارا بیٹا بیرونی کمرے میں اپنی کاروں سے کھیل رہا تھا۔ میں پونے ایک بجے گھر سے نکلا اور ساڑھے سات بجے مجھے تمہارا فون ملا اور میں یہاں آگیا۔''

''ٹھیک ہے مسٹر بیل۔'' لومونڈ نے کہا۔''پھر بھی ہم تمہارا موبائل فون ریکارڈ چیک کریں گے۔ اس کے علاوہ تمہارے پاس کوئی ایسی چیز ہے جس سے تمہاری نقل وحرکت کا پتا چل سکے۔ مثلاً کافی ہاؤس کی رسید؟''

''مجھے آج کافی پینے کا وقت نہیں ملا کیونکہ بہت زیادہ ڈرائیونگ کرنی تھی۔ میں نے کل شام گھر آنے سے پہلے پیٹرول بھروا لیا تھا۔ اس لیے پیٹرول پمپ پر رکنے کی ضرورت بھی نہیں پڑی۔ میں آج صبح کچھ ضروری سپلائی کرنا چاہ رہا تھا۔ اس کے بعد مجھے لنچ کرنا تھا لیکن میری وین میں ڈیش کیم کی فوٹیج ہے جس سے میری کہی ہوئی ہر بات کی تصدیق ہوجائے گی۔''

''ہم اسے بھی چیک کرلیں گے۔'' سلیٹر نے کہا۔

''کیا میرا کام ختم ہوگیا؟''

''کیمروں اور ویڈیو ایکوپمنٹ کی دوبارہ پروگرامنگ ہوسکتی ہے۔'' سلیٹر نے کہا۔''ایسا اس وقت ہوتا ہے جب لوگ کچھ چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔''

''اور میں کیا چھپانے کی کوشش کررہا ہوں؟''

''میں نے یہ نہیں کہا کہ تم کچھ چھپا رہے ہو؟''

''لیکن تمہارا مفہوم یہی تھا۔ دیکھو تم مجھے فارغ کردو۔ تمہیں کسی اور سے بات کرنی چاہیے۔ مثلاً ارسل سے جو میرے گھر کے سامنے میدان کے پار رہتا ہے۔ شاید وہ وہی آدمی ہو جسے میرے بیٹے نے کھڑکی میں دیکھا تھا۔ وہ بھی لیزا میں بہت دلچسپی لیتا تھا۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ وہ اس پر فریفتہ تھا؟'' سلیٹر نے پوچھا۔

''یہ تم اسی سے پوچھنا۔''

''ہم تمہارے پڑوسیوں سے بھی بات کریں گے۔'' لومونڈ نے کہا۔

''پانچ میل کے دائرے میں صرف وہی ایک پڑوسی ہے۔ تمہیں وقت ضائع کرنے کے بجائے سیدھا اسی کے پاس جانا چاہیے۔''

''کیا تم یہ بتانے کی کوشش کررہے ہو کہ ہم اپنا کام کیسے کریں؟'' سلیٹر آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ انسپکٹر نے اس کی اپروچ کو پسند نہیں کیا لیکن وہ جانتا تھا کہ بعض اوقات اس کا اچھا نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔

بیل اپنا ہونٹ چبا کر رہ گیا۔ اس نے لومونڈ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔''تم یہاں انچارج ہو؟''

''ہاں، میں سینئر آفیسر ہوں۔''

''پھر تم میرے ایک سوال کا جواب دے سکتے ہو۔ کیا تم مجھ پر کوئی الزام لگا رہے ہو؟''

''اس مرحلے پر نہیں مسٹر بیل۔ کیا تم پر الزام لگانے کی کوئی وجہ ہے؟''

''نہیں۔''

''کیا تم نے ہی اپنی بیوی کو قتل کیا ہے؟'' سلیٹر نے پوچھا۔

''خدا کے واسطے یہ مت کہو۔ اب میرا دوسرا سوال کہ اگر تم مجھ پر کوئی الزام نہیں لگا رہے ہو تو کب میرے راستے سے ہٹو گے اور مجھے میرے بیٹے سے ملواؤ گے؟''

☆☆☆

''میں یہی کہوں گا کہ اس کا دکھ اب غصے کی شکل اختیار کرگیا ہے۔'' لومونڈ نے کہا۔

سلیٹر نے چائے کا آخری گھونٹ لیا اور بولا۔''کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ قتل اس نے کیا ہے؟''

''میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ اب تک جو ہمیں معلوم ہے وہ یہ کہ لڑکے نے نہیں دیکھا کس نے قتل کیا ہے۔ اس نے بس ایک آدمی کو کھڑکی میں دیکھا تھا اور وہ پوسٹ مین نہیں تھا جس نے سب سے پہلے لاش دیکھی۔ لڑکا اسے جانتا ہے اور اس کا اصرار ہے کہ کھڑکی میں پوسٹ مین نہیں تھا لیکن میں نے دو مرتبہ نوٹ کیا کہ وہ کھڑکی والے آدمی کے

بارے میں الجھن کا شکار ہے اور سمجھ رہا ہے کہ کھڑکی میں اس کا باپ تھا۔''

''میں جانتا ہوں اور میں نے بھی یہ بات نوٹ کی ہے۔''

لومونڈ اپنی ٹھوڑی کھجاتے ہوئے بولا۔ ''اس سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ اس نے کھڑکی میں اپنے باپ کو دیکھا تھا۔ ماہر نفسیات کو بھی اس معاملے میں شامل کیا گیا ہے لیکن میں نہیں سمجھتا کہ ہمیں اس سے زیادہ کچھ معلوم ہو سکے گا۔ اس بچے کا بیان بڑا واضح ہے۔ اس نے کسی کو اپنی ماں کو تکلیف دیتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اس کا کہنا ہے کہ ماں، بیٹے ۔۔ تزبیل کے ساتھ لنچ کیا۔ اس نے باپ کو رخصت کیا اور ماں نے ہاتھ ہلا کر اسے الوداع کیا۔''

''اس کے باوجود کہ فریزر نے قتل ہوتے نہیں دیکھا تب بھی اس کا باپ ایسا کر سکتا ہے۔ وہی سب سے زیادہ مشتبہ ہے۔ ہمیں اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہوگا۔''

''ہاں لیکن ڈیش کیم کی فوٹیج کو بھی ذہن میں رکھو۔ بیل کو کوئی جلدی نہیں تھی۔ وہ وین اسٹارٹ کرتا ہے اور محتاط طریقے سے گاڑی چلاتا ہے۔ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ اس نے کھڑکی کی جانب کسی کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا تھا۔''

''لیکن ہمیں کچن کی کھڑکی میں کوئی نظر نہیں آ رہا جس نے جواب میں ہاتھ ہلایا ہو۔ لہٰذا یہ دکھاوا بھی ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اداکاری کر رہا ہو، ہم نے ماضی میں بھی ایسے کئی اداکار دیکھے ہیں۔'' سلیٹر نے کہا۔

''یہ سچ ہے۔'' لومونڈ بولا۔ ''گو کہ اس کے کپڑوں یا کار میں کہیں خون نظر نہیں آیا۔''

''یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ وہ چند سیکنڈ میں کپڑے تبدیل کر کے خون آلود لباس راستے میں کسی بھی کوڑے دان میں پھینک سکتا ہے اور ہم اسے کبھی تلاش نہیں کر سکتے۔ اگر وہ اتنا محتاط تھا کہ اس نے کچن کے فرش سے قدموں کے نشان صاف کر دیے تو سب کچھ ممکن ہے۔ اس لیے اس کا نام مشتبہ افراد میں سب سے اوپر ہے۔''

''وہی ہے اور یہ وقت بتائے گا، مجھے امید ہے کہ وہی ہے۔''

''یہ تم کس طرح کہہ سکتے ہو؟''

''کیونکہ اگر وہ نہیں ہے تو کھڑکی میں کوئی اتفاق سے آ گیا ہوگا۔ کوئی شخص جو وہاں سے گزر رہا ہو اور اس نے موقع سے فائدہ اٹھایا لیکن ہر قتل کا کوئی نہ کوئی محرک ہوتا ہے۔ کوئی اجنبی ایسا کیوں کرے گا۔ اس لیے میں نہیں مانتا کہ یہ کوئی اتفاق ہے۔''

رسل کا مکان بیل کے گھر کے عقبی حصے سے نظر آتا تھا اور جیسا کہ نیل بیل نے بتایا کہ اس کے مکان سے پانچ میل کے دائرے میں یہ واحد گھر تھا۔ وہ تین منزلہ مکان دیکھنے میں قدرے نیا لگ رہا تھا۔ ان دونوں نے باہر سے مکان کا جائزہ لیا اور عادت کے مطابق اس پر تبصرہ کرنے لگے۔

''ایک پراپرٹی انویسٹر اس طرح کا مکان کیسے افورڈ کر سکتا ہے؟'' سلیٹر نے کہا۔

''بظاہر تو وہ ایک منزلہ مکان بھی افورڈ نہیں کر سکتا۔'' لومونڈ نے جواب دیا۔

''اوپر کی منزل کی کھڑکی کی حالت دیکھو، لگتا ہے کہ مکان اس نے خود نہیں بنایا۔''

''ابھی پتا چل جائے گا۔''

نتاشا رسل نے دروازہ کھولا۔ وہ تقریباً پینتالیس سال کی دراز قد دبلی پتلی عورت تھی۔ اس کی آنکھیں گہری نیلی اور سنہرے بال تھے۔ اس کا شمار خوب صورت عورتوں میں کیا جا سکتا تھا۔ اس نے سیاہ پارٹی ڈریس پہن رکھا تھا۔

''تم پولیس والے ہو، اندر آ جاؤ۔''

''ممکن ہے کہ تم پہلے ہمارے کارڈ دیکھنا چاہو۔'' لومونڈ نے اپنا کارڈ نکالا۔ ''میں انسپکٹر لومونڈ ہوں اور یہ سارجنٹ سلیٹر۔ ہم مسز بیل کے بارے میں بات کرنے آئے ہیں۔''

مسز رسل نے سر ہلایا۔ ''پلیز اندر آ جاؤ۔'' وہ راہداری میں رکھے ہوئے ایک ریک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''تم اپنے جوتے وہاں رکھ سکتے ہو۔''

انہوں نے اپنے جوتے اتارے اور مسز رسل کے پیچھے چلتے ہوئے لیونگ روم میں آ گئے۔ اس نے انہیں کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود سامنے والے صوفے پر براجمان ہو گئی۔

''کیا تم کہیں جا رہی تھیں؟'' لومونڈ نے پوچھا۔

''ہاں، مجھے اپنے کام پر جانا ہے۔ لیزا کے بارے میں سن کر صدمہ ہوا لیکن کام تو پھر کام ہی ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم سمجھتے ہو۔''

''ہم تمہارا زیادہ وقت نہیں لیں گے۔''

''میں نے گزشتہ روز تمہیں اپنی نقل و حرکت کے بارے میں بتا دیا تھا۔''

''ہم بیل خاندان کے بارے میں تمہارے تاثرات جاننا چاہتے ہیں۔''

''میں نے لیزا کو صرف آتے جاتے دیکھا ہے۔ وہ دونوں گھروں کے درمیان راستے پر دوڑتی تھی۔ لگتا تھا جیسے وہ ریس میں حصہ لینے کی تیاری کر رہی ہے۔ میں اسے جنگل کے درمیان دوڑتا ہوا دیکھ کر پریشان ہو جاتی تھی۔''

''اس پریشانی کی کوئی وجہ تھی؟'' سلیٹر نے پوچھا۔

''ہاں، جنگل میں تاریکی اور سناٹا ہوتا ہے۔''

''کیا تم نے جنگل میں کبھی کسی اور کو بھی دیکھا؟''

''بہت کم، بعض اوقات آوارہ گرد وہاں سے گزرتے ہیں لیکن گزشتہ اکتوبر سے میں نے لیزا کے سوا کسی کو وہاں سے گزرتے نہیں دیکھا۔''

''کیا تم بھی جنگل میں جاتی ہو؟'' لومونڈ نے پوچھا۔

''نہیں، میں شاید اتوار کے دن لنچ کے بعد مہمانوں کے ساتھ ایک یا دو مرتبہ چہل قدمی کے لیے گئی تھی۔ مجھے کھڑکی میں بیٹھ کر جنگل کا نظارہ کرنا اچھا لگتا ہے۔''

''کیا تم نے منگل کے روز مسز بیل کو جنگل سے گزرتے دیکھا؟''

''نہیں۔''

''اس کے شوہر کے بارے میں کیا کہو گی؟'' سلیٹر نے پوچھا۔ ''اس کے بارے میں کیا جانتی ہو؟''

وہ احمقانہ انداز میں مسکرائی۔ ''نیل؟ وہ احمق آدمی۔ سارا دن اپنی وین میں گھومتا رہتا ہے۔ میں اس سے مذاق میں پوچھتی ہوں کہ وہ اپنی بکریاں کہاں رکھتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ کسی اور جگہ فارم پر ہوں گی۔ وہ زیادہ بات نہیں کرتا۔ میں نہیں سمجھتی کہ وہ ہمیں بہت پسند کرتا ہے۔''

''تم یہ بات کیوں کہہ رہی ہو؟ کیا اس کے ساتھ تمہارا کوئی مسئلہ ہے؟''

''نہیں، وہ مجھ سے نرمی سے بات کرتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ میرے شوہر کو پسند نہیں کرتا۔''

''کیا تمہیں اس کی وجہ معلوم ہے؟'' لومونڈ نے پوچھا۔

''میں ٹھیک سے نہیں کہہ سکتی۔ میرا خیال ہے کہ وہ حاسد ٹائپ شخص ہے اور جب بھی میرا شوہر لیزا کو ہیلو کہتا تو وہ بدگمان ہو جاتا تھا۔''

''کیا، صرف ہیلو کہنے پر؟'' سلیٹر نے پوچھا۔

''ہاں، اس کے چہرے کے تاثرات بدل جاتے تھے گو کہ اس نے زبان سے کبھی کچھ نہیں کہا اور ہمیں اس کی یہی بات پسند تھی۔''

''کیا کبھی لیزا نے ایسا کوئی اشارہ دیا کہ وہ گھر پر خوش نہیں ہے؟''

''نہیں، میں نہیں سمجھتی کہ کبھی اسے یہ بات کہنے کا موقع ملا ہو۔ جیسا کہ میں نے کہا کہ ہم اتنے قریب نہیں تھے۔ مجھے شبہ ہے کہ مسٹر بیل نے اپنے آپ کو دنیا سے چھپانے کے لیے یہاں رہائش اختیار کی تھی۔ وہ اور اس کی فیملی کسی سے نہیں ملتے تھے۔''

''یہ کوئی جرم نہیں ہے۔'' لومونڈ نے تبصرہ کیا۔ ''تم اپنے اور مسٹر رسل کے بارے میں کیا کہو گی؟ تم لوگ بھی تو یہاں رہتے ہو؟ کیا تم نے بھی اپنے آپ کو دنیا سے چھپا رکھا ہے؟''

''بالکل نہیں، ہم اس جگہ کو تفریحی مقصد کے لیے استعمال کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ یہ ابتدا ہے۔ اس کے بعد ہم گلاسگو اور ایڈنبرا میں فلیٹ بنائیں گے۔''

''مجھے لگتا ہے کہ اس مکان کی فنشنگ کی گئی ہے۔'' سلیٹر نے کہا۔ ''یہ زیادہ پرانا نہیں ہو سکتا۔''

''اسے بنے ہوئے دو سال ہوئے ہیں۔ ہم نے اس میں صرف چند تبدیلیاں کی ہیں۔''

''کیسی تبدیلیاں؟'' لومونڈ نے پوچھا۔

''اس کا گٹر سسٹم ٹھیک کروایا ہے۔ اس میں کچھ لیکج تھی جو مکان بنتے وقت نہیں دیکھی گئی۔''

''اسی لیے باڑھ لگی ہوئی ہے؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''کاریگر کئی دنوں سے نہیں آیا حالانکہ ہمیں کئی اور کام بھی کروانے ہیں۔ اس نے اختتامِ ہفتہ آنے کے لیے کہا ہے۔ اُمید ہے کہ اس سے پہلے طوفان نہیں آئے گا۔''

''کیا میں مخل ہو سکتا ہوں؟'' راہداری میں ایک تیز آواز گونجی۔

بلیئر رسل ایک لمبا چوڑا شخص تھا۔ گنجے سر اور چہرے پر سیاہ گھنی داڑھی کی وجہ سے وہ اپنی عمر سے زیادہ لگ رہا تھا۔ ''کیا تم لوگ چائے پینا پسند کرو گے؟'' اس نے پوچھا۔

''ہم زیادہ دیر نہیں رکیں گے مسٹر رسل۔'' انسپکٹر نے جواب دیا۔ ''ہم جانتے ہیں کہ تمہیں کہیں جانا ہے۔ ہم بیل فیملی کے بارے میں صرف چند سوالات پوچھنا چاہتے ہیں۔''

''بہت افسوس ناک واقعہ ہے۔ ان کا ایک چھوٹا لڑکا بھی ہے۔ میری نظر میں یہ ایک خوفناک المیہ ہے۔''

''اس کے لیے المیہ کا لفظ استعمال کرنا ایک مذاق ہے۔'' سلیٹر نے کہا۔

اب رسل حیران نظر آیا۔ ''ہم نے صرف یہ سنا تھا کہ وہ مرگئی ہے۔ تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ اسے قتل کیا گیا ہے؟''

''ہم یہی معلوم کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ تم مسٹر بیل کے بارے میں کیا جانتے ہو؟''

''کچھ زیادہ نہیں۔ تمہارا خیال ہے کہ یہ قتل اس نے کیا ہے؟''

''ہم سوالات کررہے ہیں۔'' سلیٹر کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ ''کیا تم دونوں کا آمنا سامنا ہوتا تھا؟''

''میں جانتا تھا کہ وہ بہت معیاری پنیر بناتا ہے اور یہ بات میں نے اس سے بھی کہی تھی۔ وہ پریشان لگ رہا تھا کہ میں اس کے کاروبار کے بارے میں جانتا ہوں۔ کسی کاروباری آدمی کا یہ رویہ مناسب نہیں۔ میں حیران تھا کہ اس کا کام اتنا اچھا چل رہا ہے، اگر وہ مجھ سے کہتا تو میں اسے ایسا منصوبہ بنا کر دیتا جس سے اس کی آمدنی میں ہر سال چالیس فیصد اضافہ ہوجاتا۔''

''لگتا ہے کہ تم نے اس کے کاروبار کا بغور مطالعہ کیا تھا؟'' لومونڈ نے کہا۔

''بالکل، میں ایک کاروباری شخص ہوں۔'' رسل مسکرایا۔ ''اور مواقع کی تلاش میں رہتا ہوں۔''

''اور کیا تم اپنے پڑوسیوں کے بارے میں بھی اس طرح کا تخمینہ لگاتے ہو؟''

''وہ ایک وین چلاتا ہے جس کے چاروں طرف اس کی کمپنی کا نام لکھا ہوا ہے۔ جس سے مجھے تجسس ہوا۔ میں نہیں سمجھتا کہ مجھے یہ بتانے کی ضرورت ہے۔''

لومونڈ ایک لمحہ سوچنے کے بعد بولا۔ ''کیا تم ایک مہربانی کرسکتے ہو؟ میں ایک نظر اوپر جا کر دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''بالکل، کیا تمہیں کسی خاص چیز کی تلاش ہے؟''

''ایک یا دو چیزیں ہیں۔'' لومونڈ کھڑا ہوگیا۔

''میں سمجھتا ہوں۔ آؤ میرے ساتھ۔'' پھر وہ بیوی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''تم اس کے ساتھی کا خیال رکھنا۔''

''مجھے خوشی ہوگی۔'' وہ آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولی۔

☆☆☆

''مسز رسل کافی دلکش دکھائی دیتی ہے۔'' لومونڈ نے کار کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

''تم غلط نہیں کہہ رہے۔'' سلیٹر نے بیزاری سے کہا۔

''خیر چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہ تم نے اوپر جا کر کیا دیکھا؟''

''یہی کہ پیسے سے انسان کا ذوق نہیں بدل جاتا... کم از کم بیڈروم سے تو یہی اندازہ ہوا۔ دیواروں پر انتہائی گھٹیا رنگ استعمال کیا گیا ہے۔''

''کیا تم بتانا چاہو گے کہ کیا دیکھنے گئے تھے؟''

''نظارہ، اس کی کھڑکی سے بیل کے گھر کا کچھ حصہ نظر آتا ہے۔''

''اور کچھ؟''

''میں باڑھ کو قریب سے دیکھنا چاہ رہا تھا جس پر کھڑے ہوکر مستری کام کرتا ہے۔ وہ مجھے گٹر سے بہت نیچے لگی۔''

''وہ چھت کے نیچے لگے ہوئے نکاسی کے پائپ چیک کررہے ہوں گے۔''

''میں بھی یہی سمجھا تھا۔'' لومونڈ نے کہا۔ ''اس لیے میں نے رسل سے پوچھا کہ کتنے لوگ گٹر پر کام کررہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ ایسا کوئی کام نہیں ہورہا۔ اس کی بیوی کو غلط فہمی ہوگئی تھی۔''

''تو باڑھ کس لیے لگائی گئی تھی؟''

''وہ تار دیکھ رہے ہو، خفیہ کیمرا اور سیکیورٹی۔''

''میرے خیال میں انہوں نے کہا تھا کہ ان کے یہاں کوئی کیمرا نہیں لگا ہوا؟''

''وہ جلد ہی ایک نیا سسٹم لگائیں گے۔ جیسے ہی کاریگر کا کام ختم ہوا۔ میں نے مکان کے اندر کچھ مزید تار بھی دیکھے جو حال ہی میں لگائے گئے ہیں لیکن کوئی کیمرا نظر نہیں آیا۔''

''پھر تم کیا کہہ رہے ہو؟''

''مسز رسل نے کیمروں کا کوئی ذکر نہیں کیا جبکہ وہ جانتی ہوگی۔ اس نے کہا تھا 'بزنس از بزنس' تو یہ اس کا پہلا جھوٹ ہوا۔''

☆☆☆

روسن کوئی نے انہیں اپنے دفتر سے جھانک کر دیکھا۔ لومونڈ نے بھی اسے دیکھ لیا اور بیرونی دروازے کی گھنٹی بجا دی۔ کوئی نے دروازہ کھولا۔ وہ ایک دراز قامت شخص تھا۔

''تم جلدی سے اپنی بات ختم کرو۔'' اس نے کہا۔ ''آج مجھے بہت کام کرنا ہے۔''

''یہ ہمارا مسئلہ نہیں۔'' سلیٹر نے کہا۔ ''اگر ضرورت ہوئی تو ہم سارا دن بھی لے سکتے ہیں۔''

وہ انہیں اپنے دفتر میں لے گیا اور پرانی گھومنے والی کرسی پر بیٹھ کر چائے پینے لگا۔ کیمرا کمپنی کا مالک ہونے کے باوجود اس نے دونوں سراغ رسانوں کو چائے پیش نہیں کی۔

''تم کیا جاننا چاہتے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

لومونڈ آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ ''مسٹر اور مسز رسل کے ساتھ تمہارے کاروبار کی نوعیت کیا ہے؟''

''رسل؟'' کرونی نے تیوری چڑھاتے ہوئے کہا۔ ''وہی جو برائڈل تک'' پر ایک بڑے سے مکان میں رہتے ہیں؟''

''ہاں، تم ان کے لیے ایک کیمرا سسٹم پر کام کر رہے تھے۔ کیا یہ درست ہے؟''

اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''میں یہی کام کرتا ہوں۔''

''کیا تم نے اس مکان پر اپنا کام ختم کرلیا؟''

''ابھی نہیں، کچھ کام باقی ہے۔''

''منگل کے روز کیا ہوا تھا؟''

''میں اس دن رسل کے مکان پر کام نہیں کر رہا تھا۔''

''تمہیں اس بارے میں یقین ہے؟'' لومونڈ نے نوٹ بک پر سے نظریں اٹھاتے ہوئے کہا۔

''ہاں، انہیں کہیں جانا تھا اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ میں ان کی غیر موجودگی میں کام کروں۔ انہوں نے مجھے جمعے کے دن آنے کے لیے کہا۔''

سلیٹر اپنی جگہ سے کھڑا ہو کر کونی کی میز کی طرف بڑھا۔ ''جب ہم یہاں آئے تو تمہیں رسل کے بارے میں سرسری معلومات تھیں اور اب تم پوری تفصیل بیان کر رہے ہو۔ کیا یہ تمہاری ڈیسک ڈائری ہے؟''

کونی کھڑا ہو گیا اور اس نے ڈائری پر اپنے ہاتھ رکھ دیے۔ ''تم میری چیزوں سے چھیڑ چھاڑ نہیں کر سکتے۔''

سلیٹر نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''ہم کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کر رہے۔ بس تم سے کچھ سوالات کرنا ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ تم اتنے کیوں گھبرا گئے ہو۔ تمہیں منگل کے روز کی ڈائری دیکھنے پر اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔''

کونی نے کہا۔ ''میں پہلے ہی تمہارے افسروں سے بات کر چکا ہوں۔ میں منگل کے روز گلاسگو سٹی سینٹر میں کام کر رہا تھا۔ ایک نائٹ کلب کے لیے نیا سسٹم لگ رہا ہے۔ بہت بڑا کام ہے۔''

سلیٹر نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ تمہاری ڈائری میں یہی لکھا ہے لیکن پھر بھی ہم ڈبل چیک کریں گے کہ تم وہیں کام کر رہے تھے۔''

''کیا تم اس کام کے لیے کسی دوسرے کی مدد حاصل کرتے ہو؟'' لومونڈ نے کہا۔ ''اس کاروبار میں کوئی اکیلا آدمی یہ کام نہیں کر سکتا۔''

''میں کرتا ہوں۔'' کونی نے بے دھڑک کہا۔ ''میں سب میں بہترین ہوں۔ اسی لیے مجھے کام ملتا ہے۔ یہ میری ٹریڈ ہے اگر میں کسی دوسرے کی مدد لوں گا تو وہ کام خراب کر دے گا۔ میں جانتا ہوں کہ کیا کر رہا ہوں۔''

''تو تم آج اور کل گلاسگو سینٹر میں کام کر رہے ہو اور کل۔ ارادن بھی وہیں تھے؟'' لومونڈ نے کہا۔

''ہاں، میں نے یہی کہا۔''

''کیا مسز بیل کے ساتھ تمہاری کوئی ڈیلنگ تھی؟''

''کون مسز بیل؟''

''وہی بس کا قتل ہوا ... وہ رسل کے گھر کے سامنے رہتی تھی۔'' سلیٹر نے کہا۔ ''تم یہ بھی نہیں جانتے؟''

''میں جانتا ہوں کہ اس کی موت ہو گئی ہے۔'' کونی نے تند لہجے میں کہا۔ ''اور پولیس اس کی تفتیش کر رہی ہے۔ میں نے خبروں میں دیکھا تھا لیکن اس کا نام نہیں جانتا۔ ہاں، وہ اس سفید گھر میں رہتی تھی۔ میں وہاں یہ معلوم کرنے کے لیے گیا تھا کہ کیا انہیں کیمرے کی ضرورت ہے۔ میں پولیس والوں کو یہ پہلے ہی بتا چکا ہوں۔ وہ دیہی علاقہ ہے اور وہاں چوریاں بہت ہوتی ہیں۔ وہ عام طور پر بڑے گھروں میں وارداتیں کرتے ہیں۔''

''یہ سچ ہے۔'' لومونڈ نے کہا۔ ''تم نے اس سے کب بات کی تھی؟''

''میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ کون سا دن تھا۔ میں کچھ عرصے سے رسل کے گھر کام کر رہا ہوں۔ شاید آٹھ دس دن پہلے بات ہوئی تھی۔''

''کیا وہ پیر کا دن ہو سکتا ہے؟''

''میں نہیں جانتا، شاید پیر ہی ہو۔''

''کیا مسز بیل نے کیمرا لگوانے میں دلچسپی ظاہر کی؟''

''اس نے کہا کہ وہ اس بارے میں سوچے گی۔ اس نے اعتراف کیا کہ وہ لوگ کیمرا لگوانے کے بارے میں بات کر رہے تھے۔''

''کیا تم رسل کے مکان سے دیکھ کر بتا سکتے ہو کہ مسز بیل کے گھر پر کیمرے کی ضرورت تھی؟'' لومونڈ نے پوچھا۔

''نہیں، میں باڑھ پر سے نہیں دیکھ سکا۔ دونوں گھروں کے درمیان بہت سے درخت ہیں۔ لہٰذا میں خود ہی دیکھنے چلا گیا۔''

''جب تم مسز بیل سے بات کرنے گئے تو تم نے وہاں کسی اور کو دیکھا؟''

''صرف اس کا چھوٹا بیٹا، میں سمجھتا ہوں کہ وہ ابھی اسکول نہیں جاتا۔ اس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ صرف پلیٹیں ہٹاتا رہا۔''

''یہ بات کچن میں ہو رہی تھی؟'' لومونڈ نے پوچھا۔

''ہاں، میں نے کھڑکی میں کھڑے ہو کر بات کی۔ اس نے دروازے میں آنے کے بجائے کھڑکی سے سر لگا لیا۔ اس نے مجھے اندر نہیں بلایا۔ یہاں تک کہ بیرونی دروازہ بھی نہیں کھولا۔ میں نہیں جانتا کہ کیوں؟''

''تو تم نے اس سے کھڑکی میں کھڑے ہو کر بات کی؟'' سلیٹر نے پوچھا۔

''ہاں۔''

''کیا یہ عجیب بات نہیں ہے؟''

کونی نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اس کی پروا نہیں۔ میں تمہیں اور اس سے پہلے دوسرے پولیس والوں کو بتا چکا ہوں کہ میں منگل کے روز رسل کے گھر پر نہیں بلکہ گلاسگو سٹی سینٹر میں کام کر رہا تھا۔ وہاں درجنوں لوگوں نے مجھے دیکھا ہوگا۔ وہاں کئی لوگ مرمت کا کام کر رہے ہیں۔ تم ان سے پوچھ سکتے ہو۔''

''ضرور پوچھیں گے۔'' لومونڈ نے کہا۔

''میں مرنے والی عورت کے بارے میں جو کچھ جانتا تھا، وہ تمہیں بتا دیا ہے اگر تم مزید بات کرنا چاہتے ہو تو میں پھر کسی وقت پولیس اسٹیشن آ جاؤں گا اور اپنے بڑے بھائی کو بھی ساتھ لیتا آؤں گا۔''

''کیا وہ تمہارا سرپرست ہے؟'' سلیٹر نے پوچھا۔

''وہ وکیل ہے اور قانونی معاملات کو سمجھتا ہے۔''

''کیا منگل کے روز تمہاری رسل فیملی سے بات ہوئی تھی؟'' لومونڈ نے پوچھا۔

''ہاں، دو مرتبہ فون پر بات ہوئی تھی۔ وہ تصدیق کرنا چاہ رہے تھے کہ میں جمعہ سے پہلے کام پر نہیں آؤں گا۔''

''تمہاری کس سے بات ہوئی تھی؟''

''مسز رسل سے، وہ کہہ رہی تھی کہ انہیں کسی میٹنگ میں جانا ہے۔''

''اس کے بعد بھی ان سے بات ہوئی؟''

''ہاں، ایک یا دو مرتبہ۔ وہ جاننا چاہ رہے تھے کہ میں کب تک کام ختم کر لوں گا۔''

''پھر تم نے کیا جواب دیا؟''

''میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس کا انحصار موسم پر ہے۔ اگر تیز ہوا چلی تو میں باڑھ پر نہیں چڑھ پاؤں گا۔''

لومونڈ کھڑے ہو کر اس کی میز کا جائزہ لینے لگا۔ وہاں دو فریم شدہ تصویریں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک خوب صورت عورت اور دوسری چھوٹے بچے کی۔

''یہ تمہاری فیملی ہے؟''

''ہاں، میری بیوی اسٹیفی اور بیٹا جیمس۔ کیا تم ان کی نقل و حرکت کے بارے میں بھی پوچھنا چاہتے ہو؟''

''میں یقیناً تمہاری بیوی کو فون کروں گا۔'' لومونڈ نے کہا۔ ''اور تم سے بھی رابطے میں رہیں گے۔ ہم صرف ایک یا دو باتیں معلوم کرنا چاہتے ہیں۔''

''اس لیے تم اپنا فون آن رکھنا۔'' سلیٹر نے کہا۔

☆☆☆

دفتر واپس آنے کے بعد سلیٹر نے اپنی ای میلز چیک کیں۔ ''فون ریکارڈ سے معلوم ہوتا ہے کہ کونی نے مسز رسل سے چار مرتبہ بات کی۔ منگل کے روز دو بار اور آج صبح دو مرتبہ۔''

لومونڈ اپنے کمپیوٹر اسکرین کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کونی نے جو سسٹم وہاں لگایا تھا، اس روز اسے ٹیسٹ کیا گیا اور کلب والوں نے اس کی فوٹیج محفوظ کر لی لہٰذا ہم اس کی مدد سے اس کی نقل و حرکت چیک کر سکتے ہیں۔''

''میں کسی ماہر نفسیات سے بات کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔'' سلیٹر نے کہا۔ ''میں جاننا چاہتا ہوں کہ کون جھوٹ بول رہا ہے۔''

''تم نے کوئی نظریہ قائم کیا؟''

''مجھے کونی کی بات پر یقین نہیں آیا۔ اس کا انداز دفاعی تھا۔''

لومونڈ نے کہا۔ ''نہیں، مجھے اس میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ وہ جھوٹا نہیں ہے۔ اس نے جو کچھ کہا اس میں حقیقت ہے۔ البتہ جو نہیں کہا مجھے اس میں دلچسپی ہے۔''

اسی وقت لومونڈ کے فون پر ایک کال آئی۔ اسے سننے کے بعد وہ بولا۔ ''ایمر کا فون تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ مسز بیل کے گردن پر زخم گوشت کاٹنے والی چھری کا ہے اور کچن سے

کوئی چھری غائب نہیں ہوئی۔ ایمر کا خیال ہے کہ ڈش واشر میں پڑی ہوئی ایک چھری کا پھل مشین چلنے سے خراب ہوگیا ہے۔"

"یعنی قاتل نے صرف فرش ہی صاف نہیں کیا بلکہ اس نے آلۂ قتل مشین میں ڈال کر ناکارہ بنا دیا۔"

"وہ کوئی عورت بھی ہوسکتی ہے۔" لومونڈ نے کہا۔ اس نے اسکرین پر کچھ فائلیں کھولیں اور مختلف تصویریں دیکھنے لگا پھر وہ ڈش واشر کے اندرونی حصے کی تصویر پر رک گیا۔ اس کے نچلے خانے میں کٹلری رکھی ہوئی تھی۔ تمام چھریاں اور کانٹے قطاروں میں ترتیب سے رکھے ہوئے تھے۔ وہ سب بے داغ اور چمک دار تھے۔ البتہ ایک چھری کا ہینڈل بلاک سے باہر نکلا ہوا تھا اور اس کا پھل نیچے کی جانب تھا۔

"تم کیا سوچ رہے ہو؟"

"میں سوچ رہا ہوں کہ لاپتا آدمی سے بات کی جائے۔"

"وہی جو کھڑکی میں کھڑا تھا؟ لیکن اب وہ لاپتا نہیں رہا۔ کیا وہ کوئی نہیں ہے؟"

"نہیں۔"

☆☆☆

بلیئر رسل انہیں دیکھ کر اپنی کرسی سے کھڑا ہوگیا اور ان کے پاس آکر بولا۔ "مجھے تمہاری آمد کی توقع نہیں تھی۔ کیا تم نے ملاقات کا وقت لیا تھا؟"

"ہم اس طرح کام نہیں کرتے۔" سلیٹر نے کہا۔

"ہم تمہارے گاہک نہیں ہیں۔"

"اوہ، کیا کوئی ضروری کام ہے، تم بیٹھتے کیوں نہیں؟"

"ہم صرف دو تین باتیں پوچھیں گے۔" لومونڈ نے کہا۔

"اچھا، پوچھو۔"

"ہم منگل کے روز تمہاری نقل و حرکت کے بارے میں تفصیل سے جاننا چاہتے ہیں۔ تمہاری بیوی کا کہنا ہے کہ وہ گھر پر اکیلی تھی اور تم سارا دن گھر سے باہر گاہکوں سے ملاقات کرتے رہے۔"

"ہاں۔" رسل نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "میں ڈرومونڈ ہل پر تھا، وہاں ایک بہت بڑا پروجیکٹ بن رہا ہے۔ اس میں بہترین طرز رہائش کے علاوہ پارک، پوسٹ آفس، بطخوں کا تالاب، تفریحی مرکز، سپر مارکیٹ اور

اسکول بھی ہوگا۔“

”تمہاری میٹنگز کب تھیں؟“

”میں تمہیں دکھاتا ہوں۔“ رسل نے ایک ڈائری اٹھائی اور اس کے صفحے پلٹنے لگا پھر ایک صفحے پر انگلی رکھتے ہوئے بولا۔ ”یہ رہا۔ صبح ساڑھے آٹھ بجے ہنٹر، اسٹیوارٹ اور رابرٹ کے ساتھ ناشتا کیا۔ یہ تینوں بلڈرز ہیں۔ پھر دس بجے سائٹ کا وزٹ کیا۔ اس کے بعد ڈھائی بجے ایک اور سائٹ پر گیا۔“

سلیٹر نے ڈائری دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ اس کے درمیان میں جو وقفہ ہے اس میں تمہاری کیا مصروفیت تھی؟“

”میں ڈرومونڈ ہل کے بعد دوسری سائٹ پر چلا گیا تھا۔“

”تم نے لنچ کہاں کیا؟“ لومونڈ نے پوچھا۔

”میرے پاس سینڈوچ تھا۔“

”کیا تم نے ہنٹر، اسٹیوارٹ اور دوسرے لوگوں کے ساتھ لنچ نہیں کیا؟“

”نہیں۔ ان کے ساتھ لنچ کا پروگرام نہیں تھا۔“ رسل نے دفتر سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ ایک حساس معاملہ ہے۔ دراصل میں دوسری سائٹ کے لیے ایک اور بلڈر کے بارے میں غور کررہا ہوں۔ ہنٹر، اسٹیوارٹ اور رابرٹ کے ساتھ کچھ مسائل ہیں جو زیادہ بڑے نہیں لیکن بڑھ بھی سکتے ہیں۔“

”تم سینڈوچ لینے کہاں گئے تھے اور ہنٹر، اسٹیوارٹ اور رابرٹ کے ساتھ میٹنگ کب ختم ہوئی تھی؟“

”تقریباً ایک بجے۔“

”اور سینڈوچ؟“

”وہ میں نے اپنی کار میں بیٹھ کر کھایا تھا۔“

”میرا ساتھی جاننا چاہ رہا ہے کہ تم نے اپنی کار کہاں کھڑی کی تھی اور اس کے بعد تم کہاں گئے تھے؟“ لومونڈ نے کہا۔

”میں نے اپنی کار اس سڑک کے کنارے کھڑی کی تھی جو ڈرومونڈ ہل اور میک ریز برن کو ملاتی ہے۔ میں نے دفتر واپس آنے کے بارے میں سوچا تھا لیکن اس وقت سٹی سینٹر میں پارکنگ کا بہت مسئلہ ہوتا ہے۔“

”اس سڑک کے کنارے اور کون تھا؟“

”میرے سوا کوئی نہیں۔“

لومونڈ نے دیوار پر لگے ہوئے نقشے پر انگلی رکھی اور بولا۔ ”تم نے ایک بجے لنچ ختم کیا اور میک ریز برن جانے والی سڑک پر روانہ ہوگئے جو تمہارے گھر سے کافی قریب ہے۔“

”ہاں لیکن گھر جانے کے لیے مجھے ایک لمبا چکر کاٹ کر واپس آنا پڑتا کیونکہ قریب میں کوئی یوٹرن نہیں تھا اور سائٹ پر پہنچنے میں دیر ہوجاتی ورنہ میں گھر پر ہی لنچ کرتا۔“

سلیٹر نے کہا۔ ”یعنی منگل کے روز ایک اور ڈھائی بجے کے درمیان تم اپنی کار میں تنہا تھے اور کوئی تمہارے ٹھکانے کی تصدیق نہیں کرسکتا یا یہ کہ تم کس کے ساتھ تھے؟“

”تم میرے محلِ وقوع کی تصدیق آسانی سے کرسکتے ہو۔ اس کے لیے میرے فون ریکارڈ کو چیک کرنا ہی کافی ہوگا۔ اس طرح تم میری لوکیشن معلوم کرسکتے ہو۔ میں نے نتاشا کو بھی فون کیا تھا اور کھانے کے وقفے میں اس سے باتیں کرتا رہا۔“

”فون ریکارڈ سے ہمیں صرف یہ معلوم ہوگا کہ تمہارا فون استعمال میں تھا۔“ لومونڈ نے کہا۔ ”اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ تم نے کوئی کال کی تھی۔“

رسل نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”میں جانتا ہوں کہ تمہارا اشارہ کس طرف ہے لیکن میں منگل کی دوپہر کے حوالے سے صرف ایک بات کہوں گا کہ میں اپنی کار میں تنہا تھا اور میک ریز برن جانے سے پہلے ایک جگہ رک کر سڑک کے کنارے لنچ کررہا تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں کہ اس بے چاری عورت کے ساتھ کیا ہوا۔ یہ ایک خوفناک المیہ ہے۔ اگر تم مزید کچھ معلوم کرنا چاہتے ہو تو ہماری اگلی میٹنگ کسی وکیل کی موجودگی میں ہونی چاہیے۔“

”ٹھیک ہے۔“ لومونڈ نے کہا۔ ”ہم بہت جلد تم سے رابطہ کریں گے تاہم مجھے ایک چیز کے بارے میں تجسس ہے۔ کیا مسز بیل......؟“

رسل نے تیوری چڑھاتے ہوئے کہا۔ ”کیا؟“

”کیا وہ بہت خوب صورت تھی؟“

رسل نے کچھ سوچنے کے بعد کہا۔ ”ہاں، وہ دوڑنے کی شوقین تھی اور اس نے اپنے آپ کو فٹ رکھا ہوا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ بہت دلکش تھی۔“

”تم اسے پسند کرتے تھے؟“

”میں اس کے بارے میں اتنا نہیں جانتا تھا کہ کوئی رائے قائم کرسکوں، میں نے شاید ہی اس سے کوئی بات کی ہو اور جب کبھی ایسا اتفاق ہوا تو اس کے شوہر کو غصہ آگیا۔ کچھ مرد ایسے ہی ہوتے ہیں۔“

''مجھے تو یہ شخص مشتبہ لگتا ہے۔'' دفتر واپس پہنچ کر سلیٹر نے کہا۔

''وہ کیسے؟''

''اس کی باتوں میں تضاد ہے۔ وہ ہمیں نہیں بتانا چاہتا کہ کھانے کے وقفے کے دوران کیا کر رہا تھا۔''

''وہ ایک چالاک شخص ہے۔'' لومونڈ نے کہا۔ ''وہ اپنے آپ کو ممکنہ الزام تراشی سے دور رکھنا چاہتا ہے چاہے وہ بے قصور ہی کیوں نہ ہو۔''

''تم نہیں سمجھتے کہ یہ قتل اس نے کیا ہے؟''

''مجھے کچھ اندازہ نہیں ہے البتہ اتنا جانتا ہوں کہ وہ کچھ چھپا رہا ہے اور بہت جلد وہ بات سامنے آجائے گی۔ اس میں اسی کا فائدہ ہے۔''

سلیٹر نے اپنے فون پر آنے والا پیغام پڑھا اور ایک سرد آہ بھری۔

''کیا ہے؟''

''جس نائٹ کلب میں رومن کوئی منگل کے روز کام کر رہا تھا۔ کیمرا فوٹیج کے مطابق وہ ساڑھے بارہ بجے سے دو گھنٹے کے لیے غائب ہو گیا۔ لگتا ہے کہ اس نے طویل لنچ بریک لیا۔''

''میرا خیال ہے کہ ہمیں اس سے ایک اور مرتبہ بات کرنی ہوگی۔ اس کے بھائی کی موجودگی میں۔''

''نیل بیل کی ڈیش کیم کا ایک حصہ غائب ہے۔ جب وہ لنچ کرنے گھر آیا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ آخری سپلائی کے بعد وہ اسے آن کرنا بھول گیا تھا۔ ایسا اکثر ہو جاتا ہے۔ اس لیے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دوبارہ کام پر جانے سے پہلے اس نے اپنی بیوی کو قتل کر دیا ہو۔''

''ٹھیک ہے۔ ہم پہلے بیل سے بات کرتے ہیں۔''

☆☆☆

بیل پہلے سے زیادہ کمزور نظر آرہا تھا۔ اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''بعض اوقات میں ڈیش کیم کا سوئچ آن کرنا بھول جاتا ہوں۔ اس روز فرنچ ریسٹورنٹ میں ایک دوست سے لمبی گفتگو ہوئی۔ وہ میرا گاہک ہے اور میں اسے برسوں سے جانتا ہوں۔ اس نے مجھے بہت عمدہ کافی پلائی اور میں اس کی باتوں میں کھو کر ڈیش کیم کا سوئچ آن کرنا بھول گیا۔ یہ محض ایک اتفاق ہے۔''

''ہم سمجھ گئے مسٹر بیل۔'' لومونڈ نے کہا۔ ''ہم اس بارے میں بات کرنا چاہتے ہیں۔''

''میں نے اسے قتل نہیں کیا۔ میں یہ کیسے کر سکتا ہوں۔''

''ہم صرف سب چیزوں کا موازنہ کر رہے ہیں۔ یہ بہت ضروری ہے۔''

''تم نہیں جانتے کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہے۔ میں اس ہوٹل میں پھنس کر رہ گیا ہوں۔ میں گھر نہیں جا سکتا اور نہ ہی اسے دفنانے کا انتظام کر سکتا ہوں۔ میں تمہیں ایک بات اور بتا دوں۔ وہ جانتا ہے۔'' اس نے اپنے بیٹے کی طرف اشارہ کیا۔ ''اسے تفصیل معلوم نہیں لیکن وہ جانتا ہے کہ اس نے کیا دیکھا لیکن اسے پوری بات معلوم نہیں لہٰذا میں اسے سمجھانے کی کوشش کروں گا کہ اب وہ دوبارہ اپنی ماں کو نہیں دیکھ سکے گا۔ گرمیوں کے بعد اس کا اسکول شروع ہونے والا ہے۔''

بیل نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''پلیز، پُرسکون ہو جاؤ۔'' لومونڈ نے کہا۔

''کیا تم مجھے مجرم ٹھہرا رہے ہو؟''

''نہیں، ہم صرف تم سے کچھ سوالات کرنا چاہتے ہیں جو زیادہ تر تمہارے پڑوسی مسٹر رسل کے بارے میں ہیں۔''

''اوہ......وہ......'' بیل سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''تم نے بتایا کہ اسے پسند نہیں کرتے تھے۔''

''میری اس سے بات چیت نہیں تھی نہ کوئی تعلق تھا۔ ہمارے راستے مختلف ہیں۔ البتہ وہ لیزا سے فری ہونا چاہتا تھا اور اس کی یہ بات مجھے پسند نہیں تھی۔''

''وہ کس طرح؟''

''وہ کبھی اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتا۔ کبھی اس کی کہنی کو چھوتا۔ دیکھنے میں خبطی لگتا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ تم اس سے مل چکے ہو گے۔ اگر آزمانا چاہتے ہو تو اپنی کسی خاتون افسر کو اس کے پاس بھیجو۔ تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ وہ کس قسم کا ہے۔''

''کیا لیزا اسے پسند کرتی تھی؟'' لومونڈ نے پوچھا۔

''میں یہ نہیں کہوں گا کہ وہ اسے پسند کرتی تھی۔ اسے اجنبی لوگ پسند نہیں تھے۔ وہ یہاں سے جانا چاہتی تھی۔''

''مسز رسل کے ساتھ اس کے کیسے تعلقات تھے؟''

''میرا خیال ہے کہ ان کے درمیان آتے جاتے بات ہوا کرتی تھی۔ لیزا اسے بوش عورت کہتی تھی مگر اس سے نفرت نہیں کرتی تھی تاہم میں پھر کہوں گا کہ دونوں گھروں میں برائے نام تعلق تھا۔''

بیل کے کمرے سے باہر آنے کے بعد لفٹ میں سوار ہوتے ہوئے سلیٹر نے پوچھا۔ ''اب تم کیا کہتے ہو؟''

لومونڈ نے گراؤنڈ فلور کا بٹن دباتے ہوئے کہا۔

''ہمارے پاس یہ تین آدمی ہیں جن کے بیانات میں جھول پایا جاتا ہے۔ وہ یہ قتل نہیں کر سکتے۔''

''تم چوتھے کو بھول رہے ہو۔'' سلیٹر نے کہا۔ ''مسز رسل، جب لیزا کا قتل ہوا تو وہ اسی علاقے میں موجود تھی۔''

''میں کسی کو نہیں بھولا لیکن میرا خیال ہے کہ آج دوپہر تک ہم سچ کے کچھ قریب پہنچ جائیں گے۔''

☆☆☆

رومن کوئی اور اس کا بھائی انٹرویو روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ رومن کوئی نے اپنی کہنی میز پر رکھی اور دوسرا ہاتھ سر پر پھیرتے ہوئے بولا۔ ''مجھے امید ہے کہ اس بات کو نظرانداز کر دیا جائے گا اور میری بے گناہی سامنے آجائے گی۔''

اس کے بھائی نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

''ایک منٹ رکو رومن۔''

''نہیں، میں تمہیں بھی بتانا چاہتا ہوں کہ میں بے قصور ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''مجھے اعتراف ہے کہ میرے دل میں مسز رسل کے لیے جذبات تھے۔''

کوئی کے بڑے بھائی نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا لیکن اس کا قلم نوٹ بک پر چلتے چلتے رک گیا۔

''وہ ایک خوب صورت عورت ہے۔ میں اس سے انکار نہیں کروں گا۔ تم بھی اس سے مل چکے ہو۔ اس جیسی عورتیں بہت کم قریب آتی ہیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ ماضی میں دو گھریلو خواتین سے فلرٹ کر چکا ہوں لیکن شادی کے بعد کسی دوسری عورت سے تعلق قائم نہیں ہوا۔''

لومونڈ نے پوچھا۔ ''تم آخری بار مسز رسل سے کب ملے تھے؟''

''منگل کے روز لنچ ٹائم میں۔ اس وقت اس کا شوہر گھر پر نہیں تھا۔ اس نے مجھے فون کر کے میٹنگ کے لیے بلایا۔ یہ میری اپنی غلطی تھی۔ میں اسے منع کر سکتا تھا لیکن میں اس کے اکسانے میں آ گیا۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ بہرحال مجھ سے غلطی ہو گئی اور میں اس کے گھر چلا گیا۔ اگر کوئی عورت اس قسم کی پیشکش کرے تو کم از کم اس کے بارے میں سوچنا چاہیے۔''

''اس کے ساتھ تمہاری کتنی ملاقاتیں ہوئیں؟'' لومونڈ نے پوچھا۔

''صرف ایک۔ اس منگل کو لنچ کے وقفے میں۔''

''تو تم تصدیق کر رہے ہو کہ منگل کے روز کھانے کے وقفے میں رسل کے گھر پر تھے؟ کیا تم بتا سکتے ہو کہ کتنے بجے وہاں پہنچے؟''

''میں ساڑھے بارہ بجے کلب سے روانہ ہوا اور تقریباً ایک بجے رسل کے گھر پہنچ گیا۔ میری واپسی دو بجے ہوئی۔''

سلیٹر نے کہا۔ ''یہ تم اب بتا رہے ہو۔ کیا تم نے لیزا بیل کو بھی دیکھا تھا اور اسی لیے تم اس کے گھر یہ پوچھنے کے لیے گئے تھے کہ کیا وہ کیمرا اسسٹم لگوانا چاہتی ہے؟''

کوئی نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''ہاں۔''

''پھر کیا ہوا؟'' سلیٹر نے پوچھا۔ ''تفصیل سے بتاؤ۔''

''میں جب مسز رسل کے گھر سے نکل رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ لیزا کا شوہر اپنی وین میں بیٹھ کر واپس جا رہا تھا پھر میں نے لیزا کو اس کے کچن کی کھڑکی میں دیکھا۔ میں اس کے پاس گیا اور ہمارے درمیان تھوڑی سی گفتگو ہوئی۔ اس نے کہا کہ وہ کیمرا اسسٹم لگوانے کے بارے میں سوچے گی۔ اس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں ہوئی۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہی سچ ہے۔''

''تم نے ہم سے غلط بیانی کی مسٹر کوئی۔'' لومونڈ نے کہا۔ ''ہم سمجھ رہے تھے کہ تم منگل والے دن مسز رسل کے گھر نہیں گئے تھے۔''

''میں نے اس لیے جھوٹ بولا کہ میں شادی شدہ ہوں اور وہ بھی۔ وہ بے چاری عورت اس وقت زندہ تھی جب میں وہاں سے رخصت ہوا۔ اور اس کا شوہر جا چکا تھا۔''

☆☆☆

''میری بیوی اوپر کمرے میں تیار ہو رہی ہے۔'' بلیئر رسل نے کہا۔ ''ہم یہاں بات کر سکتے ہیں۔ کیا میں تمہارے لیے کچھ کھانے پینے کا انتظام کروں؟''

''ہم تمہاری بیوی سے بات کرنا چاہتے ہیں۔'' لومونڈ نے کہا۔

''اسے آنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔'' رسل نے کہا۔

''ہم اس سے تنہائی میں بات کرنا چاہتے ہیں۔'' سلیٹر نے کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ تم ہماری مجبوری کو سمجھتے ہو۔''

''بالکل، لیکن تمہیں اس سے جو بات کرنی ہے وہ مجھ سے کہہ سکتے ہو۔''

''تم ایک کاروباری شخص ہو اور رازداری کی اہمیت کو سمجھتے ہو۔ ہم اس سے تنہائی میں بات کرنا چاہتے ہیں۔''

''مجھے شک ہے کہ تم اس شخص کے بارے میں پوچھنا چاہتے ہو جو ہمارے یہاں کیمرا اسسٹم لگا رہا ہے؟''

’’ہم اس کے بارے میں کیوں پوچھیں گے؟‘‘ لومونڈ نے کہا۔

’’مجھے اس لیے شک ہوا کہ نتاشا نے اس کے ساتھ منگل کے روز دوپہر میں ہم بستری کی تھی۔‘‘ اس نے زوردار قہقہہ لگایا۔ ’’کیا تم سمجھتے ہو کہ میں اس بارے میں نہیں جانتا؟‘‘

’’ٹھیک، ٹھیک بتاؤ۔ تم کیا جانتے ہو؟‘‘ لومونڈ نے پوچھا۔

’’سب کچھ۔ نتاشا شروع سے ہی اس پر مہربان تھی۔ پہلے اس سے تھوڑا سا فلرٹ کیا پھر اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگی جب وہ باڑھ پر چڑھ کر کام کررہا ہوتا تھا۔ کوئی ایک بدمعاش ہے لیکن اسے نتاشا کی بات سمجھنے میں کچھ دیر لگی بالآخر اس کے بیڈروم تک پہنچ گیا۔‘‘

’’یہ تم کیسے جانتے ہو؟‘‘ سلیٹر نے پوچھا۔

’’میں نے اس کا انتظام کیا تھا۔‘‘

’’کیا تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ تم نے اپنی بیوی کو ایک ایسے شخص کے ساتھ سونے کا اہتمام کیا جسے کیمرا سسٹم لگوانے کے لیے گھر لے کر آئے تھے؟‘‘

رسل نے اثبات میں سر ہلایا۔ ’’ہاں، ایسا ہی ہے۔‘‘

’’تم اس وقت کہاں تھے؟‘‘

’’میں پہلے بتا چکا ہوں۔ سڑک کے کنارے ویڈیو کال کے ذریعے اپنی بیوی اور اسے دیکھ رہا تھا۔ کیمرا سسٹم صرف گھر کے باہر نہیں بلکہ پہلے ہمارے بیڈروم میں لگایا گیا تھا۔ وہ خفیہ کیمرا ہے اور اسے میرے فون کے ساتھ منسلک کیا جاسکتا ہے۔‘‘

’’کیا نتاشا جانتی ہے کہ بیڈروم کی سرگرمی ریکارڈ ہورہی ہے؟‘‘ لومونڈ نے پوچھا۔

’’بالکل یہ ہمارے لیے کوئی بڑی بات نہیں۔‘‘

’’اگر تمہارے نزدیک یہ کوئی بڑی بات نہیں تو تم ہمیں پہلے ہی بتا دیتے۔‘‘ لومونڈ نے کہا۔ ’’اس طرح ہمارا وقت بچ جاتا۔‘‘

’’تم نے میری نقل و حرکت کے بارے میں پوچھا تھا وہ میں نے بتا دیا تھا۔

’’زیادہ ہوشیار مت بنو۔‘‘ سلیٹر نے کہا۔ ’’تم نے کچھ باتیں ہم سے چھپائیں، کیوں؟‘‘

’’کیونکہ اس میں ایک تیسرا فریق ملوث ہے اور شادی شدہ بھی ہے۔ میں اور نتاشا ان باتوں کی پروا نہیں کرتے لیکن اسے اعتراض ہوسکتا ہے اور یہی اخلاقیات کا تقاضا ہے۔‘‘

’’اخلاقیات؟‘‘ سلیٹر نے ناک چڑھائی۔ ’’تم اس کی ویڈیو دیکھتے رہے یہی تمہاری اخلاقیات ہے؟‘‘

’’یہ مت سمجھنا کہ میں ایک ڈش پر اکتفا کرتا ہوں اور نتاشا کا بھی یہی حال ہے۔ اسی لیے ہماری شادی کامیاب ہے۔ ہمارے درمیان کوئی راز نہیں۔ اس نے مجھے دوسری عورتوں اور میں نے اسے دوسرے مردوں کے ساتھ دیکھا ہے۔ ہم کیوں اپنی زندگی کو محدود بنائیں۔ اسی آزادی کی وجہ سے ہم ایک دوسرے پر بھروسا اور آپس میں محبت کرتے ہیں۔‘‘

’’میرا خیال ہے کہ تم وہ ویڈیو مجھے دے دو اور یہ کام تم آج ہی کروگے۔‘‘ لومونڈ نے کہا۔

’’تم ابھی مجھ سے اس کی ایک کاپی لے سکتے ہو۔‘‘ رسل نے کہا۔

دروازہ کھلا اور مسز رسل نمودار ہوئی۔ اس نے دونوں پولیس والوں کو گھورا۔

’’ڈارلنگ، کیا یہ دونوں تم سے دوبارہ احمقانہ سوالات کررہے ہیں؟‘‘

’’ہاں، میں نے انہیں منگل کے بارے میں بتا دیا ہے۔ یہ تھوڑے سے حیران لگ رہے ہیں۔‘‘

’’یہ عجیب بات ہے۔‘‘ مسز رسل نے کہا۔

’’ہمیں تم دونوں کا بیان چاہیے۔‘‘ لومونڈ نے کہا۔

مسز رسل نے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ’’کیا تم اوپر چل کر میرے کیمرے کا معائنہ کرنا چاہو گے مسٹر سلیٹر؟‘‘

’’نہیں شکریہ۔‘‘ سلیٹر نے کہا۔ ’’میرا خیال ہے کہ ہماری فارنسک ٹیم اس کا معائنہ کرے گی۔ ہمیں صرف فوٹیج چاہئیں۔‘‘

اس نے اپنے شوہر سے کہا۔ ’’تم کوشش کرو۔‘‘

’’تم دونوں اوپر جاسکتے ہو۔‘‘ رسل بولا۔ ’’اس طرح تمہاری بدگمانی دور ہوجائے گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کے بعد ہم مشتبہ نہیں رہیں گے۔ تم مکمل طور پر تلاشی لے سکتے ہو۔ میری بیوی تمہیں وہ سب کچھ دکھا سکتی ہے جو تم جاننا چاہتے ہو۔‘‘

’’یہ حماقت کی انتہا ہے۔‘‘ لومونڈ نے کہا۔ ’’تمہارے گھر کے سامنے ایک عورت مرگئی۔ اسے تم بھول گئے اور اب کسی ویڈیو کا ذکر کررہے ہو؟‘‘

☆☆☆

اپنے دفتر میں سلیٹر نے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے

کہا۔ ''حقیقی زندگی میں ایسا نہیں ہوتا۔''

''ایسا ہوسکتا ہے اور ہو گیا۔''

''ہمیں یہ بات اپنی رپورٹ میں لکھنی ہوگی۔ کوئی بھی اس پر یقین نہیں کرے گا۔'' یہ کہہ کر اس نے ویڈیو چلا دی۔ کمپیوٹر اسکرین پر انہوں نے جو کچھ دیکھا۔ وہ حیران کر دینے کے لیے کافی تھا۔ تبھی دروازے پر دستک ہوئی اور سلیٹر نے ویڈیو روک دی۔

سراغ رساں سارجنٹ اسمتھ کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کی بغل میں چند پرنٹ آؤٹ دبے ہوئے تھے۔ اس نے اسکرین پر نظر ڈالی اور قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ ''یہ مسز رسل اور کوئی ہوں گے؟''

''یہ بڑی دل خراش ویڈیو ہے۔'' لومونڈ بولا۔ ''اگر تم چاہو تو اسے دیکھ سکتی ہو۔''

اسمتھ نے ایک کرسی کھینچی اور سلیٹر کے برابر میں بیٹھ گئی۔ ''کوئی بھی بتا سکتا ہے کہ یہ جنس پرست ہیں۔ اس کا اعتراف انہوں نے میرے سامنے بھی کیا جب میں پہلی بار ان سے ملی۔ یہاں تک کہ انہوں نے مجھے ایک پارٹی میں بھی مدعو کیا لیکن میں معذرت کر کے چلی آئی۔ یہ میرا مشغلہ نہیں۔ دوسرے یہ کہ اس وقت وہ مشتبہ تھے لیکن یہ صاف ظاہر تھا کہ وہ شروع سے ہی اس معاملے سے لاتعلق تھے۔''

''یہ تم کیسے جانتی تھیں؟'' لومونڈ نے پوچھا۔

''رسل شیر کی کھال پہنے ہوئے ایک گیڈر ہے اور اس کا گھر عیاشی کا اڈا ہے۔ وہ اسے ان پارٹیوں کے لیے استعمال کرتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ ایک رپورٹ ہے۔ اس پر ایمر نے دستخط کر دیے ہیں۔'' وہ لومونڈ کو ایک فولڈر پکڑاتے ہوئے بولی۔

لومونڈ وہ رپورٹ پڑھنے لگا۔ ''اس کے علاوہ ایک اور ویڈیو بھی ہے۔'' اسمتھ بولی۔ ''رسل نے ایک گھنٹا پہلے مجھے دی ہے۔ تم اسے بھی دیکھ لو۔''

''یہ کون سی ویڈیو ہے۔'' سلیٹر نے پوچھا۔

''یہ مسٹر رسل نے اپنی ویڈیو بنائی ہے۔'' لومونڈ نے کہا۔ ''جب وہ کار میں بیٹھا اپنی بیوی اور کوئی کی لائیو ویڈیو دیکھ رہا تھا۔''

''عرف عام میں اسے سیلفی کہتے ہیں۔'' اسمتھ بولی۔

سلیٹر نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ ''زبردست۔ یہ ویڈیو مسٹر رسل نے سینڈوچ کھاتے ہوئے بنائی ہے۔ اس سے اس کے بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔''

☆☆☆

مسٹر بیل کے مکان سے کرائم سین ہٹایا جا چکا تھا۔ لومونڈ اور سلیٹر ڈرائیو وے سے گزرتے ہوئے آگے بڑھے۔ کچن میں لائٹ جل رہی تھی۔

دونوں ویڈیوز سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسٹر رسل اور اس کی بیوی جائے وقوعہ سے دور تھے۔ نتاشا اپنے بیڈ روم میں کوئی کے ساتھ تھی جبکہ رسل سڑک کے کنارے اپنی کار کھڑی کر کے لنچ کر رہا تھا۔'' سلیٹر نے کہا۔

''اسی طرح بیل کو بھی مشتبہ نہیں قرار دیا جا سکتا۔ کیونکہ کوئی کے کہنے کے مطابق مسز بیل اس وقت زندہ تھی جب بیل کھانے کے بعد واپس جا رہا تھا۔''

''کوئی نے کھڑکی میں کھڑے ہو کر مسز بیل سے بات کی تھی لیکن اس نے اسے قتل نہیں کیا۔'' سلیٹر نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ اس وقت لومونڈ بیرونی دروازہ کھول رہا تھا۔ ''میرا خیال ہے کہ اب تم مجھے بتانے والے ہو کہ مسز بیل کو کس نے قتل کیا۔''

''تم کیا سمجھتے ہو، میں کیا کہنے والا ہوں؟''

''یہی کہ بیل کے جانے کے بعد اس کی بیوی کے ساتھ گھر میں صرف ایک ہی فرد رہ گیا تھا۔''

''تم ٹھیک سمجھے ہو۔'' لومونڈ نے کہا۔

''یعنی ایک تین سالہ بچے نے اپنی ماں کا گلا کاٹ دیا؟''

''بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔'' لومونڈ نے کہا۔ اس نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ ''وہ فریزر نہیں تھا۔''

''تو پھر کیا یہ ایک اتفاقی حادثہ تھا؟''

''ہاں، مجھے قطعی طور پر کچھ کہنے سے پہلے ایک دو باتوں کو جوڑنا ہے تب تک دوسرے لوگ بھی آ جائیں گے۔''

☆☆☆

نیل بیل اور اس کا بیٹا کچن میں داخل ہوئے۔ فریزر اپنی ماں کو یاد کر کے رونے لگا۔ ''ہمیں افسوس ہے۔'' لومونڈ نے کہا۔ ''لیکن یہ بتانا بہت ضروری ہے کہ تمہاری بیوی کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا۔''

بیل نے میز کی طرف دیکھتے ہوئے سر ہلایا جہاں برتن، چھری کانٹے اور سراغ رسانوں کا بچا ہوا کھانا پڑا تھا۔

''میں دیکھ رہا ہوں کہ تم نے خود ہی اپنے لیے انتظام کر لیا۔''

''اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔'' لومونڈ نے کہا۔ ''ہم ابھی سب صاف کر دیں گے۔''

لومونڈ نے بڑی احتیاط سے ایک پیالہ اٹھایا جس میں

تھوڑا سا چکن سوپ باقی رہ گیا تھا لیکن پیالے پر اس کی گرفت کمزور تھی۔ سوپ کے چند قطرے فرش پر گر گئے۔

''اسے صاف کرنا ہوگا۔'' بچے نے کہا اور لپک کر الماری کھولی اور اس میں جھانکنے لگا۔

''کیا تم سوپ تلاش کر رہے ہو؟'' لومونڈ نے پوچھا۔

''سوپ اور بالٹی۔'' لڑکے نے کہا۔ اس نے ایک ڈش ٹاول اٹھایا اور اس جگہ کی صفائی کرنے لگا جہاں سوپ گرا تھا۔ اس نے صفائی کرنے کے بعد فرش کو غور سے دیکھا اور ڈش ٹاول ریک میں رکھ دیا۔

اس دوران لومونڈ نے ڈش واشر کھولا اور پیالے، پلیٹیں اور کٹلری خانوں میں رکھ دیے۔ ''تم بہت ہوشیار لڑکے ہو۔'' لومونڈ نے کہا۔ ''کاش میری بیٹی بھی تمہاری جیسی ہوتی۔'' پھر اس نے مکھن کاٹنے کی چھری کٹلری کے خانے میں اس طرح رکھی کہ اس کا پھل اوپر کی جانب اٹھا ہوا تھا۔

''نہیں۔'' لڑکے نے کہا۔ ''یہ غلط ہے۔'' پھر اس نے چھری اٹھا کر دوبارہ اس طرح رکھی کہ اس کا پھل نیچے کی جانب ہوگیا۔

''تم بہت ہوشیار ہو۔'' لومونڈ نے کہا۔ ''تم جانتے ہو کہ برتن کیسے دھوتے ہیں؟''

فریزر نے ایک دراز کھولی اور اس میں سے ایک ٹکیا نکالی۔ اس کا کاغذ الگ کیا پھر واشر کا ایک پینل کھول کر وہ ٹکیہ اس میں ڈالی اور اسے بند کر دیا پھر اس نے دو بٹن دبائے اور ڈش واشر بند کر دیا اور ایک غرغراہٹ کے ساتھ دھلائی کا عمل شروع ہوگیا۔

نیل بیل نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔ ''پلیز، یہ مت کرو۔ بہت ہوگیا۔ میں یہ نہیں سُن سکتا۔''

''کیا نہیں سُن سکتے؟''

''تم مجھے یہ نہیں بتا سکتے کہ اس نے قتل کیا ہے۔''

''اس لڑکے نے کچھ نہیں کیا۔''

''پھر وہ کون تھا؟ کس نے میری بیوی کو قتل کیا؟''

''کسی نے نہیں۔'' لومونڈ ڈش واشر کے سامنے کچن کی دوسری طرف گیا۔

''لیزا نے اپنی موت کے وقت دوڑنے کا لباس پہن رکھا تھا اور وہ ایک علیحدہ کمرے میں ایکسر سائز کی تیاری کر رہی تھی۔ اس نے پرانے اسپورٹس شوز پہن رکھے تھے۔ ان کا تلا تقریباً گھس چکا تھا۔ وہ غالباً انہیں برسوں سے استعمال کر رہی تھی۔''

''شاید، میں نے اس پر زیادہ توجہ نہیں دی۔''

''اس نے تمہیں رخصت کرنے کے بعد ڈش واشر میں برتن ڈالے۔ فرش پر سوپ لگایا اور سوپ کے ساتھ بالٹی بھی فرش پر چھوڑ دی۔ اس نے ایک چھری بھی ریک میں چھوڑ دی۔ اس کا پھل اوپر اٹھا ہوا تھا۔''

''میں نے اسے منع بھی کیا تھا۔'' بیل نے کہا۔ ''وہ ایسی ہی بے پروا تھی۔''

لومونڈ نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''فرش گیلا تھا۔ اس کا پاؤں پھسلا اور وہ ڈش واشر پر جا گری۔ اس کا ڈھکنا کھلا ہوا تھا اور دراز باہر نکلی ہوئی تھی۔ چھری اس کے گلے میں اتر گئی جس نے اس کی شہ رگ کو کاٹ دیا۔ وہ تیزی سے اٹھی جس سے مزید نقصان ہوا۔ کچن کیبنٹ پر خون کی دھار سے ظاہر ہوتا ہے کہ زخم لگنے کے بعد وہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو رہی تھی پھر وہ پیچھے کی جانب گری اور اس کی موت واقع ہوگئی۔ فریزر نے ہمیں جو بتایا اس سے تو یہی لگتا ہے کہ اس نے وہ منظر نہیں دیکھا، وہ اس کے بعد کچن میں آیا اور اسے مردہ حالت میں پایا۔''

''لہٰذا جب اس نے خون دیکھا تو اس نے وہی کیا جو ابھی ہمیں دکھایا ہے۔ جیسے وہ صفائی کرنے میں ماں کی مدد کرنا چاہتا ہے۔ اس نے چھری کا پھل نیچے کیا۔ واشر میں ایک ٹکیہ ڈالی اور اسے چلا دیا پھر اس نے سوپ سے فرش صاف کیا اور قدموں کے نشان مٹا دیے۔ اسی طرح اس نے کیبنٹ پر سے بھی خون کے دھبے صاف کر دیے پھر اس نے سوپ کو دھویا اور بالٹی کا پانی ٹوائلٹ میں بہانے کے بعد دونوں چیزیں واپس کپ بورڈ میں رکھ دیں۔''

''یہ ایک حادثہ تھا مسٹر بیل۔ ایک خوفناک حادثہ۔'' لومونڈ نے کہا۔ پھر وہ سیلٹر سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''یہ بالکل اتفاقیہ تھا۔ ایسا خوفناک حادثہ جو کسی بھی وقت کہیں بھی پیش آسکتا ہے۔''

''اب ہم تمہیں چھوڑ کر جا رہے ہیں مسٹر بیل۔ اس حادثے کی تحقیقات ہوگی اور تمہیں بھی ثبوت دینے کے لیے طلب کیا جائے گا۔ فی الحال ہم تمہیں کچھ لوگوں کے نمبر دے رہے ہیں جو تمہاری اور فریزر کی مدد کر سکتے ہیں۔ برائے کرم ان کی پیشکش قبول کر لینا۔ اب تمہیں اپنا اور فریزر کا خیال رکھنا ہوگا۔ کیا تم اس کا وعدہ کرتے ہو؟''

بیل نے کچھ نہیں کہا اور دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگا۔

❖❖❖

امجد جاوید

زندگی کی کشمکش میں فنا و بقا ایک حقیقت ہے۔ قدرت کا دستور ہے کہ کوئی غیر معمولی طاقت اسی کو ملتی ہے جو اس کا موزوں استعمال جانتا ہے۔ فنا و بقا سے نبرد آزما ہونے والے خود شناس ہوتے ہیں۔ یہ وصف انہی کو حاصل ہوتا ہے جو انا گیر ہوں اور اپنا ادراک رکھتے ہوں... جو ظلم و جبر کے بگولوں کو مات دینا جانتے ہوں... سنہری ریت کے باطن سے اُبھرنے والے ایک نوجوان کی پرت در پرت کھلتی داستانِ دل نواز۔ وہ ریت کی طرح بکھر سکتا تھا مگر ذروں میں بٹ نہیں سکتا تھا۔ دھرتی کی مٹی میں نکھرنے اور سنورنے کا فن بخوبی جانتا تھا... اپنی ذات کو انا کے بھنور سے بچانا جانتا تھا... حالات کی آندھیوں کے سامنے سینہ سپر ہونے کے گر سے آگاہ تھا۔ جانتا تھا کہ بگولے ریت کو اِدھر اُدھر لے جاسکتے ہیں، فنا نہیں کرسکتے۔ ریشمی سراب تھے جو اس کی راہ میں حائل ہورہے تھے۔

صحرا کے سرابوں سے ایک دیدہ ور دل نگار نوجوان کی ہنگامہ خیزیاں

قسط :11

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

میرا نام علی زین ہے۔ صحرائے چولستان میں وارد ہوتے ہی میں مقامی غنڈوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ وہ مجھے زخمی کر کے بستی چراغ شاہ میں میرن شاہ کے ڈیرے پر لے آئے۔ وہاں پہنچ کر پتا چلا وہ غلط فہمی اور جلد بازی میں کسی دوسرے بندے کو اغوا کر کے لے آئے ہیں جبکہ مجھے اسی بستی اور ڈیرے پر جانا تھا۔ میں نے اپنا تعارف سروے آفیسر کی حیثیت سے کرایا تھا۔ میرن شاہ چونکہ اس علاقے کا حاکم تھا۔ میرے رہنے کا بندوبست اسی کے ڈیرے پر ہوا تھا۔ اس بستی میں میرے بچپن کی یادیں بکھری تھیں۔ مجھے اپنے بچپن کے دوست سانول اور ساوری کے علاوہ کئی دوسرے بھی یاد تھے۔ اگلے ہی دن معلوم ہوا کہ جس کے دھوکے میں مجھے اغوا کر کے لائے ہیں، وہ نزدیکی بستی کا ایک فرد بختاور تھا، جن کے ساتھ ان کی خاندانی دشمنی چل رہی تھی۔ میرن شاہ بجائے وہاں کا سروے کروانے کے، مجھے خرگوش کے شکار پر لے گیا۔ اسی رات بارڈر پار سے کچھ لوگ میرن شاہ سے ملنے آئے .... جو سخت غصے میں تھے اور میرن شاہ پر قتل کا الزام لگایا جس سے وہ لاعلمی کا اظہار کرتا رہا۔ اسی رات ڈیرے پر میری ملاقات میرن شاہ کی خودسر بہن پیروزاں سے ہوگئی جو اپنے بھائی سے بھی زیادہ ظالم تھی۔ اگلی رات ڈیرے پر کچھ لوگ حملہ آور ہوئے جن میں ایک میرے ہاتھوں جہنم واصل ہوا اور دو شدید زخمی ہو گئے یہیں سے میرے بارے میں شک ہوا کہ میں کوئی آفیسر نہیں۔ مجھے جلد ہی ایک مقامی نوجوان زمان موہل سے بہت ساری معلومات ملنے لگی تھیں۔ جس سے اندازہ ہوا کہ پیروزاں اور میرن شاہ روہی کے علاقے میں کیسے اپنی حاکمیت بنائے ہوئے تھے۔ دونوں بہن بھائی اپنے اپنے طور پر غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث تھے، دونوں ایک دوسرے کے راستے میں نہیں آتے لیکن اپنی اپنی حاکمیت مضبوط بنا رکھی تھی۔ میری ساوری سے ملاقاتیں بڑھ گئی تھیں۔ اس کا کہنا تھا کہ پیروزاں ایک ''ڈائن'' اور مرد مار قسم کی عورت ہے۔ وہ مجھے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ روہی میں بارڈر پار سے کئی لوگ آتے تھے جو مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث تھے۔ پیروزاں نے راجھستان کے کئی بندے مروا دیے تھے۔ رتو بھوہڑ سے بھی مڈھ بھیڑ ہوتی ہے۔ مجھے پتا چلتا ہے کہ وہ اپنے تعلقات میں کتنی وسعت رکھتی ہے اور کس قدر طاقتور ہے۔ مجھ پر راجھستانی حملہ کرتے ہیں، جس میں، میں بچ جاتا ہوں۔ اس حملے میں پیروزاں کی نیت ظاہر ہو جاتی ہے کہ وہ مجھے چارے کے طور پر استعمال کرنا چاہتی ہے۔ میں نے بھی اس کے ساتھ کھیلنے کا فیصلہ کر لیا۔ حالات اس نہج پر آ پہنچتے ہیں کہ میں نے پیروزاں کو قتل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ ساوری اس رات پیروزاں کو بچا لیتی ہے اور مجھے اس کے ڈیرے سے جانا پڑتا ہے۔ میرے لاہور والے دوست روہی آ کر میری مدد کرتے ہیں اور میرن شاہ کے کئی لوگ ہمارے ہاتھوں قتل ہو جاتے ہیں۔ میرن شاہ سے میری جنگ لکھی تھی۔ میں پوری پلاننگ کے ساتھ میرن شاہ کو اس کے گھر سے نکال کر بستی میں اس جگہ لایا جہاں کبھی اس نے میرے ماں، باپ اور بہن کو قتل کیا تھا۔ میں نے میرن شاہ کو اس کی ماں کے سامنے آگ لگا کر بے رحمی سے قتل کر دیا۔ میرن شاہ کے قتل کے بعد میرا وہاں رہنا مشکل تھا۔ پیروزاں اور اس کے طاقتور ساتھی پوری کوشش کرتے ہیں کہ مجھے گھیر کر مار دیں۔ دشمن کا دشمن، دوست کی بنا پر رتو بھوہڑ اور چاچا سائیں نے میری مدد کی۔ یہاں تک کہ پیروزاں کے ساتھ جنگ جیسی صورتِ حال بن گئی۔ پیروزاں نے فورسز کا سہارا لیا تو چاچا سائیں اور رتو بھوہڑ کی مدد سے میں سرحد پار راجھستان پہنچ گیا۔ مجھے ایک سرحدی بستی میں پناہ ملی تھی۔ مجھے وہاں کا مکھیا قتل کرنے کے درپے تھا۔ وہاں سے چاچا سائیں کا بیٹا بختاور مجھے بچا کر اودھے رام کے پاس لے گیا۔ اودھے رام ایک مجرم تھا جو اپنے ہاں پناہ لینے والوں سے جرم کرواتا تھا۔ اودھے رام سے ملاقات کے بعد مجھے ٹاسک دیا گیا کہ جیسلمیر میں موجود ایک بزنس مین کو قتل کرنا ہے۔ میں جیسلمیر پہنچ چکا تھا۔ مانسی نامی لڑکی کے ساتھ مل کر میں نے بزنس مین کا کام تمام کر دیا۔ مادھو نامی ایک خانہ بدوش کے ہاں پناہ لینا پڑی جہاں بھارتی آرمی آن پہنچی۔ وہاں سے بھی فرار ہونا پڑا۔ اسی جرم کی دنیا میں مجھے نیا ٹاسک سونپ دیا۔ اس بار دو لڑکیوں کو اغوا کرنا تھا۔ رتنا اور رشتما نامی لڑکیوں کو میں نے اغوا کر کے ایک ویرانے میں پہنچا دیا تھا، جہاں میرے قتل کا منصوبہ تیار تھا۔ مگر میں رتنا اور رشتما کو بچا کے جودھ پور لے گیا۔ رتنا اور رشتما خود جرم کی دنیا کی بڑی کھلاڑی تھیں۔ وہیں پر مجھے ''کلیان جی'' نامی ایک مجرم تنظیم کا پتا مل گیا۔ مجھے اپنے ذرائع سے معلوم ہوا کہ پوجا نامی لڑکی دراصل کلیان جی کی ایجنٹ ہے۔ میں نے خود کو اس سے بچایا میں اسے اغوا کر کے قتل کرنا چاہتا تھا مگر قتل نہیں کر پایا۔ پوجا کا ساتھی پرتاب راؤ، ان دونوں لڑکیوں کو غداری کی پاداش میں قتل کروانا چاہتا تھا۔ اسی دوران میں پتا چلا کہ کلیان جی کے ڈانڈے تو ریاستی خفیہ تنظیم سے ملتے ہیں، اس تنظیم کو چلانے والوں میں راکیش ورما بھی شامل تھا۔ جودھ پور میں خود کو بچاتے ہوئے مجھے بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ وہیں سے مجھے ایک مددگار سے مشرا جی نامی آدمی سے پرتاب راؤ کے بارے میں خبر ملی۔ میں اس کے تعاقب میں دیوگڑھ جا پہنچا۔ دراصل وہاں پر رانی بھاگ وتی اور پرتاب راؤ کے درمیان دشمنی چل رہی تھی۔ اس نے رانی بھاگ وتی کی طرف سے پرتاب راؤ پر حملہ کیا۔ ریتو نامی ایک بازی گر لڑکی نے میرا بھرپور ساتھ دیا۔ اپنی کارروائیوں سے میں نے پرتاب راؤ کو جھکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ پرتاب راؤ خود ریاستی ایجنٹ تھا اور کلیان جی نامی خفیہ تنظیم کا رکن جس نے ڈاکٹر کامران ملک اور اس کی بیوی فائزہ ملک کو اپنی نجی جیل میں رکھا ہوا تھا۔ میں نے اپنی پوری قوت استعمال کرتے ہوئے ان دونوں کو بازیاب کروایا۔ یہاں سے مجھے پتا چلا کہ کلیان جی نامی تنظیم کا وجود کتنی دور تک پھیلا ہوا ہے۔ پرتاب راؤ کے قتل کی پاداش میں مجھے وہاں سے فرار ہونا پڑا، آرمی فورس تعاقب میں تھی۔ ایک سادھو مائی نامی عورت کی مدد سے میں جے پور جا پہنچا۔ آسمان سے گرا اور کھجور میں اٹکا کے مصداق میں جے

پور میں پھنس گیا۔ ایک مقامی تنظیم نے اس شرط پر مجھے بھارت سے نکالنے کی ہامی بھری کہ میں ستیہ رام نامی شخص کو قتل کردوں۔ بملا نامی آئی ٹی ایکسپرٹ کی مدد سے میں نے ان لوگوں کو قتل کردیا۔ وہی بملا مجھے دوبارہ جیسلمیر تک لے گئی جہاں بھارتی فورسز انتظار میں تھیں۔ وہاں بھی حالات خراب تھے۔ میں بُری طرح پھنس چکا تھا مگر بختاور کی مدد سے میں واپس روہی آن پہنچا۔ وہاں میرا ٹارگٹ پیروزاں تھی جو میرے لیے پہلے ہی جال بچھائے بیٹھی تھی۔ پیروزاں اپنی پوری قوت کا مظاہرہ کررہی تھی۔ اس کی مدد کو راجستانی دشمن اور بھارتی ایجنٹ آگئے۔ یہاں ایک نئی کشمکش کا آغاز تھا۔ یہاں تک کہ بختاور کی مدد سے ہم نے پیروزاں کو اغوا کرلیا۔ ساوری اپنے انتقام کے باعث پیروزاں کو قتل کرنا چاہتی تھی۔ ساوری کو اپنی محبت کے اظہار کے طور پر میں نے اپنا ماضی بتایا کہ کس طرح بستی چراغ شاہ سے بھاگا اور کہاں کہاں سے ہوتا ہوا لاہور پہنچ گیا۔ اب تک کی زندگی کیسے گزری۔ چاچا عبدالمجید جس نے ہر پل میری راہنمائی اور مدد کی، وہ روہی میں آگیا تھا۔ ہم نے سانول اور رحماں کی شادی کردی تھی۔ اسی شادی پر ناچنے والی لڑکی ردھی اور چھوٹو رام جیسا بدمعاش سامنے آگیا تھا جس کے ڈانڈے جرم کی دنیا میں بہت دور تک جاتے تھے۔ وہ عورتوں کی خرید وفروخت کا بہت بڑا بیوپاری تھا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

میں کچھ دیر خاموش رہا پھر میں نے ساوری کی جانب دیکھا، وہ میرے جواب کی منتظر تھی۔ آنکھوں میں ہی نہیں اُس کے چہرے پر بھی انتظار پھیلا ہوا تھا۔ میں چند لمحے یونہی دیکھتا رہا پھر دھیمے لہجے میں کہا۔

''وقت جو فیصلہ کرے گا ساوری، وہی بہتر ہوگا۔ میں اپنے سارے معاملات وقت پر چھوڑتا ہوں۔''

''ایسا تو نہیں چلے گا' یہاں کے معاملات کو دیکھنا ہے۔ ان لوگوں کو اکیلا......''اس نے کہنا چاہا تو میں نے ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے کہا۔

''اگر ہم اس جہاں میں نہ بھی رہیں تب بھی یہاں کے معاملات چلتے رہیں گے۔ تم فکر نہ کرو۔'' میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو وہ میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

''علی، میں نے جو وقت گزارا ہے، رحماں نے اور ہمارے جیسی کئی لڑکیوں نے جو اذیت جھیلی ہے، وہ اذیت تم نہیں سمجھ سکتے۔ کچھ تو اس جہان سے بھی چلی گئیں۔ مجھے زندگی سے کوئی گلہ شکوہ نہیں ہے۔ ہم پیدا ہی ایسے خطے میں ہوئے ہیں، ہماری آنکھ ہی ایسے گھر میں کھلی، کسی کو کیا دوش دیں علی، ہم جیسوں کی قسمت یہی ہوتی ہے۔'' اس نے دکھی دل سے کہا۔

''تم مجھے جذباتی کرنے کی کوشش مت کرو ساوری۔ جو تم کہنا چاہتی ہونا...... وہی کہو۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا اور اس کے کندھے سے ہاتھ ہٹالیا تو وہ لرزتے لبوں اور کانپتی پلکوں کے ساتھ بولی۔

''میں کچھ بھی نہیں چاہتی سوائے تمہارے۔''

''تم میرے بارے میں سب جانتی ہو بلکہ میرے بارے میں جاننے کی ضد تم نے خود کی، اب جبکہ تمہیں میرے بارے میں سب پتا ہے تو پھر تم میرے ساتھ کیوں امیدیں باندھ رہی ہو، اگر تمہیں کچھ معلوم نہ ہوتا تو شاید میں تمہیں کوئی امید دلاتا، کوئی جھوٹ بول دیتا، کوئی آس دلا دیتا۔'' میں نے اس کا ہاتھ اپنے میں لیتے ہوئے کہا تو اس نے میرے ہاتھ مضبوطی سے پکڑتے ہوئے جذباتی لہجے میں پوچھا۔

''کیا تم مجھے محبت کرنے سے روک سکتے ہو؟''

''میں کسی کی سوچ پر پہرے کیسے بٹھا سکتا ہوں ساوری مگر حقیقت کیا ہے؟ اسے جاننے کے بعد فیصلہ کرنا بھی ایک حقیقت ہے، دانش مندی ہے۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ اس کی گرفت میرے ہاتھوں پر مزید سخت ہوگئی۔ تبھی میں نے نرم سے لہجے میں کہا۔ ''تمہیں پتا ہے میں کن راہوں کا مسافر ہوں، میری کوئی منزل نہیں ہے۔ سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی، اب اگر میں چاہوں بھی تو ان راہوں سے پلٹ نہیں سکتا۔ پتا نہیں کب، کہاں، کس وقت زندگی ہار جاؤں، یہ بھی ایک حقیقت ہے۔''

میرے کہے ہوئے لفظوں کی گونج کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے بہت نرمی سے اپنے ہاتھ چھڑاتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

''میں تمہارے پاؤں کی زنجیر نہیں بننا چاہتی لیکن یہ بھی حقیقت ہے، مجھے کل بھی تم سے محبت تھی، آج بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔ نہ تم مجھے اپنی محبت سے روک سکتے ہو نہ میں خود کو۔''

''تو پھر سب کچھ وقت پر چھوڑ دو نا۔ وقت ہمارے لیے کیا لاتا ہے، اس کا انتظار ہم دونوں کریں گے۔'' میں نے کہا اور بڑی نرمی سے اس کا سر اپنے کاندھے پر رکھ لیا۔ وہ ایک دم سے رونے لگی۔ میں نے اسے رونے دیا۔ جو کالی

گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں، میں چاہتا تھا کہ وہ کُھل کر برس جائیں۔

☆☆☆

دن کا اُجالا پھیل رہا تھا۔ پرندے رزق کی تلاش میں نکل پڑے تھے۔ روہی کے سناٹے میں مال مویشیوں کی آوازیں جا بجا پھیلی ہوئی تھیں۔ ساوری اور رحماں کچن نما کمرے کے باہر ناشتا بنانے میں مصروف تھیں۔ میں وہیں ان کے پاس ایک پیڑھے پر جا بیٹھا۔ رحماں نے دودھ بلو لیا تھا۔ میرے بیٹھتے ہی اس نے ایک کٹورے میں لسی ڈال کر مجھے دے دی۔ میں ٹھنڈی لسی پی رہا تھا کہ سانول بھی وہیں آ گیا۔ تبھی ساوری نے کہا۔

''یہ روٹی اور لسی لے جا اور چھوٹو رام کو دے آ۔''

''لے مکھن بھی لے جا۔'' رحماں نے کہتے ہوئے مکھن والے برتن کی جانب ہاتھ بڑھایا۔ میں خاموش رہا۔ چاہے چھوٹو رام ہمارا دشمن تھا لیکن اس وقت ہمارے پاس تھا۔ بھلے قیدی تھا لیکن اسے کھانا تو دینا تھا۔ وہ چنگیر لے کر باہر نکل گیا۔ میں وہیں بیٹھ کر کھانے لگا۔ دونوں نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ مجھے تھوڑا سا عجیب لگا تبھی میں نے صرف ان سے بات کرنے کے لیے کہا۔

''ردھی کو بھی دے دو روٹی۔''

''تمہیں بڑا خیال ہے اُس کا۔ جب روٹی دینا ہوگی میں دے دوں گی، تم جاؤ جہاں جانا ہے، اپنا کام کرو۔'' ساوری نے بے پروائی سے کہا تو میں ہنس دیا۔ وہ بھی لبوں میں مسکرا رہی تھی۔

''وہ ہے کہاں دکھائی نہیں دے رہی؟'' میں نے جان بوجھ کر پوچھا۔

''رات اس کے ساتھ تھوڑی کھینچا تانی کی گئی ہے، میں نے اسے کپڑے دیے ہیں کہ نہا لے۔'' اس نے دھیمے سے بتایا۔ میں چاہتا تھا کہ اس سے تھوڑی دیر باتیں کروں لیکن وہاں رحماں بھی تھی اس لیے ناشتے کے بعد ڈیرے پر جانے کے لیے اٹھ گیا۔

ڈیرے پر خاموشی تھی۔ شاید سبھی کہیں گئے ہوئے تھے۔ چھوٹو رام ایک طرف بندھا ہوا میری طرف دیکھ رہا تھا۔ خالی برتن اس کے پاس پڑے تھے۔ میں ایک چارپائی پر بیٹھ کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وقت کتنا بدل گیا تھا۔ کبھی یہاں پر مظلوم لوگ یوں بندھے پڑے ہوتے تھے اور آج یہاں ظالم بندھے ہوئے ہیں۔ میں کچھ نہ بولا تو اس نے مجھے زور سے آواز دی۔

''علی، مجھے کھول دے، جانے دے مجھے۔''

''اگر ایسا نہ کروں تو؟'' میں نے اونچی آواز میں پوچھا۔

''میرا قبیلہ تیرا دشمن ہو جائے گا۔ میرے دوست تجھے نہیں چھوڑیں گے۔'' اس نے مجھے باقاعدہ دھمکی دیتے ہوئے کہا۔

''تم نے کہا اور میں ڈر گیا، بات ختم۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''بات اتنی نہیں علی، جانے دو۔'' اس نے پھر سرزنش والے انداز میں کہا۔

''دیکھو، اگر تیرے لوگوں میں اتنا دم ہوتا نا، تو وہ اب تک مجھ پر حملہ کر چکے ہوتے۔ اور سچ پوچھ تو...... میں تجھے لایا ہی اسی لیے ہوں۔ وہ جو بھی ہیں میرے سامنے آ جائیں۔'' میں نے اطمینان سے جواب دیا۔

''تمہیں کس کی تلاش ہے؟'' اس نے تیزی سے پوچھا۔

''میں اُسے خود سامنے لے آؤں گا۔'' میں نے بے پروائی سے کہا۔

''دیکھو، اگر مجھے معلوم ہوا تو میں بتا دیتا ہوں۔'' اس بار وہ نرم پڑتے ہوئے بولا تو میں نے اسی بے پروائی سے جواب دیا۔

''تمہیں چھوٹو رام، اب نہیں، تمہیں بستی والوں کے سامنے زندہ جلانا ہے۔ تم زیادہ سے زیادہ ایک پہر یا دوپہر کے مہمان ہو۔ میں تم سے اب کچھ نہیں پوچھوں گا۔'' میں نے کہا اور اٹھ کر گیٹ کی طرف جانے لگا۔ ابھی میں گیٹ تک نہیں پہنچا تھا کہ میرا فون بج اٹھا۔ اسکرین پر اجنبی نمبر تھے۔ میں نے کال ریسیو کی تو دوسری طرف سے کھنکناتی.... ہوئی مردانہ آواز ابھری، جس میں بے تکلفی سے زیادہ سختی تھی۔

''علی میاں بات کرت ہو؟''

''ہاں تو......'' میں نے اختصار سے کام لیا۔

''ہم بات کریں ہیں، راما کانت بیوپاری۔''

''کون راما کانت بیوپاری؟'' میں نے سمجھتے ہوئے بھی انجان بن کر پوچھا تو وہ کافی حد تک نرم لہجے میں بولا۔

''رات تم نے ہمارے لڑکے اور اس کے ملا جموں کو مارا، ان کے ساتھ بوہت جیاستی کی۔ تم نے لڑکی چھیننا تھی چھین لی، مال کو ڈاکو پڑ جاتے ہیں نا، کوئی بات نہیں، پر جو تم نے ان کی بے عزتی کی، وہ ٹھیک نہیں کیا تم نے۔''

''اب کیا کریں راما کانت جی، ہماری بات نہیں مانی انہوں نے۔ مان جاتے تو سکون سے بھیج دیتے، تیرے لڑکے نے کچھ زیادہ ہی بیوپاری بننے کی کوشش کی تو مار کھائی۔'' میں

نے بھی اسی اطمینان سے جواب دیا۔

’’اب سنا ہے تم نے چھوٹو رام کو بھی پکڑا ہوا ہے۔‘‘ اس نے بات بدلتے ہوئے کہا تو میں سکون سے بولا۔

’’ہاں نا، پکڑا ہوا ہے، ابھی کچھ دیر میں اسے زندہ جلا دوں گا، بس بندوبست ہو رہا ہے۔‘‘

’’ایسا نہیں کرو۔ سمجھ جاؤ۔ ہم کہتے ہیں اُسے چھوڑو، ہم سب کچھ بھول جائیں گے۔ چھوڑ دو اُسے۔‘‘ اس نے اسی نرم اور ٹھنڈے لہجے میں کہا۔

’’تمہاری بات مان کر میں اگر اسے زندہ چھوڑ دوں گا تو وہ پھر سے لڑکیاں بیچے گا۔ اسے سزا دوں گا تو پھر کم از کم اس علاقے میں کسی میں ہمت نہیں ہوگی ایسا کام کرنے کی۔‘‘ میں نے بھی اسی کے انداز میں ٹھنڈے اور نرم لہجے میں کہا۔

’’پھر تو بہت غلط ہو جائے گا۔ دیکھو ہمارا یہ بیوپار ہے اور ہم اپنے بیوپار کو ہر قیمت پر بچائیں گے۔ چھوٹو رام کو مارنے کا مطلب ہے تم نے ہماری دشمنی مول لے لی۔ تمہیں یہ بھی پتا ہونا چاہیے کہ پہلے تو بیوپاری دشمنی لیتے نہیں اور اگر ان کے بیوپار پر بات آجائے تو دشمنی سے بھی آگے نکل جاتے ہیں۔ میری بات سمجھ رہے ہو کیا؟‘‘ اس نے دبے دبے غصے میں کہا۔

’’تم دشمنی میں کہاں تک جاتے ہو، مجھے اس سے غرض نہیں، تم جہاں تک جانا چاہتے ہو چلو میں نہیں روکتا تمہیں۔ ہاں مگر میں اپنے علاقے میں عورتوں کا بیوپار نہیں ہونے دوں گا۔ یہ طے ہے راما کانت جی۔‘‘ میں نے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔

’’مطلب تم نہیں مانو گے؟‘‘ اس نے حتمی لہجے میں پوچھا۔

’’میں تو مان رہا ہوں کہ عورتوں کا بیوپار اب نہیں ہوگا۔‘‘ میں نے سخت لہجے میں کہا تو دوسری جانب خاموشی چھا گئی۔ چند لمحے یونہی خاموشی رہی پھر وہ کافی ملائم لہجے میں بولا۔

’’دیکھ، میں مانتا ہوں کہ اب اس علاقے پر تمہاری اجارہ داری ہے۔ بول کیا لے گا، تاکہ ہم اس علاقے میں اپنا بیوپار جاری رکھ سکیں۔‘‘

’’تمہاری کوئی بیٹی، یا بہو ہے تو وہ مجھے بیچ دے پھر سوچوں گا۔‘‘ میں نے سخت غصے میں کہا لیکن اس وقت مجھے انتہائی حیرت ہوئی جب وہ بڑے ہی نرم لہجے میں طنزیہ انداز میں بولا۔

’’جب تم ہماری بیٹی بہو خریدو گے تو اس مطلب تم بھی بیوپاری بن گئے۔ آؤ پھر ڈیل کر کرتے ہیں بیوپار، رواج کے مطابق بہو تو بکتی نہیں، بیٹی کا سودا کرو گے تو آؤ، کرتے ہیں بیوپار۔‘‘

’’بہت بے غیرت ہو یار تم۔‘‘ میں نے بھنا کر کہا تو وہ ہنستے ہوئے بولا۔

’’اگر غیرت ہوتی تو یہی بیوپار کرتے۔ اب چپ چاپ اپنی قیمت بتاؤ اور چھوٹو رام کو چھوڑ دو۔ اگر اُسے کچھ ہو گیا تو سمجھو ہماری اور تمہاری دشمنی شروع ہو جائے گی، بتائے دے رہے ہیں۔‘‘

’’مجھے تو مارنا ہے چھوٹو رام کو، تم اگر روک سکتے ہو تو روک لو، ٹھیک گیارہ بجے۔‘‘ میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا تو وہ تیزی سے بولا۔

’’ٹھیک ہے۔ ہم کرتے ہیں کچھ۔‘‘

اُس نے کال ختم کردی۔ میں نے سیل فون جیب میں

ڈال لیا۔ اس وقت تک میں گیٹ پر آ گیا تھا۔ میں نے دیکھا کچھ فاصلے پر جہانگیر لوگ کھڑے تھے۔ ان کے پاس بختاور اپنی بائیک لیے کھڑا تھا۔ شاید وہ ابھی یہاں آیا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ سب میری طرف آنے لگے۔ چند منٹ بعد جب وہ ڈیرے پر آ کر چارپائیوں پر بیٹھے تو میں نے انہیں راما کانت کے فون کے بارے میں بتایا۔

''وہ اپنے ٹھکانے پر بیٹھ کر بات کر رہا ہے نا، جب سامنے آئے گا تو دیکھا جائے گا۔'' بختاور نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔

''کیا کرنا ہے اس چھوٹو رام کا؟'' جہانگیر نے پوچھا۔

''اسے ساری بستی کے سامنے زندہ جلانا ہے۔'' میں نے کہا تو چھوٹو رام نے رحم طلب نگاہوں سے میری جانب دیکھا، میں نے اسے نظرانداز کرتے ہوئے بختاور سے کہا۔ ''تم جاؤ نا، بستی والوں کو اکٹھا کرو۔''

''جاتا ہوں۔ اتنی جلدی کس بات کی ہے۔'' وہ میری بات سمجھتے ہوئے بولا تو چھوٹو رام تیزی سے بولا۔

''میں مانتا ہوں میری تم لوگوں سے دشمنی رہی ہے۔ بس ایک بار معاف کر کے دیکھ لو۔ میں تم لوگوں کے بڑے کام آؤں گا۔''

تیر نشانے پر لگتا ہوا دیکھ کر بختاور نے بے پروائی سے پوچھا۔ ''مثلاً، کیا کام آؤ گے؟''

''میں راما کانت کے بارے میں معلومات دے سکتا ہوں اور......'' اس نے کہنا چاہا تو بختاور اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

''وہ جب آئے گا نا سامنے تو اس کی ساری جنم کنڈلی نکل آئے گی۔ تیری جو سزا ہے، وہ تجھے مل کر رہے گی۔''

''تم لوگ اس کی پہنچ تک نہیں پہنچ سکتے بختاور۔ میں تو مر جاؤں گا، کوئی بات نہیں لیکن وہ بیوپاری ہے، ایک ایک ٹکے کا حساب رکھتا ہے، اپنا ایک ٹکا وصول کرنے کے لیے کتنے ہی روپے... خرچ کرنا پڑیں، وہ کر دے گا۔ وہ خود لڑنے بھی نہیں آئے گا، مگر سازش ضرور کرے گا، ایسی سازش جس کا تم لوگ مقابلہ نہیں کر سکتے۔'' چھوٹو رام نے معلومات دینے کی کوشش کی۔

''یار وہ جو کرے گا سو کرے گا، تیرا کام پہلے نہ کر دوں، تیری اوقات تو اتنی ہے کہ تیری بستی کا کوئی تجھے لینے نہیں آیا۔ کسی نے تیرے بارے میں پوچھا تک نہیں، راما کانت کا نام لے کر تو ہمیں ڈرا رہا ہے۔'' آفتاب نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے غصے میں کہا تو وہ سر جھکا کر بیٹھ گیا پھر کچھ دیر بعد بولا۔

''وہ لوگ ڈرے ہوئے ہوں گے تم لوگوں سے۔''

''اچھا ہے نا مزید ڈر جائیں، تیرا جیسا کوئی پیدا نہ ہو ان میں۔'' آفتاب نے نفرت سے کہا تو وہ بالکل ہی مایوس ہو گیا۔

''اوئے ایک بات بتا، تو ہے یہاں کا، اسی بستی میں پیدا ہوا۔ یہیں پلا بڑھا لیکن تیرا پاسپورٹ بھارتی ہے، یہ کیا چکر ہے؟'' مدثر نے ایک دم سے پوچھا تو اس نے مردہ سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''بہت کچھ کرتا رہا ہوں وہاں پر۔ بس اب چھوڑ دینا چاہتا تھا۔ اُدھر جا کر بسنا چاہتا تھا۔ کبھی دوبارہ نہ آنے کے لیے۔''

''چل ٹھیک ہے، اب یہ تیری قسمت کہ تو اب کہیں نہیں جا سکے گا، تیرا انتم سنسکار اِدھر ہی ہو گا۔'' جہانگیر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ایک بات کہوں اگر آپ مان لیں تو؟'' چھوٹو رام نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ جسے سن کر میں چونک گیا۔ مجھے لگا جس وجہ کے لیے میں اسے زندہ جلانے کی دھمکی دے رہا تھا، شاید اب وہی بات بتا دے۔

''بولو گے تو معلوم پڑے گا۔'' میں نے تیزی سے کہا۔

''دیکھو مجھے مارنا ہے تو بھلے مار دو لیکن اگر تم لوگوں نے راما کانت کا زور دیکھنا ہے تو مجھے شام تک مت مارو، رات کو مار دینا، تم مجبور ہو جاؤ گے مجھے نہ مارنے کے لیے، یہ تماشا بھی دیکھ لیں۔'' اس نے اسی عجیب لہجے میں کہا۔

''یہ کیا کہہ رہے ہو؟'' بختاور نے حیرت سے پوچھا۔

''بختاور، تم جانتے ہو کہ اِدھر سے اُدھر کیسے آیا جاتا ہے، اس میں سو کام ہوتے ہیں، یہ بات تم بھی جانتے ہو۔ راما کانت کی رسائی بہت دور تک ہے۔ وہ بڑے کام کا بندہ ہے۔'' چھوٹو رام نے کہا تو بختاور نے غصے میں کہا۔

''چل اب دھمکیاں دینا بند کر، میں نے سوچا کچھ کام کی بات کرے گا۔''

چھوٹو رام پر مردنی چھا گئی تھی۔ وہ ہمیں ڈرانا چاہتا تھا لیکن نہیں ڈرا پا رہا تھا۔ مجھے راما کانت کے بارے میں پوری معلومات نہیں تھی۔ میں چاہتا تھا کہ چھوٹو رام مجھے اس کے بارے میں بتائے لیکن وہ ہر بار طرح دے جاتا۔ میں نے بڑے نرم لہجے میں کہا۔

''چل تجھے شام تک نہیں مارتے۔ اگر کچھ نہ ہوا تو پھر

تجھے مارنا بنتا ہے نا کہ نہیں؟ تو خود بتا؟"

"ٹھیک ہے پھر مجھے مار دینا مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" اس نے کافی حد تک حوصلہ مند لہجے میں کہا تو مجھے فکر لاحق ہوگئی۔ میں اٹھا اور رہائشی علاقے کی طرف چلا گیا۔ کمرے میں جا کر میں نے زمان موہل کا نمبر ملایا۔ وہ جیسے میرے فون ہی کا منتظر تھا۔ فوراً کال ریسیو کرتے ہی بولا۔

"چھوٹو کو مارا نہیں ہے اب تک؟"

"ابھی تک تو نہیں مارا۔ کیوں، تم کیوں پوچھ رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"تمہیں راما کانت نے فون کیا تھا؟" اس نے جواب دینے کے بجائے سوال کر دیا تو میں نے اسے بتاتے ہوئے پوچھا۔

"بات کیا ہے؟"

"اصل میں تمہارا اب تک اس بندے سے واسطہ نہیں پڑا۔ یہ ہے تو راجھستانی لیکن بہت عرصے سے ادھر کام کر رہا ہے۔ اب بھی اس کا کام دونوں طرف ہے۔ عورت سے لے کر منشیات تک، اغوا سے لے کر قتل تک سارے کام کرتا ہے۔ میں حیران ہوں کہ اب تک اس نے پلٹ کر وار کیوں نہیں کیا؟"

"جتنی میں نے اُس کے بیٹے اور اس کے بندوں کی ایسی کی تیسی کر دی ہے، اسے اب تک وار کر دینا چاہیے تھا۔" میں نے حیرت سے کہا تو بولا۔

"نہیں کیا، یہی تو اصل بات ہے۔ وہ بہت ٹھنڈا دشمن ہے۔"

"اچھا چل جتنا بھی ٹھنڈا دشمن ہے، وہ اپنی جگہ رہے، ابھی مجھے یہ بتاؤ کہ تم اس سے ملے ہو کبھی؟ کہاں ہے اس کا ٹھکانا؟ اس کے بارے میں ساری معلومات دو۔" میں نے کہا تو وہ خوف زدہ ہوگیا۔

"بات سن علی، سمجھو وہ بھڑوں کا چھتا ہے۔ ایک بار ہاتھ ڈالو گے تو جان چھڑانا مشکل ہو جائے گی۔ اس کی آر پار بہت بنی ہوئی ہے۔ اور......" اس نے مزید کہنا چاہا لیکن میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"مجھے ڈراتے رہو گے یا بتاؤ گے؟"

"یہاں سے کوئی دس بارہ کلومیٹر کے فاصلے پر ایک بستی ہے، سندر بستی، وہ بستی انہی کی ہے... اور ارد گرد کا بہت علاقہ، سمجھو انہی کا ہے۔ وہیں قاتل، ڈاکو، لٹیرے اور کئی مجرم بستے ہیں۔ آج تک نہ انہوں نے کسی کو چھیڑا ہے اور نہ کسی نے انہیں۔ بس وہ جو کام کرتے ہیں، کرتے چلے جا رہے ہیں۔ میرن شاہ کا ان کے ساتھ لینا دینا تھا۔ وہ ان کے ساتھ کام کرتا تھا۔" زمان موہل نے ایک سرسری کا خاکہ میرے سامنے رکھ دیا۔

"وہاں کوئی سورس مل سکتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ ممکن ہی نہیں، اب تک یہی ان کی کامیابی ہے، وہاں کوئی غدار نہیں رہ سکتا، جس پر شک بھی ہوا، وہ اسے مار دیتے ہیں۔" اس نے تیزی سے بتایا۔ میں کچھ دیر تک مزید اس سے باتیں کرتا رہا پھر فون بند کر دیا۔

ایک دم بے چینی سے میرے اندر ہلچل ہونے لگی۔ ایسا کوئی راما کانت کے بارے میں معلومات لینے سے نہیں ہوا تھا کہ وہ کتنا طاقت ور ہے بلکہ مجھے افسوس ہونے لگا تھا کہ رات میں نے اس کے بیٹے کو کیوں چھوڑ دیا۔ میں انہیں بے ضرر سا بیوپاری سمجھا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ ایک ریکٹ ہے۔ اب جو کچھ تھا، اسے ختم کرنا تھا۔

☆☆☆

شام کے سائے پھیل گئے تھے۔ میں گوپے پر کھڑا سورج غروب ہونے کا نظارہ کر رہا تھا۔ میں نے دوپہر کے وقت چاچا سائیں سے پوری مشاورت کی تھی۔ ان سے بات کر کے مجھے کافی کچھ ایسا سننے کو ملا تھا جس سے میں بہت کچھ کر سکتا تھا۔ چاچا سائیں نے مجھ سے کہا تھا۔

"پتر، دنیا کے جس خطے پر بھی انسان آباد ہے نا، وہاں اگر محبت ہے بھائی چارہ ہے، سکون ہے تو وہیں پر قتل و غارت گری بھی ہے۔ نفرت اور دشمنی بھی اسی طرح موجود ہے۔ کیونکہ یہ سب انسان کی سرشت میں شامل ہے لیکن ایسا بھی نہیں ہے۔ جہاں سوچ پختہ ہو، انسان کسی دوسرے کی زندگی میں دخل نہ دیں، لالچ نہ کریں تو وہ خطہ پھر بھی رہنے کے قابل ہوتا ہے۔"

"لیکن میں راما کانت کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"وہی نا، ہم یہاں نجانے کب سے رہ رہے ہیں، ہمارے آباؤ اجداد بھی یہاں آکر بسے تھے، ہماری طرح دوسرے لوگ بھی آئے، کبھی کسی میں بھائی چارہ رہا، تو کبھی دشمنی، کوئی چلا گیا، کوئی یہیں ہے اور نئے لوگ بھی آکر آباد ہو سکتے ہیں، یہ سلسلہ چلتا رہا ہے اور چلتا رہے گا۔ راما کانت کے آباؤ اجداد بھی یہیں ہیں، ان کا بیوپار نجانے کب سے... راجھستان کے ساتھ ہے۔ وقت کے ساتھ اگر مشکلیں بڑھی ہیں تو آسانیاں بھی تلاش کر لی گئی۔"

"لیکن یہ بیوپار، کس قدر گھناؤنا ہے؟" میں نے

نفرت سے کہا۔

''میرا تو خیر نہیں لیکن میرے بڑوں کا اسی پر اختلاف رہا ہے۔ ہم نے انہیں اسی لیے قریب نہیں آنے دیا۔ سچی بات ہے، ہمیں ڈر بھی تھا۔ سب سے بڑا ڈر تو میرن شاہ اور پیروزاں کی دشمنی تھی۔'' چاچا سائیں نے دھیمے لہجے میں کہا تو میں نے پوچھا۔

''میں نہیں جانتا کہ ان کی کمزوریاں کیا ہیں، میں انہیں کیسے ختم کر پاؤں گا، لیکن مجھے ختم کرنا ہے انہیں، بتائیں کیا کروں؟''

''میں تمہیں بتاتا ہوں، سکون سے سنو۔'' چاچا سائیں نے کہا اور پھر پوری تفصیل سے مجھے راما کانت اور اس کے قبیلے کے بارے میں بتاتا رہا۔ ان کے کام کرنے کا اسٹائل کیا تھا، کن قبائل سے ان کا تعلق ہے، کن سے بیوپار ہے اور وہ کیا اور کیسے کرتے ہیں۔ میں کیا کر سکتا تھا اور کیا کچھ ممکن تھا، سب پر تفصیل سے بات ہوئی تھی۔ پھر میں نے سوچ لیا کہ مجھے کرنا کیا ہے۔

جہانگیر، مدثر اور آفتاب کے ساتھ بختاور بالکل تیار تھا۔ شعیب کو میں نے پیچھے ڈیرے پر سیکیورٹی کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ مجھے اس پر اعتماد تھا۔ میں کچھ دیر وہیں کھڑا رہا پھر پلٹ کر چارپائیوں کے پاس آگیا۔ چھوٹو رام کو میں ساتھ اٹھا لایا تھا۔ میں اس کے بالکل قریب بیٹھا تھا۔ اس کی طرف دیکھتا رہا پھر بڑے سرد لہجے میں پوچھا۔

''دیکھ بھئی چھوٹو، ہم نے تیری بات مان لی، تجھے دوپہر تک نہیں مارا، شام ڈھلنے کو ہے، اب بتا تیرے ساتھ کیا کریں۔''

''جو مرضی کرلیں، اب مجھے پتا چل گیا کوئی میرے لیے نہیں آئے گا۔'' اس نے بے بسی سے کہا۔

''ایک رسک ہے، اس سے تم بچ بھی سکتے ہو۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو زندگی کی رمق پا کر وہ فوراً بولا۔

''کیا کرنا ہوگا مجھے؟''

''ہمیں ان کے ٹھکانے تک لے چل۔'' میں نے آفر دی۔

''میں لے تو جاؤں مگر وہاں سے بچ کر آنا مشکل ہے۔'' اس نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

''تو بتا دے بس آگے ہماری......'' لفظ میرے منہ ہی میں تھے کہ مدثر نے تیز لہجے میں ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اوئے علی وہ دیکھ......''

میں نے اس کے اشارے... کی سمت میں دیکھا تو وہاں غبار اٹھ رہا تھا۔ چار پانچ گاڑیاں تیزی سے آرہی تھیں۔ اگرچہ ڈوبتے ہوئے سورج میں وہ سارا منظر صاف نہیں تھا لیکن مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ جو کوئی بھی ہیں، وہ اچھے تیور نہیں رکھتے۔ گاڑیاں بھاگتی ہوئی اسی انداز میں آرہی تھیں۔

''شعیب کو بتادے۔'' میں نے تیزی سے کہا۔ ہم سب پھیل کر ان کی گھات میں بیٹھ گئے۔ ہم اگر خود کو پوری طرح چھپا بھی لیتے لیکن ہماری گاڑیاں گوپے کے باہر ہی کھڑی تھیں۔ ایک لمحے میں اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ یہاں کوئی ہے۔ وہی ہوا، چند لمحوں بعد وہ گاڑیاں بالکل گوپے کے سامنے آن رکیں۔ وہ گاڑیاں کچھ دیر تک ویسے ہی کھڑی رہیں، ان میں سے کوئی نہیں اترا۔ وہ کون ہیں، ہو سکتا ہے وہ راما کانت کے لوگ نہ ہوں؟ میں اس وقت اوٹ میں کھڑا ایک جھری سے باہر دیکھ رہا تھا۔ میں نے چھوٹو رام کو اشارہ کرتے ہوئے دھیمے سے کہا۔

''چل جا انہیں دیکھ، کون ہیں؟''

میں یہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر چھوٹو رام ان کے ساتھ جا کر مل بھی گیا تو کون سے پہلے کم لوگ تھے، ایک یہ بھی سہی لیکن یہ یقین ہو جاتا تھا کہ وہ راما کانت کے لوگ ہیں۔ چھوٹو رام آہستہ قدموں سے چلتا ہوا گوپے کے تھڑے سے نیچے اترا اور پھر گاڑیوں تک چلا گیا۔ وہ جس جیپ کے پاس پہنچا، اس کا شیشہ اترا تو اس میں بیٹھا ہوا شخص مجھے دکھائی نہیں دیا۔ اندھیرا ہو گیا تھا۔ چھوٹو سے اس کی جو بھی بات ہوئی لیکن اس کا ردِعمل بڑا سخت نکلا۔ چھوٹو کے بات کرنے کے ساتھ ہی گاڑی کا سن روف کھلا اور گوپے کی طرف گولیوں کی بوچھاڑ ہو گئی۔ ایک زبردست برسٹ نے طبلِ جنگ بجا دیا تھا۔ فائرنگ کی آواز سے سناٹا دہشت ناک بن گیا۔ فوراً ہی پچھلی جیپ سے بھی ایسی ہی فائرنگ... ہونے لگی۔ چھوٹو رام ان کے ساتھ جیپ میں جا بیٹھا تھا۔ ایسا ہی ہونا تھا۔ مجھے پوری طرح یقین تھا کہ گوپے پر صرف میں ہوں باقی چاروں وہاں نہیں تھے۔ اگر انہوں نے فوراً ہی اسلحے کی نمائش کر دی تھی تو ہمارے پاس کون سا کم تھا۔ میں پوری تیاری سے گیا تھا کہ مجھے راما کانت کی سندر بستی جانا تھا لیکن وہ خود ہی چل کر آگئے تھے۔ میں نے فون نکالا اور جہانگیر کو فون کیا۔

''ہاں کیا صورتِ حال ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بس ایک آدھ منٹ گوپے کی طرف متوجہ رکھو انہیں، باقی میں سنبھال لوں گا۔'' اس نے تیزی سے کہا تو میں نے پوچھا۔

''تم دیکھ رہے ہو کتنی گاڑیاں ہیں؟''

''چار ہیں۔'' اس نے کہا اور پھر جواب نہیں دیا لیکن مجھے آوازیں آرہی تھیں۔ میں نے فون جیب میں ڈال لیا اور ایک دم سے برسٹ مارا اور اگلے ہی لمحے اپنی جگہ بدل لی۔ پھر وہاں سے برسٹ مارا، پھر جگہ بدل لی۔ اس کے ساتھ ہی جو فائرنگ ہوئی، وہ ماحول کو دہلا دینے والی تھی۔ بیک وقت چار پانچ گنز سے فائر ہونے لگے تھے۔ مجھے منٹوں کا نہیں لمحوں کا انتظار تھا اور پھر ویسا ہی ہوا۔ اچانک یکے بعد دیگرے چار زوردار دھماکے ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی چیخیں بلند ہوئیں۔ میں نے واپس اپنی جگہ پر آکر دیکھا گاڑیاں آگ میں جل رہی تھیں۔ ان میں سے لوگ تیزی سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے گن کی نال اس جھری میں رکھی اور فائر کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی چاروں جانب سے فائر ہونے لگے۔ مدثر کا دیا ہوا پلان کامیاب ہو گیا تھا۔

دوپہر کے وقت جب ہم پلان کر رہے تھے، مدثر ہی نے ایک آپشن دیا تھا کہ اگر گوپے پر اچانک ہمیں دبوچ لیا جائے تو ہم کیا کر سکتے ہیں؟ تبھی جہانگیر نے جواب دیا تھا کہ پھر گوپے پر کوئی نہ رہے۔ گوپے سے باہر آکر فائرنگ کرے یا پھر ہینڈ گرینیڈ سے فوراً ہی ان کی گاڑی تباہ کی جائے۔ اس وقت اور دوسری باتوں کے ساتھ یہ بڑی بے ضرر سی بات لگی تھی لیکن مدثر نے پوری تفصیل سے پلان دیا تھا کہ اگر ایسی کوئی صورتِ حال بن جائے تو ہمیں کیا کرنا ہوگا، وہی پلان کام آیا۔ جہانگیر سمجھ گیا تھا کہ کیا کرنا ہے۔ جیسے ہی یہ یقین ہو گیا کہ حملہ آور نے فائرنگ کر کے طبلِ جنگ بجا دیا ہے تو وہ تینوں گوپے سے ہٹ گئے۔ انہوں نے پکی سڑک پر کھڑی گاڑیوں تک ہینڈ گرینیڈ پھینک دیے۔ جیسے ہی وہ گرینیڈ پھٹے، انہوں نے فائرنگ شروع کر دی۔ ایک دو منٹ میں وہاں کا ماحول یکسر بدل کر رہ گیا تھا۔

اب وہ گوپے کا رخ نہیں کر سکتے تھے۔ اگر کرتے بھی تو بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت تھی۔ دوسری طرف وہ چار تھے۔ وہ بلاوجہ فائرنگ کر کے اپنے رخ کی نشاندہی نہیں کر سکتے تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہاں سے بھاگ کر کئی لوگ چھپنے کی کوشش کرتے۔ جو کچھ کرنا تھا، تیزی سے کرنا تھا۔ فون ابھی تک چل رہا تھا۔ میں نے دو تین بار جہانگیر کو آواز دی تو اس نے کہا۔

''کافی حد تک ان کا نقصان ہو گیا ہے، لوگ بھاگ رہے ہیں۔''

''مگر کسی کو جانے نہیں دینا، یہ بعد میں خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔'' میں نے تیزی سے کہا تو وہ بولا۔

''فائرنگ کرتا ہوں تو ہمارے بارے میں پتا چل جائے گا۔''

''اچھا میں انہیں انگیج کرتا ہوں، جو فائر کرے اسے اڑا دو۔'' میں نے کہا اور سامنے کی طرف دیکھا۔ میں نے فائر کیا، پھر دوسرا کیا۔ سامنے سے کسی نے جوابی فائر نہیں کیا۔ میں نے برسٹ مارنا چاہا لیکن میگزین خالی ہو چکا تھا۔ میں اس وقت میگزین لگا رہا تھا، جب سامنے سے فائرنگ ہوئی۔ میں جوابی وار کی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ میں وہاں سے جگہ بدل کر گوپے کے تھڑے پر آ گیا۔ وہاں سے دائیں جانب دیوار کے ساتھ ساتھ آگے بڑھا۔ میرے سامنے سارا منظر واضح تھا۔ دو افراد گوپے کی پچھلی جانب بڑھ رہے تھے۔ یہ بہت خطرناک بات تھی، میں نے انہیں نشانے پر رکھا اور اور برسٹ مار دیا، وہ چیختے ہوئے وہیں ڈھیر ہو گئے۔ چند لمحے ٹھہر کر میں نے ایک ہینڈ گرینیڈ نکالا، اس کی پن کھینچی اور گاڑیوں کی جانب اچھال دیا، گرتے ہی چند لمحے بعد ایک دھماکا ہوا۔ لمحے سے بھی کم وقت میں روشنی ہوئی، اس میں کئی لوگ بے بس پڑے ہوئے نظر آئے۔ ان کا کافی حد تک نقصان ہو چکا تھا۔ تبھی میں نے زوردار انداز میں کہا۔

''صرف دو منٹ ہیں۔'' یہ کہہ کر میں نے جگہ بدل دی۔ مجھے اندازہ تھا کہ فائر ہوگا، لیکن نہیں ہوا۔ تبھی میں نے کہا۔ ''اپنے سر پر ہاتھ رکھ کر گوپے سے باہر آجاؤ۔ ورنہ کوئی نہیں بچے گا۔'' اس کے ساتھ ہی میں نے جگہ چھوڑ دی۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ فوراً ہی ایک برسٹ پڑا۔ اس کا مطلب تھا وہ ہار ماننے والے نہیں تھے اور آخری دم تک لڑنے والے تھے۔ مجھے اندازہ تھا کہ جہانگیر وغیرہ بھی چھپ گئے ہوں گے، سامنے اندھیرا تھا۔ کسی پر نشانہ تو لگا نہیں سکتے تھے۔ ایسے ہی اندھا دھند وار کرنا تھا۔ جونہی میں نے برسٹ مارا، کئی اطراف سے بھی برسٹ آئے۔ بلاشبہ یہ جہانگیر لوگوں نے مارے تھے۔ انہی لمحات میں میرا فون بج اٹھا۔ شعیب کی کال تھی جیسے ہی میں نے ریسیو کیا، وہ بولا۔

''فون کہاں انگیج تھا؟''

''چھوڑو، یہاں......'' میں نے کہنا چاہا تو وہ تیزی سے بولا۔

’’ہاں مجھے مدثر نے بتایا، میں پہنچ رہا ہوں بس دو چار منٹ میں، تم انہیں سنبھالے رہو۔‘‘ اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

اگلے چند منٹ میں ہمارے درمیان دوبارہ فائرنگ کا تبادلہ ہوا پھر ایک دم سے روشنی ہو گئی۔ بالکل گوپے کے قریب پہنچ کر شعیب نے گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس روشن کی تھیں۔ حملہ آوروں کی چاروں جیپیں بری حالت میں مجھے دکھائی دے رہی تھیں۔ شعیب نے اپنی گاڑیاں بالکل ان کے قریب لا کر کھڑی کی تھیں۔ یوں جیسے انہیں گھیر لیا گیا ہو۔ سامنے کافی روشنی تھی۔ تبھی شعیب کی آواز گونجی۔

’’کوئی فائر نہ کرے، ورنہ مارے جاؤ گے۔‘‘ آواز کی بازگشت میں کچھ بھی نہ ہوا تو وہ پھر بولا۔ ’’اپنے سر پر ہاتھ رکھ کر باہر نکل آؤ، کچھ نہیں کہیں گے۔‘‘

چند لمحوں بعد ایک شخص سر پر ہاتھ رکھے کچے راستے کے کنارے پر آ کھڑا ہوا۔ پھر ایک کے بعد ایک کر کے تین بندے باہر آ گئے۔ اس کے ساتھ ہی زخمیوں کی آہ و بکا ابھرنے لگی۔ ان میں سے کچھ زخمی بھی باہر آ گئے۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد وہاں کی صورتِ حال سامنے آ گئی۔ وہ کل اٹھارہ افراد آئے تھے، ان میں سے پانچ بالکل ٹھیک تھے۔ سات زخمی تھے اور باقی چھ مر چکے تھے۔

’’ان ساتوں کو باندھو اور اسپتال لے جاؤ، اگر کوئی بچ گیا تو بچ جائے۔‘‘ میں نے بستی کے ایک شخص اللہ دین سے کہا۔

وہ زخمیوں کی جانب بڑھا ہی تھا کہ ایک شخص بولا۔

’’ہمارے زخمی ہمیں دے دو۔ ہم واپس لے جائیں گے۔‘‘

’’تمہیں جانے کون دے گا؟‘‘ میں نے سرد لہجے میں کہا پھر اپنے لوگوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ ’’ان کو باندھو اور لے آؤ ڈیرے پر۔‘‘

’’اوئے وہ چھوٹو رام کدھر ہے؟‘‘ جہانگیر نے تجسس سے پوچھا۔

’’وہ مر گیا ہے، وہ دیکھو وہ پڑا۔‘‘ آفتاب نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس کے منہ سمیت آنکھیں بھی کھلی ہوئی تھیں۔

وہ پانچوں میرے سامنے کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے لیکن ان کی گردن اب بھی اکڑی ہوئی تھی۔

’’مجھے معلوم ہے کہ کس نے تم لوگوں کو یہاں بھیجا ہے، لیکن پھر بھی تم سے سننا چاہتا ہوں، بولو، کس نے بھیجا ہے؟‘‘ میں نے سرد لہجے میں پوچھا تو ان میں سے ایک نے کہا۔

’’راما کانت جی۔‘‘

’’بالکل درست، لیکن کس لیے؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’تم میں جو علی ہے، یا اس کے جو دوست ہیں یہاں..... انہیں مارنے آئے ہیں۔‘‘ اس نے صاف گوئی سے کہا جو مجھے اچھا لگا۔

’’تو پھر نہیں مرے نا، اب کیا کرو گے؟‘‘ میں نے یونہی پوچھا۔

’’جو تمہارا من چاہے۔ مجھے لگتا ہے علی تم ہی ہو؟‘‘ اس نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

’’ہاں میں ہی ہوں۔ مجھے تمہارا جواب دینا اچھا لگا۔‘‘ یہ کہہ کر میں نے ایک دم سے پوچھا۔ ’’کیا راما کانت نے یہ سمجھا کہ ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے یونہی بیٹھے ہوں گے۔ تم لوگ آؤ گے اور مار کر چلے جاؤ گے؟‘‘

’’آج تک اس روہی میں ہمارے سامنے کوئی سر نہیں اٹھا سکا۔ ہم کسی پر وار نہیں کرتے لیکن جو ہمارے راستے میں آتا ہے، پھر وہ بچتا نہیں۔‘‘ اس نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

’’میں ہمت والے لوگوں کی قدر کرتا ہوں، مجھے تم لوگوں کے کسی بھی دھندے سے کوئی لینا دینا نہیں، بس یہ عورتوں والا دھندا...... یہ نہیں۔ راما کانت مان جاتا تو شاید ہم اسے معاف کر دیتے۔‘‘ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

’’وہ دھندا تو ہم کریں گے، ہمیں کوئی نہیں روک سکتا، اس کی چنتا مت کرو، ہاں اگر تم ہمت والوں کی قدر کرتے ہو تو ایک بات کہوں؟‘‘ اس نے اعتماد سے کہا۔

’’بولو کیا کہنا چاہتے ہو؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’علی، گن سے تو کوئی بھی فائر کر سکتا ہے۔ جو پہلے وار کر گیا، وہی جیت گیا۔ ہمت تو ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر دکھائی جاتی ہے، آؤ میرے ساتھ ہاتھ میں ہاتھ ڈالو، میں ہار گیا تو مجھے فوراً مار دینا، جیت گیا تو مجھے اپنے ساتھیوں سمیت جانے دینا۔‘‘ اس نے چیلنج دینے والے انداز میں کہا۔

’’تمہارا یہ شوق بھی پورا کر دیتا ہوں۔‘‘ میں نے گن ایک طرف رکھتے ہوئے کہا تو شعیب تیزی سے بولا۔

’’علی یہ وقت نہیں ایسے تماشا دکھانے کا، ابھی یہ تو......‘‘

"نہیں مجھے اس کی بات تو اب رکھنی ہے، کوئی ہمارے قریب نہیں آئے گا، بھلے یہ مجھے مار دے۔" میں نے کہا اور اٹھ کر اس کے سامنے آ گیا۔

اس کے ہاتھ کھلے ہوئے تھے۔ مجھے اس لمحے کا انتظار تھا جب وہ پینترا لیتا۔ یہیں مجھے سمجھنا تھا کہ وہ لڑنے میں ماہر ہے یا نہیں، اگر لڑنے میں ماہر ہے تو کس طرح کی فائٹ میں مہارت رکھتا ہے، وہ میری نگاہوں میں تھا۔ اچانک اس نے لڑنے کے لیے پینترا بدلا، اس نے اپنے ہاتھوں اور پیروں کو جس طرح جنبش دی، میں سمجھ گیا، اس کا انداز فری اسٹائل کشتی والا تھا۔ میں لمحے کے ہزارویں حصے میں سمجھ گیا کہ اسے خود پر ناز کیوں تھا۔ یہاں دور دور تک کوئی اس کے مقابلے کا نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ اپنی عقابی آنکھیں میری آنکھوں میں ڈالے مجھ پر جھپٹنے کے لیے تیار تھا۔ اچانک وہ ایک قدم آگے بڑھا اور اس نے اپنی کلائی سے میری گردن پر وار کیا۔ ظاہر ہے اس کے لیے اسے تھوڑا سا جھکنا پڑا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور نیچے سے گردن نکالی۔ تبھی اس نے اپنی کلائی چھڑوانا چاہی۔ لیکن اب وہ کلائی میرے ہاتھ میں آ چکی تھی۔ دیسی کشتی والے اپنے ایکس داؤ میں ایک داؤ یہی سکھتے ہیں کہ کلائی پکڑ کر پھر کیا کرنا ہوتا ہے۔ فنِ پہلوانی میں مدِمقابل کا رویہ ہی ہار جیت کا فیصلہ کرتا ہے۔ اس کی کلائی جیسے ہی میرے ہاتھ میں آئی تو اس کے بدن نے لاشعوری طور پر وہی جنبش لی جو وہ چاہتا تھا۔ وہ مجھے اپنی طرف کھینچنا چاہتا تھا۔ اس نے کلائی پکڑ کر پیچھے کی طرف زور لگایا، یہ طاقت آزمائی تھی۔ میں نے اس کی کلائی چھوڑتے ہوئے اسے دھکا بھی دے دیا۔ اس کے پاؤں اکھڑ گئے، وہ لڑکھڑا گیا۔ میں چاہتا تو اسے یہیں زمین بوس کر دیتا، لیکن میں اس کی 'چاہت' پوری کرنا چاہتا تھا۔

وہ دوبارہ میرے سامنے تن کر کھڑا ہوا۔ لیکن اس کی جنبش بدن (باڈی لینگوج) بتا رہی تھی کہ وہ حیرت زدہ ہے۔ اس نے جو سوچا ہے، ویسا نہیں تھا۔ اس کی سوچ میں دراڑ پڑ گئی تھی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں بھی لڑنے بھڑنے کے فن میں مہارت رکھتا ہوں۔ اب میں اسے زیادہ وقت نہیں دے سکتا تھا۔ میں اسے بڑھ کر وار کرنے کا موقع دے رہا تھا لیکن وہ ہچکچا رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسی کا داؤ استعمال کیا اور اس کی گردن پر ہاتھ مارا۔ میں جانتا تھا کہ اس کے ردِعمل میں اسے کیا کرنا ہے۔ اس نے وہی کیا، اپنی گردن کو جھٹکا دیا، یہی جھٹکا اس کے لیے نقصان دہ ثابت ہوا، وہ سر سے پیروں تک لڑکھڑا گیا۔ اس نے گھبرا کر ایک گھونسا میرے منہ پر مارا، جو میرے جبڑے کے نیچے لگا۔ میں نے پوری قوت سے کہنی اس کے سینے پر ماری، ایک آہ کی آواز نکلی، اسی لمحے میں نے کھڑی ہتھیلی کے وار اس کے دونوں کانوں پر کیے، وہ چکرا گیا۔ اب میں اسے 'دھوبی پٹکا' مار دیتا' یا 'بغلی'، وہ میرے ہدف پر آ چکا تھا، میں نے اس کی کلائی پکڑی اور اسے بغلی مار دی۔ وہ کچے تھڑے پر پھسلتا چلا گیا۔ اس کے گرتے ہی میں نے ایک ٹھوکر اس کی پسلیوں میں ماری۔ اس کے حلق سے چیخ نما آواز نکلی، دوسری ٹھوکر پر وہ زمین بوس ہو گیا۔ میں جانتا تھا کہ اس نے یہ مزید مار کھانے سے بچنے کے لیے کیا تھا، حالانکہ ابھی اس میں دم تھا۔ وہ اٹھ کر لڑ سکتا تھا۔ وہ کس داؤ پر تھا، میں یہ نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ اسے سمجھنے کے لیے میں نے اونچی آواز میں پوچھا۔

"کیا تم اب مرنے کو تیار ہو؟"

یہ سنتے ہی جیسے اسے ہوش آ گیا۔ اس نے جھرجھری لی اور اٹھ کر میرے مقابل آتے ہی وحشیانہ انداز میں حملہ کیا۔ حریف جب اپنے حواس کھو دے تو اسے قابو میں کرنا آسان ہوتا ہے۔ میں نے اس کے وحشیانہ انداز کو سنبھال لیا۔ اس نے میرے سر پر کہنی مارنے کی کوشش کی، جسے میں بچا گیا۔ اس نے گھوم کر ایک کک میرے سینے پر مارنا چاہی میں اسے بھی بچا گیا، پھر اس نے ایک گھونسا میرے منہ پر مارنا چاہا، میں اسے بھی بچا گیا تو پے در پے ناکامی کے بعد ایک لمحے کے لیے وہ پاگل ہو گیا۔ اس نے سارے داؤ اور مہارت ایک طرف رکھی اور مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ بلاشبہ وہ ایک طاقتور نوجوان تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے میری گردن کو پکڑ لیا تھا، مجھے اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہوا، میں نے ایک دم خود کو ڈھیلا چھوڑا اور پوری قوت سے اس کے ماتھے پر گھونسا مارا، اس کے ہاتھ ذرا سے ڈھیلے ہوئے، جسے میں نے چھڑا لیا۔ پھر میں نے اسے گھونسوں پر رکھ لیا۔ اس کا چہرہ لہولہان ہو گیا۔ اسی دوران میں نے اس کی پنڈلی پر کک ماری تو وہ لڑکھڑا گیا، میں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ مارا تو وہ گر گیا، میں اس کی چھاتی پر بیٹھ گیا۔ اگلے چند لمحوں بعد وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو چکا تھا۔

میں اٹھا اور میں نے باقی سب کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"تم میں سے کسی کو شوق ہے تو آ جائے؟"

میرے یوں کہنے پر کوئی بھی نہیں بولا۔ یہ تو واضح تھا کہ حملہ آور کون تھے، اس نوجوان نے مجھے بتا بھی دیا تھا لیکن میں نے پھر بھی اتمام حجت کرتے ہوئے پوچھا۔

''کون لوگ ہو تم اور کیوں حملہ کیا؟''

میری بات کا جواب دینے کے بجائے وہ خاموشی سے میری طرف دیکھنے لگے۔ میں نے اپنا سوال پھر دہرایا تو ان میں سے ایک بولا۔

''ہمیں راما کانت جی نے بھیجا تھا، چھوٹو رام کو چھڑوانے کے لیے۔''

''اچھا چل لگا فون اپنے راما کانت کو اور بتا تم لوگوں کے ساتھ کیا ہوا۔'' میں نے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ وہ چند لمحے ہچکچاتے رہے پھر ایک نے اپنی جیب سے فون نکالا اور نمبر پش کرنے لگا۔ چند لمحوں بعد کال مل گئی تو وہ بتانے لگا کہ کیا ہوا۔ باتوں سے اندازہ ہو گیا کہ دوسری جانب راما کانت ہے۔ جب وہ بتا چکا تو فون میں نے پکڑ لیا۔

''ہاں تو راما کانت، صرف چھوٹو رام کو چھڑوانے بھیجا تھا ان بے چاروں کو یا...... اپنے بیٹے کی بے عزتی کا بدلہ لینے بھی بھیجا تھا؟''

''جو مرجی سمجھ لے بابو...... پر اب تیری موت تو میرے ہاتھوں لکھ دی گئی ہے۔ چھوڑوں گا نہیں تجھے۔''

''تو پھر دیر کس بات کی ہے...... میں ابھی یہاں ہوں...... آجا...... اپنی لاشیں بھی اٹھا کر لے جا...... تیرے کچھ بندے ابھی زندہ ہیں...... انہیں لے جا...... زخمی تو میں نے...... اسپتال بھیج دیے ہیں۔'' میں نے اسے چڑانے کے لیے ٹھہر ٹھہر کر کہا تو وہ دھیمے سے لہجے میں بولا۔

''تو نہیں جانتا میرا انتقام کتنا بھیانک ہے۔ تو نے جو کرنا ہے، کر لیا بابو۔''

''مزہ تو تب آتا نا، اگر تم اپنے اسی بیٹے کو بھیجتے جو یہاں سے ذلیل ہو کر گیا تھا۔ ان بے چاروں کو بھیج دیا مرنے کے لیے۔'' میں نے جان بوجھ کر اونچی آواز میں کہا تاکہ میرے سامنے کھڑے بندے سن لیں۔

''تجھے جو بھی ان کے ساتھ کرنا ہے کر، لیکن بھولنا مت، وقتی فتح پر اتنا مت اچھل، کچل کر رکھ دوں گا۔'' راما کانت مجھ سے اکھڑ گیا۔

''چل اب تیرے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہے، اب میں تیرا انتظار کروں گا، کب مجھے کچلے گا۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

شاید راما کانت نے میرے بارے میں غلط اندازہ لگایا تھا یا پھر اسے اپنی طاقت پر ناز تھا۔ جو بھی تھا، کہیں نہ کہیں کچھ ایسا تھا جس کی مجھے یا انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ زمین پر پڑا ہوا پہلوان اچانک اٹھا اور مجھ پر حملہ آور ہو گیا۔ میں لاشعوری طور پر اپنا پہلو بچا گیا۔ وہ مجھے چھوتے ہوئے دوسری طرف جا گرا۔ تب میں بھی اسے بچا نہیں پایا۔ ایک دم سے کئی فائر ہوئے اور اس کے بدن کو چھید کر رکھ دیا۔

گوپے کے تھڑے پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ پہلوان تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ میرے سامنے اب چار جوان کھڑے تھے۔ میں نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے شدت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''اب تم لوگوں کے ساتھ کیا کیا جائے؟''

''جو تم چاہو۔'' ان میں سے ایک نے کہا تو میں نے جہانگیر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تم بولو، کیا کہتے ہو؟''

''میرا تو یہ خیال ہے، ان چاروں کو اپنی گاڑی دو، یہ اپنے لوگوں کی لاشیں اٹھا کر واپس چلے جائیں۔ ان کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔''

''ٹھیک کہا ہے، جانے دو۔'' ایک دم سے مدثر نے اس کی تائید کر دی۔

''ٹھیک ہے پھر جانے دو۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور چارپائی پر بیٹھ گیا۔

میں نہیں جانتا تھا کہ انہوں نے ایسا فیصلہ کیوں کیا۔ اب میرے ساتھیوں نے یہ کہہ دیا تھا، سو کہہ دیا تھا۔ اگلے پندرہ بیس منٹ میں وہ اپنی لاشیں نکال چکے تھے۔ انہوں نے ہماری ایک فور وہیل میں ان لاشوں کو ایک دوسرے کے اوپر رکھا اور پھر چاروں اس میں گھسے اور چل دیے۔

''تم نے ایسا فیصلہ کیوں کیا؟'' شعیب نے جہانگیر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ بڑے سکون سے بولا۔

''اس لیے کہ ہم نے آج رات ہی راما کانت کو اٹھانا ہے۔''

''آج رات، تیرا دماغ......'' بختاور نے کہنا چاہا مگر کہتے ہوئے رک گیا، پھر جیسے ہی اس کے لفظوں پر غور کیا، وہ حیرت سے بولا۔ ''یہ تم نے کیسے سوچا؟''

''اس لیے میری جان، ہمیں کسی نے یہ کچھ سکھایا ہے۔'' جہانگیر نے پورے اعتماد سے کہا تو مجھے اپنے اساتذہ پر بہت پیار آیا، ان کا سکھایا ہوا آج ہمارا مان اور بھرپور حوصلہ تھا۔ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ ہم ان پر ایسے وقت میں حملہ کریں گے جب انہوں نے اپنی لاشوں کو بھی ٹھکانے نہیں لگایا، ان میں غم و غصہ بھی ہے، لیکن ان کے یہ لاشعور میں بھی نہیں ہوگا کہ ہم

آج ہی اُن پر چڑھ دوڑیں گے۔“

”جو گاڑی دی گئی ہے، اس میں ٹریکنگ ہے۔“ مدثر نے کہا تو سب نے اس کی طرف دیکھا۔ تب میں فیصلہ کن لہجے میں بولا۔

”چلو پھر تیاری کرو۔“

میرے کہتے ہی سب نے تائید کی اور جہانگیر بستی میں فون کرنے لگا تاکہ کچھ گاڑیاں منگوانے کے ساتھ دوسری تیاری بھی کی جاسکے۔

☆☆☆

رات کا دوسرا پہر شروع ہو چکا تھا۔ ہم سندر بستی سے تقریباً ایک کلومیٹر دور آکر رک چکے تھے۔ ہمارے پاس تین گاڑیاں تھیں اور تقریباً پندرہ کے قریب بندے تھے۔ سب گاڑیوں سے اتر آئے تھے۔ گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس بند تھیں۔ صحرا کا سناٹا تھا، ہم ایک دوسرے کو ہیولوں کے مانند دیکھ رہے تھے۔ ہم سبھی ایک دائرے کی صورت کھڑے تھے۔

”دیکھو ہمارا مقصد، وہاں پر کوئی قتل و غارت گری نہیں کرنا ہے۔ نہ ہی ہمیں ان سے کوئی بدلہ لینا ہے۔ وہ ہم لے چکے ہیں۔ پھر آپ کا یہ سوال ہو سکتا ہے کہ ہم یہاں پر کیوں آئے؟“ میں نے کہا اور لمحہ بھر کے لیے سانس لیا، کسی نے کوئی بات نہیں کی تو میں کہتا چلا گیا۔ ”ہمارا مقصد انہیں عورتوں کے بیوپار سے روکنا ہے۔ مجھے یہ پتا چلا ہے کہ پوری روہی میں ان کے علاوہ کوئی دوسرا ایسا بیوپار نہیں کرتا۔ روہی سے خریدی گئی کچھ عورتیں اب بھی ان کے پاس ہیں جنہیں ہم کو چھڑوانا ہے۔ ہمیں اس بستی پر حملہ کے لیے زیادہ لوگ نہیں چاہئیں۔ میں اور مدثر ہوں گے، بختاور اور شعیب الگ جائیں گے۔ باقی سب ہمارے کور پر ہوں گے۔ آفتاب اور جہانگیر باقی سب لوگوں کو دیکھیں گے، وہ جو کہیں انہیں ماننا ہوگا۔“

”ہمیں پھر کرنا کیا ہے؟“ اُن میں سے ایک نے پوچھا۔

”کہا نا صرف کور دینا ہے۔ ہمیں بستی میں جا کر ان عورتوں کو ان کی قید سے چھڑوانا ہے، جو اَب بھی ان کے پاس ہیں۔ مجھے پتا چلا ہے وہ کوئی آٹھ یا دس ہیں، جنہیں وہ سرحد پار لے کر جانا چاہتے ہیں۔ ایک گروپ انہیں تلاش کرے گا اور واپس لائے گا۔ دوسرا وہاں سے راما کانت کو اٹھائے گا۔ اس راہ میں جو بھی آئے اسے اُڑا دینا ہے، جو نہ آئے اسے کچھ نہیں کہنا۔“

”ٹھیک ہو گیا۔“ ایک آواز ابھری تو میں نے کہا۔

”چاہے کچھ ہو جائے، ہمیں کامیابی ملے یا نہیں، ہر بندے کے پاس صرف چالیس منٹ ہیں۔ اس نے بستی تک جا کر واپس بھی آنا ہے۔ وہ کسی کا انتظار کیے بغیر بستی پلٹ جائے گا۔“

”ٹھیک۔“ ایک آواز ابھری تو ہم نے اپنے اپنے مائیک کو جانچا اور بستی کی جانب چل دیے۔

ہم بستی کے قریب ترین ٹیلے پر پہنچے۔ وہ کوئی گنجان بستی نہیں تھی۔ میری معلومات کے مطابق... گوپے والی جگہ راما کانت کی تھی اور اسی کے آس پاس انہوں نے عورتیں رکھی ہوئی تھیں۔ میں نے اور بختاور نے آپس میں طے کر لیا تھا کہ کیا کرنا ہے۔ ہمیں سب سے پہلے راما کانت کو پکڑنا تھا۔ اچانک کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ہمیں ان کے بارے میں پتا تھا اور ہم نے اس کا بندوبست پہلے ہی کر رکھا تھا۔ ایک بھیڑ کا گوشت ساتھ لائے تھے۔ ہمارے دو ساتھی تیزی سے آگے بڑھے، ان کے ہاتھوں میں گوشت کی پوٹلیاں تھیں۔ وہ انہیں گھما گھما کر دور دور پھینکنے لگے۔ دس سے پندرہ پوٹلیاں گرا دینے کے بعد وہ ایک طرف ہٹ گئے۔ چند منٹ انتظار کیا تو کتوں کی آوازیں آنا بند ہو گئیں۔ بلاشبہ وہ گوشت کی بُو پر پہنچ گئے تھے۔

ہم چاروں تیزی سے گوپے والی جگہ کی جانب بڑھنے لگے۔ ہم بستی میں داخل ہوئے تو ہمیں دبی دبی چیخوں اور رونے کی ہلکی ہلکی آوازیں آرہی تھیں۔ ظاہر ہے جس بستی کے اتنے جوان زندہ نہ رہے ہوں، وہاں ماتم تو ہوگا۔ وہ بستی ایک اونچے ٹیلے پر آباد تھی۔ اس میں کوئی باقاعدہ گلیاں نہیں بنی ہوئی تھیں، بس ایسے ہی تھا کہ جہاں جس کا جی چاہا، اپنا گھر یا جھونپڑی بنالی۔ بیچ میں سے یوں راستے تھے جیسے بڑی بڑی پگڈنڈیاں ہوتی ہیں۔

ہم جھونپڑیوں اور دیواروں کی آڑ لیتے ہوئے تیزی سے گوپے والی جگہ کی جانب بڑھ رہے تھے۔ باقی لوگ اپنے ٹیلے پر موجود تھے۔ انہیں ابھی تک بستی میں داخل ہونے کا نہیں کہا گیا تھا۔ کچھ دور جا کر احساس ہوا کہ گوپا کہاں ہو سکتا ہے۔ ہم انتہائی خاموشی سے گوپے کے قریب پہنچ گئے۔ باہر چھوٹی چھوٹی چار دیواری تھی اور درمیان میں بڑا صحن تھا، جس میں چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں اور ان پر چند افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان آگ جل رہی تھی۔ میں نے راما کانت کو دیکھا نہیں تھا، بس جو معلومات ملی تھی

اس کے مطابق مجھے وہاں بیٹھے ہوئے سارے لوگ ہی راما کانت لگ رہے تھے۔

''یار ان میں راما کانت ہے؟'' میں نے مائیک میں سرگوشی کی۔

''ہونا تو یہیں چاہیے۔'' بختاور نے بھی سرگوشی کی، وہ مجھ سے تھوڑے سے فاصلے پر چھپا بیٹھا تھا۔ تبھی اچانک مجھے خیال آ گیا۔

''ٹھہرو، میں ابھی دیکھ لیتا ہوں، تم نے پیچھے والوں کو بتانا ہے جب میں اشارہ دوں۔''

میرے کہنے پر خاموشی چھا گئی۔ بختاور میری بات سمجھ گیا تھا۔ میں نے تیزی سے اپنا فون نکالا، اس میں سے راما کانت کا نمبر تلاش کیا، میرا دل دھڑک رہا تھا کہ وہ نمبر اسی کا ہونا چاہیے۔ بیل ہو رہی تھی۔ سناٹے میں فون بجنے کی آواز جب صحن میں گونجی تو میرا دل کنپٹی میں دھڑکنے لگا۔ ایک ادھیڑ عمر، پتلے سے، سفید بے تحاشا ابھی داڑھی والے شخص نے اپنی جیب سے فون نکالا، پھر بڑے غور سے نمبر دیکھا اور کال ریسیو کر لی۔

''بول علی کیا بات ہے؟''

''بات اتنی سی بتانی ہے، تم اس وقت بالکل میرے نشانے پر بیٹھے ہوئے ہو۔ میں جب چاہوں تمہیں گولی مار دوں۔'' میں نے اتنا کہا ہی تھا کہ وہ حواس باختہ سا چاروں طرف دیکھنے لگا۔ میں نے بختاور کو اشارہ کر دیا۔ کچھ نہ پا کر اس نے شاید خود پر قابو پایا اور بڑے اطمینان سے بولا۔

''میں جانتا ہوں تو نے آج مجھے زخم لگایا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہر بار ایسا ہو گا، یوں تیرے فون کرنے کو میں مذاق سمجھوں یا میرے زخموں پر نمک پاشی......'' اس نے غصے بھری عجیب بے بسی سے کہا۔

''میں تم سے صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں، وہ عورتیں کتنی ہیں جنہیں تم نے پار بھیجنا تھا؟'' میں نے یونہی سوال کر دیا۔

''مت پوچھ...... مت کر نمک پاشی، وقت کا انتظار کر، اب میں انہیں تیری لاش ٹھکانے لگانے کے بعد ہی پار بھیجوں گا۔'' اس نے دہاڑتے ہوئے کہا تو مجھے کنفرم ہو گیا کہ ان میں راما کانت کون ہے۔ تبھی میں بولا۔

''چل پھر تیار ہو جا، فون چھوڑ اور اپنے سر پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو جا، ذرا سی بھی دیر کی تو گولی مار دوں گا۔'' یہ کہتے ہی میں نے کال بند کر دی۔ اگلے ہی لمحے میں نے پسٹل سیدھا کیا اور فائر کر دیا۔ اب ہمارے پاس وقت نہیں تھا۔

ہم انتہائی تیز رفتاری سے دیوار کود کر صحن میں آ گئے۔ میں کودا تو میرے کور پر مدثر تھا، میں نے کودتے ہی فائر کرنا شروع کر دیا، میرا مقصد صرف انہیں ڈرانا تھا۔ میں چند لمحوں میں ان چارپائیوں کے پاس جا پہنچا۔ ہم نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔ وہ سبھی گم صم بیٹھے رہے۔ اچانک ایک شخص نے چادر ہٹائی، اس کے نیچے سے پسٹل یا ریوالور یا دیسی ساخت کا کوئی ریپیٹر نکال کے فائر کرنا چاہا تھا لیکن اس کی حسرت دل ہی میں رہ گئی، میں نے اس کے چہرے کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔

''میں چاہتا تو چھپ کر بھی تم لوگوں پر فائر کر سکتا تھا۔''

''تو کیا کیوں نہیں۔'' راما کانت نے حوصلے سے جواب دیا۔

''میں تم سے دو باتیں کرنا چاہتا تھا لیکن پہلے یہ بتاؤ، وہ عورتیں کہاں چھپا رکھی ہیں؟'' میں نے تیزی سے کہا۔

''دیکھ تو حد سے آگے بڑھ رہا ہے، تو میرے بیوپار......'' اس نے کہنا چاہا تو مدثر نے چیختے ہوئے کہا۔

''بھاڑ میں گیا تیرا بیوپار، چل بول۔'' یہ کہتے ہی اس نے فائر اس کے پیروں میں کر دیا۔

''تم لوگ بولو۔'' میں نے وہاں موجود لوگوں سے کہا تو ان میں سے ایک نے ہماری دائیں جانب اشارہ کیا۔ وہیں جہاں کمرا تھا۔ اس کی کنڈی باہر سے لگی ہوئی تھی۔ بختاور بھاگ کر گیا اور اس نے کنڈی کھولی اور اندر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد کئی عورتیں تیزی سے باہر آنے لگیں، وہ کل نو عورتیں تھیں۔ یہی وہ وقت تھا، جب فائرنگ کی آواز سے بستی کے لوگ چونک کر اکٹھا ہونا شروع ہو گئے تھے۔

یہ ایک خطرناک صورتِ حال تھی۔ ایک نوجوان جوشِ جذبات میں چیخنے لگا تھا۔ ''اوئے کون وہ تم......''

تبھی بختاور نے سخت لہجے میں کہا۔ ''تم لوگوں کو اگر اپنی زندگی پیاری ہے تو یہاں سے چلے جاؤ، گولی یہ نہیں دیکھتی کہ وہ کس کے سینے کے پار ہوتی ہے۔''

''تم لوگوں کو جانے دیں گے تب نا۔'' ایک اور آواز ابھری تو بختاور نے کہا۔

''راما کانت کی زندگی چاہتے ہو؟''

اس کے یوں کہنے پر خاموشی چھا گئی۔ یہی وہ لمحہ تھا جب اُن کے پیچھے سے فائرنگ ہوئی۔ اگلے چند لمحوں میں وہ لوگ تتر بتر ہو گئے۔ میں نے وقت دیکھا، دیے گئے وقت میں سات منٹ رہتے تھے۔

میں نے راما کانت کو اپنے ساتھ لیا اور صحن کے کونے میں کھڑی گاڑی کی جانب بڑھا۔ باقی سبھی لوگ عورتوں کو لے کر چل پڑے۔ اچانک ایک جانب سے کئی فائر ہوئے، کچھ چیخیں بلند ہوئیں۔ اس کے ساتھ پھر شدت سے فائرنگ ہونے لگی۔ یہ وقت دھیان دینے کا نہیں تھا، میں نے راما کانت کو گاڑی میں ڈالا۔

''چابی کہاں ہے اس کی؟''

''میرے پاس نہیں ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

میں نے اپنی چابی نکالی، اسے اگنیشن میں ڈالا اور فوراً ہی اسٹارٹ کرلی، میں وہاں سے نکلا تو سب کو معلوم ہو گیا۔

جلد ہی میں بستی کے باہر آ گیا۔ میرے پیچھے باقی لوگ فائرنگ کرتے ہوئے، بھاگتے آ رہے تھے، انہیں مشکل یہ ہو رہی تھی کہ جو عورتیں ان کے ساتھ تھیں، وہ انہیں دیر کروا رہی تھیں۔ کچھ نوجوان بھاگتے ہوئے عورتوں تک پہنچے اور انہیں لے کر گاڑی کے قریب پہنچ گئے، جیسے تیسے وہ اس میں سوار ہوئے، مدثر میرے اور دو مزید نوجوان میرے ساتھ آ گئے۔ مدثر سن روف کھول کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے.... گولیاں برسانا شروع کر دیں تاکہ بستی والے دہل جائیں۔ ہم وہاں سے نکلے تو سیدھے ڈیرے پر آ گئے۔ اس وقت دن نکلنے کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔

ڈیرے پر جنریٹر کی وجہ سے روشنی تھی۔ وہ ساری عورتیں ایک جانب تھڑے پر بیٹھ گئیں۔ میں نے راستے میں ساوری کو بتا دیا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے ساری عورتوں کو اندر بلا لیا۔ سارے نوجوان اِدھر اُدھر ہو گئے۔ راما کانت میرے سامنے چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

''اب بول راما کانت بیوپاری..... کیا کیا جائے تیرے ساتھ؟''

''مجھے مار دے۔ اب میں ذلت کی زندگی برداشت نہیں کرسکتا۔'' اس نے انتہائی جذباتی لہجے میں کہا تو مجھے اس پر ترس آ گیا۔

''نہ یار ایسے تو نہ کہو..... تیرا کوئی بیٹا سامنے نہیں آیا، حیرت ہے؟''

''حیرت نہیں ہے مجھے، نہ تجھے ہونی چاہیے۔'' اس نے پھر جذباتی بلکہ رو دینے والے لہجے میں کہا تو میں نے اسے غور سے دیکھا تبھی وہ بولا۔ ''تیرے آنے سے تھوڑی دیر پہلے میرے دونوں بیٹے کچھ...... لوگوں کے ساتھ زخمیوں کو دیکھنے کے لیے چلے گئے تھے۔ پر مجھے دکھ نہیں، جو قسمت میں ہے۔''

''چل پھر تھوڑی دیر آرام کر، ابھی ناشتا کرتے ہیں۔'' میں نے کہا اور اٹھ گیا۔ رہائشی علاقے کی طرف جاتے ہوئے میں نے بختاور کو فون کر کے بتا دیا کہ راما کانت کے بیٹے زخمیوں کے لیے اسپتال کی طرف گئے ہیں، ہوسکتا ہے وہ پاگل پن کریں اور ڈیرے پر حملہ کردیں اس لیے محتاط رہنا۔ وہ میری بات سمجھ گیا۔ اس نے مجھے بھی صلاح دی کہ راما کانت کو ڈیرے سے ہٹا دیا جائے۔ کچھ دیر بعد میں نے اپنے سامنے بٹھا کر راما کانت کو ناشتا کروایا پھر بختاور کے ساتھ اسے بھیج دیا۔

☆☆☆

سارا دن کچھ نہیں ہوا۔ میں سکون سے پڑا سوتا رہا۔ میری.... آنکھ کھلی تو میرے قریب ساوری بیٹھی تھی۔ وہ مجھے بڑی خوشگوار اور نکھری نکھری سی لگی جیسے ابھی نہا کر تازہ دم ہوئی ہو۔ اس کے لبوں پر دنداسہ، کھلے بال اور آنکھوں میں کاجل دیکھ کر مجھے لگا کچھ ہٹ کر ہے۔ تبھی میں نے حیرت سے پوچھا۔

''ارے واہ...... بڑی نکھری لگ رہی ہو۔''

''اب بندہ نہائے دھوئے بھی نا۔'' اس نے شکوہ بھرے لہجے میں کہا۔

''تم خود ہی کام کاج میں لگی رہتی ہو، میں تمہیں مہارانی.....' میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولی۔

''گولا مار مہارانی کو...... اٹھو جاؤ نہاؤ دھولو۔''

''بڑا اہتمام کر رہی ہے، خیر تو ہے نا۔'' میں نے ایک آنکھ دباتے ہوئے کہا تو اس نے زور سے ایک مکّا کاندھے پر مارتے ہوئے کہا۔

''اگر میرے پیچھے نہیں آئے نا تو میں پانی یہاں لاکر تم پر پھینک دوں گی۔''

''اوہ نہیں ایسا نہ کرنا، میں ابھی آتا ہوں۔'' میں نے کہا اور اس کے ساتھ ہی کمرے سے باہر آ گیا۔ باہر صحن میں آیا تو مجھے پتا چلا سہ پہر ہو گئی ہے۔ خاموشی دیکھ کر میں نے پوچھا۔

''ارے وہ رات جو عورتیں آئی تھیں؟''

''رات کو نہیں آج صبح آئی تھیں۔ ان سب کو میں نے اپنے اپنے گھروں میں بھجوا دیا ہے، ان کے ساتھ ردھی بھی چلی گئی ہے۔'' اس نے بتایا۔

''چلو یہ اچھا ہوا۔'' میں نے سکون سے کہا اور نہانے کے لیے بڑھ گیا۔

میں ڈیرے پر آیا تو ان چاروں کے ساتھ بختاور بھی بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ ہنس دیے۔

''کیا بات ہے، بڑے دانت نکال رہے ہو۔''

''یار تمہارا خیال تو ساوری بھابی رکھتی ہے، ہمارا خیال کون رکھے گا۔'' مدثر نے پھیلتے ہوئے کہا تو میں نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''تیری شادی ہو تو گئی ہے میرا خیال ہے؟''

''شادی ہونا اور خیال رکھنا دو الگ الگ باتیں ہیں میرے دوست، تمہیں اس فلسفے کا پتا ہونا چاہیے۔'' اس نے ترنگ میں کہا تو سبھی ہنس دیے۔

''پہلی بات تو یہ کہ ساوری ابھی تم لوگوں کی بھابی......''

''بند کر بکواس......'' بختاور نے ایک دم اٹھ کر کہا۔ ''یہ بیان ہم ہزار بار سن چکے ہیں۔ کوئی نئی بات کر۔''

''مجھ سے نہیں ہوتی، تم لوگ کر لو۔'' میں نے کہا اور آرام سے ایک چارپائی پر لیٹ گیا۔ ہنستا ہوا بختاور بھی واپس چارپائی پر بیٹھ گیا۔ ہمارے درمیان باتیں ہونے لگیں۔

سندر بستی سے کوئی اطلاع نہیں تھی کہ وہاں کیا ہونے جا رہا ہے، کیا ہلچل ہے۔ کچھ پتا نہیں تھا۔ میں نے جب اپنے دوستوں سے یہ بات کی تو ہر کوئی اپنا اپنا تبصرہ کرنے لگا۔ ہم کافی دیر تک انہی باتوں میں مشغول رہے۔ پھر ایک دو کر کے بھی اٹھتے چلے گئے۔ یہی ان کا معمول تھا۔ وہ ایک جگہ ٹک کر نہیں بیٹھتے تھے۔ انہیں اپنے اردگرد کی ساری خبر رکھنا ہوتی تھی۔ میں چارپائی پر پڑا راما کانت کے بارے میں سوچنے لگا۔ میری راما کانت سے تفصیلی بات نہیں ہوئی تھی۔ مجھے جتنا بھی اس کے ساتھ کچھ وقت ملا تھا، اتنی دیر میں وہ بندہ کچھ اصول پسند لگا تھا۔ بس یہ عورتوں کے بیوپار پر میرا ماتھا گھوم گیا تھا۔ ورنہ وہ جو کرتا تھا، کرتا رہتا۔ میرا فون بج اٹھا۔ میں نے نمبر دیکھا تو وہ فون چاچا عبدالمجید کا تھا۔ میں نے کال ریسیو کر کے سلام کیا تو انہوں نے پوچھا۔

''کہاں ہو تم؟''

''میں ڈیرے پر ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''اچھا وہیں رہو، میں بس پہنچ گیا ہوں۔'' انہوں نے کہا تو میں ایک دم سے چونک گیا۔

''کہاں ہیں اس وقت آپ؟'' میں نے تصدیق کرتے ہوئے دوبارہ پوچھا اور تیزی سے اٹھ کر گیٹ کی طرف چل دیا۔ تبھی ان کی آواز گونجی۔

''بس نزدیک ہی ہوں، آ رہا ہوں۔''

انہوں نے فون بند کر دیا۔ میں نے دور دور تک دیکھا، کہیں بھی ان کے آنے کے آثار نہیں تھے۔ میں نے ساوری کو کال کی۔

''چاچا عبدالمجید کا فون آیا تھا، وہ آ رہے ہیں، کہیں کہیں نزدیک ہی ہیں۔''

''مجھے پتا ہے، وہ میرے ساتھ رابطے میں ہیں، میں انہی کا انتظار کر رہی ہوں۔'' اس نے بتایا تو نجانے کیوں مجھے عجیب سا لگا۔ یہ ساوری کر کیا رہی ہے؟ چلیں اسے ہی بتایا تھا تو وہ کم از کم مجھے تو بتا دیتی۔ یہ مجھ سے چھپانے کیوں لگ گئی ہے۔ یہی سوچتے ہوئے میں نے فون بند کر دیا۔

میں نے گیٹ کی جانب دیکھا، کافی دور سے فور وہیل جیپ ریت اور دھول اڑاتی ہوئی آ رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں وہ ڈیرے کے صحن میں آ رکی۔

چاچا عبدالمجید کے ساتھ بابا خیر دین اترے تو مجھے بہت اچھا لگا۔ پچھلی سیٹ سے دو لڑکیاں اتریں۔ جنہیں بہرحال میں نہیں جانتا تھا۔ اگلی سیٹ پر سے ایک صحت مند نوجوان اترا، سرخ و سفید، گول چہرہ کلین شیو۔ اس کا جسم بتا رہا تھا کہ خاصا مضبوط ہے۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ میں باری باری سب سے ملا اور اندر جانے کا اشارہ کیا۔ وہاں دروازے میں ساوری کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں تیل والا برتن تھا۔ اس نے دروازے کے دونوں طرف تیل گرایا اور انہیں اندر بلا لیا۔ یہ روہی کی ہی نہیں، پنجاب کی بھی رسم ہے۔ اس سے اپنے مہمان کو عزت دینا مقصود ہوتا ہے۔ اسے بتایا جاتا ہے کہ تم ہمارے لیے کتنے اہم ہو۔ کچھ دیر بعد ہم صحن میں بچھی چارپائیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں بھی وہیں بیٹھ گیا تو چاچا عبدالمجید نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

''دیکھو بابا خیر دین کی صحت کتنی اچھی ہو گئی ہے۔ علاج نہ ہونے سے ساری گڑبڑ ہو گئی تھی۔''

''یہ تو بہت اچھا کیا آپ نے۔ چلیں اس بہانے ان کا علاج ہو گیا۔'' میں نے خوشدلی سے کہا۔

''اچھا ان لڑکیوں سے تم واقف نہیں ہو، یہ ساوری کی سہیلیاں ہیں شبانہ اور فرزانہ۔ لیکن اس لڑکے کے بارے میں جانتے ہو، کون ہے یہ؟'' چاچا عبدالمجید نے مسکراتے ہوئے پوچھا تو میں نے غور سے اسے دیکھا۔ چند لمحے دیکھتے رہنے کے بعد میں نے چاچا سے معذرت والے انداز میں

کہا۔

''مجھے یہ چہرہ مانوس تو لگ رہا ہے مگر ذہن میں نہیں آرہا۔''

''بس دیکھ لئی تیری یاری۔'' اس لڑکے نے مخصوص انداز میں اچانک کہا تو ایک دم سے اپنے کالج والے ہاسٹل جا پہنچا۔ سارا منظر واضح ہو گیا۔

''اوئے شہباز وڑائچ تم ہو۔'' میں نے بے ساختہ کہا اور اسے گلے لگانے کے لیے بڑھا، اس وقت تک وہ بھی اٹھ چکا تھا۔ ہم بہت گرم جوشی سے گلے ملے۔ وہ مجھے الگ کرتے ہوئے بولا۔

''اگر تم مجھے نہ پہچانتے نا تو میں.... تمہارے سر میں ڈانگ مار دیتا، تاکہ تمہاری یادداشت واپس آجائے، وہ جیسے اردو فلموں میں ہوتا ہے۔''

اس کی بات سن کر سبھی ہنس دیے۔ تب میں نے کہا۔

''تم بہت بدل گئے ہو، صحت مند، گورے چٹے، کلین شیو، اُس وقت تم......''

''تم کون سا شیر جوان تھے۔'' اس نے تیزی سے کہا تو میں بھی کھلکھلا کر ہنس دیا۔ مجھے اس کا بے تکلفانہ انداز اچھا لگا۔

''اچھا کیا تم آ گئے، بہت اچھا لگا مجھے۔'' میں نے خوشی سے کہا۔ اتنے عرصے بعد اسے دیکھ کر مجھے واقعی بہت اچھا لگا تھا۔ وہی تھا جو اُن دنوں میرا چند دنوں کا ساتھی رہا تھا۔ جس کی باتوں نے ایک دنیا سے متعارف کروایا تھا۔ اس سے باتیں کرتے ہوئے لگتا تھا جیسے زندگی بس انجوائے کرنے کے لیے ہے۔

رحماں چائے لے کر آ گئی تھی۔ اس نے سب کو چائے پیش کی اور ایک طرف بیٹھ گئی۔ ہم باتیں کرتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد شبانہ اور فرزانہ اٹھ کر ساوری کے ساتھ چلی گئیں۔ ساوری جب لاہور میں تھی تو وہیں یہ اس کی سہیلیاں بنی تھیں۔ چونکہ وہ چاچا کے ساتھ آئی تھیں اس لیے مجھے کوئی تردد نہیں تھا۔ ہم وہیں اِدھر اُدھر کی باتوں میں لگے رہے۔ دن ڈھل گیا تو ساوری نے کھانا لگا دیا۔ لاہور میں رہ کر وہ بہت کچھ سیکھ گئی تھی جس کا اظہار اس نے کھانے کی صورت میں کیا۔ اس نے لذیذ کھانے بنانے پر بہت محنت کی تھی۔ کھانے کے بعد بابا خیر الدین بھی اٹھ گئے اور ہم ڈیرے پر آ گئے۔

جہانگیر، مدثر، آفتاب، شعیب اور بختاور بھی وہیں آ گئے۔ یونہی روہی کی باتیں چل پڑیں۔ اب تک کیا ہوا، چاچا عبدالمجید سوال کرتے تو اس کا جواب دے دیا جاتا۔ شہباز کے چہکنے کی وجہ سے بہت اچھا ماحول بن گیا تھا۔ انہی باتوں کے دوران چاچا عبدالمجید نے بے پروا انداز میں پوچھا۔

''سناؤ، کیا حالات ہیں یہاں کے؟''

''حالات تو ٹھیک ہیں۔'' میں نے دھیمے سے کہا۔

''تو پھر لاہور کیوں نہیں گئے تم؟'' انہوں نے ذرا سختی سے پوچھا۔

''جی بس میں یہاں کے معاملات......'' میں نے کہنا چاہا تو وہ بولے۔

''یہاں اب کچھ نہیں ہوگا، کم از کم کچھ عرصے تک تو کوئی یہاں سر نہیں اٹھا سکتا۔ میں نے سارا بندوبست کر دیا ہے۔''

''آپ جیسا کہیں، اگر لاہور میں کوئی کام ہے تو میں ابھی چلا جاتا ہوں۔'' میں نے ان کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا۔

''کام بھی رکتے ہیں یار۔'' انہوں نے سنجیدگی سے کہا تو سبھی ان کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ چند لمحے خاموش رہے پھر بولے۔ ''اچھا یار بات یوں ہے، علی تمہارے ذمے جو کام تھا، وہ تم نے پورا کیا۔ لیکن اس میں ایک نئے کام کی بھی بنیاد ڈال دی ہے تم نے۔ یہ کوئی نئی یا انوکھی بات نہیں ہے، ایسا ہوتا ہے۔ ہماری اس اَن دیکھی دنیا میں جب کسی پر ضرب لگتی ہے تو کم از کم بدلہ لینے کی خواہش ضرور ابھرتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو لانا ہمارا حق تھا، اس میں کوئی دورائے نہیں کہ تم نے اپنا حق چھینا اور انہیں سزا بھی دی۔ ہم بہت خوش ہیں تم سے لیکن یہ بھی سمجھو کہ ایک نیا کھاتا کھول دیا ہے تم نے۔ اور وہ ہے کلیان جی والا قضیہ......''

''اب سارا کیا دھرا ہی ان کا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے ڈاکٹر صاحب کو اغوا کیا۔ مجھے تو ان کے بارے میں پتا ہی تھا، وہ خود سامنے آ گئے۔ اب آپ نے مجھے واپس بلوا لیا، ورنہ میں انہیں مزید سزا دے کر آتا۔''

''تمہیں پتا ہے کلیان جی کے بارے میں؟'' انہوں نے سنجیدگی سے پوچھا تو میں نے دھیمے سے لہجے میں کہا۔

''میں ان کے بارے میں حتمی تو کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن ان کے بارے آپ نے تھوڑا بہت بتایا تو تھا اور تھوڑا......''

''کیا تمہیں یاد ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''جی، آپ نے بتایا تھا کہ کوئی کلیان آنند نامی مجرم ہے۔ اودھے پور سے اس کا تعلق ہے لیکن اب وہ بھارتی ایجنسی کے لیے کام کرتا ہے اور پتا یا میں ہے۔ یہاں

اودھے پور اور پٹایا دونوں جگہوں پر اس کا نیٹ ورک ہے۔‘‘میں نے بتایا تو وہ سر ہلاتے ہوئے بولے۔

’’ہاں ایسا ہی ہے۔ یہاں اودھے پور میں اس کا نیٹ ورک کافی مضبوط ہے لیکن پٹایا میں وہ چند عالمی سطح کے مجرموں کے ساتھ کام کرتا ہے۔ یہ سب بھارتی خفیہ ایجنسی کی مدد سے ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ اس سے کافی کام لیتے ہیں۔‘‘ انہوں نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

’’اگر وہ پٹایا میں ہے تو......‘‘میں نے .... کہنا چاہا تو وہ بولے۔

’’اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ حقیقت میں کوئی آدمی ہے بھی یا نہیں یا فقط نام گھڑ کر یہ سب کام چلایا جارہا ہے۔ فرض کیا، ہم اس بندے کو تلاش .... کر بھی لیتے ہیں تو اس کو مار دینے سے کیا ہوگا؟ وہ کوئی دوسرا بندہ وہاں کھڑا کردیں گے۔ تیسرا لے آئیں گے۔ وہ کام تو ختم نہیں ہوگا۔‘‘

’’تو پھر وہ......‘‘ میں نے پُر جوش انداز میں کہنا چاہا تو وہ بولے۔

’’میں جانتا ہوں، تمہارے اندر اس کے لیے بہت غصہ ہے۔ تمہارے دل میں اس کے لیے بہت نفرت ہے۔ تم یہ غصہ سنبھال رکھو۔ مگر میں تمہیں ایک دوسری بات کہنا چاہتا ہوں۔‘‘

’’جی۔‘‘میں نے سعادت مندی سے کہا۔

’’دیکھو، کسی کے گھر میں گھس کر مارنے سے پہلے اپنا گھر مضبوط کرو۔ اس میں کوئی شک نہیں، وہ لوگ بھی اپنا کام کررہے ہیں، انہیں روکنا کس نے ہے۔ ہم نے...... ہمیں روکنا ہے انہیں۔‘‘ چاچا نے دبے دبے جوش سے کہا۔

’’چاچا، آپ بتائیں مجھے کرنا کیا ہے؟ میں نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ میری طرف دیکھنے لگے پھر بولے۔

’’ابھی تم میرے ساتھ لاہور جاؤ گے، وہیں فیصلہ ہوگا کہ کیا کرنا ہے۔‘‘

’’جیسا آپ کہیں، میں آپ کے ساتھ جانے کو تیار ہوں لیکن کوئی خاص بات ہوگئی ہے؟‘‘ میں نے ایک دم سے اپنا فیصلہ سنادیا

’’شاباش علی، مجھے تم سے یہی امید تھی کہ تم میرے ساتھ جارہے ہو، باقی رہی خاص بات تو بیٹے...... دشمن کسی بھی وقت کچھ بھی کرسکتا ہے۔ یہ جو کلیان جی والا کھاتا ہم نے کھول دیا ہے، اسے چھیڑا تو بہت کچھ دکھائی دے گیا، دعا

میں یہی کرتا ہوں کہ انہیں یہ معلوم نہ ہو کہ ہم یہ سب جانتے ہیں۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ وہ یہاں کتنا کام کرچکے ہیں۔‘‘ وہ انتہائی سنجیدہ لہجے میں بولے، پھر چند لمحے خاموش رہنے کے بعد عام سے انداز میں پوچھا۔ ’’اچھا اس راما کانت کو تو سامنے لاؤ، وہ زندہ تو ہے نا؟‘‘

یہ سنتے ہی ہم سب نے ایک دوسرے کو چونک کر دیکھا۔ میں نے بختاور کی طرف دیکھ کر کہا۔ ’’اسے لے آتے ہیں یہاں۔‘‘

اس سے پہلے بختاور کچھ کہتا، چاچا نے چارپائی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ’’نہیں ہم اُدھر چلے جاتے ہیں۔ چلو اٹھو۔‘‘ وہ ایک دم سے یوں تیار ہوگئے جیسے انہیں جلدی ہو۔ میں اور بختاور ان کے ساتھ چل پڑے۔

اس وقت راما کانت کے پاس چاچا سائیں بیٹھا ہوا تھا۔ اسے چاچا عبدالمجید کی آمد کی خبر تھی۔ وہ ان سے ڈیرے پر مل کر آیا تھا۔ راما کانت اجنبیوں کے مانند بیٹھا رہا یوں جیسے اسے ہم سے کوئی تعلق واسطہ نہ ہو۔ چاچا نے راما کانت کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

’’میں تم سے ملنے آیا ہوں راما کانت......‘‘

جیسے ہی اس نے آواز سنی تو وہ چونک گیا۔ وہ چاچا کو یوں حیرت سے دیکھنے لگا جیسے اسے امید ہی نہیں تھی کہ یہ شخص بھی مجھے ملنے کے لیے آسکتا ہے۔ اس نے کھڑے ہوتے ہوئے بے ساختہ کہا۔

’’آپ جناب......؟‘‘

’’ہاں میں، آؤ بیٹھو کرتے ہیں بات۔‘‘ چاچا نے اسے اشارہ کیا تو وہ پھر سے چارپائی پر بیٹھ گیا۔

میں یہ دعویٰ کرتا تھا کہ میں چاچا کو بچپن سے دیکھتا آیا ہوں اس لیے مجھے ان کے بارے میں سب معلوم ہے۔ لیکن ان لمحات میں مجھے اپنے آپ پر شک ہونے لگا۔ میں چاچا کے بارے میں پوری طرح نہیں جانتا تھا۔ ان کی رسائی کہاں تک ہے اور کن لوگوں تک ہے، مجھے ابھی تک پتا نہیں تھا۔ مجھے اپنی ادھوری معلومات کا احساس ہونے لگا۔

اسی لمحے چاچا سائیں جانے لگے تو چاچا نے انہیں روکتے ہوئے کہا۔

’’آپ بھی بیٹھیں، کہاں جارہے ہیں؟‘‘

’’میں ذرا باہر دیکھ لوں۔‘‘ انہوں نے عام سے لہجے میں کہا تو چاچا نے ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھاتے ہوئے کہا۔

’’آپ ادھر بیٹھیں میرے پاس ۔‘‘

ہم سب چارپائیوں پر بیٹھ گئے تھے۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ ہمارے سامنے تازہ دودھ آگیا۔ ایک لڑکا سب کو پیش کر چکا تو چاچا نے دودھ کا سپ لیا اور سخت لہجے میں بولے۔

''راما کانت، جب میں نے تمہیں روکا تھا کہ کچھ نہیں کرنا، پھر تم نے علی پر حملہ کیوں کیا؟''

''مجھے اپنی غلطی کا احساس ہے جناب۔'' اس نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا تو میں حیران نہیں ہوا۔ یہ سب پہلے ہی ہو چکا تھا۔

''اب دیکھو غلطی کا نقصان کتنا ہوا؟ اندازہ ہے تمہیں؟'' چاچا نے افسوس بھرے انداز میں پوچھا۔

''نقصان تو میرا بہت ہو گیا ہے۔'' اس نے اپنا سر دونوں طرف مارتے ہوئے کہا تو مجھے یوں لگا جیسے اسے انسانوں کا نہیں، رقم جانے کی فکر ہو۔

''کم از کم میرے آنے کا ہی انتظار کر لیتے۔'' چاچا نے سخت لہجے میں کہا۔

''کاش ایسا ہوتا، اب میرے سامنے جوان خون ہے، میری بہت کم سنی جاتی ہے۔ زیادہ تر فیصلہ وہی نوجوان طبقہ کرتا ہے جس نے نقصان اٹھایا۔'' اس نے افسوس بھرے انداز میں جواب دیا تو چاچا اسے باور کراتے ہوئے بولے۔

''اب اسی نوجوان طبقے نے مجھے یہاں فوراً پہنچنے کو کہا، انہیں یہ پورا احساس ہو گیا ہے کہ وہ تمہیں چھڑا کر نہیں لے جاسکتے۔''

''میں جانتا تھا ایسا ہی کچھ ہوگا۔'' اس نے روہانسا... ہوتے ہوئے کہا۔

''اب ایسا کرو، سکون سے واپس جاؤ۔ تمہارے بیٹے تمہیں لینے کے لیے آرہے ہیں۔ جو کرنا ہے کرو، لیکن جو کچھ علی نے تم لوگوں سے کہا ہے وہ اب نہیں ہونا چاہیے۔''

چاچا نے تحکمانہ انداز میں کہا تو راما کانت کے اندر کہیں جو چنگاری موجود تھی، وہ بھڑک اٹھی۔ اس نے دھیمے سے کہا۔

''تو پھر ہمیں ویسے ہی واپس چلے جانا چاہیے۔ آپ کو پتا ہے ہمارا بیوپار اسی میں ہے۔ ہم نے سامنے سے بہت ایڈوانس بھی پکڑا ہوا ہے۔ یہ نہیں کریں گے تو سامنے والوں سے الجھنا پڑے گا۔''

''تیرا اب تک جتنا نقصان ہوا، وہ میں دوں گا۔ جتنا بھی بنتا ہے، یہاں دے کر جاؤں گا۔ واپس جا کر پوری رقم کا تخمینہ مجھے بتاؤ۔ دوسرا، تجھے جب بھی ضرورت پڑے، تو نے انہیں کہہ دینا ہے، ایک فون کال پر یہ تیرا ساتھ دیں گے، یہ سلسلہ اس وقت تک چلتا رہے گا، جب تک تیری طرف سے کوئی الجھن یا دقت نہیں آتی، میری بات سمجھ رہا ہے؟'' چاچا نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔ چند لمحے سوچتا رہا پھر سوالیہ انداز میں بولا۔

''ٹھیک ہے لیکن اس کے بعد جو بھی دھندا کریں، وہ ہوگا؟''

''جو مرضی کرنا، ہم نے پہلے بھی تجھ پر ہاتھ رکھا، پھر بھی رکھیں گے۔ دوست بن کر ایک دوسرے کی خبر گیری کرے گا تو سب ٹھیک رہے گا۔'' چاچا نے فیصلہ کن انداز میں کہا تو اس نے سر ہلاتے ہوئے بات مان لینے کا عندیہ دے دیا۔ تبھی چاچا نے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔

''راما کانت کا فون کدھر ہے؟ وہ دو اسے۔''

''میرے پاس ہے، میں دیتا ہوں۔'' بختاور نے جلدی سے کہا اور جیب میں پڑا فون نکال کر اسے دے دیا۔

''چل فون کر اپنے بیٹے کو، پوچھ کہاں ہے وہ، پہنچا ہے یا نہیں ابھی تک؟''

راما کانت فون کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد بولا۔ ''وہ تو ادھر ڈیرے کے آس پاس ہیں۔''

''انہیں کہو ڈیرے پر جائیں، میں کہہ دیتا ہوں۔'' چاچا نے کہا اور فون پر نمبر ملانے لگے۔ انہوں نے جہانگیر کو بتایا اور فون بند کر کے جیب میں رکھ لیا۔ اب ہمیں واپس ڈیرے پر جانا تھا۔

جس وقت ہم واپس ڈیرے پر پہنچے تو راما کانت کے بیٹے بیٹھے ہوئے تھے۔ چاچا باری باری ان سے ملے، راما کانت بھی ملا۔ میں نے بھی ہاتھ ملایا۔ وہ اس کا چھوٹا بیٹا تھا، جو روہی کو خرید کر لے جا رہا تھا۔ وہ مجھے کچھ اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے نظرانداز کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ جانے لگے تو رہائشی حصے کی طرف سے ساوری آگئی۔ اس کے ہاتھ میں کپڑے تھے، اس نے وہ کپڑے راما کانت کو دیتے ہوئے کہا۔

''بابا، کسی کی بھی کوئی غلطی نہیں ہے۔ اسے ایک خواب سمجھ کر بھول جاتا۔''

راما کانت چند لمحے کھڑا سوچتا رہا پھر اس نے ایک ہاتھ سے کپڑے تھام لیے اور دوسرا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا۔ روہی کی روایت کے مطابق اب وہ اس کے خلاف کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ تبھی ساوری نے کچھ فاصلے پر کھڑے سانول کی طرف دیکھ کر کہا۔

''سانول، ایکس گائیں بھی ان کے ساتھ بھیج دو، کچھ بندے لے کر چلے جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے، صبح بھیج دوں گا، اس وقت تو مال ڈنگر آرام کررہے ہیں۔'' سانول نے ہانک لگاتے ہوئے کہا تو راما کانت دھیمے قدموں سے چلتا ہوا گاڑی میں جا بیٹھا، کچھ دیر بعد وہ وہاں سے چل دیے۔

رات کا دوسرا پہر چل رہا تھا۔ راما کانت کے جانے کے بعد کچھ دیر ڈیرے پر بیٹھے ہم باتیں کرتے رہے۔ چاچا ہمارے درمیان سے جلدی اٹھ گئے۔ شہباز نے بہت مزے کی باتیں کیں، وہ ایک جہان دیکھ چکا تھا۔ کافی دیر باتیں کرتے رہنے کے بعد سب نے سونے کے لیے اپنے اپنے ٹھکانوں کا رخ کیا۔ میں سیکیورٹی دیکھ کر جب اندر کمرے میں آیا تو ساوری میری منتظر بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے اسے دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔

''تمہاری سہیلیاں آئی ہیں، انہیں وقت دو، تم یہاں ہو، وہ کیا سوچیں گی؟''

''وہ کب کی سوگئی ہیں۔ کافی تھک گئی تھیں۔'' اس نے دھیمے سے کہا۔

''تم بھی جاؤ سو جاؤ، رات اتنی ہوگئی ہے۔'' میں نے ہولے سے کہا۔

''تمہیں کوئی تکلیف ہے میرے یہاں ہونے سے؟'' اس نے تنک کر پوچھا تو میں جواب نہ دے سکا، چپ چاپ بستر پر لیٹ گیا۔ وہ بھی خاموشی سے میرے پاؤں کی طرف بیٹھ گئی۔ کتنے ہی لمحے یونہی گزر گئے۔

''کچھ کہنا چاہتی ہو؟'' میں نے دھیمے سے پوچھا۔

''بالکل بھی نہیں، بس چند دن سے جو عادت پڑی گئی ہے نا تیرے پاس بیٹھنے کی، وہی پوری کررہی ہوں۔'' اس نے ناراض لہجے میں کہا تو میں بولا۔

''تم ایسا کرو، جاؤ، آرام کرو۔ گھر میں اتنے لوگ ہیں وہ کیا سوچیں گے۔''

اس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا اور اٹھ کر چل دی۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھ سے ناراض ہوکر گئی ہے مگر اس ناراضی سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

☆☆☆

صبح کا اُجالا پھیل چکا تھا۔ میں کمرے سے نکل کر صحن میں آگیا۔ صحن میں ایک میلہ سا لگا ہوا تھا۔ کافی ساری چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ شبانہ اور فرزانہ کے ساتھ شہباز بیٹھا ہوا تھا، ان کے پاس آفتاب، مدثر، شعیب اور جہانگیر بھی موجود تھے۔ ساوری اور رحماں مائی انہیں ناشتا دے رہی تھیں۔ انہوں نے اپنی مدد کے لیے بستی سے لڑکیاں بلالی تھیں۔ میں جیسے ہی صحن میں گیا، وہ بھی میری طرف دیکھ کر خاموش ہوگئے۔ میں نے خوشگوار حیرت سے دیکھا تو رحماں مائی بولی۔

''بھائی، پانی بھرا پڑا ہے، کپڑے بھی وہیں رکھے ہیں، جاؤ نہا دھو کر تیار ہوجاؤ۔ پر جلدی آنا، اگر سب کے ساتھ ناشتا کرنا ہے تو۔''

''او جاؤ یار، ہمیں کوئی بات کرنے دو۔'' جہانگیر نے باتھ روم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو مجھے لگا کہ ضرور کوئی میرے بارے میں بات ہورہی ہے۔ مجھے تجسس... ہونے لگا۔ ایسے میں گھر کے پھاٹک سے بختاور اور سانول بھی آتے ہوئے دکھائی دیے۔ میں سمجھ گیا کہ کوئی اہم بات ہے۔

میں نہا کر واپس آیا تو سب ناشتا کررہے تھے۔ میں بھی خاموشی سے ان کے ساتھ شامل ہوگیا۔ درمیان میں یونہی ہلکی پھلکی باتیں چلتی رہیں۔ جب سب ناشتا کرچکے تو چاچا نے چارپائی پر پڑے تکیے سے کمر لگاتے ہوئے بڑے سکون سے پوچھا۔

''اچھا یار بختاور، اور سانول تم بھی میری بات سنو۔ اگر علی زین کے ساتھ یہ چاروں بھی یہاں روہی سے چلے جائیں تو یہاں سب سنبھال لوگے؟''

ان کے یوں پوچھنے پر وہ کچھ دیر تک خاموش رہے، پھر بختاور ہی بولا۔ ''سچی بات تو یہ ہے کہ علی زین کے آنے سے پہلے ہم میرن شاہ اور پیروزاں کا مقابلہ نہیں کرپائے تھے۔ ہمارے بہت بندے مارے تھے انہوں نے۔ اس میں کوئی شک نہیں، وہ تھے بھی زور آور۔ ان کے علاوہ کوئی قبیلہ ہماری ٹکر کا نہیں تھا۔ اب حالات بدل گئے ہیں۔''

''تم کیا کہتے ہو سانول؟'' چاچا نے اس سے پوچھا۔

''ہم نے بڑے سخت حالات دیکھے ہیں۔ علی زین کے آجانے کے بعد اب تھوڑا سکھ کا سانس لیا ہے۔ باقی لڑنا تو حوصلہ ہے نا۔ میں نے نجانے کتنے برس یہاں ڈیرے کے گیٹ پر کھڑے ہوکر ان کی نگرانی کی ہے۔ میں باوجود اپنے اندر کی آگ کے انہیں نہیں مار سکا تھا۔ سچی بات ہے ہم کمزور نہیں تھے لیکن ہم میں حوصلے کی کمی تھی۔ اب آپ کے آجانے سے میں بہت کچھ سمجھا ہوں، آپ چاہیں تو یہاں کوئی بھی ہماری طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔'' سانول نے اس طرح کہا کہ چاچا سب کچھ سمجھ گئے۔ وہ کچھ

دیر سر ہلاتے رہے پھر گہری نگاہوں سے سب کی طرف دیکھ کر بولے۔

''آپ سب یہاں ہو، کیونکہ ہم سب ہی ایک خاندان ہیں، ایک فیملی ہیں، یہ تقدیر میں تھا یا قسمت کا لکھا ہوا تھا، جو بھی تھا، اب سچائی یہی ہے۔ میں ایک صلاح دیتا ہوں اور آپ کا مشورہ بھی مانگتا ہوں۔ کیا ساوری اور علی کی شادی کر دی جائے؟''

یہ ایک دم سے دھماکا نہیں تھا بلکہ اس بات کے پیچھے پوری طرح سوچا گیا ورنہ چاچا یہ بات کبھی نہ کہتے۔ میں پُرسکون رہا۔

''چاچا صاحب، یہ آپ ہم سے کیا پوچھتے ہیں، جنہوں نے شادی کرنی ہے ان سے پوچھیں، ہم تو آئے ہی ان کی شادی کے لیے ہیں۔ ورنہ میں اور یہ لڑکیاں یہاں ٹیلے دیکھنے نہیں آئے۔'' شہباز نے اپنی مسکراہٹ روکتے ہوئے ساری بات ایک دم سے کھول کر رکھ دی۔ تبھی انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔

''یار میں تمہیں بے وقوف سمجھتا تھا مگر تم اتنے احمق ہو گے، یہ مجھے پتا نہیں تھا۔''

''چاچا صاحب سچ کہہ رہا ہوں، اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔'' شہباز نے مصنوعی حیرت سے کہا تو چاچا بولے۔

''رائے لینا برائی نہیں، ساری بات کھول دینا بے وقوفی ہے۔''

ان کے اس تبصرے پر سبھی ہنس دیے۔ چاچا نے میری طرف دیکھا، ان کی نگاہوں میں سوال تھا۔ میں سمجھ گیا وہ کیا پوچھ رہے ہیں۔ میں نے دھیمے سے اپنا عندیہ دیتے ہوئے کہا۔

''جیسا آپ بہتر سمجھیں۔''

''مطلب تمہاری اپنی کوئی رائے نہیں، نہ پسند، نہ......'' انہوں نے کہنا چاہا تو میں جلدی سے بولا۔

''نہیں، نہیں، میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ مجھے ساوری پسند ہے۔ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''ہاں یہ ہوئی نا بات۔'' چاچا نے سنجیدگی سے کہا پھر ساوری کی طرف دیکھ کر بڑی شفقت سے پوچھا۔

''جی بیٹی، تم بتاؤ؟''

''جی میں بھی یہی چاہتی ہوں۔'' اس نے نرم سے لہجے میں سر جھکاتے ہوئے کہا تو چاچا نے پوچھا۔

''اب بتاؤ، کوئی دل میں خواہش، حسرت، کوئی آرزو، یا کوئی بھی شرط ہو، ابھی سے سب کہہ دو؟''

''چاچا جی میں نے سوچا بھی نہیں تھا جو مجھے مل گیا۔ میری زندگی کی حسرت تھی کہ میں اپنی ماں کا بدلہ لے سکوں، وہ میں نے لے لیا۔ میری خواہش تھی کہ علی زین مجھے مل جائے، وہ مجھے مل گیا، آرزو تھی کہ میں اپنے باپ کو ایک اچھی زندگی دے سکوں، اسے مل گئی، چاہے اس کی زندگی جتنی بھی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو رکی، پھر میری طرف دیکھ کر بولی۔

''بس ایک شرط ہے۔''

''کیسی شرط؟'' چاچا نے حد درجہ سنجیدگی سے پوچھا تو سبھی اس کی طرف دیکھنے لگے۔ انہیں توقع نہیں تھی کہ ساوری کوئی شرط بھی رکھے گی۔ وہ چند لمحے خاموش رہی پھر انتہائی سنجیدگی سے بولی۔

''میری شرط یہ ہے کہ جہاں علی رہے گا، میں وہیں رہوں گی۔''

''ایسا ممکن نہیں ہے۔'' میں نے فوراً اس کی بات کا جواب دے دیا۔

''کیوں ممکن نہیں ہے۔'' چاچا نے پوچھا پھر نپے تلے انداز میں بولے۔ ''ظاہر ہے بیوی وہیں رہے گی جہاں اس کا خاوند رہے گا۔''

''مگر آپ جانتے ہیں کہ میری زندگی......'' میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولے۔

''کیا ہو گیا زندگی کو؟ جہاں ساوری رہتی ہے، وہیں رہو۔ کہاں پر کیا ہو رہا ہے، چھوڑو اسے۔ اپنی زندگی سنوارو، کیا تمہارے نہ ہونے سے دنیا کے کام رُک جائیں گے۔ اب یہ تمہارا فیصلہ ہے تم یہاں روہی میں رہو یا لاہور جا کر رہو۔''

''تو پھر میں سوچ کر بتاؤں گا، مجھے کیا کرنا ہے۔'' میں نے نرمی سے کہا۔

''ٹھیک ہے تمہارے پاس ایک دن ہے، سوچ لو۔ کوئی زبردستی نہیں ہے۔ ہم ایک دن مزید ہیں یہاں پر۔'' چاچا نے فیصلہ کن لہجے میں کہا تو یوں لگا جیسے چاچا مجھے پرکھ رہے ہیں۔ میں نجانے کیوں جذباتی ہو گیا تھا۔

''چاچا، میں یہ مانتا ہوں کہ ساوری میری محبت ہے، یہ کوئی آج کی بات نہیں ہے، بچپن کے ان دنوں سے ہے، جب میں محبت کے بارے میں جانتا بھی نہیں تھا۔ لیکن مجھے آپ نے اس قابل بنایا کہ میں دوبارہ ساوری سے مل سکوں، اپنی محبت حاصل کر سکوں۔ آپ ہی میری ماں ہیں اور آپ ہی میرے باپ۔ جو بھی آپ فیصلہ کریں، مجھے

منظور ہے۔‘‘

’’میرا تو فیصلہ ہے کہ تم ساوری سے شادی کرو، اور اس کی شرط کے مطابق کرو۔ جہاں رہو، اسے ساتھ رکھو۔‘‘ چاچا نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

’’ٹھیک ہے مجھے ساوری کی شرط منظور ہے۔‘‘ میں نے حتمی لہجے میں کہا۔

’’جاگا بٹھا دو۔‘‘ شہباز نے اونچی آواز میں اعلان کرتے ہوئے کہا۔

’’اوئے تمہیں جاگے کا کیسے پتا ہے؟‘‘ مدثر نے حیرت سے پوچھا۔

’’یہی سن کر تو میں آیا ہوں، سنا ہے یہاں راجستانی ڈانس دیکھنے کو ملے گا۔‘‘ اس نے آنکھ مارتے ہوئے کہا تو سبھی ہنس دیے تو جہانگیر نے سر مارتے ہوئے غصے میں کہا۔

’’پہلے ایک راجستانی ڈانس نے کیا کچھ نہیں کر دیا۔‘‘

’’شادی آج ہی ہو گی۔ کل ہم واپس لاہور جا رہے ہیں۔‘‘ چاچا نے کہا تو سبھی نے ان کی طرف دیکھا، کسی کی مجال نہیں تھی کہ اُن کے حکم سے روگردانی کرے۔ سو وہاں پر سبھی کام بانٹنے لگے۔

دوپہر تک آس پاس کی ساری بستیوں والے اکٹھے ہو گئے۔ وہی دعوت پکانے والے اور کھانے والے بھی تھے۔ وہی براتی بھی تھے اور وہی لڑکی والے، ایک میلہ سج گیا تھا۔ دوپہر کے بعد میرا۔۔اور ساوری کا نکاح پڑھا دیا گیا۔ اس دن بابا خیر دین بہت خوش تھا۔ اس نے کئی بار اپنی اس خوشی کا اظہار کیا۔ وہ لوگوں سے باتیں کرتا رہا۔ سارا دن وہاں کھیل تماشے ہوتے رہے، لوگ خوشیاں مناتے رہے۔ چاچا نوٹوں کا ایک بیگ ساتھ لے کر آئے تھے۔ انہوں نے وہاں کے لوگوں میں وہ جی بھر کر بانٹے تھے۔

رات گئے تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ ہر طرف خاموشی طاری ہو گئی۔ میں ڈیرے پر سب کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا کہ رہائشی حصے کی طرف سے رحماں مائی کی آواز آئی۔ سانول نے مجھے بتایا تو میں اُدھر چلا گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔

’’اندر آجانا بھائی، اس بے چاری کا کیا قصور، کچھ باتیں اس نمانی ساوری سے بھی جا کے کر لے۔‘‘

’’او اچھا، کدھر ہے وہ؟‘‘ میں نے جان بوجھ کر پوچھا۔

’’اماں سئین والے کمرے میں۔‘‘ اس نے کہا اور کچھ دور کھڑی لڑکیوں کی طرف چلی گئی۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی خوش کن مہک نے میرے وجود کو سرشار کر دیا۔ کمرے کی ہیئت ہی بدلی ہوئی تھی۔ ایک بڑا سا بیڈ پڑا ہوا تھا۔ سارا کمرا پھولوں سے سجا ہوا تھا۔ سفید بیڈ شیٹ پر میرون رنگ کا لہنگا پہنے، گھونگھٹ نکالے بیٹھی تھی وہ۔ اس کے ارمان تھے۔ میں قریب گیا، اس کا ہاتھ پکڑا، اسے انگوٹھی پہنائی اور گھونگھٹ اٹھا دیا۔ وہ ہلکا ہلکا میک اَپ کیے کسی دوسری دنیا کی مخلوق لگ رہی تھی۔ میرے خیال میں سارا کچھ آج ہی بہاول پور سے یہاں تک پہنچا تھا اور خاموشی سے کمرا سجا دیا، جیسے صحرا میں نخلستان بنا دیا گیا ہو۔ میں نے یونہی شرارت سے انتہائی سنجیدگی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

’’او معاف کرنا، مجھے ساوری کے کمرے میں جانا تھا، غلطی ہو گئی۔‘‘

’’اے میں ہی ہوں۔‘‘ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا تو ہنستے ہنستے میرے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ میں وہیں بیڈ پر لیٹ گیا۔ میں بے تحاشا ہنسا۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا، ساوری نے میرا ہاتھ کب پکڑا۔ کچھ دیر بعد مجھے احساس ہوا تو وہ میری طرف بڑے جذباتی انداز سے میں دیکھ رہی تھی۔ ایک دم سے میری ہنسی رک گئی۔ میں نے خجل سا ہوتے ہوئے کہا۔

’’معاف کرنا ساوری، آج زندگی میں پہلی بار اتنا ہنسا ہوں۔‘‘

’’یہی میری زندگی کا حاصل ہے علی، اب چاہے ابھی موت آجائے، مجھے کوئی پروا نہیں۔‘‘ ساوری نے.... کہا۔ وہ کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی پھر اپنے ہونٹ میرے ہونٹوں پر رکھ دیے۔ رات نجانے کب سحر میں بدل گئی، ہمیں احساس ہی نہیں ہوا۔

ناشتے کے وقت پھر ایک میلہ لگا ہوا تھا۔ اس صبح بابا خیر دین بھی وہیں موجود تھا۔ میں سب کے درمیان ناشتا کرنا چاہتا تھا لیکن رحماں اور مہمان لڑکیوں نے کمرے میں ہی ناشتا لگا دیا۔ ساوری نئی نویلی دلہن تھی، مجھے اس پر بہت پیار آ رہا تھا۔ اس کی محبتیں تو تھیں، شدتیں بھی کمال کی تھیں۔

’’کیا دیکھ رہے ہو؟‘‘ اس نے مجھے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

’’تمہیں دیکھ رہا ہوں۔‘‘ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

’’اچھا علی! مجھے تم سے ایک بات کرنی ہے۔‘‘ اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''کہو، کیا بات ہے؟'' میں اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''علی، میں سب جانتی ہوں تمہارے بارے، مجھے پتا ہے تم ایک جگہ کبھی نہیں رہ سکتے۔ میں نے کل جو شرط لگائی تھی، چاچا کے کہنے پر لگائی تھی۔ انہوں نے ہی مجھ سے کہا تھا۔''

''میں یہ نہیں پوچھوں گا کہ کیوں لیکن مجھے یہ بتاؤ کہ انہوں نے یہ بات مجھ سے چھپانے کو کہا تھا۔'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، یہ نہیں کہا۔'' اس نے اپنی رو میں کہہ دیا۔

''پھر ٹھیک ہے۔'' میں نے اطمینان سے کہا تو لحہ بھر میری طرف دیکھتی رہی جیسے میری بات سمجھ رہی ہو پھر دھیمے سے بولی۔

''علی، مجھے بس چند دن دے دو۔ محض چند بھرپور دن، ایسے دن جو صرف میرے ہوں۔ پھر چاہے جو مرضی کرنا، جدھر مرضی جانا۔ مجھے تم سے کوئی شکوہ نہیں ہوگا۔ میں یہیں رہوں گی روہی میں۔ جانتی ہوں یہاں کیسے رہنا ہے۔''

میں اس کی بات کا جواب نہیں دے سکا، بس اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ نجانے اس کے من کیا کچھ چل رہا تھا۔

اس دن ہمیں لاہور کے لیے نکلنا تھا۔ نجانے کیوں میرا دل اداس ہو رہا تھا۔ میں گھر سے نکل گیا۔ میں پہلے دور ایک ٹیلے پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ اپنی بستی کی طرف دیکھتا رہا۔ اس وقت میں نے واضح طور پر محسوس کیا جیسے میرے اندر وہ بچہ اب شور نہیں مچاتا، نہ روتا ہے نہ بلکتا ہے، کوئی آگ مجھے گھیرے میں نہیں لیتی۔ کچھ دیر بعد میں وہاں سے ڈیرے کی جانب چل پڑا۔ میں ابھی ڈیرے سے تھوڑے فاصلے پر تھا کہ مجھے سامنے سے سانول آتا ہوا دکھائی دیا۔ میرے قریب آتے ہی بولا۔

''کدھر چلے گئے تھے۔ میں تمہیں دیکھنے نکلا تھا۔''

''بس یار ادھر باہر نکلا تھا، تم آؤ ذرا وہاں تک چلیں جہاں کھجور ہے، جہاں تمہاری بھیڑیں بیٹھا کرتی تھیں، جہاں ہم بچپن میں کھیلتے تھے۔'' میں نے خود واضح طور پر محسوس کیا کہ میں جذباتی ہو رہا ہوں۔ سانول میرے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے لگا۔ ہم اس کھجور کے نیچے آ کر کھڑے ہو گئے لیکن ہم نے ایک لفظ بھی ایک دوسرے سے نہیں کہا جیسے کچھ کہے بنا ہم سب کچھ سمجھ رہے ہوں۔ اچانک سانول نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ تبھی میں نے اسے گلے لگایا اور ایک دم سے پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

دوپہر سے ذرا پہلے ہم لاہور کے لیے روانہ ہو گئے۔ رحماں مائی، سانول، بختاور، چاچا سائیں، بابا خیر دین اور بستی والے ہمیں الوداع کہتے ہوئے خوش تھے۔ ان کے چہروں پر زندگی سے بھرپور مسکراہٹ تھی۔

لاہور آتے ہی نجانے کیوں مجھے ایک دم سے یہاں کا ماحول اجنبی لگا۔ حالانکہ میں نے لڑکپن اور جوانی یہیں گزاری تھی۔ تب رونق ہوا کرتی تھی۔ اب آیا تو لگا جیسے رش ہے۔ انسانوں کا ایک ہجوم ہے۔ میں خود پر حیران تھا۔ مجھے یہاں سے گئے اتنا عرصہ نہیں ہوا تھا۔ روہی میں تھوڑا ہی وقت گزارا تھا۔ شاید جنم بھومی سے محبت لاشعور میں بسی ہوتی ہے یا فطرت کا حصہ بن جاتی ہے۔

وہ چاروں لاہور آتے ہی غائب ہو گئے۔ ہاں مگر شہباز مجھے روزانہ ملنے آتا رہا۔ ہم تھوڑا وقت ساتھ رہتے پھر وہ چلا جاتا۔ مجھے رہنے کے لیے ماڈل ٹاؤن میں ایک گھر مل گیا تھا۔ وہاں میں ساوری کے ساتھ رہتا تھا۔ ہمارے ساتھ چند لوگ اور تھے، جو گھر کے مختلف کام کرتے تھے۔ ان میں شبانہ اور فرزانہ بھی شامل تھیں۔ وہاں آ کر مجھ پر آشکار ہوا کہ وہ لڑکیاں بھی ہمارے ہی قبیلے سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس کا پتا اس دن چلا جب ایک صبح ساوری نے مجھ سے کہا۔

''علی، تم نے مجھے بتایا تھا، کالج کے دنوں میں تمہاری ایک دوست ہوا کرتی تھی، شاید اس کا نام تم نے صائمہ بتایا تھا۔''

''ہاں تھی، بات کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ تمہیں مغل بادشاہ کے دربار پر لے کر جایا کرتی تھی۔'' ساوری نے ہنستے ہوئے کہا مجھے اس کے طنز کی سمجھ آ رہی تھی لیکن میں نے انجان بنتے ہوئے کہا۔

''وہ مغل بادشاہ تو تھا، جہانگیر اس کا نام تھا، لیکن اس کا دربار نہیں ہے، اس کا مزار ہے وہاں پر، اس کے ساتھ دراصل ایک باغ ہے۔''

''تو چل مجھے وہ جگہ دکھا کر لا۔'' اس نے ایک دم سے کہا۔

''ٹھیک ہے ہو جاؤ تیار، میں لے جاتا ہوں۔'' میں نے عندیہ دیا تو وہ اٹھ کر تیار ہونے لگی۔

جس وقت میں نے گاڑی نکالی تو شبانہ اور فرزانہ بھی تیار ہوئی ساتھ کھڑی تھیں۔ میں نے ان کی طرف حیرت سے دیکھا اور پھر سکون سے پوچھا۔

’’ساوری، یہ بھی جائیں گی؟ تم نے کہا ہے ان سے؟‘‘

’’میں نے کب کہا ہے، یہ تو چاچا عبدالمجید کی طرف سے یہاں پر ہیں۔‘‘ اس نے کہا تو میں چونک گیا۔ تبھی میں نے ان دونوں کی طرف دیکھا تو شبانہ مسکراتے ہوئے بولی۔

’’ہم ساوری کو اکیلے کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔‘‘

’’اوہو، تو یہ بات ہے ٹھیک ہے، چلو پھر۔‘‘ میں نے کہا اور ساوری کے ساتھ گاڑی کی پچھلی نشست پر آن بیٹھا۔

اگرچہ میں ساوری کے ساتھ بھرپور وقت گزار رہا تھا، اسے باہر پھرانے لے جاتا، کبھی شاپنگ، کبھی ڈنر، کبھی ویسے ہی آوارہ گردی لیکن تقریباً دو ہفتے گھر میں رہنے سے میں اُکتا گیا تھا۔ انہی دنوں شام کے وقت چاچا اور شہباز آ گئے۔ ایویں کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد ہم نے ڈنر کیا۔ تبھی وہیں بیٹھے بیٹھے چاچا نے مجھ سے کہا۔

’’جب بھی تمہارا کوئی کام کرنے کو جی چاہے تو بتانا۔‘‘

’’دل تو کب کا کر رہا ہے۔‘‘ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

’’میں جانتا تھا تم گھر میں نہیں ٹک سکتے، خیر کل آفس آ جانا، تمہیں کوئی ریسرچ ورک دیتے ہیں، یہ شہباز بھی وہیں ہے۔‘‘ انہوں نے عام سے لہجے میں کہا۔

’’ٹھیک ہے، کل آ جاؤں گا۔‘‘ میں نے کہا تو مجھے لگا مصروفیت مل گئی۔

اگلے دن جب میں آفس جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا تو ساوری نے میری بھرپور مدد کی۔ میں نے کار نکالی اور آفس جا پہنچا۔ بہ ظاہر وہ امپورٹ ایکسپورٹ کمپنی تھی لیکن وہاں پر اردگرد کے حالات پر نہ صرف نگاہ رکھی جاتی تھی بلکہ ان کا تجزیہ بھی کیا جاتا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ بس وہاں گپ شپ ہوگی لیکن وہاں اچھا خاصا کام تھا۔ ایسی ہی ایک صبح آفس جاتے ہی شہباز نے میرے سامنے ایک فائل رکھتے ہوئے کہا۔

’’اسے پڑھو، جب پڑھ لو تو پھر اس پر بات کرتے ہیں۔‘‘

’’تم نے پڑھی ہے؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’پڑھی ہے اسی لیے تمہیں دے رہا ہوں نا۔‘‘ اس نے سنجیدگی سے کہا۔

’’تو بتا دو، کیا ہے اس میں؟‘‘ میں نے کہا تو وہ بولا۔

’’تم پڑھو گے نا، تبھی سمجھ آئے گی۔ اس میں دراصل ہے کیا، یہی تمہیں پڑھانا ہے۔ تم اسے پڑھو، میں تمہارے لیے کافی بھیجتا ہوں۔‘‘

’’اوکے، میں دیکھ لیتا ہوں۔‘‘ میں نے کہا اور فائل کھول لی۔ وہ کمرے سے جا چکا تھا۔ فائل پڑھتے ہوئے مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ شام کب ہو گئی۔

اس فائل میں ’کلیان جی‘ نامی تنظیم کے بارے میں وہ معلومات درج تھیں جس کے بارے میں ابھی تک میں نہیں جانتا تھا۔ اس میں سب سے زیادہ چونکا دینے والی معلومات فائل کے آخری صفحات پر تھیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ تنظیم بھارتی پنجاب اور راجھستان کے کچھ علاقوں تک محدود تھی۔ اس کا اصل مقصد جو بھی تھا، اس سے کام تو بھارتی خفیہ ایجنسی ہی لیتی تھی۔ اس تنظیم کی سب سے زیادہ مہارت اغوا... دہشت گردی اور قتل تھا۔ اس کا زیادہ تر اثر یہیں راجھستان اور پنجاب میں تھا۔ لیکن کچھ عرصے سے یہ مغربی پنجاب میں بھی اپنا اثر و رسوخ بنا گئے تھے۔ روہی میں یہ تنظیم زیادہ دکھائی نہیں دی لیکن یہ فائل بتا رہی تھی کہ ان کا اثر و رسوخ مغربی پنجاب تک آن پہنچا ہے۔ ابھی تک کوئی بھی ایسا ’اہم‘ شخص سامنے نہیں آیا تھا جس کے ذریعے کلیان جی کے لوگ مغربی پنجاب تک پہنچے تھے، آخری صفحات پر مجھے، چند تصویروں کے ساتھ ایک ایسی تصویر دیکھنے کو ملی جس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ وہ پوجا کی تصویر تھی۔ وہ یہاں کیسے تھی اور کہاں تھی، کچھ پتا نہیں تھا۔

شام ڈھلے میں چاچا عبدالمجید کے پاس جا پہنچا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ میرے ہی انتظار میں ہیں۔ میں جیسے ہی ان کے پاس جا کر بیٹھا، وہ مسکراتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولے۔

’’لگتا ہے اس فائل نے اثر دکھا دیا ہے جو تم نے آج پڑھی ہے۔‘‘

’’جی۔‘‘ یہ کہہ کر میں چند لمحے خاموش رہا پھر پوچھا۔

’’کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں اُن کے پیچھے جاؤں؟‘‘

’’تم اُن کے پیچھے کیا جاؤ گے، وہ تمہاری تلاش میں یہاں تک آ گئے ہیں۔‘‘ انہوں نے عجیب سے لہجے میں کہا تو میں نے بے ساختہ کہا۔

’’میری تلاش میں...... میں سمجھا نہیں؟‘‘

’’دیکھو، میں تمہیں اب تفصیل سے بتاتا ہوں۔‘‘ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوئے پھر کہتے چلے گئے۔

’’کچھ عرصہ پہلے تمہیں یاد ہے، دو بھارتی یہاں آئے تھے جنہیں تم نے پولیس کے حوالے کیا تھا۔ بہت کچھ اُن سے ملا،

انہوں نے کافی کام کی باتیں بتائیں۔ جس سے ان کے نیٹ ورک کو سمجھنے میں مدد ملی، وہ اب بھی ہمارے پاس ہیں۔ انہوں نے راما کانت کی سندر بستی کو اپنا ٹھکانا بنانے کی کوشش کی، یہ دو بندے وہیں سے تم تک پہنچے تھے۔ تم نے عقل مندی کی جو اُن دونوں کو پولیس کے حوالے کیا۔ ان کی تنظیم کا خیال یہی ہے کہ دونوں مر چکے ہیں مگر وہ یہاں عیش و آرام سے ہیں۔"

"کہاں ہیں وہ، میں اُن سے مل سکتا ہوں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں کیوں نہیں۔" انہوں نے یہ کہا اور پھر بولے۔ "راما کانت کے پاس وہ بیوپاری بن کر ہی آئے تھے۔ لیکن اس کے بیٹے کو خبر تھی۔ ان کا ایک آلہ کار چھوٹو رام تم سب کی ٹوہ لے رہا تھا۔ یہاں تک مجھے پتا تھا۔ میں نے ساوری کو بھیجا اور اسے کسی نہ کسی طرح چھوٹو رام تک رسائی کرنے کا کہا۔ خیر اس نے جو کیا، وہ میرے کہنے پر کیا، اب اس سے پوچھنا مت۔"

"نہیں پوچھوں گا۔" میں نے سنجیدگی سے کہا تو چاچا کہنے لگے۔

"سانول کے ذریعے اسے رودھی مل گئی۔ وہاں کی خبریں آنا شروع ہو گئیں۔ یہ تھی وہ وجہ...... جس کے لیے سانول کی شادی پر اسے بلایا گیا تھا۔ رودھی کا تم لوگوں کے درمیان ہونا کسی دھماکے سے کم نہیں تھا اور پھر وہ ہو گیا، جو میں چاہتا تھا۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ تم اسی رات یہ سب کر دو گے لیکن آخر کار تمہیں کرنا وہی تھا۔ اسی رات جب راما کانت کو تم ڈیرے پر لے آئے تو انہیں ڈرایا بھی بہت گیا۔ سو اس کا بڑا بیٹا معافی مانگنے پر مجبور ہو گیا کہ کسی طرح میرے باپ کو واپس کر دیا جائے لیکن اسے کوئی خبر بھی نہ ہو۔ اس کے عوض جو کچھ کہیں، وہ کرنے کو تیار ہیں پھر اس نے مجھے سب بتایا۔"

"کیا بتایا؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"یہی کہ کئی افراد علی زین کی تلاش میں آ چکے ہیں، ان کو روہی آنا ہے۔ کب آتے ہیں، یہ پتا نہیں۔ دوسرا ان کا ٹھکانا یہیں لاہور کے آس پاس ہے، ممکن ہے وہ وہیں ہوں۔" انہوں نے سنجیدگی سے بتایا۔

"کچھ پتا چلا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں، میں شہباز اور ان لڑکیوں کو اسی لیے ساتھ لے کر گیا تھا۔ انہوں نے کافی کوشش کی۔ خیر، اب وہ لوگ کب اور کہاں سے نمودار ہو جائیں، یہ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ میں تمہیں بتاتا ہوں، یہ سب کیسے ہو گیا؟"

"جی کیسے ہوا؟" میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔

"ہماری دنیا میں جب بھی کوئی معرکہ رونما ہوتا ہے تو اس کے مضر اثرات بھی ہوتے ہیں۔ جو بندہ سامنے آتا ہے اگر وہ کہیں مارا جائے تو اور نہ مارا جائے تب بھی، یہ پتا لگ جاتا ہے کہ وہ کون لوگ تھے۔ دوسرا یہ ہوتا ہے دشمن کا اندازہ ہو جاتا ہے، اور تیسرا جو تنظیم بھی اپنا ہدف پورا کر لیتی ہے، اس کا معیار سامنے آجاتا ہے کہ وہ کتنے پانی میں ہے۔ میں نے صورتِ حال تمہارے سامنے رکھ دی ہے۔ اب تمہارے پاس آپشن ہے کہ تم ان کا سامنا کرنا چاہتے ہو یا نہیں؟" آخری فقرہ کہتے ہوئے انہوں نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"یہ کیا بات کہہ دی آپ نے؟" میں نے دبے دبے احتجاجی لہجے میں کہا۔

"نہیں، میرا مطلب ہے تم پتایا جانا چاہو گے، وہاں سے اپنا کام کرو گے یا یہاں سے انہیں کاؤنٹر کرو گے؟ جیسے تمہاری مرضی، یہ سب کرنا تم کو ہی ہے۔ انہیں نہ صرف تلاش کرنا ہے بلکہ ان کا یہاں موجود نیٹ ورک بھی ختم کرنا ہے، یہ لوگ کینسر کے مانند ہیں۔ ان کا وجود برداشت نہیں کیا جا سکتا۔" چاچا آخری لفظ کہتے ہوئے ایک دم سے جذباتی ہو گئے۔

"جیسے آپ کہیں۔" میں نے تذبذب میں کہا تو وہ بولے۔

"تمہیں اب تک فیصلہ کرنا نہیں آیا؟"

"میں یہیں سے دیکھوں گا۔" میں نے ایک دم سے فیصلہ دے دیا۔

"گڈ...... تم ابھی نکل جاؤ، شہباز تمہارے ساتھ ہو گا۔" چاچا نے کہا تو میں کوئی لفظ کہے بنا اٹھا اور کمرے سے نکلتا چلا گیا۔ جب تک میں پورچ میں آیا، میں نے شہباز کو کال ملا لی تھی۔

☆☆☆

راوی پُل پار کرنے تک میں سوچتا چلا گیا۔ اگر میں اکیلا ہوتا تو اب تک کلیان جی وغیرہ کے چکر میں آ گیا ہوتا۔ یہ چاچا عبدالمجید ہی تھے جنہوں نے بڑی سہولت سے معاملے کو سنبھال لیا تھا۔ مجھے گمان بھی نہیں تھا کہ ساوری اس حد تک معاملات کو سمجھ سکتی ہے۔ نجانے کیوں، اس معاملے میں وہ میرے سامنے نہیں کھلی تھی۔ خیر جو بھی تھا، اس نے بڑے سلیقے سے اپنا کردار ادا کیا۔ وہ سب کس طرح ہمیں

لاہور لے آئے تھے۔ مجھے احساس ہی نہیں ہونے دیا ورنہ اب تک شاید میں جذبات میں پھنسا رو ہی میں ہی ہوتا۔

راوی پُل پار کرتے ہی بائیں جانب مجھے شہباز کی فور وہیل دکھا دی۔ میں نے کار بالکل اس کے قریب روک دی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر شہباز بیٹھا ہوا تھا۔ میں اترا اور فور وہیل تک جا پہنچا۔ پسنجر سیٹ سے ایک لڑکا اتر چکا تھا، میں نے کار کی چابی اسے تھمائی اور خود شہباز کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس نے فور وہیل بڑھا دی۔ تھوڑا سا آگے بڑھنے کے بعد اس نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔

''سنا فیر کیا سنے گا؟ گیت، دوہا ماہیا یا پھر کوئی سڑا ہوا گانا؟''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''او یار تم تو یوں ساتھ میں بیٹھے ہوئے ہو جیسے کوئی روبورٹ ہو، یار جو چند لمحے میسر ہیں، انہیں خوب انجوائے کرو۔'' اس نے لہراتے ہوئے کہا۔

''تمہارا کیا خیال ہے میں سیٹ پر بیٹھا ناچنے لگوں؟'' میں نے جل کر پوچھا۔

''ناچو نہیں لیکن موج میں تو آسکتے ہو۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو خاموش ہوا پھر ہنستے ہوئے بولا۔ ''میں نے سنا ہے تم نے پوجا کے ساتھ تھوڑا وقت بھی گزارا ہے، مطلب اکیلے بھی رہے ہو اس کے ساتھ؟''

''ہاں یار، اسے دیکھ کر نجانے کیوں مجھے سانپ کا خیال آنے لگتا ہے۔ دیکھنے میں بڑی خوبصورت ہے۔ بالکل شفاف جلد والی، ہاتھ لگے تو اسے سلوٹ پڑ جائے مگر اتنی ہی زہریلی ہے۔ بس یوں سمجھ لو، کچھ عشق کیا، کچھ کام کیا، دونوں ہی پورے نہیں کرسکا۔'' میں نے خوشگوار لہجے میں کہا۔ کیونکہ میں سمجھ گیا تھا کہ شہباز کیا چاہتا تھا اس لیے فوراً اپنے رویے میں تبدیلی کر لی تھی۔ ایسا کر کے اچھا لگا مجھے۔

''اب اگر وہ تمہارے سامنے آگئی، تو کیا کرو گے، عشق یا کام؟'' اس نے ہنستے ہوئے پوچھا تو میں ہنستے ہوئے بولا۔

''عشق تو شاید نہ ہوسکے، اب سیدھے کام ہی ہوگا۔ وہ جو میرے ہجر میں یہاں تک آگئی ہے، اس کا تھوڑا بہت صلہ تو اسے ملنا چاہیے۔''

''یار ویسے ایک بات ہے، کیا وہ پوجا ہی ہوسکتی ہے کوئی دوسری بھی تو ممکن ہے، جسے اس کی جگہ بھیج دیا گیا ہو۔'' اس نے یونہی بات بڑھانے کی غرض سے کہا تو میں نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''یار وہ پوجا ہو یا پوجا کا عکس، کوئی بھی ہو، بھیجنے والوں نے تو پوجا ہی کو بھیجا ہے نا، ہمیں تو اسے ہی دیکھنا ہے۔''

''ہاں یہ تو ہے۔'' اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''اچھا چھوڑ پوجا کو، یہ بتا، جب تم ہاسٹل میں میرے پاس آئے تھے، تب کچھ اور ہی شے تھے، اب بالکل بدل گئے ہو، ایسا کیا کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''تم بھی تو بھی مریل سے ہاکی کے کھلاڑی تھے، پھر بن گیا شہر کا ایک غنڈا، اب ایک اور ہی شے ہو۔ انسان ترقی کرتا ہے یا تنزلی، یہ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔'' اس نے دکھی سے لہجے میں کہا اور پھر ایک دم سے قہقہہ لگا دیا۔

''ہاں یار ہم یہ سمجھ ہی نہیں سکتے۔'' میں نے دھیمے سے کہا۔

''لیکن ایک بات ہے، زندگی جیسی بھی ہے، جو بھی ہے اس کی زیادہ ٹینشن نہیں لینی چاہیے۔ یہ ہے ہی بے وفا...... یہ اس کی مرضی ہے جتنی دیر ہمارے ساتھ رہے، جب جائے گی تو اپنی مرضی سے جائے گی۔'' اس نے کہا پھر ہنستے ہوئے بولا۔ ''لو ہم پھر سے اسی کھردرے موڈ میں آگئے۔''

''یہی زندگی ہے پیارے، گھما کے اپنے محور پر لے آتی ہے۔'' میں نے کہا اور جاندار قہقہہ لگا دیا۔ میری ٹینشن واقعی ہی ختم ہو گئی تھی۔ شہباز کا ساتھ بہت شاندار لگا تھا مجھے۔ تبھی وہ بولا۔

''ہے نا، کتنی ظالم ہے، کسی مغرور محبوبہ کی طرح۔''

''بالکل، اچھا یہ بتا، ہم جا کہاں رہے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''یار یہ ننکانہ صاحب شہر کے ساتھ ہی جڑانوالہ روڈ پر ایک گاؤں ظفروال ہے۔ وہاں میرا ایک یار رہتا ہے، اس سے ملنے جانا ہے، تھوڑی گپ شپ کرتے ہیں وہاں جا کر۔'' اس نے عام سے لہجے میں بتایا۔ پھر وہ مجھ سے اپنے بارے میں باتیں کرنے لگا۔

''کتنی دور ہے یار۔'' میں نے کافی دیر بعد پوچھا۔

''بس پہنچ گئے، وہ سامنے پیٹرول پمپ ہے نا اس سے پہلے ہی ہم بائیں مڑ جائیں گے۔'' اس نے کہا اور اگلے ایک منٹ بعد ہم دائیں جانب مڑ گئے۔ گاؤں میں مختلف دکانوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے بالکل چوک میں مسجد کے سامنے جا ٹھہرے۔ ''لو بھئی پہنچ گئے۔''

زاہد حمید ہمارے انتظار ہی میں تھا۔ اس نے باہر والا

کمرا کھلوایا تو ہم اس میں جا بیٹھے۔ عام سی گپ شپ میں کھانا لگ گیا، ہم کھانے کے دوران باتیں کرتے رہے، خوب جی بھر کر کھا چکے تو چائے پیتے ہوئے شہباز نے کہا۔

''یار وہ تیرے گاؤں میں مٹھا سائیں کا میلہ لگا کرتا ہے۔''

''ہاں نا، لیکن اس میلے میں تو ابھی دیر ہے' وہ ٹھنڈے موسم میں لگتا ہے، کیوں خیر ہے؟'' اس نے پوچھا تو شہباز نے عقیدت سے کہا۔

''نہیں یار اس میلے پر بڑے لوگ آتے تھے۔ ان میں ایک درویش خاتون بھی تھی، سنا ہے بہت پہنچی ہوئی ہستی تھی۔ یہاں شاید کسی کے ہاں مہمان آئی ہوئی تھی۔ لوگ کہتے ہیں بڑی اللہ والی خاتون تھی۔''

''ہاں یار آئی تو تھی، پتا نہیں اب ہے کہ نہیں۔ اصل میں وہ مٹھا سائیں کے ڈیرے پر نہیں آئی تھی۔ یہاں ساتھ ہی ایک گاؤں ہے، وہاں ایک گھر ہے، وہ درویش خاتون ان کے ہاں آئی تھی۔ اب پتا نہیں وہاں ہے کہ نہیں۔'' اس نے سوچتے ہوئے کہا۔

''یار اس کے بارے میں معلومات مل سکتی ہیں؟'' شہباز نے تیزی سے پوچھا تو زاہد نے حیرت سے سوال کیا۔

''خیریت ہے، تمہیں اس سے کیا کام؟''

''یار ہمارا ایک دوست ہے، اس کی بیوی پر کوئی سایہ وایا ہے، سنا ہے کہ وہ خاتون اس کا علاج کر لیتی ہے۔ ہم نے سوچا......'' یہ کہتے ہوئے اس نے جان بوجھ کر اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

''اچھا میں پتا کرواتا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''نہیں تم ہمارے ساتھ چلو، وہیں سے پتا کر کے ہم واپس نکل جائیں گے، تم گھر آ جانا، ہم مل بھی لیں گے اگر وہ وہاں ہوئی تو......'' شہباز نے جلدی سے کہا تو زاہد برا سا منہ بنا کر بولا۔

''جب بھی آتے ہو، ہوا کے گھوڑے پر سوار، رات رہو، گپ شپ کرتے ہیں، اس کا پتا کروا لیتے ہیں، صبح جا کر مل لیں گے۔ اتنی کیا ایمرجنسی ہے؟''

''اوئے تجھے پتا تو ہے میرا باس کتنا کھڑوس بندہ ہے چھٹی ہی نہیں دیتا، اب بھی ان کی گاڑی لے کر آیا ہوں تاکہ واپسی ہو سکے، تو چل نا یار۔'' شہباز نے کچھ اس طرح کہا کہ جیسے ابھی اسے نوکری سے نکال دیا جائے گا، تبھی زاہد نے ...... اسے اطمینان دلانے والے انداز میں کہا۔

''اچھا اچھا چلتے ہیں۔''

یہ کہتے ہی وہ اٹھ گیا اور اگلے دس منٹ بعد اس کا ڈرائیور گاڑی نکال چکا تھا۔ ہم پھر واپس ننکانہ صاحب روڈ پر چل دیے، کوئی چند کلومیٹر کے بعد وہ دائیں جانب مڑ گیا اور پھر مطلوبہ گاؤں آ گیا۔ کافی پرانا گاؤں لگ رہا تھا۔ جن اینٹوں سے مکان بنے ہوئے تھے، وہ اب نہیں بنتی تھیں۔ وہ گھر یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی چھوٹی سی حویلی ہو۔ لکڑی کے پھاٹک سے گزر کر جب زاہد نے اپنی کار روکی تو سامنے کھڑے دو جوان الرٹ ہو گئے۔ ان کے الرٹ ہونے کا جو انداز تھا، اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کوئی تربیت یافتہ لوگ ہیں۔ عام آدمی کو ذرا بھی پتا نہیں لگ سکتا تھا کہ وہ کتنے خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔ زاہد کو کار سے اترتے دیکھ کر وہ کچھ ڈھیلے پڑ گئے۔ ہم بھی اتر کر اس کے ساتھ ہو گئے۔ ایک عام سے کمرے میں ہمیں بٹھایا گیا جیسے گاؤں کے ڈیرے ہوتے ہیں ..... وہاں کرسیاں، چارپائیاں اور موڑھے پڑے ہوئے تھے۔ وہاں چند آدمی پہلے ہی سے بیٹھے تھے۔ اگلے دو منٹ میں لحیم شحیم شخص اندر آ گیا۔ اس نے کرتے کے ساتھ دھوتی باندھی ہوئی تھی، سر سے ہلکا سا گنجا تھا، بڑی بڑی بے تحاشا پھیلی مونچھیں اور گول سے چہرے والا تھا۔ اپنی شخصیت کے برعکس اس نے نیازمندانہ انداز میں کہا۔

''او معاف کرنا یار زاہد، مجھے دو منٹ دیر ہو گئی، میں بی بی کے پاس بیٹھا ہوا تھا، بس آتے آتے دیر ہو گئی۔''

''کوئی بات نہیں یار اسلم، بس یہ میرے دوست لاہور سے آئے تھے مجھے ملنے۔ یونہی ذکر ہوا تو میں انہیں تمہارے پاس لے آیا۔ ہم کون سا بتا کر آئے ہیں۔'' اس نے بھی دھیمے انداز میں بات کی۔

''نہیں، نہیں یار، اچھا بتا مہمان کیا پسند کریں گے، چائے یا پھر لسی وغیرہ، کھانا بالکل تیار ہے۔'' اس نے نہایت خلوص سے کہا۔

''سب کچھ کھا پی کر آئے ہیں، بس ہمیں بھی جلدی جانا ہے، تم سے بس اُس خاتون درویش کے بارے میں پوچھنا تھا، جو یہاں آئی تھی۔'' زاہد نے بے تکلفی سے کہا۔ اسے کون سا پتا تھا کہ ہم نے دراصل کیا پوچھنا ہے۔ اسلم جٹ نے بھی فوراً ہی سادہ سے انداز میں کہا۔

''وہ آئی تو تھی یہاں۔ ہمارے اس علاقے میں۔ دو چار دن ہمارے پاس بھی رہی ہے پھر چلی گئی تمہارے گاؤں، میلے پر گئی تھی انہی دنوں۔''

''اب نہیں مل سکتی، کہاں ہے وہ؟'' میں نے پُرسکون

انداز میں پوچھا۔

"دراصل، وہ یہاں کی ہے نہیں، وہ تھی پار پنجاب کی۔ وہاں ہے نا فرید کوٹ، اس کے قریب کوئی جگہ ہے سادھووان، وہاں کی رہنے والی ہے، اصل میں وہ سکھنی ہے۔ وہ اپنی کوئی تیرتھ یاترا کرتی پھر رہی ہے۔ وہ یہاں پہلے دربار صاحب آئی تھی، پھر اس علاقے میں پھرتی رہی، اب پتا نہیں کہاں ہے۔ سیلانی روح تھی کوئی۔" اس نے پوری تفصیل سے ہمیں بتایا۔

"مطلب اب اس کا کوئی اتا پتا نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں بندہ کوشش کرے تو پتا لگ سکتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے وہ پھر ہمارے پاس یا ارد گرد کہیں آجائے۔ سیلانی روح جو ہوئی......" اسلم جٹ نے پھر اپنی سادگی میں کہا تو مجھے بہت ہنسی آئی، جسے میں نے بڑی مشکل سے قابو کیا، بھی میں نے کہا۔

"چلو جی اگر آسانی سے پتا لگ جائے تو ٹھیک، یا پھر یہاں کہیں آجائے تو بتایئے گا ضرور۔"

"خیر تو ہے نا؟" اس نے پوچھا تو زاہد نے وہی بات کہہ دی جو کچھ دیر پہلے اسے شہباز نے بتائی تھی۔ اس پر باتیں ہوتی رہیں۔ اتنے میں چائے آگئی۔ بات وہاں سے نکلی تو اردگرد کی باتیں بھی ہونے لگیں۔ میں جانتا تھا کہ شہباز بڑا چرب زبان ہے۔ اس نے ایسی ایسی باتیں چھیڑیں جس سے پتا لگ گیا کہ اسلم جٹ کے نہ صرف پار پنجاب میں تعلقات ہیں بلکہ یہاں بھی ایک خاص مافیا سے تعلق رکھتا ہے۔ جس کا کام بدمعاشی، غنڈا گردی، ڈکیتی وغیرہ کے علاوہ منشیات سے بھی تھا۔ تقریباً دو گھنٹے بعد جب ہم وہاں سے اٹھے تو تھوڑا بہت منظر واضح ہو چکا تھا۔

زاہد واپس چلا گیا اور ہم انتہائی تیزی سے اس علاقے سے نکل کر ننکانہ صاحب آگئے۔ راستے میں ہم اسلم جٹ کی بات پر سیر حاصل باتیں کرتے رہے تھے۔ وہ اتنا سادہ اور معصوم نہیں تھا، جتنا وہ بظاہر نیاز مند دکھائی دے رہا تھا۔ ممکن ہے کہ وہ سچ کہہ رہا ہو اور یہ بھی بعید نہیں تھا وہ ہمیں 'گولی' دے گیا ہو۔ اس سے بہر حال یہ پتا چل گیا تھا کہ وہ کسی خاتون گیانی کے روپ میں یہیں کہیں موجود ہے ورنہ اب تک راما کانت کی طرف سے کوئی اطلاع آجاتی اگر وہ روہی میں کہیں ہوتی۔

اس وقت رات کا دوسرا پہر چل رہا تھا۔ جب ہم رائے بلار پارک کے سامنے کی سڑک پر سے مڑ کر اندر چلے گئے۔ تھوڑا آگے جا کر ایک دو منزلہ گھر تھا۔ شہباز نے فوراً وہیل روکی ہی تھی کہ گیٹ کھل گیا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ہماری آمد سے مطلع تھے اور ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ ہم اندر چلے گئے۔ وہ چھوٹا سا پورچ تھا لیکن اتنی گنجائش تھی کہ مزید ایک گاڑی کھڑی کی جا سکے۔ میری کار وہیں کھڑی تھی۔ کچھ نوجوان ہمارے بیک اَپ پر تھے۔

وہ رات وہیں گزار کر صبح ناشتے کے بعد ہم پھر نکل پڑے۔ اس بار ہمارا رخ بائی پاس کی طرف تھا۔ ہم بائی پاس روڈ پر جا رہے تھے جہاں سے کوٹ ہیرا سنگھ جانا تھا، جس سے آگے تقریباً چھ کلومیٹر پر گاؤں واقع تھا۔ ہم روڈ سے اترے تو ایک چھوٹی سی پختہ سڑک پر آگئے جو سیدھی گاؤں کو جاتی تھی۔ ہمارے دونوں جانب ہرے بھرے کھیت تھے۔ کہیں دور ونزدیک لوگ کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ عام گزرگاہ ہونے کے باعث ان کی ہماری طرف توجہ ہی نہیں تھی۔ قطاروں میں لگے شاداب درخت، گہرا سبزہ، پھولوں بھری ڈالیاں نگاہوں کو ٹھنڈک دے رہی تھیں۔ قدرت کا ایک مسحور کرنے والا حسین نظارہ ہمارے سامنے تھا جو مجھے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ تبھی میں نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

"قدرت کے بھی کیا نظارے ہیں یار، ایک طرف صحرا اور یہاں سبزہ ہی سبزہ، معطر ہوا... بھرپور سانس لینے کو جی چاہتا ہے۔"

"دیکھ لو پھر۔ رب کی مخلوق ہر جگہ موجود ہے۔ پہاڑوں پر، ندی نالوں پر، گرمی میں برف باری میں سب جگہ۔" شہباز نے خوشگوار لہجے میں کہا۔

"ہاں یہ تو ہے، ہر جگہ کا اپنا رنگ ہے۔" میں نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

"اب یہاں پر نگاہ اور سوچ کا فرق دیکھو، کوئی کہتا ہے کہ انسان کی کیا اوقات، اسے جہاں رب رکھتا ہے وہ وہیں رہتا ہے، لیکن دوسرا ازاویہ نظر یہ ہے کہ انسان ہی اس دنیا کو خوبصورت بنا رہا ہے۔" وہ کھوئے ہوئے لہجے میں بولا۔

"اور کچھ لوگ اس دنیا کو ہی عذاب بنا رہے ہیں۔ یہ رہنے کے لیے بہترین جگہ ہے۔ جب تک زندگی ہے، اگر انسانوں کی طرح رہا جائے۔ مگر مکروہ سوچ والے، خبیث لوگ اس دنیا کو جہنم بنا دینے پر تلے ہوئے ہیں۔" میں نے نجانے کس رو میں کہہ دیا تو وہ پھیکی سی ہنسی ہنستے ہوئے بولا۔

"یار یہ سب اپنی اپنی سوچ ہے نا، جو کسی کے دماغ

میں بھر دی جائے، ہم اپنے آپ کو نہیں سمجھتے، ہم انسان کو نہیں سمجھتے، اس کی فطرت سے واقف نہیں ہو رہے، بس اندر جو شر کی قوت ہے، اسے ہی بڑھاتے چلے جا رہے ہیں اور اپنی ہی نوع کی بربادی کا سامان کر رہے ہیں۔''

باتیں کچھ زیادہ ہی سنجیدگی کی طرف چلی گئی تھیں اس لیے میں نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔

''کتنا مزید جانا ہے؟''

''یہ سامنے گاؤں ہے، میں تو خود سکون سے جا رہا ہوں تاکہ تم یہ نظارے کر لو، سمجھو ہم پہنچ گئے۔'' یہ کہتے ہی اس نے رفتار تیز کر دی۔ اس نے گاؤں کے سرے پر موجود ایک ڈیرے پر جا کے فور وہیل روکی۔ وہاں بہت سی چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ کچھ لوگ بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان ایک موٹا سا ادھیڑ عمر شخص حقہ رکھے بیٹھا تھا۔ اس کی نگاہیں ہم پر ہی تھیں جیسے ہمیں ٹٹول رہا ہو۔ شہباز نے جاتے ہی دور سے دونوں ہاتھ ملانے کے لیے بڑھا دیے اور زور زور سے اپنا تعارف کراتے ہوئے ہوئے کہا۔

''فیروز صاحب، میں جی شہباز برو کر لاہور والا۔''

یہ سنتے ہی اس کی آنکھوں سے اجنبیت دور ہو گئی۔ وہ مسکراتے ہوئے ہم سے ملا۔ اس نے کچھ لوگوں کو اشارہ کیا تو وہ اٹھ گئے۔ ہم اس کے سامنے والی چارپائی پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد شہباز نے وہی مدعا بیان کر دیا۔ وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر مودب لہجے میں بولا۔

''ہاں مجھے تمہاری آمد کے بارے میں تمہارے پاس نے بتایا تھا۔ وہ درویش مائی صاحبہ چند دن پہلے یہاں آئی تھی۔ یہاں قریب ہی ایک ڈیرا ہے وہاں اس نے اپنی پوجا پاٹ کی اور چلی گئی۔ اب اس کا نہیں پتا کہاں ہے۔''

''یہ تو پتا ہے کہ وہ یہاں نہیں ہے، وہ آئی کس کے پاس تھی، سنا ہے وہ پار پنجاب سے تھی۔'' میں نے پوچھا۔

''جی وہ وہیں کہیں کی تھی، یہاں تو میرے پاس میاں عالم نے بھیجا تھا۔ جانتے ہو نا وہ لاہور ہی کا رہنے والا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے ہمارے چہرے پر ردِعمل دیکھا۔ اس کے لیے میاں عالم بہت بڑی ہستی ہو سکتی تھی لیکن ہم اسے اسمگلر، لاہور کے انڈر ورلڈ مافیا اور بھتہ خور کے طور پر جانتے تھے۔ اس کے لیے فطری طور پر ہمارے چہرے پر کوئی ردِعمل نہیں ابھرا تو وہ اپنی بات کا اثر نہ دیکھ کر بولا۔

''اس درویش مائی صاحبہ نے یہاں کسی بزرگ کے مزار پر حاضری دینا تھی۔ ہمارا ایک لڑکا ہے ارشد، اُسے تھوڑی معلومات ہیں، بلواتا ہوں اُسے۔'' اس نے کہا پھر ایک لڑکے کو اسے بلوانے کے لیے بھیج دیا۔ اس دوران میں چائے وغیرہ آ گئی۔ ہم چائے پی رہے تھے کہ ارشد بھی آ گیا۔ اس کے پاس بھی کوئی اتنی معلومات نہیں تھیں۔ اسے صرف میاں عالم کا ہی پتا تھا یا پھر اس کے سیل فون میں کچھ تصویریں اور ویڈیوز تھیں۔ شہباز نے بڑے آرام سے وہ تصویریں اور ویڈیوز اس سے لے لیں۔ ہمیں وہاں سے بھی کوئی خاطر خواہ معلومات نہیں ملیں۔ تقریباً تین گھنٹے وہاں گزار کر ہم واپس لاہور کے لیے چل دیے۔ گاؤں سے نکلتے ہی میں نے وہ تصویریں اور ویڈیوز دیکھیں۔ ان میں پوجا، وہ پوجا لگ ہی نہیں رہی تھی، ایک دم سے روپ بدلا ہوا تھا۔ اس نے ان سکھ خواتین کی طرح سفید لباس پر نیلی دستار باندھی ہوئی تھی جو اُن کے لیے مخصوص ہوتی ہے۔ اس کا چہرہ صاف شفاف تھا، جس کے گرد سفید دوپٹے کا ہالہ تھا۔ اس میں تمام گیسو چھپے ہوئے تھے۔ اس کی کلائی میں کڑا تھا اور وہ پوری طرح ایک سکھ گیانی خاتون دکھائی دے رہی تھی۔ اگر وہ میرے سامنے اچانک آ جاتی تو شاید میں کچھ دیر کے لیے اسے پہچان ہی نہ پاتا۔ وہ بالکل بدلی ہوئی تھی۔

☆☆☆

ہم دوپہر سے پہلے ہی لاہور واپس پہنچ گئے تھے ہم سہ پہر ہونے تک آفس ہی میں رہے لیکن ہمیں کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ شہباز نے یہ اپنے ذمے لے لیا تھا کہ وہ خود میاں عالم سے بات کر کے پوجا کے بارے میں معلومات لے گا، مجھے سامنے آنے کی ضرورت نہیں، شام تک کچھ نہ کچھ ہو جائے گا تو میں اٹھ کر گھر کی طرف چل دیا۔

میں ذہنی طور پر اس قدر منتشر ہو چکا تھا کہ کچھ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کروں کیا؟ مجھے کرنا کیا ہے؟ کیا صرف پوجا ہی کو تلاش کرنا ہے؟ نہ جانے اس جیسے کئی بندے ہمارے ملک میں پھر رہے تھے، یہاں کے ذرائع نجانے کیسی کیسی معلومات کہاں کہاں سے دے رہے تھے۔ اگر پوجا کو اتنے تردد کے بعد پکڑ بھی لیا جائے تو پھر اس کا کرنا کیا ہے؟ بس یہی ایک آپشن تھا ہمارے پاس کہ وہ کوئی کلیان جی کا ٹارگٹ لے کر یہاں آئی ہے، پتا لگانا ہے کہ وہ ٹارگٹ کیا ہو سکتا ہے؟ اس کے یہاں آنے کا کوئی نہ کوئی مقصد تو ضرور ہو گا؟ میں گھر پہنچ کر بیڈ پر لیٹا تو میری آنکھ لگ گئی۔ میں اٹھا تو اندھیرا پھیل چکا تھا۔ میں فریش ہوا تو ساوری میرے پاس آ گئی۔

''خیریت تو ہے نا، اتنی گہری نیند سوئے ہو؟''

''یار تم بیویوں کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے۔ نیند

ہو تو کیوں ہنسے ہو، چپ کیوں بیٹھے ہو، باتیں کیوں نہیں کرتے، اگر باتیں کرو تو بڑے بہک رہے ہو۔ اب اگر میں بہت گہری نیند سویا ہوں، اس کا تمہیں کیسے پتا چلا کہ یہ نیند گہری ہے؟'' میں نے جواب دینے کے بجائے سوال کر دیا۔ اس نے ایک لمحے کو میری طرف دیکھا پھر مسکراتے ہوئے سکون سے بولی۔

''سوہنا، میں تو سوتے ہوئے تمہارے خواب بھی 'چیک' کرتی ہوں۔ تم کیا سمجھتے ہو، تمہیں یونہی آوارہ چھوڑ دوں۔''

''او جا اوئے وڈھی درویش۔'' میں نے بے ساختہ کہا تو اسی لمحے مجھے پوجا کی یاد آ گئی۔ اسی لمحے مجھ پر پھر وہی انتشار چھانے لگا۔ لیکن اب میں نے اسے خود پر قابو نہیں پانے دیا۔ میں نے اس خیال کو بھگاتے ہوئے پوچھا۔

''کیا بنایا ہے آج کھانے میں؟''

''یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔'' ساوری نے کہا۔

''نہیں ہے تو نہ سہی، تھک گیا تھا سو گیا، اور کیا؟'' میں نے اکتاہٹ سے کہا تو وہ میرے ساتھ بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''ہم نے آج باہر سے کھانا کھانے کا سوچا تھا، شبانہ اور فرزانہ کئی دن سے باہر نہیں گئی ہیں۔ اب تم ہو تو چلیں۔''

''ٹھیک ہے، نکلو پھر۔'' میں نے جان چھڑاتے ہوئے کہا تو وہ اٹھ کر باہر کی طرف چل دی اور میں تیار ہونے لگا۔

یہ پوجا میرے دماغ پر چھا گئی تھی۔ میں اُسے ذہن پر چھانے نہیں دینا چاہتا تھا۔ یہ فطری سی بات ہے، جب بے بسی ہو جائے تو انسان اس بے بسی کو دور کرنے کے لیے سو طرح سے سوچتا ہے۔ شاید میں لاشعوری طور پر اس کی یہاں آمد برداشت نہیں کر پا رہا تھا یا پھر یہ سوچ رہا تھا کہ اس کی اتنی ہمت کہ وہ میرے پیچھے یہاں تک آ گئی۔ جو بھی تھا، میں بہر حال اسے فوری طور پر اپنے سامنے دیکھنا چاہتا تھا۔ مجھے علم ہونا چاہیے تھا کہ وہ یہاں پر کیوں ہے؟

''ہم تو باہر سے کھا لیں گے جو لڑکے یہاں پر ہیں، ان کے لیے کھانا......'' میں نے گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے ساوری سے پوچھا۔

''ان کی فکر مت کرو، وہ شیف سے اپنی پسند کا بنوا رہے ہیں۔ ان کی تو موج لگی ہوئی ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اچھا...... جانا کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا تو وہ بولی۔

''پہلے تھوڑی سی شاپنگ کرنی ہے، پھر کسی اچھے سے ریسٹوران میں ڈنر۔ وہ بھی شبانہ اور فرزانہ کی پسند کا، مجھے ان کو ٹریٹ دینی ہے۔''

''لو بھئی فرزانہ شبانہ آپ بتا دیں کہاں جانا ہے۔'' میں نے کہا اور ڈرائیونگ سیٹ کی جانب بڑھنے لگا تو شبانہ بولی۔

''آپ نہ کریں ڈرائیونگ، میں خود لے جاتی ہوں۔''

''او کے۔'' یہ کہتے ہوئے میں پیچھے بیٹھ گیا تو ساوری میرے ساتھ آ کر بیٹھ گئی۔ فرزانہ پسنجر سیٹ پر بیٹھی تو ہم چل پڑے۔

ایک معروف شاپنگ مال سے جب وہ تینوں کپڑوں سمیت کافی خریداری کر چکیں تو ہم وہاں سے نکلنے لگے۔ تیسری منزل سے نیچے جانے کے لیے ابھی ہم ایسکلیٹر کے پاس گئے ہی تھے۔ اگلے چند لمحوں میں ہم نے پاؤں رکھ دینا تھا۔ اسی لمحے بھر میں چند لوگ دوسری طرف سے اوپر آئے۔ ان میں کچھ خواتین تھیں۔ ایسے میں ایک حواس باختہ سی خاتون مجھ سے بائیں جانب ٹکرائی۔ ٹکراتے ہی اس نے تیزی سے کہا۔

''اوہ، سوری جی......''

یہ کہتے ہی اس نے میرے کاندھے پر ہاتھ پھیرا اور نکلتی چلی گئی۔ میں اس کی آواز میں کھو گیا۔ کہاں سنی ہے میں نے یہ آواز؟ میں سوچ رہا تھا کہ ایک دم سے جیسے میرے دماغ میں ہلچل مچ گئی۔ میرے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے بیگ چھوٹ گئے۔ میں تیزی سے مڑا اور اس خاتون کی تلاش میں دیوانہ وار دیکھنے لگا۔ مگر وہ مجھے کہیں بھی دکھائی نہیں دی۔ وہ یوں غائب ہو چکی تھی جیسے کوئی چھلاوا نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے؟ اگر وہ سامنے رہتی تو شاید میں اس کے بارے میں سوچتا بھی نہ لیکن اس کا غائب ہو جانا ہی مجھے یقین دلا رہا تھا۔ میں تیزی سے آگے بڑھنے لگا تو ساوری نے مجھے روکتے ہوئے پوچھا۔

''علی، کیا پاگل ہو گئے ہو؟''

''ساوری چھوڑو مجھے، اس عورت کو دیکھو، فوراً۔'' میں نے دیوانہ وار کہا۔

''وہ تم سے بس ٹکرائی ہی تھی، اتنا قصور تو نہیں تھا۔'' اس نے احتجاجی لہجے میں کہا تو میں نے اس کی آنکھوں میں

دیکھتے ہوئے کہا۔

''تمہیں نہیں پتا وہ کون تھی، وہ پوجا تھی۔''

''پوجا؟'' ساوری نے شدتِ حیرت سے کہا، اس کے ساتھ ہی وہ بھی اِدھر اُدھر دیکھنے لگی لیکن وہ کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ شبانہ اور فرزانہ نے میرے ہاتھوں سے گرے ہوئے بیگ اٹھا لیے تھے۔

''مجھے اُسے تلاش کرنا ہے۔'' میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا تو ساوری میرے دونوں ہاتھ پکڑتے ہوئے ہولے سے بولی۔

''دھیرج علی۔ اگر وہ اس طرح سامنے آ گئی ہے تو پھر دوبارہ بھی آئے گی۔ ممکن ہے تمہیں شک ہوا ہو، کیونکہ وہ تمہارے دماغ پر چھائی ہوئی ہے۔ آؤ، کہیں سکون سے بیٹھتے ہیں۔''

''اوکے۔'' میں نے اس کی بات سمجھتے ہوئے کہا اور ایک طویل سانس لے کر ایسکلیٹر میں پاؤں رکھ دیا۔ ہم نیچے کی طرف جانے لگے۔ انھی لمحات میں میرا فون بج اٹھا۔ میں نے فون جیب سے نکالا تو اسکرین پر اجنبی نمبر تھے۔ میں نے کال ریسیو کی تو دوسری طرف سے نسوانی آواز گونجی۔

''کیسی رہی ملاقات؟''

''مطلب......'' میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا، میں نے لاشعوری طور پر پیچھے کی طرف دیکھا تو سرے پر پوجا کھڑی تھی۔ اس نے مجھے دیکھ کر یوں ہاتھ ہلایا، جیسے میرا مذاق اُڑا رہی ہو۔ میں پوری قوت سے گھوما اور واپس سیڑھیاں چڑھنے لگا، سرے تک پہنچنے میں مجھے یوں لگا جیسے میرے بدن میں ذرا سی بھی قوت نہ رہی ہو۔ مجھے توقع تھی میں اس تک پہنچ جاؤں گا لیکن وہ وہاں نہیں تھی، میں دیوانہ وار اسے تلاش کرنے لگا۔ میں کبھی ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلا جاتا، کبھی وہاں سے نکل کر کسی راہداری میں گھس جاتا، تقریباً پندرہ بیس منٹ میں اسے دیکھتا رہا لیکن وہ نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ اچانک مجھے ہاتھ میں پکڑے ہوئے فون کا خیال آیا۔ میں نے دیکھا تو کال ابھی تک چل رہی تھی۔

''ہیلو، کہاں ہو تم؟'' میں نے پھولی ہوئی سانسوں میں پوچھا۔

''ایسا کرو جاؤ اپنی بیوی کے ساتھ، میں بعد میں کال کرتی ہوں۔'' اس نے طنزیہ لہجے میں کہا تو میں انتہائی غصے سے بولا۔

''تم میرے سامنے آؤ۔''

''اگر نہ آؤں تو......'' اس نے چیلنج والے انداز میں کہا۔

''میں تمہیں تلاش تو کر ہی لوں گا۔'' میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا تو وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

''تم ساری رات بھی یہاں تلاش کرتے رہو گے ناتو مجھے نہیں تلاش کر پاؤ گے۔ جاؤ اپنی بیوی کے ساتھ، گھر پہنچو گے تو بات کرتی ہوں۔''

آخری لفظ کے ساتھ ہی اس نے کال ختم کر دی۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے ہاتھ آئی ہوئی مچھلی نکل گئی ہو۔ میں نے چند لمحے وہیں کھڑے سوچا اور پھر اپنے آپ پر مسکراتے ہوئے واپس ایسکلیٹر کی جانب بڑھ گیا۔

وہ تینوں میرے انتظار میں پریشان کھڑی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی ساوری میری جانب بڑھی اور پھر چند لمحے میری طرف دیکھتے رہنے کے بعد بولی۔

''اب چلیں؟''

''ہاں چلو، جاؤ فرزانہ گاڑی لے آؤ۔''

''آپ باہر نکلیں میں لاتی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ پارکنگ کی جانب چلی گئی۔ اس کے ساتھ شبانہ بھی بڑھ گئی۔

ریستوران میں بھی میرا دھیان پوجا ہی کی طرف رہا۔ اس نے ایسا کیوں کیا؟ وہ بہت کچھ کر سکتی تھی۔ اتنا قریب آ کر مجھے اپنی جھلک دکھا کر وہ نگاہوں سے اوجھل کیوں ہو رہی ہے؟ کیا وہ مجھے ذہنی اذیت میں ڈالنا چاہتی ہے؟ کیا وہ مجھے یہ باور کرانا چاہتی ہے کہ وہ میرے ملک میں آ کر مجھے چکرا کر رکھ دے گی؟ ایسا کر کے وہ مجھے کیا تاثر دینا چاہتی ہے؟ وہ مجھے یہ بتانا چاہتی ہے کہ وہ یہاں پر کتنی مضبوط ہے؟ ایسے ہی نجانے کتنے سوال میرے دماغ میں چکرا رہے تھے۔

ہم گھر واپس آ گئے۔ ساوری کا موڈ خراب تھا، میں نے اس کی طرف توجہ نہیں دی۔ میں نے اسے بیڈ روم ہی میں چھوڑا اور چھت کی طرف جانے لگا، ایک موہوم سی امید تھی کہ پوجا مجھے فون کرے گی۔ مجھے شہباز کے فون کا بھی انتظار تھا۔ اس نے میاں عالم سے معلومات لینا تھیں۔ کھلی فضا میں آ کر ایک طویل سانس لیا۔ میں نے اپنے دماغ کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ وہ جو میرے دماغ کی طنابیں کسی ہوئی تھیں، وہ میں نے ڈھیلی چھوڑ دیں۔ کچھ دیر بعد میں نارمل ہوتا چلا گیا۔ شہر بھر کا ہلکا ہلکا شور سنائی دینے لگا، اردگرد کی روشنیاں مجھے دکھائی دینے لگیں۔ رات کا ملگجا اندھیرا بھلا لگنے لگا۔ میرے اندر جو خیال اور سوچیں اٹھ رہی تھیں، ان

سے میں نے اجنبیت اختیار کرلی۔ میرے سامنے صرف ایک سوال تھا اور وہ یہ کہ پوجا ایسا کیوں کررہی ہے؟ یہ سوچ ابھی میرے دماغ میں گھوم رہی تھی کہ میرا فون بجنے لگا۔ میں نے اسکرین پر نگاہ ڈالی تو وہی نمبر تھا جس سے کچھ دیر پہلے پوجا نے بات کی تھی۔ میں نے کال ریسیو کرلی۔

''مجھے تو لگا تم مجھے کال کرو گے، انتظار کررہی تھی؟''

''کیوں؟'' میں نے سردمہری سے پوچھا۔

''اور بلاشبہ تم یہ بھی سوچ رہے ہو گے کہ میں تمہارے ساتھ ایسا کیوں کررہی ہوں، سوچا ہوگا نا؟'' اس نے انتہائی سنجیدگی سے کہا تو میں چونک گیا۔

''ہاں، میں یہی سوچ رہا ہوں۔'' میں نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

''یہی سوچ پیدا کرنے کے لیے میں نے اب تک ایسا کیا، تم اب تک کم از کم تین بار میرے ایسے ہدف پر تھے کہ میں تمہیں آسانی سے گولی مار سکتی تھی۔'' اس نے بھی سخت لہجے میں کہا تو میں نے طنزیہ پوچھا۔

''تو پھر ماری کیوں نہیں؟''

''مجھے تم سے کچھ ڈیل کرنی ہے۔'' اس نے آرام سے کہا۔

''پوجا، کیا تم صرف اسی لیے یہاں ہو؟ صرف ڈیل ......'' میں نے کہنا چاہا تو اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''نہیں، میں تمہیں قتل کرنے کے لیے آئی ہوں، یہی میرا ٹاسک تھا، جنھوں نے مجھے یہ ٹاسک دیا ہے، ان کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہوگئی ہوں کہ ابھی تمہیں اُلجھاؤں گی، اتنا اُلجھاؤں گی کہ تم صرف میرے بارے میں سوچو گے۔ اس دوران ہم دوسرے بہت سارے کام کرجائیں گے جن کا تمہیں اور تمہارے لوگوں کو پتا بھی نہیں چلے گا۔ مجھے تھوڑی مہلت چاہیے تھی، وہ شاید اب نہ ملے، اب یا تو تمہارے اور میرے درمیان ڈیل ہوگی یا ہم میں سے کوئی ایک مارا جائے گا۔''

''اور میں تمہاری بات آسانی سے مان لوں گا؟ تم کوئی بھی کہانی گھڑو گی اور میں اس پر آنکھیں بند کرکے یقین کرلوں گا؟'' میں نے پوچھا۔

''میں اتنی پاگل نہیں ہوں، جو کچھ یہاں ہو رہا ہے اور جو کچھ ہم کرچکے ہیں، تمہاری سوچ بھی نہیں ہے۔ ڈیل صرف میرے اور تمہارے درمیان ہوگی۔ اس ... کا لینا دینا نہیں۔ ہاں مگر قتل ہونا یا کرنا، تمہارا ذاتی عمل ہے...

ہے لیکن میرا نہیں۔'' اس نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا تو اچانک مجھے خیال آیا، تبھی میں نے پینترا بدلتے ہوئے پوچھا۔

''میں اب تک بھی نہیں سمجھا، تم چاہتی کیا ہو؟''

''صرف ایک ڈیل، جس کے لیے ہمیں ایک دوسرے پر اعتماد کرنا ہوگا، ظاہر ہے، میں وہ ڈیل اپنے فائدے کے لیے کرنا چاہتی ہوں، اس کے عوض میں تمہیں تمہاری سوچ سے بھی زیادہ فائدہ دوں گی۔'' اس نے حتمی لہجے میں کہا۔

''مثلاً کیا؟'' میں نے پوچھا تو وہ حد درجہ اعتماد سے بولی۔

''ملو گے تو بتاتی ہوں بلکہ اعتماد کرو تو بتا دوں گی۔''

''پوجا، میں تمہیں ایک بات بتاؤں۔'' میں نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

''بولو، میں سن رہی ہوں۔'' وہ دھیمے سے بولی۔

''میں نے جب تمہیں پہلی بار دیکھا تھا، تب یوں لگا جیسے تم کوئی انتہائی چمکیلا اور خوبصورت سانپ ہو، ظاہر ہے ایسے سانپ بہت زہریلے ہوتے ہیں اور بہت زیادہ خطرناک، میں......''

میں کہہ رہا تھا لیکن اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''میں اب بھی سانپ ہی کی طرح ہوں لیکن میں صرف اسے ڈستی ہوں جس سے مجھے خطرہ ہو۔ دوسری بات سنو، ہماری جرم کی اس دنیا میں صرف فائدہ دیکھا جاتا ہے اور فائدے سے بھی بڑھ کر اپنی طاقت کا اظہار، تم بھی اور میں بھی طاقت چاہتے ہیں۔ یا ان کی طاقت کا آلۂ کار بنتے ہیں، جن کے ہم مہرے ہیں۔ جان لو ہم مہرے ہیں۔ بس اتنا جان لو میں تمہارے ساتھ مل کر کسی کو اپنی طاقت کا اندازہ کروانا چاہتی ہوں۔''

''چلو پھر ملتے ہیں کہیں۔'' میں نے ایک دم سے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میرے دماغ میں جو ایک دم سے ہلچل مچی تھی، اسے سکون آ گیا تھا۔ مجھے سمجھ آ رہی تھی کہ وہ مجھے کس ٹریک پر لانا چاہتی ہے۔ میرے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ آ گئی تھی میں اسی سوچ میں گم تھا کہ شہباز کا فون آ گیا۔

''ارے فون کہاں بزی تھا تمہارا۔''

''تھا ایک پنچھی، اپنی آواز سنا رہا تھا۔'' میں نے گول مول جواب دیا۔

''میں میاں عالم کے پاس سے واپس آ رہا ہوں۔'' اس نے بتایا۔

''کیا کہتا ہے؟'' میں نے پوچھا تو اس نے بتایا۔

''اس کے کہنے کے مطابق، بھارت میں ان کے پیر صاحب کی گدی ہے، وہاں سے کسی نے کہا تھا کہ ایک گیانی ملنگ قسم کی خاتون ہے۔ وہ اپنی تپسیا بڑھانے کے لیے پاکستان میں موجود درگاہوں اور مقدس جگہوں پر جانا چاہتی ہے، سو انہوں نے میرے پاس بھیج دیا۔ وہ ابھی اپنی سیر پر ہے، جس دن بھی واپس آ گئی، اس سے ملاقات ہو جائے گی۔''

''وہ صرف آواز کی حد تک، مجھ تک پہنچ گئی ہے۔'' میں نے دھیمے سے کہا۔

''نہ کر......'' اس نے شدتِ حیرت سے کہا۔

''اس کا دعویٰ ہے کہ اب تک وہ مجھے تین مرتبہ مار سکتی تھی لیکن نہیں مارا۔'' میں نے اسی سکون سے کہا تو وہ پھر اتنی ہی شدتِ حیرت سے بولا۔

''مذاق نہ کر۔''

''ابھی اسی کا فون تھا بلکہ میں تمہیں تفصیل بتاتا ہوں، کہاں ہو تم؟'' میں نے پوچھا تو وہ بولا۔

''ہمیں کہاں جانا، ہم جیسے کنوارے چھڑے چھانٹ اپنے کسی حجرے میں سر دیں گے، تم اگر اچھا سا کھانا کھلانے کا وعدہ کرو تو ابھی آ جاتا ہوں۔''

''اچھا آ جاؤ۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ میرے سامنے بیٹھا کھانا کھا رہا تھا اور اس دوران اس نے ساری رُوداد سن لی تھی۔ وہ خاموشی سے سوچ رہا تھا، وہ کھا چکا تو اس کے سامنے چائے رکھ دی گئی۔ اس نے چائے کا ایک سپ لیا اور بولا۔

''لے بھئی تم نے ایک بھوکے کو کھانا کھلایا، رب تمہیں مزید دے، کمائی میں برکت ڈالے، سنا ہے جو لنگر چلاتے ہیں، ان کے رزق میں بہت برکت ہوتی ہے۔''

''بکواس نہیں کرو، جو میں کہہ رہا ہوں، اسے سمجھنے کی کوشش کرو۔'' میں نے جھلاتے ہوئے کہا تو وہ ہنس دیا۔

''اوئے، تمہاری سب سے بڑا پرابلم یہ ہے کہ تم ہر وقت جلے بھنے رہتے ہو، تمہارے منہ کے پٹھے کھنچے رہتے ہیں، جس سے تم بڑے بھیانک لگتے ہو۔ یار تم اتنا نہیں سمجھ سکتے وہ ہمارے ماموں کی کڑی ہے یا پھوپی کی، وہ ہماری دشمن ہے اور دشمن......''

''نہیں شہباز، دشمن سے پھر بھی کبھی بھلائی کی توقع کی

جاسکتی ہے، اگر وہ بدنسل نہ ہو۔ ہاں مگر منافق سے نہیں۔ کیونکہ منافق ہوتا ہی وہی ہے جو بدنسل ہو، جس کے تخم کا پتا نہ ہو۔" میں نے جھلاتے ہوئے کہا۔

"کول...... مائی ڈیئر کول...... غصہ نہیں۔" اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے منع کرتے ہوئے کہا، پھر ایک سپ لے کر بولا۔ "اگر وہ یہ کہتی ہے نا ہماری جرم کی دنیا میں صرف طاقت منوائی جاتی ہے تو وہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ میں یہ بھی مانتا ہوں کہ دشمن اگر بدنسل نہ ہو تو وہ خود سامنے آکر للکار کر لڑتا ہے۔ لیکن منافق بقول تمہارے بدنسل ہوتا ہے، وہ اپنی عورتوں کو آگے کرتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں۔"

"پھر تم میری بات کو سنجیدگی سے کیوں نہیں لے رہے ہو؟" میں نے کہا۔

"تم کیا سمجھتے ہو، ہم کوئی بھیڑ بکری یا آوارہ جانور ہیں کہ ہمیں دشمن کے علاقے میں یونہی لاوارث بھیج دیا جاتا ہے، ہمارا پورا خیال رکھا جاتا ہے۔ تم نے جب مجھے بتایا، میں نے تب سے لے کر یہاں آنے تک اس نمبر سے سارا حساب کتاب ملا لیا ہے، ذرا سا وقت دو ابھی کچا چٹھا سامنے آجائے گا۔" اس نے اطمینان سے کہا تو میں نے صوفے سے ٹیک لگاتے ہوئے پوچھا۔

"وہ کیسے کرلیا تم نے، ابھی تک تم نے نمبر لیا ہی نہیں مجھ سے؟"

"ہم سب کی باتیں اور خاص طور پر ہمارے فون اور رابطے کہیں دوسری جگہ بھی دیکھے جاتے ہیں، ان پر کام ہوتا ہے۔ یہ کیسے ہوتا ہے، جدید دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں رہا۔ وہ بھی یہاں لاوارث نہیں ہے، وہ اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتی۔" شہباز نے اطمینان سے کہا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ لیکن ہماری اس دنیا میں کب کیا ہوجائے......"

"دیکھو، تم اچانک اس دنیا میں وارد ہوئے، کسی کو تمہارے بارے میں اتنا اندازہ نہیں تھا، تم میں خلوص تھا اور تم نے ایک معرکہ مار لیا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں اب بھی ایسے ہی ہوگا۔ بہت سارے لوگ تمہارے بارے میں نہ صرف جان چکے ہیں بلکہ انہیں تمہاری صلاحیتوں کا بھی اندازہ ہو چکا ہے۔ وہ تمہیں کس طرح ٹریٹ کریں گے، وہ جانتے ہیں۔ تنظیمیں صرف مار کٹائی، دہشت گردی یا قتل پر نہیں چلتیں، ان میں بڑے بڑے نفسیات داں ہوتے ہیں، وہ نفسیات جو مجرموں کی ہوتی ہے۔ اور پھر لڑائی صرف مار دھاڑ سے نہیں جیتی جاتی، دوسروں کو احساس دلایا جاتا ہے کہ تم وہ نہیں جو تمہیں ہونا چاہیے تھا۔"

"کیسے؟" میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

"جیسے کوئی گپ باز یہ کہے کہ میں نے نو قتل کیے ہیں لیکن کبھی اس نے مچھر نہ مارا ہو، تو وہ اس لائق نہیں کہ اس کے تھپڑ مارا جائے، بلکہ اسے اس کی اوقات یاد دلا دی جائے کہ تم بدنسل ہو، یہی برتری ہے۔ یہی ففتھ جنریشن وار ہے، جو ہم لڑ رہے ہیں۔" شہباز نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

"پھر اب کیا کرنا ہے اس کے ساتھ۔ مطلب پوجا کے ساتھ؟" میں نے پوچھا تو وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"ملیں گے، اس سے ضرور ملیں گے بلکہ میں تو بے تاب ہوں کہ اس کے حسن کے جلوے سے پوری طرح مستفید ہوسکوں۔"

اس نے یوں کہا تو میرا قہقہہ بلند ہوگیا۔ وہ صرف بات کر سکتا تھا یا واقعی ہی وہ اس قدر اعتماد رکھتا ہے، میں کوئی فوری فیصلہ نہیں کر سکا۔ انہی لمحات میں اس کا فون بج اٹھا، اس نے اسکرین پر دیکھ کر کال ریسیو کی، ہیلو کے جواب میں سنتا رہا، پھر فون بند کر کے بولا۔

"اس وقت، اگر میں غلط نہیں ہوں تو گوالمنڈی کی کسی ایک گلی میں موجود ہے۔ اگر کہو تو ابھی چلیں۔"

"چلو، ابھی دیکھیں اُسے۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا تو وہ بھی اٹھ گیا۔ اگلے دس منٹ میں تیاری کے ساتھ میں شہباز کے ساتھ آبیٹھا تھا۔

☆☆☆

وہ ایک پرانی سی عمارت تھی۔ کبھی وہ بہت شاندار بلڈنگ رہی ہوگی لیکن وقت نے اس کا سارا حسن چھین لیا... تھا۔ رنگ و روغن تو اڑ ہی چکا تھا، اس پر کئی جگہ سے پلستر بھی اکھڑ چکا تھا۔ بڑے دروازے کے ساتھ دو چھوٹے دروازے مزید تھے۔ دوسری منزل پر چھ کھڑکیاں اور اسی طرح تیسری منزل پر بھی چھ کھڑکیاں دکھائی دے رہی تھیں، جس کی لکڑی سیاہ ہو چکی تھی۔ وہ عمارت گلی کے نکڑ پر تھی۔ کبھی کوئی ایک خاندان اس میں رہائش پذیر رہا ہوگا، لیکن اس وقت وہاں کے مکین چوں چوں کا مربہ تھے۔ کئی کرایہ دار اس بلڈنگ میں موجود تھے۔ اس عمارت کے بالکل سامنے ایک مشہور سری پائے کی دکان تھی۔ کافی ...... لوگ موجود تھے ایک بڑی ٹی وی اسکرین پر گیت چل رہے تھے۔ دکاندار مصروف تھا اور کئی 'چھوٹے' گاہکوں کو کھانا سرو کر رہے تھے۔ ہم بھی وہیں جا بیٹھے اور ہمارے تینوں ساتھی

بھی اِدھر اُدھر موجود کرسیوں پر آگئے۔ شہباز نے آرڈر دے دیا تھا۔ ہم نے کھانا کھالیا تھا، کچھ دیر ویسے ہی بیٹھے رہے، یہاں تک کہ ایک موٹا سا گنجا شخص آن وارد ہوا۔ اس نے دھوتی کرتہ پہنا ہوا تھا۔ اس نے وہاں آکر اِدھر اُدھر دیکھا اور اس کی پہچان والے ہمارے دوست نے اسے اپنی جانب متوجہ کرلیا۔ وہ کچھ دیر تمہیدی باتیں کرتے رہے۔ تبھی ہمارے ساتھی نے اس سے کہا۔

''پہلوان جی، کوئی کمرا مل جائے گا؟ ہم دو ہی دوست ہیں، ہمیں رہنا ہے، سچی بات ہے ہمارے پاس زیادہ کرائے کی بالکل گنجائش نہیں۔''

''کمرا بھی ہے، کرایہ بھی مناسب ہے لیکن تم ہو چھڑے چھانٹ اور یہاں رہتی ہیں فیملیاں، بس یہی مسئلہ ہے۔'' اس نے اپنی بھاری سی آواز میں کہا تو میرے ساتھی نے کہا۔

''پہلوان جی، آپ کو پتا ہے، ہم نے کون سا سارا دن یہاں پڑے رہنا ہوتا ہے، بس رات کو سونے کا ایک ٹھکانا چاہیے، جب حالات اچھے ہوجائیں گے تو سمجھو، چلے جائیں گے۔''

''چلو ٹھیک ہے، میں تمہیں دکھاتا ہوں کمرا۔'' اس نے اٹھتے ہوئے کہا تو وہ تینوں اٹھ کر عمارت کی جانب چل دیے۔ ہم خوامخواہ وہاں دیر لگاتے رہے۔ بل وغیرہ دینے کے بعد اٹھے تو ساتھ ہی ''بنٹے والا سوڈا'' کی دکان تھی۔ وہاں سے لیمن سوڈا پیا اور یونہی چہل قدمی کرتے ہوئے اپنی گاڑی تک چلے گئے۔

''اب دیکھو کیا کرتے ہیں وہ لڑکے۔'' گاڑی میں بیٹھتے ہی شہباز بولا اور اس نے ڈیش بورڈ میں لگی اسکرین آن کردی۔ اس چھوٹی سی اسکرین پر جو منظر دکھائی دے رہا تھا وہ ایسے تھا کہ جیسے ہمارے کسی ایک ساتھی کے ساتھ کیمرا لگا ہو۔ جو کچھ اس کے سامنے آرہا تھا، وہی اس اسکرین پر دکھائی دے رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے دوسرا بٹن دبایا تو دوسرے کیمرے کا منظر سامنے آنے لگا۔ ان کی آوازیں نہیں آرہی تھیں۔ وہ کوئی دوسرا کمرا تھا جو انہیں دکھایا جارہا تھا۔ وہاں عمارت میں ابھی اتنی خاموشی نہیں ہوئی تھی۔ لوگ جاگ رہے تھے۔ بہت سے بچوں کی، لوگوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ شہباز کا پلان یہی تھا کہ دونوں لڑکے ابھی کرایہ ایڈوانس دے کر وہیں رہیں گے۔ جیسے ہی خاموشی ہوجاتی، وہ پوجا تک جاپہنچیں گے۔ اس کی لوکیشن بتارہی تھی کہ وہ یہیں اسی بلڈنگ میں ہے۔ میں پسنجر سیٹ پر سیدھا ہوکر بیٹھا ہوا اس وقت کا انتظار کررہا تھا، جب ہمیں اندر جانے کا سگنل ملتا۔ میں گاہے گاہے اپنے اردگرد پر بھی نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ ہم گلی کے نکڑ پر کار میں تھے جس کے دائیں جانب سڑک تھی جو آگے جاکر ایک بڑی سڑک سے جاملتی تھی۔

اچانک میری نگاہ ایک برقع پوش عورت پر پڑی جو اسی عمارت کے دروازے سے نکلی۔ اس کے انداز میں کوئی جلد بازی نہیں بلکہ اطمینان تھا۔ وہ بڑے اعتماد سے چلتی ہوئی گلی کے نکڑ تک آئی اور سڑک کنارے رک گئی۔ سیاہ برقع میں ملبوس اس عوت پر مجھے پوجا کا گمان ہوا۔ اس نے سڑک کے دائیں بائیں دیکھا، اسی اثنا میں ایک رکشا آکے رکا۔ جیسے ہی وہ جھک کر اس میں بیٹھنے لگی، اس کا نقاب ذرا سا ہٹ گیا۔ اسے نقاب سنبھالنا بھی نہیں آتا تھا۔ مجھے ایک جھٹکا لگا، وہ پوجا ہی تھی اور بڑے اعتماد کے ساتھ وہاں سے نکل کر جارہی تھی۔ میرے منہ سے بےساختہ نکلا۔

''وہ پوجا۔''

''کہاں؟'' شہباز نے پوچھا۔

''وہ دیکھو۔'' میں نے اشارہ کرتے ہوئے کہا، اس وقت تک وہ رکشے میں بیٹھ چکی تھی۔ میرے پاس وقت نہیں تھا۔ میں کار سے اترا تو رکشا چل پڑا۔ میں بھاگ کر اس کے پیچھے جاسکتا تھا لیکن رکشا پکڑ لینے کے چانس بہت کم تھے لیکن میں وہاں پر تماشا بن جاتا۔ میں نے فوراً رک کر اِدھر اُدھر دیکھا، دو لڑکے آپس میں کھڑے باتیں کررہے تھے۔ ایک بائیک پر بیٹھا ہوا تھا، دوسرا کھڑا تھا۔ میں نے ایک جست لگائی اور اسی دوران اپنا پسٹل نکال لیا۔ میں جیسے ہی اس لڑکے کے پیچھے جاکر بیٹھا، وہ گھبرا گیا۔

''جلدی چل۔'' میں نے پسٹل اس کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے کہا تو وہ لڑکا ایک دم سے پریشان ہوگیا۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے بائیک چھوڑ دی۔ میں نے بائیک سنبھالتے ہوئے کک ماری تو وہ اسٹارٹ ہوگئی۔ میں جانتا تھا کہ شہباز سب سنبھال لے گا۔ میں نے سامنے سڑک پر دیکھا، وہ رکشا نگاہوں سے اوجھل ہوچکا تھا۔ میں نے بائیک اس سمت دوڑا دی۔ ذیلی سڑک ہونے کے باعث اتنا رش نہیں تھا لیکن مجھے رکشا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بس سرخ بیک لائٹ سے اندازہ لگا سکتا تھا۔ میں رفتار بڑھاتے ہوئے بائیک دوڑا رہا تھا۔

رکشا نسبت روڈ پر جاچکا تھا۔ میں جانتا تھا کہ آگے یہ سڑک لکشمی چوک پر جاکر کھلتی ہے۔ مجھے اگر اس رکشے کو پکڑنا ہے تو یہیں کہیں اسی روڈ پر ہی اسے روکنا ہوگا۔ میرا اور

رکشے کا فاصلہ لحہ بہ لحہ کم ہوتا... جا رہا تھا۔ اس سڑک کا تقریباً کافی فاصلہ طے ہو گیا تھا جب میں رکشے کے پاس پہنچ کر دھیرے دھیرے اسے سائڈ پر لگانے کے لیے مجبور کرنے لگا۔ رکشا ڈرائیور نے ایک موٹی سی گالی دی۔ جس کی میں نے پروا نہ کی اور اسے رکنے پر مجبور کر دیا۔ میں جانتا تھا کہ پوجا مجھے دیکھ چکی ہے اور بلاشبہ وہ کسی نہ کسی طرح کا ردِعمل ضرور دکھائے گی۔ میں حیران تھا کہ اب تک اس نے پسٹل نکال کر فائر کیوں نہیں کر دیا۔ رکشا ڈرائیور بک بک کرنے لگا تھا۔ میں نے کوئی توجہ نہیں دی اور بائیک روک کر پیچھے بیٹھی پوجا سے کہا۔

''پوجا، نیچے اتر آؤ۔''

''مجھے مت اتارو، خود میرے ساتھ آکر بیٹھ جاؤ۔'' خلافِ توقع اس نے کہا تو میں ٹھٹک گیا۔ تبھی میں نے ایک لمحے سے بھی کم وقت میں فیصلہ کیا اور اس کے ساتھ رکشے میں بیٹھ گیا، مجھے یقین تھا کہ وہ بائیک، اس لڑکے تک پہنچ جائے گی۔ میں نے بائیک کو سڑک پر ہی چھوڑ دیا تھا۔ میں نے پوجا کے ساتھ بیٹھتے ہی اس کا نقاب الٹ دیا۔ وہ میری طرف بڑے اعتماد سے مسکراتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ تبھی میں نے رکشا ڈرائیور سے کہا۔

''تم تو چلو۔''

میرے یوں کہتے ہی اس نے رکشا بڑھا دیا۔ جب تک ہم لکشمی چوک تک پہنچے، تب تک شہباز اپنی کار سمیت میرے قریب سے گزر رہا تھا۔ میں نے ڈرائیور کو روکتے ہوئے پوجا کا ہاتھ تھاما، دوسرے ہاتھ سے ایک بڑا نوٹ نکال کر اس کی طرف پھینکا اور پوجا سمیت اتر کر سڑک پر آ گیا۔ سامنے کار کھڑی تھی۔ میں نے پہلے اسے بٹھایا اور پھر خود بیٹھ گیا۔ شہباز نے کار ایبٹ روڈ کی جانب بڑھا دی۔ تبھی میں نے ایک طویل سانس لیا اور بولا۔

''پوجا، دیکھو پہنچ گیا تم تک......''

''نہیں ویر سنگھ جی، ایسا نہیں ہے، میں خود تم تک آئی ہوں، ورنہ تم میری ہوا تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔'' اس نے طنزیہ لہجے میں جواب دیا۔

''ایسا کیا؟'' میں نے خوشگوار حیرت سے کہا۔

''ہاں، جب انجان لوگ بلڈنگ میں گھسے تبھی مجھے شک پڑ گیا، میں وہاں چھپ بھی سکتی تھی لیکن میں جان بوجھ کر نکلی ہوں تاکہ تم سے مل سکوں۔'' اس نے اسی اعتماد سے کہا تو میں نے تیزی سے پوچھا۔

''اس کا مطلب ہے بلڈنگ میں تمہارے لوگ بھی ہیں؟''

''ہاں ہیں، انہیں جُل دے کر آئی ہوں، آگے کیا ہوتا ہے، یہ تم پر منحصر ہے یا مجھ پر۔'' اس نے قدرے سرد لہجے میں کہا تو میں خاموش ہو گیا۔

شہباز نہر تک پہنچ کر پُل پار کر چکا تھا۔ وہ خطرناک حد تک تیز ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ اس نے اپنی رفتار اس وقت کم کی جب ایک رہائشی علاقے میں داخل ہوا۔ کچھ ہی دیر بعد ایک بنگلا نما گھر کے پورچ میں اس نے کار روک دی۔ میں پوجا کو لیے لاؤنج میں آ گیا۔

''یہاں نہیں بیٹھنا، اسے اوپر لے جاؤ۔'' شہباز نے کہا۔

''آؤ، اوپر چلیں۔'' میں نے کہا تو اس نے قدم بڑھا دیے۔

ہم ایک کمرے میں جا بیٹھے جہاں دو چار کرسیاں ہی پڑی ہوئی تھیں۔ وہ کمرے کے وسط میں جا کھڑی ہوئی۔ اس نے اپنا برقع اتارا اور ہاتھ اوپر کر کے کھڑی ہو گئی۔ اس نے سی گرین شلوار سوٹ پہنا ہوا تھا۔ میرے سامنے وہ بھرپور شباب میں کھڑی تھی۔

''یہ کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''تلاشی لے لو، پھر مت کہنا۔'' اس نے پوچھا۔

''پھر مت کہنا، مطلب، نکال لو گی پسٹل۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ہاں نا، خود نکال لو، ورنہ میں نکال لیتی ہوں۔'' اس نے کہا اور نیفے میں اُڑسا ہوا پسٹل نکال کر سامنے رکھ دیا۔ پھر ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''دیکھو ویر سنگھ، میں جانتی ہوں یہ تمہارا اصلی نام نہیں ہے، تم کون ہو، یہ بھی میں جانتی ہوں، میں تم سے ڈیل کیوں کرنا چاہتی ہوں، اور وہ ڈیل کیا ہے؟ اس سے پہلے میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔''

''بولو، میں تمہاری ہر بات سنوں گا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو وہ لحہ بھر خاموش رہی پھر کہتی چلی گئی۔

''جن دنوں تم نے بکّا راجھستانی کو مارا تھا، میں انہی دنوں روہی آ گئی تھی۔ میں انتقام سے بھری ہوئی تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں دل ہی دل میں پرارتھنا کر رہی تھی کہ تم مجھے نہ ملو۔''

میں جانتا تھا کہ میں نے بکّا راجھستانی کو نہیں مارا تھا بلکہ اسے پولیس آفیسر کے حوالے کیا تھا، میں نے اسے بتانا مناسب نہیں سمجھا اس لیے پوچھا۔

’’کیوں، تم تو مجھے مارنے آئی تھیں؟‘‘

’’صرف مارنے نہیں بلکہ اور بہت کچھ کرنا تھا مجھے۔ تمہارے نہ ملنے کی پرارتھنا میں اس لیے کر رہی تھی کہ میں تم سے ڈیل کر سکوں۔‘‘

’’پھر وہی ڈیل، ہونی ہوئی تو ہو جائے گی، تم بتاؤ، تم میری نفرت میں یہاں تک آگئیں اور یہ بھی کہہ رہی ہو کہ ڈیل، کیوں بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہی ہو، سیدھی بات کرو، وقت نہ ضائع کرو۔‘‘ میں نے اکتاہٹ سے کہا تو وہ دھیمے سے مسکراتے ہوئے بولی۔

’’مجھے تم سے نفرت تھی اور اب بھی ہے۔ تم نے مجھے بہت حد تک ڈسٹرب کیا، میرا سارا بنا بنایا کھیل تباہ کر دیا۔ میرا اپنا ایک کھیل تھا۔ لیکن مجھ سے انجانے میں ایک غلطی ہو گئی۔ میں نے تمہیں جوش و جذبات میں فون کر دیا، تم الرٹ ہو گئے اور ہاتھ آنے کے بجائے نکل گئے۔ اس پر راکیش ورما اور اس کے لوگوں نے مجھ پر شک کیا۔ میری اس غلطی کو معاف نہیں کیا کہ میں نے تمہیں الرٹ کیا ہے، اگر میں تمہیں جوش و جذبات میں فون نہ کرتی تو تم گھیرے جاتے۔ اسی لیے فقط اسی لیے مجھے غدار ٹھہرایا گیا اور مجھے مار دینے کا آدیش دے دیا گیا۔ میں یہاں سزا کے طور پر بھیجی گئی ہوں۔ مار کر واپس آجاؤں تو جو چاہوں سو کروں، نہ مار سکی تو خود ہی وہیں مر جانا۔‘‘

’’تو پھر تم نے مجھے مارا کیوں نہیں؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’ڈیل، جس سے مجھے اُن کی ضرورت نہیں رہے گی، میرا کھیل اپنی جگہ ویسے ہی برقرار رہے گا۔‘‘ اس نے سکون سے کہا۔

’’ڈیل کیا ہے؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’راکیش ورما کا قتل۔‘‘ اس نے عام سے انداز میں کہہ دیا۔

’’کیسے ہوگا؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’کسی کو ذرا سی بھی بھنک نہ پڑے کہ راکیش ورما کے قتل میں میرا کوئی ہاتھ ہے، جبکہ سب میں بتاؤں گی، کرنا تم نے ہے۔‘‘ اس نے عجیب سے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

’’کیسے بتاؤ گی؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’یہ مجھ پر چھوڑ دو، سب سے پہلے یہاں کا نیٹ ورک توڑ دو جو انہوں نے بنا رکھا ہے۔ تم جیسی چاہو ضمانت لے لو، لیکن راکیش ورما ختم ہونا چاہیے۔‘‘

’’ٹھہرو، پوجا ذرا ٹھہرو......‘‘ میں نے ایک دم سے کہا پھر سوچتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ’’تم دو باتیں کر رہی ہو۔ راکیش ورما کا قتل اور یہاں کے نیٹ ورک کی تباہی، ایسے کیسے ممکن ہے؟ کیا راکیش ورما یہاں پاکستان میں ہے؟‘‘

’’نہیں، وہ پاکستان میں نہیں ہے۔ اُسے مارنے کے لیے بھارت جانا پڑے گا۔ یا کسی بھی دوسرے ملک۔‘‘ اس نے کہا۔

’’تم کہہ رہی ہو یہاں کا نیٹ ورک تباہ کروں گا تو......‘‘ میں نے پوچھنا چاہا تو وہ کندھے اچکاتے ہوئے تیزی سے بولی۔

’’ہاں نا، میں یہاں کا نیٹ ورک تباہ کرنے میں تمہاری مدد کروں گی، یہ میری طرف سے وہ فائدہ ہے جو میں تمہیں دینا چاہتی ہوں۔ پہلے راکیش ورما کو مار دو یا پھر یہاں کا نیٹ ورک توڑ دو۔‘‘

’’تم نے راکیش ورما کو مارنے کی خود کوشش......‘‘ میں نے کہنا چاہا تو وہ تیزی سے بولی۔

’’ارے میں تو اسے اپنی آنکھ کے اشارے سے مار دوں، مگر میں ذمے داری خود پر نہیں لینا چاہتی۔ میں ایسا کیوں کر رہی ہوں، یہ میرا پرابلم ہے، تمہارا نہیں۔‘‘

’’تم کیا سمجھتی ہو میں راضی ہو گیا؟‘‘ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سخت لہجے میں کہا تو وہ.... کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔

’’یہ تم پر ہے کہ تم کیا کرتے ہو، تم چاہو تو مجھے قتل کر دو۔ میں حاضر ہوں۔ چاہو تو جانے دو، یا قید کر لو، میں نے خود کو تمہاری مرضی پر چھوڑا، میں اس سے بڑا ثبوت نہیں دے سکتی، اور نہ ہی رسک لے سکتی ہوں۔‘‘

اس نے اپنی بات کہی اور سکون سے کرسی کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ایک بار تو مجھے یوں لگا جیسے میں بند گلی میں آ گیا ہوں۔ مجھ میں فیصلہ کرنے کی قوت ہی نہیں ہے۔ یہ میری زندگی کا پہلا تجربہ تھا۔ میں جس سے نفرت کرتا تھا اور جو مجھ سے نفرت کرتی تھی، ہم دونوں اپنے مشترکہ دشمن کو شکست دینے کے لیے آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اُس کی ڈیل کے جواب میں کیا فیصلہ کروں؟

حالات کی تند و تیز آندھیوں کی زد میں آجانے والے نوجوان کی سنسنی خیز داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ پڑھیے

عمران جونیئر میری رہائش گاہ پر کشادہ ڈرائنگ روم میں موجود تھا۔ وہ مسلسل ٹھنڈی آہیں بھر رہا تھا اور ماہین کو یاد کر رہا تھا۔ وہ مجھے یہ باور کرانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ماہین کی جدائی کے سبب اس کا دل ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو چکا ہے۔ دل ٹوٹنے کی وجہ سے جسم میں خون کی گردش مکمل طور پر رک چکی ہے اور اس کے باوجود وہ اگر میرے سامنے صوفے پر بیٹھا ہے، باتیں واتیں کر رہا ہے تو یہ قدرت کا بہت بڑا کرشمہ ہی ہے۔

جوابی کارروائی

طاہر جاوید مغل

کبھی کبھی حواسِ خمسہ میں رونما ہونے والی غیر معمولی حرکت کسی طوفان کی آمد کا پتا دے رہی ہوتی ہے... حساس کیفیات کے مالک ان اشاروں سے مصیبت کو بھانپ لیتے ہیں... عمران جونیئر بھی اسی قسم کی صورت سے دوچار تھا... اس کے قریب بسنے والے انجان مگر جاں نثاروں کی خوشیاں داؤ پر لگ چکی تھیں...

اینٹ کا جواب پتھر سے دینے والے کی کہانی کا سنسنی خیز اختتام

میں نے کہا۔ ''اچھا اب شام ہونے والی ہے۔ یہ میری ایکسرسائز کا ٹائم ہے۔ اگر تم واقعی اب تک زندہ ہو تو اس سہولت سے فائدہ اٹھاؤ اور اندھیرا ہونے سے پہلے گھر پہنچ جاؤ تاکہ اگر تمہاری روح نے واقعی پرواز کرنی ہے تو پھر تمہارے گھر سے اور تمہارے محلے سے کرے۔''

''لیکن فی الحال میں کہیں جا بھی نہیں سکتا۔'' وہ سخت مایوسی کے عالم میں بولا۔

''کیوں؟ جا کیوں نہیں سکتے؟''

وہ ایک دم سنجیدہ نظر آنے لگا۔ ''چاچو! تمہیں اچھی طرح معلوم ہو چکا ہوگا کہ میں توہم پرست نہیں ہوں۔ نہ ہی بے معنی باتوں پر یقین رکھتا ہوں لیکن کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن پر یقین کیے بغیر چارہ نہیں ہوتا۔ میری دائیں آنکھ جب بھی پھڑکتی ہے، کچھ نہ کچھ ہو جاتا ہے اور یہ مسلسل پھڑک رہی ہے۔ کیا پتا میں موٹر بائیک پر نکلوں اور اگلے ہی چوک پر کچھ ہو جائے۔ مشہور ٹی وی اشتہار کے مطابق میں فی الحال گرنا تو بالکل افورڈ نہیں کر سکتا...... آپ کو پتا ہی ہے پرسوں رفیق صاحب کی بیٹی کی شادی ہے اور سارا انتظام و انصرام میرے ہی ذمے ہے۔ آہ میرے خدا! اس آنکھ کو بھی آج ہی پھڑکنا تھا۔'' اس نے زور سے آنکھ کو مسلا اور بار بار کھولنے اور بند کرنے کی کوشش کی۔

میں توہم پرستی کے حوالے سے کوئی بات کرتا تو ایک لمبی اور لاحاصل بحث شروع ہو جاتی۔ میں نے چپ رہنا مناسب سمجھا۔ اسی دوران میں میری نگاہ کھڑکی سے باہر پورچ کی طرف گئی اور ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ آگئی۔ ماہین کے بوائے فرینڈ کی اسپورٹس کار اندر داخل ہو رہی تھی اور کار میں ماہین بھی موجود تھی۔

میں نے کہا۔ ''لو، تمہاری آنکھ پھڑکنے کی وجہ سمجھ میں آگئی ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''ماہین اور اس کا دوست حشام آئے ہیں...... اب یقینی بات ہے۔ تمہاری عقل پر پتھر پڑنے ہیں۔ تمہاری زبان میں کھجلی ہونی ہے اور تم نے کوئی نہ کوئی ایسی بات کر دینی ہے، جس پر صورتِ حال کشیدہ ہو جانی ہے۔ حشام تو شاید درگزر کر جائے مگر تمہیں پتا ہی ہے ماہین بڑی تابڑ توڑ قسم کی لڑکی ہے۔ طیش میں آکر تمہاری عزت افزائی کے لیے کوئی بھی طریقہ اختیار کر سکتی ہے۔''

عمران نے گردن لمبی کر کے کھڑکی سے باہر جھانکا اور کھوپڑی سہلا کر رہ گیا۔ ''باپ رے باپ...... یہ تو واقعی وہی ہے۔''

''میں تو کہتا ہوں، اب بھی نکل جاؤ...... اور اگر نکل نہیں سکتے تو پھر کوئی واہیات پن نہ کرنا، خاموش بیٹھے رہنا۔''

''خاموش بیٹھنے کو تو بیٹھ جاؤں گا چاچو...... لیکن اس آنکھ کا کیا کروں گا...... یہ تو پھڑکے گی...... اس کے پھڑکنے کو ماہین نے کوئی نازیبا اشارہ سمجھ لیا تو کیا ہوگا اور اس سے بھی بُری بات یہ ہوگی کہ وہ خانہ خراب ''حشام'' اسے کوئی نازیبا اشارہ سمجھ لے۔''

''اسی لیے کہتا ہوں کہ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔''

''نہیں، نہیں۔ یہ بھی نہیں ہو سکتا۔'' اس نے کہا اور متلاشی نظروں سے اردگرد دیکھا پھر جلدی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ''ہاں ایک بات سمجھ میں آرہی ہے۔'' اس نے کارنس پر پڑی ہوئی میری دھوپ والی عینک اٹھائی اور چڑھا لی۔

کچھ ہی دیر بعد شوخ و شنگ ماہین اور اس کا بوائے فرینڈ حشام ''ہیلو ہائے'' کرتے ہوئے اندر آگئے۔ ماہین نئے فیشن کی سرخ جیکٹ اور دھاری دار چست پینٹ میں تھی۔ حشام کا قیمتی لباس بھی جدید تراش کا تھا۔ عمران کو میرے پاس بیٹھے دیکھ کر حشام کی چمکیلی پیشانی پر ناگواری کی ہلکی سی شکن ابھری۔ دوسری طرف ماہین کی سیاہ آنکھوں میں مدھم سی شرارت ناچ گئی۔ عمران سے مخاطب ہو کر بولی۔

''مسٹر عمران! آپ نے کالے گلاسز لگا رکھے ہیں۔ کہیں پر ویلڈنگ کر رہے تھے؟''

''نہیں ایسا تو نہیں۔ کل موٹر سائیکل پر جاتے ہوئے آنکھ میں کچھ پڑ گیا تھا...... بالکل سرخ ہو رہی ہے۔''

''یقین نہیں آرہا۔'' وہ مسکرائی۔

''آنکھ میں کچھ پڑنے کا یقین؟'' عمران نے پوچھا۔

''نہیں، اس کا کہ آپ موٹر سائیکل پر جا رہے تھے۔ کیا آپ کی موٹر سائیکل واقعی چل پڑتی ہے؟'' وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ عمران نے بھی ہنسنے میں ساتھ دیا۔

''ارے ہاں یاد آیا۔'' حشام نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''وہ آپ کی منہ بولی سسٹر کی شادی کب ہو رہی ہے؟''

''پرسوں برات آنی ہے جی؟''

''واقعی؟'' حشام نے شگفتہ لہجے میں کہا۔

''ہاں، ہاں۔ پرسوں شادی ہے۔'' میں نے تائید کی۔

ماہین ایک دم جیسے اُچھل کر بولی۔ ''حشام! کیوں نا

ہم بھی اس فنکشن میں شرکت کریں، مزہ آئے گا۔''

حشام نے کوئی خاص رسپانس نہیں دیا۔

میں نے ماہین سے مخاطب ہو کر کہا۔'' بھئی، یہ گلی محلے کی شادی ہے۔ شور شرابا ہوگا، کھانا وانا بھی شاید تم لوگوں کے ٹیسٹ کا نہیں ہوگا۔''

''یہی تو مزہ ہے انکل۔'' وہ جوشیلے انداز میں بولی۔ ''فائیو اسٹار شادیاں تو اٹینڈ کرتے ہی رہتے ہیں۔ یہاں نیا ماحول دیکھنے کو ملے گا۔ نئے طور اطوار...... نئے اسٹائل...... پلیز انکل! ہمیں بھی انوائٹ کریں۔'' پھر وہ حشام کی طرف رخ پھیر کر بولی۔'' ٹھیک ہے نا حشام! ایک مختلف طرح کی انجوائے منٹ ہو جائے گی۔ تصویریں وغیرہ اتاریں گے...... ہلا گلا کریں گے۔''

ماہین کا موڈ دیکھ کر حشام بھی نیم رضا مند نظر آنے لگا۔ بہرحال اس کے چہرے پر جوش نہیں تھا، ایک طرح کی نخوت بھی جیسے بہ زبانِ خاموشی کہہ رہا ہو...... چلو دیکھ لیتے ہیں ان غریب غربا کی شادی خانہ آبادی بھی۔

عمران نے ان دونوں کو باقاعدہ طور پر آنے کی دعوت دی اور وہیں بیٹھے بیٹھے سب کچھ طے ہوگیا۔

☆☆☆

یہ ایک خنک شام تھی لیکن سردی اتنی زیادہ نہیں تھی کہ تکلیف دیتی۔ گنجان آبادی کے اس پارک میں بند شامیانے لگے ہوئے تھے۔ پارک کی چاروں جانب اونچا آہنی جنگلا تھا۔ اسی چھوٹے سے پارک میں رفیق صاحب کی بیٹی کی برات آرہی تھی۔ عمران نے ہر کام بڑے احسن طریقے سے کیا تھا۔ انتظام میں کوئی کسر نظر نہیں آتی تھی۔ محلے کے چند دیگر نوجوان جو عمران کے دوست بھی تھے اس کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔ مناسب لائٹنگ کی گئی تھی۔ راستے میں چونا بکھیرا گیا۔ ایک طرف دیگیں کھڑک رہی تھیں۔ دوسری طرف ہلکا میوزک بج رہا تھا۔ میزوں کے گرد خوش لباس مرد وزن بیٹھے برات کا انتظار کر رہے تھے۔ بچے درمیانی جگہوں پر بھاگے پھر رہے تھے۔ جس میز پر میں بیٹھا تھا، ماہین اور اس کا بوائے فرینڈ حشام بھی وہیں موجود تھے۔ ماڈرن ماہین نے آج موقع کی مناسبت سے کچھ ڈھنگ کا لباس پہنا ہوا تھا۔ وہ عنابی رنگ کے کامدار شلوار قمیص میں تھی۔ گلے میں جھلملاتا ہوا دوپٹا تھا۔ حشام بھی سلیقے کے پینٹ کوٹ میں تھا۔ بہرحال اس کے بال وہی ماڈرن بلکہ لوفرانہ اسٹائل کے تھے۔ عمران تھوڑی دیر کے لیے ہمارے پاس آکر رکتا تھا کسی بات کی پھلجھڑی چھوڑتا تھا اور پھر دیگر کاموں میں مصروف ہو جاتا تھا۔ اسی دوران میں پتا چلا کہ دلہن ''برائیڈل پورشن'' میں آکر بیٹھ چکی ہے۔ ماہین مچل کر کھڑی ہوگئی۔ ''میں دلہن کو دیکھوں گی۔'' وہ بولی۔ پھر اپنے ریشمی بالوں کو ہلکورا دے کر بڑے اسٹائل سے چلتی ہوئی دلہن کی طرف چل پڑی۔

دو تین منٹ بعد میں نے عمران کو دیکھا وہ کسی خوبرو لڑکی کے ساتھ میری طرف آرہا تھا۔ ستاروں والے خوش رنگ آنچل میں لڑکی کا چہرہ چاند کی طرح دمک رہا تھا۔ ایک جگمگاتی شال اس کے کندھوں پر تھی۔ مجھے اسے پہچاننے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ یہ اسی محلے میں رہنے والی صوفیہ تھی۔ قارئین کو یاد ہوگا کراچی کا باکسر شاہنواز عرف کمانڈو اس کی محبت میں گرفتار تھا اور اس کے پیچھے لاہور پہنچا تھا۔ یہاں صوفیہ کے منگیتر واجد اور شاہنواز کا ٹاکرا ہوا تھا اور پھر فائرنگ کے ایک واقعے میں بگڑا امیر زادہ واجد حادثاتی طور پر ہلاک ہوگیا تھا۔ اس کے بعد جذبۂ ہمدردی کے تحت عمران نے شاہنواز کمانڈو کو قبائلی علاقے کی طرف فرار کرا دیا تھا۔ پچھلے دنوں، حادثاتی طور پر مرنے والے واجد کا بھائی مشاہد بدلہ چکانے کے لیے بھڑکا پھر رہا تھا۔

عمران اور صوفیہ میرے قریب پہنچے تو صوفیہ نے ادب سے سلام کیا۔ عمران اور وہ میرے پاس ہی بیٹھ گئے۔ عمران بولا۔ ''بیٹے چاچو! یہ صوفیہ صاحبہ کیا فرما رہی ہیں؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے صوفیہ کی طرف دیکھا۔ خوشی کے اس موقع پر بھی وہ غم زدہ اور اداس نظر آتی تھی۔

وہ کچھ نہیں بولی تو عمران نے کہا۔ ''یہ آپ سے الوداعی ملاقات کرنے کے لیے آئی ہے۔ یہ لوگ دو تین روز میں لاہور سے جارہے ہیں۔ کہاں جارہے ہیں، یہ بھی ٹھیک سے پتا نہیں۔''

''یہ عمران کیا کہہ رہا ہے صوفیہ؟''

وہ دھیمی آواز میں بولی۔ ''انکل تابش! آپ نے اور عمران بھائی نے ہمارے لیے جو کچھ کیا، اس کا احسان تو مرنے تک ہمارے دلوں پر نقش رہے گا لیکن واجد کی فیملی سے اب جو دشمنی چل نکلی ہے یہ بہت پریشان کرنے والی ہے۔ ابا جان دل کے مریض ہیں آج کل بھی بیمار ہیں۔ بھائی بے چارہ خود کو مشکل سے سنبھال پاتا ہے۔ پچھلے ہفتے پتا چلا ہے کہ واجد کے بھائی کی ضمانت ہوگئی ہے۔ وہ کسی بھی وقت ہمارے لیے مسئلہ پیدا کر سکتا ہے۔ ہم کوئی مشکل فیس نہیں کر سکتے، نہ ہی آپ جیسے خیر خواہوں کو کوئی پریشانی دینا چاہتے ہیں۔ اس لیے لاہور سے جانے کا فیصلہ کیا ہے۔''

''یہ تو تم نے عجیب خبر سنائی ہے صوفیہ! یہ اچھا بھلا سیٹ اَپ یوں اچانک چھوڑ کر کہاں جاؤ گے تم لوگ ؟''

''ابا جان کے ایک پرانے دوست کوئٹہ کے آس پاس کہیں رہتے ہیں، وہیں کا ارادہ ہے۔''

''کوئٹہ کے آس پاس؟'' میں نے وضاحت چاہی۔

پھر صوفیہ کے تاثرات دیکھ کر سمجھ گیا کہ وہ وضاحت سے بتانا نہیں چاہتی۔ یقیناً تحفظ کے نقطۂ نظر سے تو اسے یہی کرنا چاہیے تھا مگر ان لوگوں کا یوں ہراساں ہو کر یہاں سے نکلنا مجھے بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ یقیناً عمران کی بھی یہی کیفیت تھی۔ مرنے والے واجد کا بھائی مشاہد یقیناً ایک بُرا شخص تھا اور تعلقات بھی رکھتا تھا مگر ایسے لوگوں کے خوف سے پسپا ہونا، درحقیقت ان کے ظلم وستم کو بڑھاوا دینے والی بات ہوتی ہے۔

شاید صوفیہ سے ہماری بات چیت کچھ آگے چلتی مگر اسی دوران میں شور اٹھا کہ برات آ گئی ہے۔ ڈھول بجنے لگا اور آتش بازی وغیرہ ہونے لگی۔ ہم نے آگے جا کر برات کا استقبال کیا۔ اچھے سفید پوش لوگ لگتے تھے۔ دولھا بھی مناسب تھا۔ عمران کو دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے اس محلے سے رخصت ہونے والی واقعی اس کی سگی بہن ہو۔ اپنے عام سے لباس اور رنگ ڈھنگ کے ساتھ وہ اسی محلے کا ایک عام فرد نظر آتا تھا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ وہ انڈیا میں وسیع کاروبار رکھنے والا ایک نہایت خوش حال نوجوان ہے۔ لیکن جو کچھ بھی تھا اس کی جڑیں اسی سرزمین میں تھیں۔ انہی گلی کوچوں میں تھیں اور وہ اپنے ان لوگوں کی مسیحائی کے لیے ان کے درمیان موجود تھا۔

برات آتے ساتھ ہی نکاح خواں بھی پہنچ گئے۔ سامنے اسٹیج پر نکاح پڑھایا جانے لگا۔ میری نگاہ اسٹیج کے پاس ہی بیٹھی ہوئی خوبرو صوفیہ اور اس کی والدہ پر پڑی۔ صوفیہ کا چہرہ ایسے پھول کی طرح تھا جو خوش رنگ تو تھا مگر کملایا ہوا تھا۔ عمران کی طرح میرے دل کی بھی یہ گواہی تھی کہ صوفیہ بے شک ظاہر نہیں کرتی لیکن وہ محبت کی بوالعجبی کا شکار ہوئی ہے۔ ایک شریف زادی ہونے کے باوجود وہ کراچی کے اس باکسر کے لیے پسندیدگی اور الفت کے جذبات رکھتی ہے جسے عرف عام میں غنڈا کہا جاتا ہے۔ اب وہ غنڈا شاہنواز کمانڈو ایک اتفاقیہ قتل کے سبب آزاد علاقے میں روپوش تھا اور صوفیہ یہاں اپنے اہلِ خانہ سمیت مصائب کا شکار تھی۔ پتا نہیں کیوں میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ لاہور سے جانے کے بعد اس کے اہلِ خانہ جیسے تیسے اس کا رشتہ دیکھ کر فوراً اس کی شادی کر دیں گے اور یوں خاموش محبت کی ایک اور کہانی اپنے المیہ انجام کو پہنچ جائے گی۔

کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ انسان کسی اندیشے کے بارے میں سوچتا ہے، اس کے بارے میں بات کرتا ہے...... اور پھر وہ اندیشہ آناً فاناً حقیقت کا روپ دھارنے لگتا ہے۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے صوفیہ میرے اور عمران کے پاس بیٹھی اپنے خوف اور خدشات کی بات کر رہی تھی۔ ہرگز اندازہ نہیں تھا کہ یہ خدشات اتنی جلدی وحشت ناک صورت میں سامنے آ جائیں گے۔ نکاح ہو گیا تھا۔ چھوہاروں، کشمش اور خشک خوبانیوں والی چھوٹی چھوٹی تھیلیاں تقسیم ہو رہی تھیں۔ اچانک داخلی راستے کی طرف شور سنائی دیا۔ یوں لگا کہ کچھ لوگ دندناتے ہوئے اندر آ گئے ہیں۔ تب میری آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ میں نے چار پانچ افراد کو دیکھا۔ وہ بھڑ امار کر اندر گھس آئے تھے۔ وہ مسلح تھے۔ ان میں سے کم از کم دو کے ہاتھوں میں کلاشنکوفیں صاف دکھائی دے رہی تھیں، باقیوں کے پاس بھی یقیناً آتشیں ہتھیار تھے۔ اکثر سروس پسٹل میرے پاس موجود ہوتا تھا لیکن آج کچھ بھی نہیں تھا۔ اندر گھسنے والے افراد لوگوں کو دائیں بائیں دھکیلتے ہوئے سیدھے اسٹیج کی طرف بڑھے۔ میں نے دیکھا شلوار قمیص میں ملبوس ایک پہلوان نما شخص میز پر چڑھ گیا۔ اس کے ہاتھ میں بھی آٹومیٹک رائفل تھی۔ وہ دہاڑا۔ ''خبردار کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلے...... اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھے رہو۔''

خواتین کے چلانے کی آوازیں آئیں اور وہ جو بھاگنے کی فکر میں تھیں اپنے بچوں کو اپنے ساتھ چمٹا کر ساکت جامد کھڑی رہ گئیں۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے پارک کی چاروں جانب اونچا آہنی جنگلا تھا۔ پارک کے سلاخ دار گیٹ کو اندر سے بند کر دیا گیا تھا اور وہاں بھی ایک مسلح بدمعاش موجود تھا۔ عملی طور پر لوگ اب اس شامیانے میں بند ہو کر رہ گئے تھے۔ اچانک میری نگاہ لمبے قد والے مسلح شخص پر پڑی اور میں سکتہ زدہ رہ گیا۔ یہ کوئی اور نہیں ضمانت پر رہا ہونے والا مشاہد احمد تھا۔ وہ اپنے بھائی کے قتل کے بعد صوفیہ کے درپے تھا۔ وہ سیدھا تیر کی طرح اس میز پر پہنچا جہاں صوفیہ اپنی والدہ اور چند دیگر خواتین کے ساتھ موجود تھی۔ اس نے جاتے ساتھ ہی دہشت زدہ صوفیہ کو بالوں سے جکڑ لیا اور کھینچ کر ایک کونے میں لے گیا۔

''یہ کیا ہو گیا ہے چاچو؟'' عمران بھاگتا ہوا میرے پاس آیا۔ اس کی نگاہ بھی اسٹیج پر تھی۔

"وہی حرام زادہ ہے۔ واجد کا بھائی۔" میں نے سرسراتے لہجے میں کہا۔

اور یہی وقت تھا جب میری نظر مشاہد کی دائیں جانب کھڑے شخص پر پڑی اور میرے پورے جسم میں سردی کی تیز لہر دوڑ گئی۔ سانولے چہرے اور صفاچٹ سر والا یہ لمبا تڑنگا شخص میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ میں اسے اچھی طرح جانتا تھا اور میں ہی نہیں پنجاب پولیس کے اکثر افسر اور اہلکار اسے بڑی اچھی طرح جانتے تھے۔ یہ دلاور عرف تیزاب تھا۔ یہ نہایت سفاک مجرم درجنوں افراد کا قاتل تھا۔ ڈھائی تین سال پہلے جب یہ جیل توڑ کر فرار ہوا تھا اس وقت بھی جیل پولیس کے تین اہلکار اس کے ہاتھوں قتل ہوئے تھے۔ فراری کے دوران میں دو بچوں کو بھی اس نے گاڑی کے نیچے کچلا تھا۔ جیتے جاگتے بندے کو موت کی نیند سلانا تیزاب کے لیے ایسا ہی تھا جیسے چیونٹی کو مسل دینا۔ اور یہ وحشی تیزابا اس وقت مشاہد کا پشت پناہ بنا اس کے عقب میں کھڑا تھا۔ مجھے اس کے ہاتھ میں بریٹا ماڈل 12 کا مشین پسٹل صاف نظر آرہا تھا۔

ہم دونوں اسٹیج کی طرف بڑھے اور اگلے دو سیکنڈ میں تیزاب اور مشاہد سے آٹھ دس قدم کے فاصلے پر پہنچ گئے۔ میں نے اندازہ لگالیا کہ عمران کا آتشیں لہو اس کے جسم کو گرما چکا ہے اور وہ جان کی پروا کیے بغیر کچھ کرگزرے گا۔

"نہیں عمران۔" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "جلدی نہیں کرنی، یہاں خطرناک لوگ موجود ہیں۔"

دو عورتوں نے خوف زدہ ہوکر شامیانے کے داخلی راستے کی طرف بھاگنے کی کوشش کی۔ تیزاب نے اپنے سائیلنسر لگے پسٹل سے بے دریغ ان کے قدموں میں گولیاں چلائیں۔ گولیاں انہیں نہیں لگیں مگر دہشت کے سبب دونوں گر گئیں۔ ان میں سے ایک شاید بے ہوش ہو چکی تھی۔

"تیزاب اپنی بھاری نشیلی آواز میں دہاڑا۔ "جس کو جان پیاری ہے اپنی جگہ سے نہ ہلے، نہیں تو بھون ڈالیں گے۔"

تیزاب کا ایک بندہ لپک کر اسٹیج کی طرف گیا۔ اس نے دولھے کے منہ پر ایک تھپڑ مار کر اس کے گلے سے نوٹوں والا ہار نکالا اور لمبے ڈگ بھرتا ہوا مشاہد کی طرف آیا۔ صوفیہ ابھی تک مشاہد کی گرفت میں تھی۔ وہ دہشت کے سبب گنگ ہو چکی تھی۔ رنگ لٹھے کی طرح سفید تھا۔ تیزاب کے کارندے نے دولھے والا ہار مشاہد کے گلے میں ڈال دیا۔

مشاہد نے پستول لہراتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔ "تم سب لوگ جانتے ہو، حسنات احمد کی یہ بیٹی صوفیہ میرے بڑے بھائی واجد احمد کی منگیتر تھی اور تم میں سے بہت سے لوگ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ ہمارے خاندان میں منگ کو چھوڑا نہیں جاتا۔ اس کا مقام بیوی جیسا ہی ہوتا ہے۔ اب واجد بھائی نہیں ہے، صوفیہ کا نکاح مجھ سے ہوگا...... اور ابھی اسی وقت ہوگا۔ آج یہاں سے ایک نہیں دو دلہنیں رخصت ہوں گی۔"

صوفیہ، مشاہد...... کی گرفت میں کسمسائی مگر باز کی گرفت میں آئی ہوئی چڑیا... کتنا کسمسا سکتی ہے۔ مشاہد یا اس کے کسی ساتھی کی نظر ابھی تک مجھ پر یا عمران پر نہیں پڑی تھی۔ میں نے اپنی سفید شال کو کسی مفلر کی طرح اپنے چہرے کے سامنے کرلیا تھا۔ یہ سنگین صورتِ حال دیکھ کر محلے کے ایک سفید ریش بزرگ لرزتے ہوئے آگے بڑھے۔ انہوں نے مشاہد سے مخاطب ہوکر نحیف آواز میں کہا۔ "پُتر جی! یہ سب ٹھیک نہیں ہے، ایک طرف تم نکاح کی بات کررہے ہو دوسری طرف اسلحہ تانا ہوا ہے...... اگر کوئی ایسی بات ہے تو......"

ابھی بزرگ کا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ تیزاب نے بے دریغ ایک جھانپڑ اُن کے سر پر رسید کیا۔ ان کی پگڑی اچھل کر دور جا گری۔ وہ خود بھی قالین پر گرے۔ تیزابا دہاڑا۔ "اس وقت یہ اچے شملوں والے حرامی محلے دار کہاں تھے جب کراچی کا وہ غنڈا باکسر اس لڑکی کو اور اس کے گھر والوں کو دھمکیاں دیتا تھا اور تب کہاں تھے یہ محلے دار، جب مشاہد کے بھائی کو گولیوں سے چھلنی کیا گیا اور اس قاتل باکسر کو آزاد علاقے میں بھگایا گیا...... بلکہ اسے بھگانے والا تم ہی حرامی محلے داروں میں سے ایک تھا۔ وہ کنجر کا تخم جسے تم لوگ ہیرو بھائی کہتے ہو۔" پھر تیزابا اپنے ایک کلاشنکوف بردار سے مخاطب ہوکر دہاڑا۔ "دیکھو اس گندی ماں کے بچے کو یہاں ہی کہیں چوہے کی طرح چھپا ہوگا۔"

میں نے عقب میں دیکھا۔ عمران اب کھڑے لوگوں کے درمیان کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ اس لیے اس کا فوری طور پر نظر آنا آسان نہیں تھا۔ اس نے اپنی پی کیپ بھی پیشانی پر جھکا رکھی تھی۔ اسی دوران میں ایک اور ہنگامہ ہوگیا۔ شومیِ قسمت ماہین دلہن والے پورشن سے نکلی تھی اور مشاہد کے ایک ساتھی کی نظر اس پر پڑ گئی تھی۔ ایک پچھلی جھڑپ میں ماہین نے ٹانگ رسید کر کے مشاہد کے ایک ساتھی کے تین دانت اس کے گلے میں پہنچا دیے تھے۔ ماہین کو دیکھتے ہی مسلح شخص اس

کی طرف جھپٹا اور اس کی گردن کو اپنے بازو کی گرفت میں جکڑنا چاہا۔ ماہین ڈر کر بھاگی اور اس کے بال حملہ آور کی گرفت میں آگئے۔ ماہین نے تڑپ کر اس کی ناف میں ٹانگ رسید کی اور خود کو چھڑانا چاہا۔ تاہم اسی دوران میں مُنڈے سر والے لمبے تڑنگے تیزابے نے بھی اسے دبوچ لیا۔ اس نے اپنا توانا بازو ماہین کی گردن میں حمائل کیا اور اسے بیدردی سے گھسیٹتا ہوا کونے میں لے گیا۔ ماہین کا بوائے فرینڈ حسام میرے پہلو میں ہی کھڑا تھا۔ ماہین کو مصیبت میں دیکھ کر اس کا رنگ ہلدی ہو گیا تھا۔ وہ بے چینی سے دو قدم آگے بڑھا لیکن پھر پیچھے ہٹ آیا۔ اس بے چارے میں اتنی سکت نہیں تھی کہ ماہین کی مدد کے لیے آتشیں ہتھیاروں کے سامنے جا سکتا۔ تیزابے کی گرفت میں ماہین ابھی تک مزاحمت کررہی تھی۔ اسے پتا نہیں تھا کہ وہ کس وحشی کے شکنجے میں ہے۔ اس کی مزاحمت ختم کرنے کے لیے تیزابے نے بے رحمی سے اس کے گریبان پر ہاتھ ڈالا اور اس کا خوب صورت عنابی کرتہ سامنے سے پھاڑ کر رکھ دیا۔ اس کا زیریں لباس جھلک دکھانے لگا۔ عمران نے بھی میرے عقب سے یہ سب کچھ دیکھ لیا تھا۔ اب اس کے لیے مزید برداشت کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔

''چاچو! کچھ کرنا پڑے گا۔'' اس نے چڑھی ہوئی سانس کے ساتھ میرے کان میں سرگوشی کی۔ وہ آگے بڑھنے کے لیے بالکل تیار نظر آیا۔

''نہیں عمران!'' میں نے اس کا کندھا بڑی مضبوطی سے تھام لیا۔ ایک طرح سے میں نے اپنی انگلیاں اس کے کندھے میں دھنسا دی تھیں۔ ''یہ شخص جنونی قاتل ہے۔ ذرا سی غلطی پر ماہین کی جان چلی جائے گی۔ میں اس جانور کو بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔''

''لیکن چاچو! کیا ہم تماشا دیکھتے رہیں گے؟'' وہ پھنکارا۔

''نہیں...... لیکن ابھی نہیں...... ہمیں موقع دیکھنا پڑے گا۔'' میں نے اپنے چہرے کے سامنے سفید شال کو درست کرتے ہوئے کہا۔ اپنے لہجے کی لرزش خود مجھے بھی محسوس ہوئی۔

اسی دوران میں اسٹیج کی طرف کسی کو زناٹے کا تھپڑ پڑا اور گرجنے کی آواز آئی۔ یہ صوفیہ کی دہشت زدہ والدہ تھیں۔ وہ تھپڑ کھا کر اوندھے منہ کرسیوں پر گری تھیں اور بے ہوش ہو گئی تھیں جیسا کہ بعد میں پتا چلا انہوں نے اپنے موبائل سے ون فائیو پر کال کرنے کی کوشش کی تھی۔

دراز قد مشاہد نے صوفیہ کو اپنے ساتھ چمٹا رکھا تھا اور پستول اس کے سر پر رکھا ہوا تھا۔ وہ گرجا۔ ''میں ایک بار پھر کہتا ہوں، اگر تم میں سے کسی نے اپنا موبائل فون استعمال کرنے کی کوشش کی تو گولی سیدھی اس کے منہ میں جائے گی۔''

پھر تیزابے کے اشارے پر وہ نیم جان صوفیہ کو گھسیٹتا ہوا اسٹیج کی طرف آگیا۔ دولھا والا ہار بدستور اس کے گلے میں تھا۔ وہ نکاح خواں سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''مولوی! چلو جلدی کرو شاباش...... نکاح پڑھاؤ...... ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔''

مولوی صاحب بے بسی کی تصویر نظر آرہے تھے۔ کبھی مسلح افراد کی طرف دیکھتے تھے، کبھی حاضرین کی طرف۔ اس شامیانے میں حاضرین کی تعداد ڈیڑھ سو کے لگ بھگ تھی۔ وہ سب کے سب پتھرائے ہوئے تھے۔ یقیناً ان میں سے پندرہ بیس تو ایسے ضرور تھے جو اس معروف قاتل دلاور عرف تیزاب کو پہچان گئے تھے اور وہ دوسروں سے زیادہ ہراساں نظر آتے تھے۔ درمیانی عمر کا ایک ایسا ہی معزز شخص ہمارے قریب موجود تھا۔ اس نے کپکپاتی آواز میں اردگرد کھڑے لوگوں کو بتایا تھا کہ یہ ڈکیت تیزابا ہے۔

مولوی صاحب نکاح پڑھانے میں پس و پیش کررہے تھے۔ لہٰذا انہیں بھی تیزابے کا ایک زوردار دھکا کھانا پڑا۔ وہ بے چارے الٹ کر اسٹیج سے نیچے جا گرے۔ اسی دوران میں مشاہد اور تیزابے کے درمیان تھوڑی سی کانا پھوسی ہوئی۔ یکایک صورتِ حال میں ڈرامائی تبدیلی آگئی۔ اندازہ ہوا کہ مشاہد نے نکاح کے تکلفات میں پڑنے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔ وہ صوفیہ کو اپنے ساتھ گھسیٹتا ہوا اسٹیج سے نیچے اتر آیا۔ دوسری طرف ماہین لمبے تڑنگے تیزابے کی گرفت میں تھی۔ اس کے پاؤں زمین پر نہیں لگ رہے تھے۔ وہ ماہین کو اسی طرح اٹھائے اٹھائے داخلی راستے کی طرف بڑھا۔ مشاہد اس کے پیچھے تھا۔ وہ یہاں سے نکل رہے تھے۔ شاید انہوں نے سوچا تھا کہ ہجوم میں سے کسی نہ کسی نے اپنا موبائل فون استعمال کر لیا ہوگا اور یہاں پولیس وغیرہ کی مداخلت ہو سکتی ہے۔

''یہ تو نکل رہے ہیں۔'' عمران نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔ اس کے ساتھ ہی وہ بپھر کر کھڑا ہو گیا۔

کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ یہ کم بخت گروہ بڑی تیاری سے آیا تھا۔ کم از کم تین کلاشنکوف...... دو سیمی آٹومیٹک

رائفلیں اور کئی پسٹل تھے۔ اتنے اسلحے کے سامنے کسی طرح کی مزاحمت سراسر حماقت تھی مگر ان نازک لمحوں میں بے عمل رہنا بھی بے حد مشکل تھا۔ حاضرین کو مزید دہشت زدہ کرنے کے لیے دو کلاشنکوف برداروں نے اچانک رائفلوں کے بیرل اوپر اٹھائے اور ٹریگرز دبا دیے۔ گولیوں کی خوفناک تڑتڑاہٹ نے قیامت کا سماں پیدا کر دیا۔ شامیانے کی ''کنوپی'' میں درجنوں ہی سوراخ ہو گئے ہوں گے۔ عورتوں اور بچوں کے چلّانے سے ہر طرف کہرام مچ گیا۔ کچھ لوگ میزوں کے نیچے چھپ گئے۔

میں اور عمران جھک کر چلتے ہوئے داخلی دروازے کی طرف بڑھے مگر آناً فاناً سب کچھ ہو گیا۔ پارک کے دروازے کے ساتھ ہی جہازی سائز کی ایک نیلی جیپ کھڑی تھی۔ دونوں لڑکیوں سمیت حملہ آور بھرا مار کر اندر گھس گئے۔ ایک کلاشنکوف کی نال اب بھی جیپ کی کھڑکی سے باہر نکلی ہوئی تھی اور ہوائی فائرنگ ہو رہی تھی۔ جونہی جیپ طوفانی انداز میں موڑ کاٹ کر روانہ ہوئی۔ میں اور عمران بھی اپنی گاڑی میں گھسے اور ان کے پیچھے لپکے۔ یہ دہی میری کار گرے کلٹس تھی۔

عمران جھلّاہٹ میں بڑبڑایا۔ ''یہ بڑی زیادتی ہو رہی ہے۔ ہمارے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے۔''

ڈرائیو کرتے ہوئے مجھے نیلی جیپ کی عقبی سرخ بتیاں نظر آ رہی تھی۔ ایک منٹ کے اندر اندر ہم اندرونی سڑک سے نکل کر بڑی سڑک پر پہنچ گئے۔ میں نے ڈیش بورڈ میں سے اپنا موبائل نکالا اور علاقے میں موجود پٹرولنگ بیٹ سے رابطہ قائم کیا۔ ''ہیلو زبیر! ڈی ایس پی تابش اسپیکنگ! یہاں موہنی روڈ پر ایک بڑی واردات ہو گئی ہے۔ مجرم نیلے رنگ کی ٹویوٹا جیپ پر بھاگ رہے ہیں۔ نمبر پلیٹ ٹھیک سے پڑھی نہیں جا سکی۔ آخری ہندسے 432 ہیں۔ جیپ کا رخ بند روڈ کی طرف ہے۔ میں پیچھا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔''

''ٹھیک ہے سر! ہم ملتان روڈ کی طرف ہیں لیکن پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔''

سب انسپکٹر سے بات کرنے کے بعد میں نے وائرلیس پر بھی پیغام چلوا دیا مگر مسئلہ یہ تھا کہ ائرپورٹ کی طرف، شاہراہ قائداعظم پر ایک بہت اہم وی آئی پی موومنٹ تھی۔ بیشتر پولیس اور پٹرولنگ گاڑیاں اُدھر موجود تھیں۔ لاہور کا ایک بڑا حصہ لاوارث پڑا ہوا تھا۔

ہم کامیابی سے نیلی جیپ کا تعاقب کر رہے تھے مگر درمیانی فاصلہ بڑھ رہا تھا۔ عمران اب غصے اور جھنجلاہٹ سے نکل کر جوشیلے موڈ میں آ چکا تھا، بولا۔ ''چاچو! میری آنکھ یوں ہی نہیں پھڑک رہی تھی۔ کل سے عجب وسوسے دل میں آ رہے تھے۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے جھک کر اپنی پتلون کا پائنچا اوپر اٹھایا۔ اس کی پنڈلی کے ساتھ چمڑے کا ایک غلاف بندھا ہوا تھا۔ غلاف میں لمبے پھل کا ایک تیز دھار چاقو تھا۔ بے شک یہ ایک معمولی ہتھیار تھا مگر فی الوقت یہ بھی غنیمت محسوس ہوا۔

میں نے کلٹس کی رفتار حتی الامکان تیز کر دی تھی مگر درمیانی فاصلہ پھر بھی کم نہیں ہو پا رہا تھا۔ مجرم کو شہریوں کی جان کی پروا نہیں ہوتی لیکن قانون نافذ کرنے والوں کو یہ خیال رکھنا پڑتا ہے۔ میں بھی اس تعاقب میں دیوانگی کی حد تک نہیں جا سکتا تھا۔ سڑکوں پر ٹریفک موجود تھا، ہمیں ایک دو سرخ اشارے بھی نظرانداز کرنا پڑے تھے۔ پھر اچانک یوں ہوا کہ نیلی جیپ کی عقبی لائٹس ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گئیں۔

''اوہ گاڈ!'' عمران نے بھنّا کر ڈیش بورڈ پر مکّا مارا۔ ''چاچو! رفتار بڑھاؤ۔''

میں نے رفتار بڑھنے کے بجائے کچھ گھٹا دی۔ ''کیا کر رہے ہو چاچو؟'' وہ بوکھلا گیا۔

میں نے کچھ آگے جا کر گاڑی بائیں جانب لوئر مال روڈ کی طرف موڑ دی۔ ''چاچو! یہ کس طرف جا رہے ہو؟''

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''عمران! مجھے لگتا ہے کہ اب ان کے پیچھے جانے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ اب ہمیں کاؤنٹر اٹیک کرنا پڑے گا۔''

''کاؤنٹر اٹیک؟''

''ہاں اینٹ کا جواب اینٹ سے دینا ہو گا...... بلکہ پتھر سے۔'' میں نے گاڑی کی رفتار بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''میں اس باسٹرڈ تیز ابے کے بارے میں کافی کچھ جانتا ہوں۔ اس کی ایک بہت زیادہ دکھتی رگ ہے۔ اس رگ کا پتا مجھے دو تین ہفتے پہلے ہی چلا ہے۔ ایک محبوبہ ہے اس کی جس پر جان چھڑکتا ہے۔ کبھی کبھار چھپ کر اس کے پاس بھی آتا ہے۔ دعا کرو کہ وہ اپنے ٹھکانے پر ہمیں مل جائے اور ہم اس تک پہنچ بھی سکیں۔''

''لیکن اگر وہ نہ ملی ...... یا ...... اُس کے ذریعے تیز ابے سے رابطہ نہ ہو سکا تو؟''

''تو پھر جو ہو گا، دیکھا جائے گا۔ ایک راستہ بند ہوتا ہے تو دو چار کھل بھی جاتے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ ہماری کوئی

پٹرولنگ ٹیم اُسے دیکھ لے...... یا پھر کسی ناکے وغیرہ پر گاڑی ٹریس ہوجائے۔‘‘

صوفیہ کا ملیح نازک چہرہ میری نگاہوں میں گھوم رہا تھا اور اس پر بے تحاشا ترس آرہا تھا۔ اس کا بھائی معذور تھا اور باپ دل کا مریض۔ وہ ایسے سنگین چکر میں پھنس گئی تھی جس نے آج آناً فاناً اس کی عزت اور زندگی داؤ پر لگا دی تھی۔ اگلے ایک ڈیڑھ گھنٹے میں اس کے ساتھ کچھ بھی ہوسکتا تھا اور اسے جاننے والا باکسر شاہنواز کمانڈو یہاں سے سیکڑوں میل دور قبائلی علاقے کی کسی ایجنسی کے چھوٹے سے قصبے میں پڑا تھا۔ اس بدقسمت کو کچھ خبر نہیں تھی کہ وہ جس کے نام کی مالا جپتا پھرتا ہے، وہ زندگی اور موت کی کٹھن ترین آزمائش سے دوچار ہو چکی ہے اور وہ اکیلی نہیں تھی۔ اس شب عروسی میں اٹھنے والے طوفان کی لپیٹ میں وہ لڑکی بھی آگئی تھی جس کا اس سارے معاملے سے قطعی کوئی تعلق نہیں تھا۔ میری مراد ماہین سے ہے۔ وہ صرف ایک روایتی شادی کی رسومات دیکھنے کے لیے اپنے فرینڈ کے ساتھ اس آبادی میں آئی تھی اور ان خطرناک قاتلوں کے چنگل میں پھنس گئی تھی۔ مجھے اس کے بوائے فرینڈ حسام کا خیال آیا۔ اگر وہ ہمت کرتا اور اس میں جذبہ ہوتا تو وہ ہمارے ساتھ اس گاڑی میں سوار ہو جاتا لیکن میں نے اسے دیکھا تھا، جب ہم جیپ کا پیچھا کرنے کے لیے اپنی گاڑی کی طرف لپکے تھے، وہ ہراساں چہرے کے ساتھ وہیں کھڑا رہا تھا۔

تیز رفتار ڈرائیونگ کے ساتھ ساتھ میں نے مسلسل فون بھی استعمال میں رکھا ہوا تھا۔ میں پٹرولنگ پولیس کی نقل و حرکت سے آگاہی حاصل کررہا تھا۔ قریباً بیس منٹ میں ہم ٹاؤن شپ کے علاقے میں ایک خوب صورت کوٹھی کے سامنے پہنچ گئے۔ میری معلومات کے مطابق یہی ہماری مطلوبہ کوٹھی تھی۔ شاید اس رہائشی علاقے میں کسی کو یہ پتا نہیں ہوگا کہ اس چار دیواری کے اندر ایک خطرناک ترین قاتل اور مفرور، ولاور عرف تیزاب کی داشتہ خانی رہائش پذیر ہے۔ پولیس کو یہ شک بھی تھا کہ وہ بھی کبھار رات کی تاریکی میں اس کے ساتھ شب بسری کرنے بھی آتا ہے۔ یہ خانی نامی لڑکی ایک مہینے سے کہیں گئی ہوئی تھی اور غالباً دو تین دن پہلے ہی یہاں پہنچی تھی۔ ہماری بڑی بڑی کشادہ آبادیوں میں رہنے والے اسی طرح اپنے اڑوس پڑوس سے بے خبر ہوتے ہیں اور یہ بے خبری کبھی کبھی بہت نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔

کوٹھی کی چار دیواری اور گیٹ بہت بلند تھا۔ بظاہر کوئی چوکیدار بھی نظر نہیں آرہا تھا مگر یہ بات یقینی تھی کہ یہاں کم از کم ایک گارڈ تو ضرور موجود ہوگا۔

ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ یہ آر یا پار والی سچویشن تھی۔ ہم نے گاڑی کچھ فاصلے پر کھڑی کی۔ کوٹھی کے پہلو کی عمارت دیکھ کر ہی پتا چل جاتا تھا کہ وہ تعمیر کے مراحل سے گزر رہی ہے۔ میں اور عمران احتیاط سے اس تاریک عمارت میں داخل ہو گئے۔ ایک کچے پکے لان میں تین مزدور ٹائپ افراد بیٹھے آگ تاپ رہے تھے اور سگریٹ پھونک رہے تھے۔ خوش قسمتی سے ہم ان کی نظروں میں آئے بغیر کوٹھی کی بیرونی دیوار کے پاس پہنچ گئے۔ پہلے عمران نے اپنے ہاتھ سے سپورٹ دے کر مجھے اوپر چڑھایا پھر خود بھی اندر چلا آیا۔

ایک السیشین کتا منہ سے غصیلی گونج دار آواز نکالتا ہوا تیزی سے ہماری طرف آیا۔ میں ردِعمل کے لیے پوری طرح تیار ہو گیا لیکن پھر عجیب بات ہوئی۔ کتا ہمارے پاس آکر رک گیا۔ اس نے تیزی سے عمران کے گرد دو چکر لگائے، اپنی تھوتھنی اس کی پنڈلی سے رگڑی اور دم کو گردش دینے لگا۔ یہ منظر عجیب تو تھا لیکن میرے لیے بہت زیادہ عجیب نہیں تھا۔ مجھے یقین ہو چکا تھا کہ عمران جونیئر میں بھی کچھ ایسی سُپر نیچرل خصوصیات موجود ہیں جو اس کے مرحوم والد عمران تابش میں تھیں۔ میں ایسی باتوں پر یقین رکھنے والا بندہ نہیں تھا مگر جب سب کچھ ہمارے حواس خمسہ کے سامنے ہو تو اسے کیسے جھٹلایا جاسکتا ہے۔ مجھے اب یقین ہونے لگا تھا کہ عمران جونیئر میں بھی بے مثال Luck موجود ہے۔ وہ بھی خطروں کی بُو سونگھ لیتا ہے۔ جانور اس کے ساتھ ایک مختلف ردِعمل کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ممکن تھا کہ آگے چل کر ایسی کچھ اور باتوں کا پتا بھی چلتا۔

ایک آواز نے ہم دونوں کو چونکایا۔ یہ کوٹھی کے مین گیٹ کی طرف سے آئی تھی۔ ہمارا اندازہ درست تھا، گیٹ کی طرف ایک کمبل پوش چوکیدار موجود تھا۔ ہم نیم تاریکی میں سمٹ گئے۔ چوکیدار کو شاید کتے کی آواز نے شک میں مبتلا کیا تھا۔ وہ اس کو پچکارتا ہوا ساتھ والی اوپن ایئر راہداری میں آیا۔ وہ لمبا اور موٹا تازہ کوہستانی تھا۔ کندھے پر رائفل بھی تھی۔ جونہی وہ ہم سے آٹھ دس فٹ کے فاصلے پر پہنچا، میں نے اس پر ہلّا بول دیا۔ میرا پہلا گھونسا ہی اس کے جبڑے پر ایسا زوردار اور ٹھکانے کا تھا کہ وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح فرش کی طرف آیا۔ گرنے سے پہلے ہی عمران نے لپک کر اسے تھام لیا اور آرام سے فرش پر لٹا دیا۔ جسیم کتا قطعی طور پر لاتعلقی کا مظاہرہ کررہا تھا۔ عمران نے اس کی

تھوتھنی کو سہلایا اور اس کی کمر پر ہاتھ پھیرا۔ چوکیدار کی خودفراموشی کی طرف سے مطمئن ہو کر میں اور عمران گھوم کر کوٹھی کے اندرونی دروازے کی طرف آئے۔ چوکیدار کی پمپ ایکشن رائفل اب میرے پاس تھی۔ اندر دو تین کمروں میں روشنی ہو رہی تھی۔ میوزک کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔

ہمارے پاس سوچنے کے لیے زیادہ وقت نہیں تھا۔ عمران نے مین انٹرینس کے دروازے پر دستک دی۔ چند لمحوں بعد درمیانی عمر کی ایک ہتھنی برآمد ہوئی۔ وہ گھر کی ملازمہ لگتی تھی مگر جسامت کسی پہلوان سے کم نہیں تھی۔ خاص طور سے چربی دار توند بہت نمایاں تھی۔ اس نے اپنے پھاوڑے جیسے دانت نمایاں کرتے ہوئے کرخت لہجے میں پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟ کون ہو تم؟“

عمران نے تپے ہوئے انداز میں کہا۔ ”پولیو ورکر ہیں۔ ٹیکا لگانے آئے ہیں۔“

”کیا کہہ رہے ہو، پولیو کا ٹیکا؟ اس وقت؟“

”یہ نئی مہم شروع ہوئی ہے۔“ عمران نے اسے نظروں ہی نظروں میں تولتے ہوئے کہا۔ ہم دونوں یہ اندازہ لگانے کی کوشش کررہے تھے کہ اندر کی صورتِ حال کیا ہے اور وہاں کتنے لوگ ہیں۔

وہ گڑبڑائے ہوئے انداز میں بولی۔ ”یہ...... کیا...... بکواس ہے اور یہاں کوئی بچہ نہیں ہے۔“ پھر بڑے غصے کے ساتھ اس نے شاید چوکیدار کو آواز دینے کے لیے منہ کھولا تھا کہ عمران نے اس کی چربی دار توند پر انگلی چبھوئی۔ ”بچہ نہیں ہے لیکن آنے تو والا ہے۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے اس کی گردن پر گسوٹا مارا اور دوسرے ہاتھ سے اس کا منہ دبا لیا۔ وہ عمران کی گرفت میں کسی وہیل مچھلی کی طرح پھڑکی۔ عمران نے لمبے پھل کا خطرناک چاقو اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا اور پھنکارا۔ ”اگر آواز نکالی تو چوکیدار کی طرح تمہیں بھی ذبح کردوں گا۔“

اُس کے ہونٹوں سے گھٹی گھٹی آوازیں نکلنے لگیں۔ وہ بُری طرح دہشت زدہ ہوگئی تھی۔ میرے اشارے پر عمران اسے گھسیٹ کر برآمدے کے پاس ایک باتھ روم میں لے گیا اور بُری طرح ڈرانے دھمکانے کے بعد اسے وہاں لاک کردیا۔ اس فربہ اندام ملازمہ کی زبانی ہمیں معلوم ہوا کہ اس وقت اندر صرف اس کی مالکن خانی جان موجود ہے اور یوٹیوب دیکھ رہی ہے۔

ہم کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر اندر گھس گئے۔ ٹی وی

بدقسمتی

وہ نیویارک کے ایک پب میں بہت دیر سے اپنا پیگ سامنے رکھے، خالی خالی نظروں سے اسے گھورے جارہا تھا۔ اچانک ایک قوی الجثہ ٹرک ڈرائیور اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نوجوان کے سامنے سے پیگ اٹھا کر اپنے حلق میں انڈیل لیا۔

نوجوان نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھاما اور بلک کر رو پڑا۔

ٹرک ڈرائیور نے خفت سے اسے پچکارا۔ ”اتنی سی بات پر یوں پھوٹ پھوٹ کر رونے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہارے لیے نیا پیگ خرید دیتا ہوں۔“

”یہ بات نہیں ہے۔“ وہ اپنا سر پیٹتے ہوئے بولا۔ ”میرے لیے آج کا دن ہی منحوس ہے۔ صبح دیر سے آنکھ کھلی۔ دیر سے دفتر پہنچا تو باس مجھ پر برس پڑا اور مجھے نوکری سے نکال دیا۔ میں مایوس ہو کر باہر نکلا تو میری گاڑی غائب تھی۔ پولیس والوں نے صاف جواب دے دیا کہ وہ فوری طور پر میری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ میں ٹیکسی لے کر گھر پہنچا۔ وہاں اترتے ہوئے میں کریڈٹ کارڈ سمیت اپنا پرس ٹیکسی میں بھول گیا۔ گھر میں گھسا تو وہاں خواب گاہ میں میری بیوی نوجوان مالی کے ساتھ داد عیش دے رہی تھی۔ یہ میرے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ میں ایک نکما اور بےکار آدمی تھا جس کی بیوی بےوفا تھی۔ میں اپنی زندگی کے خاتمے کا فیصلہ کر کے یہاں آ گیا مگر یہاں بھی میری بدقسمتی تمہاری صورت میں نازل ہوگئی۔ اپنا پیگ خالی کر کے میں نے اس میں زہر انڈیل لیا تھا... اور وہ تم اٹھا کر پی گئے۔“

اوکاڑہ سے سعدیہ خاور کی معصومیت

لاؤنج کے قیمتی صوفے پر ایک دلربا حسینہ نیم دراز تھی اور ایل ای ڈی پر کسی انڈین فلم کا آئٹم سونگ ملاحظہ کر رہی تھی۔ ہماری طرف اس کی پشت تھی۔ شیشے کی تپائی پر رکھے ہوئے اس کے پاؤں بے ساختہ تھرک رہے تھے اور صرف پاؤں ہی نہیں اس کا پورا جسم تھرکتا دکھائی دیتا تھا۔ وہ اس مصیبت سے بے خبر تھی جو اس کے سر پر پہنچ چکی تھی۔ آہٹ سن کر اس نے پیچھے مڑے بغیر اپنی فربہ اندام ملازمہ کو مخاطب کیا۔

''کون تھا رضیہ؟''

اچانک اُسے خطرے کا احساس ہوا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ میرا تگڑا تھپڑ اس کے گال پر پڑا اور وہ الٹ کر دبیز قالین پر جا گری۔ میز پر رکھا ہوا جہازی سائز کا ملائی بوٹی پیزا قالین پر بکھر گیا۔ وہ ہکا بکا ہماری طرف دیکھنے لگی۔ وہ خوب صورت تھی تاہم پشتو فلموں کی ہیروئنز کی طرح وزن تھوڑا سا زیادہ تھا۔ اس نے ڈھیلی ڈھالی سرخ نائٹی پہن رکھی تھی جس کا گریبان ''دور تک'' چلا گیا تھا۔

عمران نے آگے بڑھ کر میز پر سے اس کا موبائل فون اٹھالیا اور چاقو کا تیز دھار پھل اس کی گردن پر رکھ دیا۔

''چوکیدار...... چوکیدار......'' وہ دہشت زدہ انداز میں چلائی۔

''چوکیدار تمہارے ہی کام سے گیا ہے، قبر کی جگہ ڈھونڈنے کے لیے۔'' عمران زہریلے لہجے میں بولا۔

''کک..... کون ہو تم..... کیا چاہتے ہو؟'' وہ ہکلائی۔

اُس کی بڑی بڑی آنکھوں میں دہشت کی یلغار تھی۔ نائٹی میں اس کے دونوں بازو کندھوں تک نظر آرہے تھے۔ کندھے سے ذرا نیچے دونوں بازوؤں پر چھوٹے چھوٹے ٹیٹو بنے ہوئے تھے۔ یہ دراصل انگریزی کے دو حرف ڈی اور کے تھے جو آپس میں بڑے اسٹائل سے گتھم گتھا نظر آتے تھے۔ مجھے یہ سمجھنے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ یہ ''ڈی'' شاید دلاور کو ظاہر کرتا ہے اور ''کے'' خانی کا پہلا حرف ہے۔ یہ ٹیٹو ان دونوں کے جنسی تعلق کا نمونہ سمجھا جا سکتا تھا۔

وہ جلدی سے بولی۔ ''اگر تم کچھ لوٹنے کے ارادے سے آئے ہو تو لوٹ لو...... لل لیکن تمہیں پتا نہیں ہے کہ تم کس کے گھر میں گھسے ہو۔ بہت نقصان اٹھاؤ گے۔''

''اچھا کس رستم خان کا گھر ہے یہ؟'' عمران نے انجان بن کر پوچھا۔

''بہت برا ہے بہت بُرا پیش آئے گا۔''

''ہم بھی بُروں ہی کی تلاش میں ہیں۔'' عمران نے کہا اور اسے صوفے پر بٹھا کر چاقو اس کے پہلو سے لگا دیا۔ اس کا بھرا بھرا جوان جسم ابھی بھی تھرک رہا تھا۔ پہلے یہ تھرتھراہٹ موسیقی کی وجہ سے تھی لیکن اب خوف کے سبب تھی۔

دلاور عرف تیزابے کی اس داشتہ کا موبائل فون اب عمران کے پاس تھا۔ میں نے اس سے یہ فون لیا اور اس پر دلاور کا نمبر تلاش کرنے کی کوشش کی۔ ڈی جانو کے نام سے ایک نمبر پر مجھے شک ہوا کہ یہ تیزابے کا ہوگا۔ اس کے ٹیکسٹ میسج دیکھے تو تصدیق ہوگئی۔ گرما گرم قسم کے کچھ میسج تھے جن سے خانی کے بارے میں تیزابے کی وارفتگی کا اظہار ہوتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اس آفت زادی کو چوبیس گھنٹے اپنی آغوش میں رکھنا چاہتا تھا مگر اس کی مفروری آڑے آتی تھی۔

میں نے اپنے موبائل فون کی طرف دیکھا۔ ابھی تک میرے فون پر کوئی ایسی کال یا ایسا میسج نہیں آیا تھا جس سے کچھ امید بندھتی یا اغوا کنندگان کے پکڑے جانے کا امکان پیدا ہوتا۔ مطلب صاف ظاہر تھا۔ اب ہمیں یہی طریقہ اپنانا تھا جو ہمیں میسر تھا۔ میں نے کہا۔ ''عمران! میں اس خانی کے فون سے تیزابے کو کال ملا رہا ہوں۔ امید ہے کہ یہ وڈیو کال ہوگی۔ تم اس کنجر کو بتا دو کہ ہم اس گائے کو ذبح کر رہے ہیں۔'' میرا اشارہ خانی کی طرف تھا۔

میرے لب و لہجے نے خانی کو مزید زرد کر دیا۔ عمران بولا۔ ''یہ کام آپ خود کرو تو زیادہ اچھا نہیں؟''

''نہیں عمران! مجھے پہچانتا ہے اس کا منہ بولا خصم اور یہ بھی جانتا ہے کہ میں پولیس میں ہوں۔''

عمران میرا مطلب سمجھ گیا جو خوفناک دھمکی ہم تیزابے کو دینے جا رہے تھے، وہ ایک پولیس افسر کے منہ سے زیادہ موثر نہیں تھی۔ یہ کوئی بپھرا ہوا خطرناک شخص ہی دیتا تو ٹھیک تھا۔

یکایک خانی نے تڑپ کر خود کو عمران سے چھڑایا اور بھاگنے کی کوشش کی۔ یقیناً یہ اس کی اضطراری حرکت ہی تھی۔ عمران نے ٹخنے کے پاس سے اس کی ٹانگ پکڑی اور وہ اوندھے منہ گری۔ گرتے ہوئے اس کا ماتھا صوفے کے ہتھے سے ٹکرایا اور وہ بلند آواز میں کراہ کر رہ گئی۔ عمران نے اس کو قالین پر ہی چھاپ لیا۔ وہ اوندھی پڑی کسی اتھری گائے ہی کی طرح زور لگانے لگی۔ میں نے اس کی دونوں ٹانگیں پکڑ لیں۔ عمران نے اس کا بازو موڑ کر پشت سے لگا دیا اور تیز دھار چاقو اس کی گردن پر رکھ دیا۔ اس کے ماتھے

سے خون نکلنے لگا تھا۔ وہ مچل رہی تھی اور گالیاں بھی بک رہی تھی۔ اس دھینگا مشتی میں اس کے گلے سے ایک باریک طلائی زنجیر ٹوٹ گئی تھی۔ یہ دراصل ایک چھوٹا سا طلائی تعویذ تھا جو اَب قالین پر پڑا تھا۔ وہ اسے قالین پر دیکھ کر دہاڑی۔ ''برباد ہو جاؤ گے تم...... میں گھوڑا سائیں کی مریدنی ہوں...... بیڑا غرق ہو جائے گا تمہارا، چھوڑ دو مجھے......''

''ٹھنڈا ہونے پر چھوڑ دیں گے۔'' عمران نے زہرخند لہجے میں کہا۔ آج وہ شوخ کھلنڈرے عمران سے بالکل مختلف نظر آرہا تھا۔ اس کے ماتھے کی رگیں ابھری ہوئی تھیں۔ آنکھوں میں آگ نظر آتی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں نے دیکھا تھا کہ اس کوٹھی میں کئی جگہ گھوڑے کی ''نعل'' آویزاں نظر آئی تھی۔ یہ بدنظری سے بچنے کی ایک توہمانہ کوشش ہی کہلا سکتی تھی۔ یقیناً اس کا تعلق کسی نام نہاد ''گھوڑا سائیں'' سے بھی ہوگا۔ یہ واہی سوچیں اور یہ خرافات ہمارے وطنِ عزیز میں کہاں کہاں پنجے گاڑھے ہوئے ہیں۔

میں نے مزید وقت ضائع کیے بغیر خانی کے فون سے دلاور تیزابے کو وائس ایپ پر وڈیو کال کی۔ تھوڑی سی تاخیر ہوئی لیکن کال مل گئی۔ اسکرین پر منڈے ہوئے سر والے تیزابے کا منحوس چہرہ نظر آیا۔ وہ اب گاڑی میں نہیں کسی گھر میں تھا۔ میں نے فون کا رخ اس طرح رکھا تھا کہ تیزابے کو میری شکل نظر نہ آئے۔

''ہیلو جانی خیریت ہے؟'' تیزابے نے نارمل لہجے میں پوچھا۔

میں نے جواباً موبائل کے کیمرے کا رخ عمران اور ''خانی جانی'' کی طرف کر دیا اور موبائل کو صوفے کی دو نشستوں کے درمیان اس طرح پھنسا دیا کہ سارا ''حسین و دلربا'' منظر تیزابے کو نظر آتا رہے۔ ظاہر ہے کہ یہ منظر دیکھ کر تیزابے کی جو حالت ہوئی ہوگی، وہی جانتا ہوگا۔ خونچکاں پیشانی والی خانی کو عمران نے قالین پر دبوچا ہوا تھا اور چاقو کا دس انچ لمبا تیز دھار پھل اس کی گردن پر رکھا ہوا تھا۔ عمران کے چہرے پر اس وقت جو وحشت نظر آرہی تھی وہ مصنوعی نہیں تھی، کسی اداکاری کا نتیجہ نہیں تھی...... یہ وحشت اس ''غیظ و غضب'' کے اندر سے اٹھ رہی تھی جو ان لمحوں میں اس کے سینے میں موجود تھا۔ یہ ایک بدلا ہوا عمران تھا۔ وہ سرسراتے ہوئے لہجے میں، کیمرے کی طرف دیکھ کر پھنکارا۔ ''خیریت نہیں ہے باسٹرڈ...... بالکل بھی خیریت نہیں ہے...... اگر تیری طرف ان دونوں لڑکیوں کو کچھ ہوا تو میں اپنے مرے باپ کی قسم کھاتا ہوں تیری اس معشوقہ کو اسی قالین کے اوپر چیر کر رکھ دوں گا۔''

موبائل فون کی اسکرین پر نظر آرہا تھا کہ تیزابے کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگی ہیں۔ یقیناً اس نے عمران کے خطرناک تیور بھی دیکھ لیے تھے۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے۔ یہ کیا کر رہے ہو تم؟'' تیزابا پھنکارا۔

''ابھی کچھ کیا نہیں لیکن ہو جائے گا۔'' عمران نے کہا۔ ''دونوں لڑکیاں کہاں ہیں، انہیں میرے سامنے لاؤ۔ ابھی...... اسی وقت۔''

''تم اپنی موت کو دعوت دے رہے ہو۔'' تیزابا پھر پھنکار کر بولا۔

''لڑکیاں کیمرے کے سامنے لاؤ۔'' عمران بپھرے شیر کے مانند گرجا۔ کھلنڈرے عمران کا یہ روپ میرے لیے بھی تعجب خیز تھا۔ تیزابے جیسا خوفناک بدمعاش بھی اس لب و لہجے سے مرعوب نظر آنے لگا تھا۔ اس نے کچھ پس و پیش سے کام لیا تو عمران نے بے دریغ خانی کی گردن کے پچھلے حصے پر چاقو سے ایک خونی لکیر کھینچ دی اور یہ معمولی لکیر نہیں تھی۔ اس کی گہرائی آدھ انچ سے کم نہیں ہوگی۔ پلک جھپکتے میں اوندھی پڑی خانی کی گردن کا عقبی حصہ خون سے سرخ ہو گیا۔ وہ چلّانے لگی اور ایک بار پھر عمران کی گرفت سے نکلنے کے لیے تڑپی۔ اس مرتبہ عمران نے چاقو کا پھل خانی کے رخسار پر رکھ دیا۔ وہ گرجا۔ ''لڑکیوں کو سامنے لاؤ۔ ورنہ اس مرتبہ اس کا یہ گال چیر دوں گا...... اور پھر اس کی ناک کی باری آجائے گی۔''

تیزابے نے منہ ہی منہ میں کوئی گالی بکی اور موبائل کی اسکرین پر سے اوجھل ہو گیا۔ خانی کا حال وہی تھا جو کسی اناڑی قسائی کی چھری تلے آنے والی گائے کا ہوتا ہے۔ ماتھے کے علاوہ اس کی گردن بھی لہولہان تھی اور وہ پھڑک رہی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ ہمیں کسی گھوڑے سائیں کے قہر سے بھی ڈرا رہی تھی۔

چند سیکنڈ بعد موبائل کی اسکرین پر جو منظر نظر آیا، وہ ہمارے لیے اطمینان بخش تھا۔ ہم نے صوفیہ اور ماہین دونوں کو دیکھا۔ وہ دونوں اسی لباس میں تھیں جس میں انہیں کچھ دیر پہلے شادی کی تقریب سے اٹھایا گیا تھا۔ ماہین کی خوش رنگ قمیص سامنے سے چاک تھی اور اس کے دونوں ہاتھ بھی کسی رسی کے ساتھ سامنے سے باندھ دیے گئے تھے۔ وہ اور صوفیہ سکڑی سمٹی ایک صوفے پر بیٹھی تھیں۔ بہرحال شواہد بتا رہے تھے کہ ابھی تک ان کے ساتھ کوئی بدسلوکی نہیں ہوئی

ہے۔

اب ہمیں دراز قد مشاہد احمد کی شکل بھی نظر آگئی۔ دولھا والا کرنسی ہار ابھی تک اس کے گلے میں تھا۔ وہ واضح طور پر نشے میں لگتا تھا۔ پستول بدست وہ صوفیہ کے سر پر کھڑا تھا جو مسلسل رو رہی تھی۔ مشاہد نے یقیناً عمران کو پہچان لیا تھا۔ وہ چمک کر بولا۔ ”ہیرو! یہ سب کچھ بہت مہنگا پڑے گا تجھے، کیا چاہتا ہے تو؟“

عمران نے کہا۔ ”تیری حیثیت میرے لیے مشٹنی چوزے سے زیادہ نہیں ہے۔ میں تجھ سے نہیں تیری ماں کے خصم تیزابے سے بات کر رہا ہوں۔ بول تیزابے! کیا فیصلہ کیا ہے تو نے۔ ان دونوں لڑکیوں کو بحفاظت ہمارے پاس پہنچا دے۔ ہم بھی تیری اس معشوقہ کو چھوڑ دیں گے۔ دوسری صورت میں یہ بُری موت مرے گی اور ابھی تیرے سامنے مرے گی۔“

عمران کا چاقو بدستور خانی کے چکنے رخسار پر تھا۔ کسی وقت یہ رخسار قندھاری انار کی طرح دہکتا ہوگا مگر اب گریب فروٹ کی طرح زرد تھا۔ میں نے دیکھا کہ اپنی محبوبہ کو اس حالت میں پاکر تیزابے جیسے زہریلے قاتل کا پتّا پانی ہونے لگا تھا۔ اس نے اپنے سانولے، خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور پہلی بار قدرے ڈھیلے لہجے میں بولا۔ ”کیا چاہتے ہو تم لوگ؟“

”ان...... دونوں...... لڑکیوں...... کو حفاظت...... سے ہمارے پاس...... پہنچا دو۔“ عمران نے ایک ایک لفظ پر علیحدہ علیحدہ زور دیا۔

تیزابا چند سیکنڈ تک جانچنے والی نظروں سے عمران کی طرف دیکھتا رہا۔ غالباً اس کی جہاندیدہ نگاہوں نے اسے سمجھا دیا تھا کہ اس کا پالا اپنے ہی جیسے کسی خطرناک شخص سے پڑ گیا ہے اور یہاں وہی کچھ ہوگا جس کی دھمکی کھلے الفاظ میں دی جا رہی ہے۔

اچانک وہ ٹھہری آواز میں بولا۔ ”ٹھیک ہے...... مجھے منظور ہے۔ تم خانی کو چھوڑ دو۔ میں ان دونوں لڑکیوں کو چھوڑ دیتا ہوں۔“

”کس طرح ہوگا یہ سب؟“ عمران نے دریافت کیا۔

وہ زہریلے طنزیہ انداز میں بولا۔ ”میں بدمعاش ہوں، شریفوں کی طرح وعدے سے نہیں پھرتا۔ وہی کروں گا، جو کہہ رہا ہوں۔“

عمران بولا۔ ”تمہیں کس ناہنجار نے کہہ دیا کہ ہم شریف ہیں۔ ہم بھی وہی کریں گے جو کہیں گے...... اور یہ بھی یاد رکھنا، پیٹ بھرے بدمعاش سے بھوکا ننگا بدمعاش زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ تم بتاؤ، کس طرح کرنا چاہتے ہو یہ سب؟“

اگلے چار پانچ منٹ بڑے اہم تھے۔ گفتگو سے پہلے عمران نے خانی پر سے اپنی گرفت ختم کر دی تھی اور وہ اپنی زخمی گردن پر تولیا رکھ کر سامنے صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ چاقو بدستور عمران کے ہاتھ میں تھا۔ میں موبائل کیمرے کے سامنے نہیں آیا تھا تاہم مشاہد وغیرہ یقیناً سمجھ چکے تھے کہ میں بھی آس پاس موجود ہوں۔ عمران اور تیزابے کے درمیان ہونے والی گفتگو میں خانی، ماہین اور صوفیہ کے تبادلے کا طریقہ کار طے ہوگیا اور یہ بھی طے ہوگیا کہ اب کم از کم ان تینوں خواتین والے معاملے کو دوبارہ نہیں چھیڑا جائے گا۔

میں موبائل کی اسکرین پر مشاہد اور اس کے ایک فربہ اندام ساتھی کو بھی دیکھ رہا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ مشاہد اس ساری صورتِ حال سے کچھ زیادہ خوش نہیں ہے۔ موجودہ صورتِ حال میں خوبرو صوفیہ اس کے لیے تر نوالے کی طرح تھی اور یہ نوالہ اس کے ہونٹوں تک آکر اس سے چھن رہا تھا۔

دوسری جانب سے آنے والی آوازوں سے اندازہ ہوا کہ تیزابے اور مشاہد احمد کے درمیان کچھ تکرار ہو رہی ہے پھر مشاہد کی جذباتی آواز سنائی دی۔ وہ تیزابے سے کہہ رہا تھا۔ ”آپ یہ سمجھنے کی کوشش کرو کہ یہ میرے بھائی کی منگ تھی، میرا بھائی اسی کی وجہ سے قتل ہوا......“

اسی دوران میں موبائل کی اسکرین پر دو تین سیکنڈ کے لیے تیزابے کا چہرہ دوبارہ نظر آیا۔ وہ عمران سے مخاطب ہوکر بولا۔ ”میں دو منٹ میں دوبارہ کال کرتا ہوں۔“ اس کے ساتھ ہی وہ ڈس کنیکٹ ہوگیا۔

ہمارے لیے یہ سمجھنا بالکل مشکل نہیں تھا کہ مشاہد احمد اور تیزابے کے درمیان تکرار بڑھ گئی ہے۔ شاید مشاہد اور تیزابے دونوں کے گمان میں یہ نہیں تھا کہ صورتِ حال اس طرح پلٹا کھائے گی۔ واقعی اگر میرے پاس تیزابے کی اس محبوبہ کے بارے میں انفارمیشن نہ ہوتیں اور ہم بروقت یہاں نہ پہنچ جاتے تو ماہین اور صوفیہ کی بازیابی کے بارے میں سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ ان کی بحفاظت رہائی تو دور کی بات ہے شاید ”رہائی“ بھی ممکن نہ ہوتی۔

یہ بڑے تناؤ بھرے لمحات تھے۔ میں نے باہر جاکر پٹھان گارڈ کی طرف سے اطمینان کیا۔ وہ ابھی تک بے ہوش پڑا تھا مگر یہ بے ہوشی کسی بھی وقت نیم بے ہوشی اور پھر بیداری میں بدل سکتی تھی۔ ہتھنی نما ملازمہ بدستور واش روم

میں بند تھی اور عقلمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خاموش تھی۔
میں واپس کمرے میں پہنچا تو تیز ابا دوبارہ موبائل کی اسکرین پر نمودار ہو چکا تھا۔ ہمیں اس کی صورت دیکھ کر ہی پتا چل گیا کہ اس کے اور مشاہد کے درمیان کچھ مارا ماری بھی ہوئی ہے جس کا نتیجہ واضح طور پر تیز ابے کے غلبے کی صورت میں نکلا تھا۔ خانی ...... عیاش صفت تیز ابے کی وہ دکھتی رگ ثابت ہوئی تھی جس نے اسے ہماری بات ماننے پر مجبور کر دیا تھا۔

☆☆☆
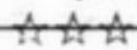
ٹھیک 45 منٹ بعد رات کے ایک بجے دریائے راوی کے کنارے ایک بیلا نما جگہ پر دو گاڑیاں موجود تھیں۔ ایک میں ہمارے ساتھ خانی تھی جس کی زخمی گردن اور پیشانی پر بینڈیج تھی۔ دوسری طرف گاڑی میں ماہین اور صوفیہ موجود تھیں۔ مزید تفصیل میں جانے سے رُوداد طویل ہو گی۔ یہ تبادلہ خیر خیریت سے مکمل ہو گیا۔ (بہرحال خانی کے چوکیدار کی رائفل میں نے فوری طور پر واپس نہیں کی اور کافی فاصلے پر جا کر اسے ایک جگہ جھاڑیوں میں پھینکا اور تیز ابے کو اطلاع دی) ہم دو بجے کے قریب واپس اس شادی والے گھر میں پہنچ گئے جہاں سے قریباً تین گھنٹے پہلے محمد رفیق کی بیٹی رخصت ہو کر گئی تھی۔ دونوں لڑکیوں کی اتنی سرعت کے ساتھ بحفاظت واپسی نے سب کو حیران کیا اور بہت حد تک خوش بھی۔ سب سے زیادہ خوشی ماہین کا بوائے فرینڈ حشام محسوس کر رہا تھا۔ وہ ابھی ابھی متعلقہ تھانے میں رپورٹ درج کرا کے واپس آیا تھا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ دل ہی دل میں خود کو خجل بھی محسوس کر رہا ہے۔ اس خجالت کی وجہ یقیناً وہی تھی جو ہم جانتے تھے۔ جب ہم گاڑی لے کر تیز ابے اور مشاہد کے پیچھے لپکے تھے، وہ لوگوں کے درمیان ایک کونے میں بے حرکت کھڑا رہا تھا۔ یقیناً ماہین نے اس سے اس بے عملی کے بارے میں پوچھنا تھا مگر فی الحال تو وہ موجودہ واقعے کے سنگین اثرات کے گھیرے میں تھی۔

واٹس ایپ کی وڈیو کال میں یقیناً ماہین نے بھی عمران جونیئر کا وہ دبنگ روپ دیکھا تھا جس نے تیز ابے جیسے قاتل بدمعاش کا پتّا پانی کیا تھا۔ اس کی نگاہوں میں عمران کے لیے شکریے کے علاوہ سخت حیرانی کے تاثرات بھی نہایت واضح دکھائی دیتے تھے۔ اس موقع پر مجھے کھلنڈرے اور اول جلول عمران کی اعلیٰ ظرفی کا بھی پتا چلا۔ وہ حشام کی خجالت اور شرمندگی دور کرنے کے لیے اس سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”حشام بھائی! ویری ویری سوری! ہم اس وقت ماہین اور صوفیہ کے پیچھے اتنی تیزی سے نکلے کہ آپ کو اپنے ساتھ سوار نہ کر سکے۔ میں نے ”بیک مرر“ میں دیکھا تھا آپ گاڑی کی طرف لپکے تھے مگر اس وقت ہم کافی دور نکل چکے تھے۔“

”ٹھ ...... ٹھیک ...... کوئی بات نہیں۔“ حشام نے نظر ملائے بغیر کہا۔ ”آپ نے جو کچھ کیا ...... مم ...... مجھ سے بھی بڑھ کر کیا۔“

ماہین نے بوائے فرینڈ حشام کا بازو تھام کر اس کے کندھے سے سر ٹکایا اور سسکنے لگی۔ میں عمران کو گھور کر رہ گیا۔

محلے داروں کے علاوہ مقامی پولیس اور میڈیا کے لوگ بھی ہمارے اردگرد جمع ہو چکے تھے۔ وہ اس تیز رفتار کارروائی کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتے تھے مگر میں نے عمران کو یہ بات سمجھا دی تھی کہ ہم اپنا بیان سوچ سمجھ کر دیں گے۔ میڈیا والے ہمیں زچ کرنے لگے تو ایک دم عمران کو جیسے کچھ یاد آ گیا۔ وہ مجھے بازو سے کھینچ کر ایک طرف لے گیا۔ وہ اب پھر اپنے نارمل ہلکے پھلکے موڈ میں نظر آتا تھا۔ یہ حیران کن تبدیلی تھی۔ اپنی ٹھوڑی کے گڑھے کو انگلی سے سہلا کر فلسفیانہ انداز میں بولا۔ ”ویسے چاچو جانی! تم سپر نیچرل باتوں کو نہیں مانتے لیکن یہ باتیں ہوتی تو ہیں نا۔ ٹھیک ہے پیر گھوڑے سائیں جیسی باتوں کو ہم نظرانداز کر دیتے ہیں مگر ٹیلی پیتھی، ہپناٹزم اور مستقبل بینی جیسی غیر مرئی توانائیاں تو کائنات میں موجود ہیں نا۔“

میں نے کہا۔ ”زیادہ کائنات کے مامے مت بنو۔ اصل بات بتاؤ۔“

وہ مسکین سی صورت بنا کر بولا۔ ”چاچو جانی! یہ موجودہ مسئلہ ابھی پوری طرح ختم نہیں ہوا لیکن مجھے لگ رہا ہے کہ کوئی اور نیا مسئلہ اسٹارٹ ہونے والا ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”دس پندرہ منٹ سے میری بائیں آنکھ پھڑ پھڑ کرنا شروع ہو گئی ہے۔“

اس نے جان بوجھ کر اپنی آنکھ پھڑکا کر مجھے دکھائی۔ میں نے قریب پڑا ہوا لوہے کا سریا اٹھایا تو وہ بھاگ نکلا۔ میں سوچتا رہ گیا، کیا یہ وہی عمران ہے جو کچھ دیر پہلے خانی کی رہائش گاہ پر، تیز ابے جیسے بدمعاش کے لیے سراپا غیظ و غضب نظر آ رہا تھا۔ اس کا یہ دبنگ روپ مجھے یقین دلا رہا تھا کہ اب صوفیہ پر ہاتھ ڈالنا کسی کے لیے آسان نہیں ہو گا ......

❖❖❖

ناکام کوشش

تنویر واسطی

بعض معاملات ایسے ہوتے ہیں کہ دوڑ دھوپ کرنے کے باوجود تمام کوششیں ناکام ہو جاتی ہیں... سراغرساں ولی کوستا کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے... مشکل آجائے تو پھر ولی کوستا کی دوڑیں لگ جاتی ہیں... کیوبا کی سرزمین سے جڑے تارکینِ وطن کی مشکلات...

[illegible]

پرائیویٹ سراغ رساں ولی کوستا نے میز پر رکھے ہوئے انکم ٹیکس فارم اور رسیدوں کے ڈھیر پر نظر ڈالی اور مایوس ہو گیا۔ جب اس نے یہ کام شروع کیا تو اس کے اکاؤنٹنٹ ڈین نے اسے تاکید کی تھی کہ وہ اپنی آمدنی اور خرچ کا باقاعدہ حساب رکھے اور ایک سال کے دوران وہ اپنے کام کے سلسلے میں جو بھی خرچ کرتا ہے، اس کی رسیدیں کسی پرانے جوتے کے ڈبے میں ڈالتا جائے۔ سال کے اختتام پر وہ ان رسیدوں کو ڈبے سے نکال کر تمام اخراجات کو جمع کرے۔

''تمہارا مطلب ہے کہ اگر کسی طلاق کے کیس میں شوہر کا پیچھا کرتے ہوئے میں نے کہیں رک کر کافی پی تو اس کی رسید بھی رکھنی ہوگی؟''

''ہاں۔'' ڈین نے کہا۔ ''کیونکہ تمہیں اس کی نگرانی کے لیے جاگنا تھا۔ اس لیے کافی پینے کی ضرورت پیش آئی۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟ لہٰذا تم اسے اپنی کمپنی کے اخراجات میں شمار کر سکتے ہو۔ یہی نہیں بلکہ تم نے سڑک پر کھڑے ہو کر جو سینڈوچ اور رول کھائے وہ بھی ان اخراجات میں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ تم نے کام کے سلسلے میں جتنی گاڑی چلائی، اس کی مسافت بھی مع تاریخ ایک کاغذ پر لکھ لیا کرو اور ان کاغذوں کو بھی اس ڈبے میں ڈالتے جاؤ۔''

اِن رسیدوں اور کاغذوں کو کیٹیگری کے حساب سے الگ، الگ کر کے ان کا ٹوٹل نکالنا اور اس کا اندراج انکم ٹیکس فارم میں کرنا تھا۔ ہر سال ولی پر اس کام کی دہشت طاری رہتی اور وہ اسے آخری وقت تک ٹالتا رہتا۔ اب وہ وقت آگیا تھا اور وہ اپنے کیلکولیٹر پر جھکا ہوا حساب کتاب میں مصروف تھا۔

ہر سال کی طرح وہ اس وقت بھی یہی سوچ رہا تھا کہ اگر کبھی اس کے پاس پیسے ہوئے تو وہ ڈنکن ڈونٹ یا اسٹار بک میں سرمایہ کاری کرے گا۔ تبھی اس کے سیل فون کی گھنٹی بجی۔ ولی نے فوراً فون اٹھایا۔

''کوستا اینڈ ایسوسی ایٹس انویسٹی گیشن۔''

''کیا میں ولی کوستا سے مخاطب ہوں؟''

وہ برطانوی لہجے میں بول رہا تھا۔ ولی نے فوراً اس کی آواز پہچان لی۔

''نیول، یہ تم ہو؟''

''تم نے ٹھیک پہچانا دوست، کیسے ہو؟''

نیول ایشلے، میامی کے برطانوی قونصل خانے میں اسکاٹ لینڈ یارڈ کا مقامی نمائندہ تھا۔ وہ ساؤتھ فلوریڈا میں برسوں سے کام کر رہا تھا۔ جب امریکی حکام نے یہ محسوس کیا کہ میامی اور کیریبین کے سابق مقبوضہ علاقوں کے درمیان جرائم کی تحقیقات کرنا زیادہ آسان ہو جائے گا۔ اگر اسکاٹ لینڈ یارڈ کے ایک سراغ رساں کو یہاں تعینات کر دیا جائے جو کیریبین پولیس اور ان کے امریکی اتحادیوں کے درمیان رابطے کا کام کرے۔

گزشتہ کئی سالوں سے نیول، ایف بی آئی، امریکی ایجنٹوں اور فلوریڈا کی ریاستی و مقامی پولیس کی مدد کر رہا تھا تاکہ ہر قسم کے جرائم پیشہ گروہوں کی سرکوبی کی جا سکے جن کی شاخیں میامی اور جزائر غرب الہند میں تھیں۔ یہ گروہ منشیات کے کاروبار، انسانی اسمگلنگ، منی لانڈرنگ اور انشورنس فراڈ میں ملوث تھے۔ جن دنوں ولی کوستا، میامی پولیس کے انٹیلی جنس یونٹ میں کام کر رہا تھا تو اسے نیول کے ساتھ جمیکا، برٹش ورجن آئی لینڈ اور بارباڈوس جانے کا موقع ملا۔ نیول کے کیریبین پولیس کے ساتھ بہت اچھے رابطے تھے اور وہ قیام و طعام کے حوالے سے بہترین جگہوں کے بارے میں جانتا تھا۔ اسی وجہ سے ولی اس کا گرویدہ ہوگیا تھا۔

رسمی گفتگو کے بعد نیول اصل موضوع کی طرف آیا۔

''میں نے تمہیں ایک انتہائی نازک اور خفیہ کام کے سلسلے میں فون کیا ہے کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ صرف تم ہی میری مدد کر سکتے ہو۔ اگر تم کل صبح برطانوی قونصلیٹ آجاؤ تو میں تمہیں تفصیل بتا دوں گا۔ میں جانتا ہوں کہ ان دنوں پرائیویٹ سراغ رساں کے طور پر کام کر رہے ہو۔ اسی لیے برطانوی حکومت تمہیں وہی معاوضہ ادا کرے گی جو تم روزانہ کی بنیاد پر وصول کرتے ہو۔''

ولی نے دوسرے دن آنے کا وعدہ کیا اور نیول نے فون بند کر دیا۔ ولی نے ایک نظر شو باکس پر ڈالی اور اسے ایک طرف دھکیل دیا۔ وہ جانتا تھا کہ موت کی طرح ٹیکس بھی ناگزیر ہے اور اس سے پیچھا نہیں چھڑایا جا سکتا۔ اس لیے اسے انکم کا گوشوارہ تو ہر حال میں پُر کرنا ہوگا۔

میامی میں برطانوی قونصلیٹ وسط شہر کے جنوب میں بریکل ایونیو پر واقع تھا۔ اس علاقے میں کئی کثیرالمنزلہ عمارتیں اور رہائشی ٹاور تھے اور یہاں دوسرے قونصل خانے اور بین الاقوامی بینک بھی واقع تھے۔ میامی بڑی تیزی سے لاطینی امریکا کا تجارتی مرکز بنتا جا رہا تھا اور بریکل ایونیو اس کا حب بن گیا تھا۔

ولی لفٹ کے ذریعے اٹھائیسویں منزل پر پہنچا اور ایک بجے سجائے استقبالیہ کمرے میں داخل ہوا۔ استقبالیہ کلرک بلٹ پروف شیشے کے پیچھے بیٹھی ہوئی تھی اور اس کے عقب میں ملکہ برطانیہ کی ایک بڑی سی تصویر آویزاں تھی۔ ایک اور بورڈ پر ویزے کے خواہش مندوں اور دوسرے مہمانوں کے لیے انگریزی اور برطانوی زبان میں ہدایات درج تھیں۔

ولی نے اپنی آمد کا مقصد بتایا اور چند لمحوں بعد نیول اس سے ملنے آگیا۔ وہ ایک طویل قامت دُبلا پتلا شخص تھا۔ اس نے تھری پیس سوٹ اور نیلی دھاری دار قمیص پہن رکھی تھی۔ اس نے ولی کے ساتھ گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور اسے کانفرنس روم میں لے گیا۔ وہ دونوں ایک بڑی سی میز کے گرد رکھی ہوئی

کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ نیول نے ایک فائل اٹھائی اور اس میں سے آٹھ ضرب گیارہ کی تصویر نکال کر ولی کو دی۔ لگتا تھا کہ یہ تصویر کسی نائٹ کلب میں لی گئی ہے۔ ایک میز پر بہت سے نوجوان لڑکے لڑکیاں بیٹھے ...... شمپئین سے دل بہلا رہے تھے۔ ان کے درمیان ایک بہت ہی پُرکشش سنہرے بالوں والی نوجوان لڑکی نظر آرہی تھی۔ اس نے کھلے گلے کا سیاہ لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک دلکش مسکراہٹ تھی۔

نیول نے اس پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ سمانتھا چیسٹر فیلڈ ہے۔ اس کی عمر بائیس سال اور یہ مسٹر ڈیوڈ چیسٹر فیلڈ کی سب سے چھوٹی بیٹی ہے جو کامن ویلتھ ٹیکنالوجی گروپ کے صدر اور سی ای او ہیں۔ یہ برطانیہ کی بڑی انٹرنیٹ کمپنیوں میں سے ایک ہے۔ چار روز قبل یہ لڑکی ساؤتھ بیچ پر واقع ایک نائٹ کلب سے نکلتے ہوئے اغوا ہوگئی۔ وہ وہاں اپنی ایک خاتون دوست کے ہمراہ گئی تھی۔ جب رات دو بجے اس عورت نے وہاں سے نکلنے کا ارادہ کیا تو مس سمانتھا وہیں رک گئی۔ وہ دو مقامی کیوبن مردوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ جن سے اس کی ملاقات کلب میں ہی ہوئی تھی۔ انہوں نے سمانتھا کو اپنی گاڑی میں ہوٹل تک چھوڑنے کی پیشکش کی لیکن وہ وہاں نہیں پہنچی۔ لگتا ہے کہ ان آدمیوں نے اس کے مشروب میں کوئی نشہ آور چیز ملا دی تھی۔ کئی گھنٹوں بعد جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے آپ کو ایک اجنبی جگہ پر پایا۔ اس کے ہاتھ پاؤں رسّی سے بندھے ہوئے تھے۔ دوسرے روز اس کے باپ سے فون پر دو ملین ڈالرز کا مطالبہ کیا گیا جو اڑتالیس گھنٹوں میں ادا کرنا تھے۔ مجھے اس بارے میں اس وقت معلوم ہوا جب وہ لڑکی گھر آچکی تھی۔ خوش قسمتی سے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا۔''

ولی نے اس کی بات غور سے سنی اور پوچھا۔ ''کلب کا نام کیا ہے؟''

''نوکٹورن۔''

ولی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''آج کل یہ کافی مقبول ہے۔''

وہ نائٹ کلبوں کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا۔ اس کا بھائی ٹومی بھی میامی کے ایک پرانے اور بہترین سالسا کلب کا مالک تھا۔ درحقیقت ولی اس کلب کا برائے نام سیکورٹی انچارج تھا۔ اس کے فرائض میں باؤنسرز کو رکھنا اور نکالنا، سیکورٹی کا شیڈول تیار کرنا اور یہ اطمینان کرنا کہ منشیات فروش، جیب کترے اور طوائفیں کلب سے دور رہیں۔ اس نے بھی کسی اغواکار کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔

''تمہارے خیال میں یہ کیسے ہوا؟'' ولی نے پوچھا۔

''کیا تم سمجھتے ہو کہ نائٹ کلب میں باتوں کے دوران مس چیسٹر فیلڈ نے اپنی خاندانی دولت کا ذکر کیا ہوگا جسے سُن کر ان لوگوں کے دل میں لالچ آگیا اور انہوں نے اس کے اغوا کا منصوبہ بنالیا۔''

نیول نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''نہیں، میں نہیں سمجھتا کہ انہوں نے موقع پر ہی یہ سوچا ہوگا۔ اس لڑکی کے یہاں آنے کے فوراً بعد میامی ہیرالڈ کے سوسائٹی کالم میں اس کا نام آیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس کے بعد ہی اغوا کنندگان نے اسے نشانے پر رکھ لیا اور اس کا پیچھا کرتے رہے۔ مناسب موقع کا انتظار کر رہے تھے۔ حالیہ دنوں میں اس کے علاوہ بھی میرے ہم وطنوں کو نشانہ بنایا گیا ہے۔''

اس انکشاف پر ولی چونک گیا۔ ''کیا واقعی؟ میں نے حالیہ دنوں میں ایسی کوئی خبر نہیں سنی۔''

''کیونکہ اس مرحلے پر متاثرین اور ممکنہ متاثرین اس کی تشہیر نہیں چاہتے تھے۔''

''ممکنہ؟''

نیول کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔ ''ایک مہینہ پہلے جوزف ہومز نامی ایک جوان برطانوی شخص پر کچھ لوگوں نے حملہ کر دیا جب اس نے کولنز ایونیو پر ایک ٹیکسی روکنے کی کوشش کی۔ ایک کار اس کے پاس آکر رکی اور کسی نے اس کا نام لے کر پکارا۔ جب وہ قریب پہنچا تو کار سے دو آدمی باہر آئے اور اسے اندر کھینچنے کی کوشش کی۔ ایک اور آدمی اسٹیئرنگ پر کار چلانے کے لیے تیار بیٹھا ہوا تھا لیکن ہومز نے پوری قوت سے چلانا شروع کر دیا اور اپنے آپ کو ان کی گرفت سے آزاد کرانے میں کامیاب ہوگیا۔ وہ دونوں جلدی سے کار میں بیٹھے اور پولیس کے آنے سے پہلے وہاں سے روانہ ہوگئے۔''

''کیا وہ بھی اسی کلب سے باہر آیا تھا؟''

''نہیں، وہ بیونس آئرس نامی کلب میں گیا تھا۔''

''کیا اس کا تعلق بھی کسی دولت مند گھرانے سے ہے؟''

نیول نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہاں اور صرف یہی نہیں بلکہ اس کے اور مس چیسٹر فیلڈ کے خاندان میں ایک بات مشترک ہے۔ دونوں خاندان کیوبا میں کاروبار کرتے ہیں۔''

''مجھے تفصیل سے بتاؤ۔''

''اس کی فیملی ویوا ایکسپورٹس کے نام سے ایک فرم چلاتی ہے۔ وہ شراب، دوسرے مشروبات اور کھانے پینے کی

اشیا کیوبا کی ٹورازم انڈسٹری کے لیے سپلائی کرتی ہے۔ اسی طرح مسٹر چیسٹر فیلڈ کے کیوبا میں دفاتر اور گودام ہیں اس کا ذکر بھی سوسائٹی کالم میں ہوا۔ جب کوئی کلب میں ایک بوتل شیمپین چھ سوڈالر میں خریدے گا تو لامحالہ اس کا نام خبروں میں آئے گا۔"

"لہٰذا ان دونوں کا تعلق دولت مند گھرانوں سے ہے اور اسی وجہ سے وہ اغوا کنندگان کا نشانہ بنے اور دونوں خاندان کیوبا میں کاروبار کرتے ہیں۔ کیا یہ محض ایک اتفاق ہے؟"

نیول نے کہا۔ "کاش ایسا ہوتا لیکن مجھے اس بارے میں شبہ ہے۔ میں نے گزشتہ ہفتے اپنے دوست سے ایک افواہ سنی۔ اس نے بتایا کہ ہسپانوی باشندوں کے ساتھ بھی ایسا واقعہ ہوا ہے۔ میں نے اس وقت کوئی کارروائی نہیں کی لیکن گزشتہ روز تمہیں فون کرنے سے پہلے ہسپانوی قونصل جنرل سے بات کی تھی۔ اس نے مجھے خفیہ طور پر بتایا کہ چھ ہفتے پہلے میڈرڈ سے آئی ہوئی ایک درمیانی عمر کی عورت کو اس وقت اغوا کرلیا گیا جب وہ اپنے اپارٹمنٹ کے سامنے چہل قدمی کررہی تھی۔ اس کے گھر والوں نے پولیس کو اطلاع دیے بغیر تاوان ادا کرکے اسے آزاد کروایا۔"

ولی نے اسے ترچھی نظر سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا اس عورت کے خاندان کا بھی کیوبا میں کاروبار ہے؟"

نیول نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "وہ کیرب ر کمپنی میں سب سے بڑے اسٹاک ہولڈر ہیں۔ انہوں نے کیوبا میں کیریبین کی پرائم بیچ لوکیشن پر ہوٹل بنائے ہیں۔ میں اس عورت کا کیس جانتا ہوں لیکن شاید کسی اور کو اس بارے میں کچھ معلوم نہ ہو کیونکہ یہ لوگ ایسے واقعات کی تشہیر نہیں کرتے۔"

کئی سالوں سے میامی مشہور شخصیات مثلاً فلمی ستاروں، کھلاڑیوں، سیاست دانوں اور کاروباری لوگوں کی پسندیدہ جگہ ہے لیکن کبھی کسی نے اغوا یا ایسی کسی کوشش کے بارے میں نہیں سنا۔ نیول کا خیال تھا کہ اگر ایسا کوئی واقعہ ہوا بھی ہوگا تو متاثرہ خاندانوں نے اس پر پردہ ڈال دیا اور کوئی بات باہر نہیں آئی لیکن ولی کے پولیس اور دوسرے قانون نافذ کرنے والے اداروں سے بڑے اچھے روابط تھے اور اگر اس طرح کا کوئی واقعہ رونما ہوتا تو اسے بھی خبر ہوجاتی۔ اب چند ہفتوں میں اغوا کی تین وارداتیں ہونے کے بعد ولی کو یقین ہو گیا تھا کہ میامی میں اغوا کنندگان کا ایک گروہ منظم ہوچکا ہے جس کے مخصوص ٹارگٹ ہیں۔

میامی میں کیوبا سے جلاوطن ہونے والوں کی کثیر تعداد مقیم ہے جو کاسترو برادرز کی حکومت سے نفرت کرتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ کسی مغربی باشندے کو کیوبا سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہیے۔ اس کے برعکس امریکی حکومت نے کئی برس تک کیوبا کو الگ تھلگ کرنے کی کوشش کے بعد قوانین میں تبدیلی کردی ہے اور اس طرح امریکی کمپنیوں کے لیے کیوبا میں کاروبار کرنا آسان ہوگیا ہے۔ بظاہر یوں لگتا ہے کہ مقامی کیوبن نے اس کے خلاف کارروائی اور ممکنہ سرمایہ کاروں کو وہاں کاروبار کرنے سے روکنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون لوگ ہوسکتے ہیں۔

"یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ گھاس کے ڈھیر میں سوئی تلاش کی جائے لیکن میں اپنی پوری کوشش کروں گا۔" ولی نے کہا۔

نیول نے دراز سے چیک بک نکالی اور ولی کو اس کے تین دن کے معاوضے کے برابر رقم کا چیک دے دیا۔ اس کے بعد دونوں نے مصافحہ کیا اور ولی اپنے مشن پر روانہ ہوگیا۔

کار میں وہ کافی دیر خاموش بیٹھا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کہاں سے آغاز کیا جائے۔ میامی میں جلاوطن کیوبا کے باشندے سیکڑوں ہزاروں کی تعداد میں ہر جگہ پھیلے ہوئے تھے۔ وہ خود بھی کیوبا کا رہنے والا تھا۔ اس نے پہلے پولیس میں ملازمت کی اور پرائیویٹ سراغ رساں کے طور پر کام کررہا تھا۔ اسے یہاں رہتے ہوئے بیس سال ہوگئے تھے اور وہ کئی لوگوں کو جانتا تھا اور بیشتر پر بھروسا کرسکتا تھا۔ آدھا گھنٹا سوچنے کے بعد اس کے ذہن میں ایک نام ابھرا "پاپی پلاناس"۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور لٹل ہوانا میں واقع پاپی کے دفاتر کی جانب روانہ ہوگیا۔

دفاتر کا لفظ اس لیے استعمال کیا کہ پاپی کے زیرِ تصرف عمارت میں ایک سے زیادہ کاروبار ہورہے تھے۔ پہلی منزل پر اس کی بیٹی کی دکان تھی جہاں ماضی کی یاد دلانے والی اشیا فروخت ہوتی تھیں۔ ان میں کاسترو دور سے پہلے پرانے ہوانا کی تصویریں، کیوبا سے شائع ہونے والے پرانے رسالے اور اس دور کے ملبوسات یعنی سفید لینن کے سوٹ، سفید جوتے اور پھول دار فراکیں شامل تھیں۔ یہاں تک کہ اس کے پاس سفید ریت سے بنے ہوئے چھوٹے بیگ بھی تھے۔ اس ریت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ صدیوں پہلے کیوبا کے ساحلوں سے جمع کی گئی تھی۔ اس دکان میں ہر وہ چیز دستیاب تھی جس کا تعلق کیوبا کے کمیونسٹ ملک بننے سے پہلے تھا۔ یہ جگہ یادوں کا نخلستان تھی۔

اس دکان کے عقب سے گزرنے والی سیڑھی دوسری

منزل تک جاتی تھی جہاں پاپی ایک مختلف نوعیت کا کاروبار کررہا تھا۔ یہ بھی ماضی کی یاد دلانے والی اشیا تھیں۔ وہ پرانے کیوبا میں پیدا ہوا اور وہیں پلا بڑھا۔ وہ وہاں ایک سرکاری محکمے میں سول انجینئر تھا۔ اس حکومت کے ختم ہونے سے پہلے پاپی نے ہر طرح کی جائدادوں کا ریکارڈ اور پبلک ورکس نقشے حاصل کرلیے جن میں ریلوے ٹریک، بندرگاہ کی سہولیات، پاور اسٹیشن، پل، ہائی وے نیٹ ورک اور سیوریج سسٹم شامل تھا۔ اس نے یہ سارا ریکارڈ میامی منتقل کردیا۔ اس کا خیال تھا کہ جب آزادی کی جنگ شروع ہوگی تو حملہ آور دستوں کو جزیرے پر قبضہ کرنے کے لیے ان معلومات سے مدد ملے گی۔

بہرحال اس کی نوبت ہی نہیں آئی لیکن کئی برسوں سے جلاوطن کاروباری لوگوں کو یہ نقشے فراہم کررہا تھا جو کیوبا واپس جانے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ اس کے علاوہ ان جلاوطن افراد کا جائدادوں کا ریکارڈ بھی دیا کرتا تھا جنہوں نے اپنے نقصانات کی تلافی کے لیے کیوبا کی حکومت پر دعویٰ کررکھا تھا۔ جلاوطن افراد پاپی کی فائلوں سے یہ بھی معلوم کرتے تھے کہ کون سی غیر ملکی کمپنی ان کے پرانے پتوں پر کاروبار کررہی ہے لیکن کوئی قانونی کارروائی نہیں ہوئی کیونکہ نہ تو کیوبا کی حکومت اور نہ ہی کمپنیوں نے ان دعوؤں پر کوئی توجہ دی۔

ولی کی پاپی سے ملاقات اس وقت ہوئی جب اس کا چچا ہوانا میں واقع اپنے پرانے مکان کی ڈیڈ تلاش کررہا تھا۔ اسے امید تھی کہ ایک دن وہ ہوانا واپس جائے گا یا اس مکان میں رہنے والوں سے اس کی قیمت کا مطالبہ کرے گا۔ مرتے دم تک وہ اپنے واجبات کا مطالبہ کرتا رہا لیکن کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔

ولی نے اپنی کار دکان کے سامنے کھڑی کی اور دکان میں داخل ہوکر کیشیئر کو بتایا کہ وہ پاپی سے ملنے آیا ہے۔ اس نے سیڑھیوں کی طرف اشارہ کیا اور ولی ان کے ذریعے اوپر کی منزل پر پہنچا۔ سیڑھیاں ختم ہوتے ہی ایک لکڑی کا دروازہ تھا۔ اس نے دستک دی۔ ایک مردانہ آواز سنائی دی۔ ”اندر آجاؤ۔“

ولی کئی برسوں بعد وہاں آیا تھا لیکن اسے دفتر میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آئی۔ چاروں دیواروں پر سیاہ رنگ کے فائل کیبنٹ لگے ہوئے تھے۔ ان کے اوپر کارخانوں، گودی پر موجود کرینوں، ریلوے انجنوں اور بڑے پاور پلانٹ کی تصویریں آویزاں تھیں۔

پاپی بلانا س میں بھی بہت زیادہ تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اس کی عمر پچاسی (85) برس کے لگ بھگ ہوگی۔ اس نے سفید قمیص اور سلیٹی رنگ کی پتلون پہن رکھی تھی۔ ولی کو یاد آگیا کہ گزشتہ بار جب وہ اس سے ملنے آیا تب بھی اس نے ایسا ہی لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے ہونٹوں میں ایک موٹا سیاہ سگار دبا ہوا تھا۔ اس نے ولی کو غور سے دیکھا جیسے پہچاننے کی کوشش کررہا ہو۔

”میں ولی کوستا ہوں۔ پیڈرو کوستا کا بھتیجا۔“

پاپی نے اپنے دماغ کو کھنگالا اور پھر سر ہلا دیا۔ ”سراغ رساں ولی تمہارے چچا پیڈرو کا ہوانا میں بہت اچھا مکان تھا۔“

”ہاں۔“

پاپی نے افسردہ لہجے میں کہا۔ ”غالباً تمہارے چچا کا کچھ عرصہ پہلے انتقال ہوا ہے۔“

”ہاں۔“

پاپی نے فائل کیبنٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ ڈیڈ ابھی تک یہاں موجود ہے۔ ممکن ہے کہ کبھی تمہیں یا کسی دوسرے رشتے دار کو اس مکان کا معاوضہ دلا سکوں۔“

ولی نے اس کا شکریہ ادا کیا لیکن اسے یہ توقع نہیں تھی کہ کیوبا کی حکومت مستقبل قریب میں کوستا فیملی کو اس مکان کا معاوضہ ادا کردے گی۔ پاپی کو بھی یہی شک تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جو کاغذات بیچ رہا ہے، ان کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ البتہ ان کاغذات سے ماضی کی یادیں جڑی ہوئی تھیں جو کیوبا سے آئے ہوئے جلاوطن لوگوں کے لیے اہمیت رکھتی تھیں۔ وہ انہیں حاصل کرکے مستقبل کے بارے میں خواب دیکھ سکتے تھے جن کی کوئی تعبیر نہیں تھی۔

ولی نے پاپی کو اعتماد میں لیتے ہوئے کہا۔ ”میں ایک ایسے کیس پر کام کررہا ہوں جس میں کچھ بہت ہی خطرناک لوگ ملوث ہیں۔ مجھے امید ہے کہ تم اس معاملے میں میری مدد کرسکو گے۔“

پاپی نے بھویں اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”کیسا خطرہ؟“

ولی نے اسے حالیہ ہفتوں کے دوران ہونے والے اغوا کے واقعات کے بارے میں بتایا اور یہ بھی کہ ان اغوا ہونے والوں میں کیا چیز قدرِ مشترک ہے جسے سن کر پاپی کے چہرے پر تشویش کے آثار نظر آنے لگے۔

”ان کے خاندان کیوبا میں کاروبار کرتے ہیں۔ تمہارے خیال میں یہی قدرِ مشترک ہے؟“

''ہاں اور میں اسی لیے یہاں آیا ہوں کیونکہ مجھے کچھ شک ہے۔ کیا تم مجھے گزشتہ چند ماہ کا ریکارڈ دیکھنے کی اجازت دو گے۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ اس دوران تمہارے پاس کون لوگ آئے اور وہ کون سی جائدادوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہ رہے تھے۔''

پاپی نے ولی پر نظریں جما دیں۔ وہ احمق نہیں تھا۔ وہ فوراً سمجھ گیا کہ ولی کیا کہہ رہا ہے۔ یعنی یہ اس کا کوئی گاہک شاید ان وارداتوں میں ملوث ہے۔ کیا یہ خفیہ معلومات کا انکشاف نہ ہوگا؟ اس سے کہا جا رہا ہے کہ وہ قیمتی ریکارڈ مفت میں فراہم کردے جبکہ پاپی اس کا عادی نہیں تھا۔

ولی نے اس کی الجھن کو محسوس کرلیا۔ اس نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے کہا۔ ''اگلی مرتبہ وہ کسی اور کو نشانہ بنا سکتے ہیں۔ ایک بے گناہ شخص مارا جائے گا۔ اگر ایسا ہوا تو ہمیشہ تمہارے ضمیر پر بوجھ رہے گا۔''

پاپی یہ سن کر گھبرا گیا۔ اس نے گہری سانس لی اور کمپیوٹر پر اپنی فائلیں کھولنے لگا۔ ولی بھی اس کے پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا۔ اسکرین پر ایک فہرست نمودار ہوئی۔

''یہ ان گاہکوں کے نام ہیں جو اس سال میرے پاس آئے۔''

اس فہرست میں بائیں جانب گاہکوں کے نام تھے۔ اس کے سامنے اس جائداد کا پتا درج تھا جس کے بارے میں وہ معلومات حاصل کرنا چاہ رہے تھے اور اس سے اگلے کالم میں ان لوگوں کے نام تھے جن کے قبضے میں اس وقت یہ جائدادیں تھیں۔ ولی جانتا تھا کہ کیوبا میں پاپی کے مخبر ہیں جو اسے باخبر رکھتے ہیں کہ یہ جائدادیں کن لوگوں کے قبضے میں ہیں۔

ولی کے چچا پیڈرو کی طرح پاپی کے زیادہ تر گاہک وہ لوگ تھے جو اپنے پرانے گھروں کے کاغذات حاصل کرنے آئے تھے اور انہیں امید تھی کہ وہ اپنی چھوڑی ہوئی جائداد کا معاوضہ حاصل کرسکیں گے یا کیونسٹ حکومت کے خاتمے پر اپنے گھر جا سکیں گے۔

لیکن اس فہرست میں کچھ تجارتی جائدادیں بھی تھیں۔ ان میں سے چند ایک میں کیوبا کی حکومت کے کاروباری دفاتر تھے اور دیگر پر غیر ملکی کمپنیوں نے قبضہ کیا ہوا تھا۔ ایک عمارت میں ہوانا کا ہوٹل کوستا قائم تھا جس کی مالک اغوا ہونے والی عورت کی بسکیان کی ہسپانوی فیملی تھی۔

اسی فہرست میں ویوا ایکسپورٹس نامی فرم کا بھی نام تھا جس کے کیوبا کے دوسرے بڑے شہر سانتا گو میں دو بڑے گودام تھے۔ اس کمپنی کا مالک جوزف ہومز کا خاندان تھا۔ اس لڑکے نے شور مچا کر اغوا کاروں کی کوشش ناکام بنا دی تھی۔ اس کے بالکل نیچے کامن ویلتھ ٹیکنالوجی گروپ کا نام تھا جس کا مالک سمانتھا چیسٹر کا باپ تھا۔

ولی نے باری باری ان تینوں ناموں پر انگلی رکھی۔ ''تینوں کمپنیاں گزشتہ تین ماہ میں اغوا کاروں کا نشانہ بنی تھیں۔''

پاپی نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ''اوہ میرے خدا۔''

اس نے دائیں کالم میں دیکھا جہاں گاہکوں کے نام درج تھے۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ان تینوں جائدادوں کے بارے میں دلچسپی لینے والا ایک ہی شخص رابرٹ جے ایگور تھا۔

''یہ کون ہے؟'' ولی نے پوچھا۔

پاپی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں نے پہلے کبھی اس کا نام نہیں سنا۔ وہ چند ماہ قبل پہلی بار میرے دفتر آیا تھا۔ وہ کیوبن فیملی سے تعلق رکھتا ہے۔ اس نے اپنے آپ کو وکیل بتایا۔ وہ ان جائدادوں میں دلچسپی رکھتا تھا جنہیں کاسترو حکومت نے ضبط کرلیا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ ان کے اصلی مالکان کی طرف سے دعویٰ دائر کر رہا ہے۔ اس نے مجھے نقد معاوضہ ادا کیا جبکہ زیادہ تر لوگ چیک یا کریڈٹ کارڈ کے ذریعے ادائیگی کرتے ہیں۔''

ولی نے پاپی سے کہا کہ وہ گوگل پر جا کر فلوریڈا بار ایسوسی ایشن کی ویب سائٹ تلاش کرے پھر وہ اس کے کندھے پر جھک گیا اور ایگور کا نام تلاش کیا۔ فوراً ہی جواب آیا۔ ''اس نام کا کوئی شخص نہیں ہے۔'' پھر اس نے ایک دوسری ویب سائٹ کھولی جس میں پورے ملک کے وکیلوں کے نام موجود تھے لیکن اس میں بھی ایگور کا نام نہیں تھا۔

''یہ شخص وکیل نہیں ہے، کم از کم اس ملک میں تو نہیں۔'' ولی نے کہا۔ ''کیا اس نے تمہیں اپنا پتا یا فون نمبر دیا تھا؟''

پاپی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں، وہ آیا۔ اس نے اپنا آرڈر لکھوایا اور دو دن بعد نقد معاوضہ ادا کر کے کاغذ لے گیا۔''

''وہ اور اس کے ساتھی جو تاوان مانگتے ہیں، اس کو دیکھتے ہوئے وہ بہ آسانی تمہیں نقد ادائیگی کرسکتا ہے۔''

ولی سوچنے لگا کہ وہ کس طرح اس جعلی وکیل کا پتا لگائے۔ جس نے کوئی نشان نہیں چھوڑا۔ ''وہ آخری بار یہاں کب آیا تھا؟'' اس نے پوچھا۔

''وہ یہاں تین چار روز پہلے آیا تھا۔'' پاپی نے جواب دیا۔

''وہ کس جائداد کے بارے میں پوچھ رہا تھا؟''

پاپی نے فہرست کے بائیں جانب دیکھنا شروع کیا۔ وہاں ان جائدادوں کے نام تھے جو کیوبا کے شمالی ساحل پر واقع تھیں اوران سب پر ایک برطانوی آئل کمپنی نارتھ سی آئل کا قبضہ تھا۔ ولی نے پڑھ رکھا تھا کہ اس علاقے میں تیل کے ذخائر ملنے کا امکان ہے اوروہ کمپنی انہیں تلاش کررہی تھی۔

ولی نے ایک کرسی کھینچی۔ پاپی کو ایک طرف ہٹایا اور کی بورڈ پر انگلیاں مارنے لگا۔ پولیس کی ملازمت کے دوران جب وہ جنوبی فلوریڈا میں موجود غیر ملکی جرائم پیشہ افراد کی تحقیقات کررہا تھا تو اس نے سیکھ لیا تھا کہ کس طرح کارپوریشنوں اور غیر ملکی فرموں کی ملکیت کا پتا لگایا جاتا ہے۔ اس نے مطلوبہ ویب سائٹ دیکھی اور صرف تین منٹ کے اندر اسے اس فرم کے سربراہ کا نام معلوم ہوگیا۔

اس نے اپنا سیل فون نکال کر نیول ایشلے کا نمبر ڈائل کیا۔ ''نیول، میں چاہتا ہوں کہ تم ایک برطانوی فرم نارتھ سی آئل کے بارے میں معلوم کرو، اس کے مالکان پیٹرس نامی فیملی سے تعلق رکھتے ہیں۔ معلوم کرو کہ ان میں سے کوئی ایک یا کوئی رشتے دار اس وقت میامی میں ہے یا عنقریب آنے والا ہے۔''

نیول پوچھنا چاہ رہا تھا کہ کیوں لیکن ولی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''پہلے تم یہ کام کرو پھر میں وجہ بتاؤں گا۔ ہم وقت ضائع نہیں کرسکتے۔''

ولی نے پاپی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر اس میں کامیابی ہوئی تو میں یقیناً تمہارے وقت کی قیمت ادا کروں گا۔''

ولی گھر واپس آیا۔ اسے بہت بھوک لگ رہی تھی۔ اس نے فریج کھولا اور رات کا بچا ہوا کھانا مائیکروواوون میں گرم کر کے کھانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس کا سیل فون بج اٹھا۔ دوسری طرف نیول تھا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے تھے۔ نارتھ سی آئل، پیٹرس گروپ کی ملکیت ہے۔ اس کے سی ای او ڈونلڈ پیٹرس کی پوتی ہیلن، ہنی مون منانے میامی آئی ہوئی ہے۔ وہ اوراس کا شوہر رینالڈ اسٹیون، کولنز ایونیو پر واقع ایک ہوٹل کیمو، میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔''

''مجھے سوچنے دو۔'' ولی نے کہا۔ ''ان کی شادی اور ہنی مون کی خبر لندن کے اخبارات میں شائع ہوئی ہوگی لہٰذا ہر کوئی جان سکتا ہے کہ وہ یہاں ہیں۔''

''بالکل۔''

''تم بتاؤ کہ کیا کرنا ہے۔ کیا تم پولیس کو فون کروگے یا ہم اس معاملے کو اپنے طور پر دیکھیں؟''

''جیسا کہ میں نے تمہیں پہلے بتایا کہ میں جہاں تک ممکن ہو، اس معاملے کو خاموشی سے نمٹانا چاہتا ہوں، اگر یہ خبر اخبارات میں شائع ہوگئی تو اس کے باوجود کہ ہم اس گروہ کو پکڑ تے ہیں۔ تب بھی کوئی اور اس موقع سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ میرا یہاں ایف بی آئی کے لوگوں سے رابطہ ہے جن کے ساتھ میں ماضی میں اشتراک کرچکا ہوں۔ مجھے ان پر بھروسا ہے کہ وہ محتاط رہیں گے۔ اس کے علاوہ میرے پاس قونصل خانے میں دو سیکیورٹی آفیسر ہیں۔ میں انہیں بھی بلا سکتا ہوں۔ امید ہے کہ ہم ان لوگوں کو پکڑلیں گے لیکن ہمیں اپنا پلان اس طرح بنانا ہے کہ ہیلن اور اس کے شوہر کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔''

ایک گھنٹے بعد وہ دونوں نیول کی لینڈ روور میں میامی کے ساحل کی طرف جارہے تھے۔ قونصل خانے میں نیول نے ولی کا تعارف دونوں سیکیورٹی افسروں فورسٹر اور گراہم سے کروایا۔ ان کا تعلق برطانوی فوج سے تھا۔ نیول اور ولی ضرورت پڑنے پر انہیں طلب کرسکتے تھے۔

نیول نے گاڑی پارکنگ لاٹ میں کھڑی کی اور وہ دونوں کیمو ہوٹل میں داخل ہوگئے۔ نیول نے استقبالیہ سے ہیلن اور رینالڈ کو فون کیا اور ان سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی پھر وہ لفٹ کے ذریعے ان کے کمرے میں پہنچے۔ نیول نے ولی کا تعارف کروایا اور صورتِ حال کی وضاحت کی اور بتایا کہ گزشتہ کیسوں میں کیا ہوا تھا۔ پہلے تو وہ میاں بیوی یہ تفصیل جان کر الجھن میں پڑ گئے لیکن جب انہیں سامنتھا چیسٹر فیلڈ کے ساتھ ہونے والے واقعے کا علم ہوا کس طرح دو آدمیوں نے ڈانس کلب میں اس سے رجوع کیا تو دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ ہیلن بولی۔

''گزشتہ روز ساحل پر دو آدمیوں نے ہم سے بات کی۔ ہم نے آج انہیں دوبارہ دیکھا اور انہوں نے ہمیں آج رات کلب چلنے کی دعوت دی۔''

نیول نے ایک نظر ولی کو دیکھا اور اپنی بھویں اوپر اٹھائیں۔ رینالڈ نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''مجھے بہت عجیب لگا کہ وہ آج دوبارہ ہمارے برابر والی چھتری کے نیچے آکر بیٹھ گئے۔ ہم سہ پہر کے وقت ساحل پر گئے تھے اور ہمارے وہاں پہنچتے ہی وہ برابر میں آکر بیٹھ گئے۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے گزشتہ روز ہی ان کے چہرے مانوس سے لگے۔ میں انہیں گزشتہ چند روز سے دیکھ رہا تھا۔

تمہارے خیال میں وہ ہماری نگرانی اور انتظار کر رہے تھے؟''

نیول سر ہلاتے ہوئے بولا۔''ہاں اگر یہ وہی ہیں جو ہم سمجھ رہے ہیں۔ ان کا حلیہ کیسا تھا؟''

ہیلن بولی۔''عمر تیس سال کے قریب، لاطینی، عورتوں کے شکاری۔''

نیول نے ایک بار پھر ولی کی طرف دیکھا۔''وہ مارا۔''ولی نے کہا۔

''تم نے آج رات کے لیے کیا پروگرام بنایا ہے؟'' نیول نے پوچھا۔

''ہم آج رات ان سے ہوانا نائٹس، میں ملیں گے۔ جو کولنز ایونیو پر ہے۔''ہیلن نے کہا۔

ولی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔''ہاں، میں جانتا ہوں۔''

نیول بولا۔''ہم ان مجرموں کو پکڑنا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ ہماری کوشش ہوگی کہ تم میں سے کسی ایک کو بھی کوئی خطرہ لاحق نہ ہو لیکن یہ تمہارے اوپر ہے کہ تم اس معاملے میں ملوث ہونا چاہو گے۔''

نوجوان جوڑے نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ہیلن سر ہلاتے ہوئے بولی۔''بالکل اس طرح ہمیں اپنے بچوں کو سنانے کے لیے ایک کہانی مل جائے گی۔''

ولی اور نیول باہر بالکونی میں آگئے اور دونوں نے سر جوڑ لیے۔ اپنے پلان کو حتمی شکل دینے کے بعد وہ دوبارہ کمرے میں آئے اور نوجوان جوڑے کو آپریشن کے بارے میں ہدایات دیں۔ نیول نے ان سے کہا کہ وہ رات کو ڈنر کے لیے باہر جانے کے بجائے کمرے میں ہی کھانا منگوا لیں۔ اس نے انہیں بتایا کہ ہوانا نائٹس کلب، اس ہوٹل سے چند بلاک کے فاصلے پر ہے۔ اس لیے وہ پیدل چل کر ہی وہاں جائیں۔ قونصلیٹ کے دونوں سیکورٹی آفیسرز سارے راستے ان کے پیچھے چلتے رہیں گے لیکن انہیں مڑ کر دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ اس مرحلے پر اس نے اپنا سیل فون نکال کر جوڑے کی ایک تصویر لی تاکہ ان افسروں کو معلوم ہو جائے کہ کس کا پیچھا کرنا ہے۔

''جب تم کلب پہنچو گے تو مسٹر کوستا، ایف بی آئی کے لوگ اور میں، وہاں موجود ہوں گے لیکن تم ہماری طرف مت دیکھنا۔ البتہ ہم تمہیں دیکھتے رہیں گے اگر ہمیں کچھ کہنا ہوا تو ایس ایم ایس کر دیں گے۔ تم اپنا فون آن رکھنا۔ اگر کوئی مسئلہ ہوا تو ہماری زبانی ہدایات پر عمل کرنا۔''

ساؤتھ بیچ کے نائٹ کلبوں میں نصف شب سے پہلے زندگی انگڑائی نہیں لیتی۔ پروگرام کے مطابق ولی کو نیول اور ایف بی آئی ایجنٹ کو برطانوی قونصل خانے کے باہر سے گیارہ بجے لینا تھا۔ جب وہ دروازے پر گیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ نیول ایک خوب صورت لاطینی عورت کے ساتھ کھڑا ہوا ہے۔ اس کی عمر پینتیس کے قریب تھی اور اس نے کھلے گلے کا سیاہ لباس پہنا ہوا تھا۔

''یہ ایف بی آئی اسپیشل ایجنٹ ماریا ایلوس ہے۔'' نیول نے اس عورت کا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔''اسے ہماری مدد کے لیے بھیجا گیا ہے۔''

ولی بہت سے مقامی ایف بی آئی ایجنٹوں کو جانتا تھا لیکن ماریا سے ملنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ اس نے گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور یہ جان کر خوش ہو گیا کہ وہ ان کی مدد کے لیے آئی ہے۔

ساڑھے گیارہ بجے وہ ہوانا نائٹس پہنچ گئے۔ دروازے پر کھڑے دربان ولی کو جانتے تھے کیونکہ ان میں سے بیشتر کئی برسوں سے ولی کے بھائی کے کلب میں ڈانس کر رہے تھے۔ اس لیے انہیں شاہانہ طریقے سے اندر لے جایا گیا اور ان کے ہتھیار بھی چیک نہیں کیے گئے جبکہ وہ تینوں مسلح تھے۔

وہ تینوں ڈانس فلور پر پہنچے اور ولی گرد و پیش کا جائزہ لینے لگا۔ ہوانا نائٹس، سالسا ڈانسرز کی پسندیدہ جگہ تھی۔ وہ ایک کشادہ ہال تھا جہاں ڈانس فلور کے گرد کسی اسٹیڈیم کی طرز پر کرسیاں لگائی گئی تھیں تاکہ ہر کوئی جنسِ مخالف پر نظر رکھے اور اپنے لیے ڈانس پارٹنر کا انتخاب کر سکے۔

یہ ترتیب ولی اور اس کے ساتھیوں کے لیے بہت مناسب تھی کیونکہ وہ بہ آسانی ہیلن اور اس کے شوہر پر نظر رکھ سکتے تھے۔ چاہے وہ جہاں بھی بیٹھتے۔ ولی نے ہال کے آخری سرے پر ایک میز کا انتخاب کیا اور ڈرنکس کا آرڈر دے دیا۔

تھوڑی ہی دیر میں کلب پوری طرح بھر گیا۔ ولی نے مشروب کا گھونٹ لیا اور ہجوم میں ممکنہ اغوا کاروں کو تلاش کرنے لگا لیکن اسے کوئی مشتبہ شخص نہیں دکھائی دیا۔ چند منٹ بعد ہیلن اور اس کا شوہر اندر داخل ہوئے اور انہیں ڈانس فلور کے کنارے پر جگہ ملی۔ ان کی میز تقریباً ولی کے سامنے تھی اور وہ انہیں بالکل صاف نظر آ رہے تھے۔ ہیلن کی میز چار آدمیوں کے لیے تھی لیکن وہاں پہلے سے کوئی نہیں بیٹھا ہوا تھا۔ دونوں سیکورٹی آفیسر فورسز اور نیول ان کے

بالکل پیچھے تھے۔ وہ ایسی جگہ بیٹھ گئے جہاں سے اغوا کار واضح طور پر نظر آئیں۔

اس کے چند منٹ بعد اسٹیج کے عقب سے آرکسٹرا نمودار ہوا اور سالسا کی دھن چھیڑ دی۔ شوقین مزاج ڈانس فلور کی طرف بڑھے اور موسیقی کی دُھن پر ناچنے لگے۔ تھوڑی ہی دیر میں ڈانس فلور پوری طرح بھر گیا اور وہاں ہر جانب تھرکتے ہوئے جسم نظر آ رہے تھے۔

ولی سوچ رہا تھا کہ وہ ماریا کو ڈانس کی دعوت دے لیکن نیول نے پہل کر دی۔ اس نے خاتون کا ہاتھ پکڑا۔ ''معاف کرنا، ہم ایک راؤنڈ لے کر آتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس جوڑے کو بھی ہماری یہاں موجودگی کا علم ہو جائے۔''

ولی ان دونوں کو ڈانس فلور کی طرف جاتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ نیول نے ماریا کو اپنے بازوؤں میں لیا اور وہ بڑی آسانی سے موسیقی کی دھن پر رقص کرنے لگے پھر وہ دونوں بڑی مہارت سے ہجوم کے درمیان سے نکلے اور ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں ہیلن انہیں دیکھ سکتی تھی۔ ایک منٹ بعد ہیلن کی نظر نیول پر پڑی اور اس نے ہیلن کو ہلکا سا اشارہ کیا۔ جواب میں اس نے بھی ایسا ہی کیا۔ دو چکر لینے کے بعد نیول اور ماریا میز پر واپس آ گئے اور مشروب سے دل بہلانے لگے۔

چند منٹ بعد دو لاطینی اس جوڑے کی میز پر دکھائی دیے۔ ان میں سے ایک نے سفید اور دوسرے نے سیاہ قمیص پہن رکھی تھی۔ وہ ہیلن اور اس کے شوہر کے برابر میں بیٹھ گئے اور جلد ہی ہنسی مذاق شروع کر دیا۔ میاں بیوی انہیں مشتبہ سمجھ رہے تھے۔ اس لیے ان کا رویہ قدرے سخت تھا تاہم وہ مسکراتے رہے۔

اگلے دو گھنٹوں میں انہوں نے کئی بار ڈرنک کا آرڈر دیا پھر سفید قمیص والے نے شوہر سے اجازت لی اور ہیلن کو ڈانس فلور پر لے گیا۔ کچھ دیر بعد اس کے دوسرے ساتھی نے بھی ایسا ہی کیا۔ نیول، ماریا اور ولی ان پر نظر رکھے ہوئے تھے کہ کہیں ان میں سے ایک یا دوسرا ہیلن کو دروازے سے باہر نہ لے جائے۔ ایک موقع پر ہیلن اور سیاہ قمیص والا رقص کرتے ہوئے ایک دیوار کے پیچھے چلے گئے اور کافی دیر تک ان کی واپسی نہیں ہوئی تو ولی ڈر گیا کہ وہ شخص کہیں ہیلن کو کار کی طرف نہ لے جا رہا ہو۔ اس نے چھلانگ لگائی اور ہجوم کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا آگے بڑھا۔ اس کا ایک ہاتھ پستول کے دستے پر تھا۔ بالآخر وہ دونوں فلور کے آخر میں نظر آ گئے۔ وہ اب بھی ڈانس کر رہے تھے۔ ہیلن نے اسے دیکھا، جواب میں ولی نے بھی سر ہلایا اور اپنی میز پر واپس آ گیا۔

ڈھائی بجے ان بدمعاشوں نے اپنی کارروائی شروع کی۔ پہلے انہوں نے ہیلن کے شوہر کو اکسایا کہ وہ بھی اپنی بیوی کے ساتھ ڈانس کرے بلکہ اسے کھینچ کر کرسی سے اٹھا دیا اور جب تک دونوں میاں بیوی ہجوم میں گم نہ ہو گئے، وہ قہقہے لگاتے رہے۔ اس موقع پر سیاہ قمیص والے نے اپنی جیب سے ایک چھوٹا لفافہ نکالا اور باری باری دونوں کے مشروب میں پاؤڈر ڈال دیا۔

''کھیل شروع ہو گیا۔'' نیول بڑبڑایا۔

ماریا، نیول اور ولی اپنی جگہ سے اٹھ کر ڈانس فلور کی طرف بڑھے۔ ولی نے ماریا کو اپنی بانہوں میں لیا اور اس کے ساتھ ڈانس کرتا ہوا اس سمت میں چلا گیا جہاں وہ دونوں آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے ایک منٹ انتظار کیا تاکہ نیول اور اس کے دونوں سیکیورٹی آفیسرز اس میز کے پیچھے اپنی پوزیشن سنبھال لیں۔ ولی نے ماریا کو لے کر ایک چکر لگایا اور وہ گھومتی ہوئی ان دونوں کے سر پر جا کھڑی ہوئی۔ اس نے اپنی جیب سے کارڈ نکالا اور بولی۔

''ایف بی آئی۔ تم دونوں زیرحراست ہو۔ میرے ساتھ آؤ۔''

ولی نے اپنا ہاتھ دوبارہ پستول کے دستے پر رکھ لیا تھا۔ کئی لمحوں تک یہ واضح نہ ہو سکا کہ دونوں بدمعاش حکم کی تعمیل یا بھاگنے کی کوشش کریں گے یا اپنے ہتھیار نکال کر فائرنگ شروع کر دیں گے۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی فیصلہ کرتے۔ نیول نے وہ دونوں بوتلیں قبضے میں لے لیں جن میں پاؤڈر ملایا گیا تھا۔ وہ دونوں بدمعاش فوراً کھڑے ہو گئے اور مختلف سمتوں میں بھاگنے کی کوشش کی لیکن ان کے عقب میں کھڑے ہوئے سیکیورٹی آفیسرز نے انہیں پکڑ لیا۔

☆☆☆

پانچ پاؤنڈ [illegible] بعد میں تصدیق کی کہ سفید قمیص والا اس کے دفتر میں آیا اور اس نے اپنا نام [illegible] پیشہ وکالت بتایا جبکہ اس کا اصل نام سرجیو یراس اور کالی قمیص والا اس کا بھائی برنارڈ تھا۔ انہوں نے مشروب میں جو پاؤڈر ملایا وہ ایک طاقتور نیند آور دوا تھی۔ دوسرے متاثرین کو بھی ان کی تصاویر بھیجی گئیں اور انہوں نے بھی ان دونوں کو اغوا کاروں کے طور پر شناخت کر لیا۔ دونوں اغوا کاروں کو جیل بھیج دیا گیا۔ ولی اور نیول نے ان کے لیے جو جال بچھایا وہ اس میں پھنس گئے اور ہیلن کو اغوا کرنے کی کوشش انہیں مہنگی پڑی۔

❖❖❖

سترھویں قسط

الائو

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

الائو... مرحوم کاشف زبیر کی آخری سلسلے وار تحریر ہے... جو انہوں نے ..... قارئین کے لیے تحریر کرنا شروع کی تھی... لیکن دستِ قضا نے ان کو اتنی مہلت نہیں دی کہ وہ چند سنسنی خیز اقساط لکھنے کے بعد اسے اختتام تک پہنچاتے... کسی بھی مصنف کی تحریر کو اسی کے رنگ و آہنگ میں لکھنا کڑا امتحان ہوتا ہے... الائو کو آگے بڑھانے کا فریضہ اب ڈاکٹر عبدالرب بھٹی انجام دیں گے... الائو ایکشن، تھرل اور سسپنس سے بھرپور داستان ہے... ایک مسیحا کو لوگوں کی مسیحائی سے دور کر کے درندگی کے گھنائونے کھیل میں ایسا الجھایا کہ وہ زندگی کی ہر رنگینی کو بُھلا بیٹھا... اب اس کا مقصد صرف اور صرف ان دشمنوں کی کھوج تھی جو سامنے ہوتے ہوئے بھی نگاہوں سے اوجھل تھے...

انساں نما درندوں کی داستان وہ جیسے
جاگتے ہم نفسوں کو بھی بازار کی جنس بنا دیتے ہیں

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

پاکستانی ڈاکٹر سیف الدین، امارات کے ایک ہاسپٹل میں جاب کر رہا ہے، یوں دیگر ممالک سے آئے ہوئے ٹاپ پروفیشنل افراد میں بھارت سے تعلق رکھنے والے دو ڈاکٹرز رمیش اگروال اور رنبیر سنگھ بھی ہیں۔ کھلے دل کا مالک اور دوست نواز رنبیر سنگھ، ڈاکٹر سیف کا ایک اچھا دوست ہے لیکن ڈاکٹر رمیش اگروال ایک کینہ پرور آدمی ہے۔ پاکستان کے خلاف اس کے دل میں شدید نفرت بھری ہوئی ہے اور وہ ڈاکٹر سیف سے بھی اسی لیے عداوت رکھتا ہے کہ اس کا تعلق پاکستان سے ہے۔ یوں رمیش جان بوجھ کر سیف کے سامنے اس کے ملک پاکستان کی برائیاں کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان ہونے والے ایک کرکٹ میچ کے دوران جب بھارت کے ہاتھوں پاکستان کو شکست ہوئی تو متعصّب ڈاکٹر رمیش اگروال کو پاکستان کے خلاف زہر اگلنے کا خوب موقع ملا اور تب ہی ڈاکٹر سیف یہ برداشت نہ کر سکا اور زبانی کلامی اسے منہ توڑ جواب دے دیا۔ نوبت ہاتھا پائی تک آتی اگر دیگر کولیگز ان کے درمیان نہ آتے، انہوں نے بھی رمیش کو ہی اس کی بداخلاقی اور بدزبانی پر کوسا تھا جن میں رنبیر سنگھ سرفہرست تھا۔ بہ ظاہر بات آئی گئی ہوگئی لیکن رمیش نے دل میں رکھ لی۔ انہی دنوں سیف پر ایک بھیانک انکشاف ہوا کہ اسپتال میں چند جرائم پیشہ خفیہ طور پر انسانی اعضا کی غیر قانونی پیوند کاری میں ملوث تھے۔ اسپتال کے تیرہویں چودھویں فلور میں غلطی سے جانے پر سیف کو رمیش دانستہ کچھ باکسز کی جھلک دکھاتا ہے اور ساتھ ہی اسے بڑی کینہ توز اور متقمانہ نظروں سے گھورتا ہے، سیف نہیں جانتا کہ ان باکسز میں اس کے چھوٹے معصوم بھائی عادل کو رمیش نے اپنی دشمنی کے غبار تلے ٹکڑوں میں تقسیم کر کے فروخت کر دیا ہے۔ اس دوران سیف پر قاتلانہ حملے ہوتے ہیں، مگر قسمت اس کا ساتھ دیتی ہے اور اس کی جگہ اسی کا ہم وطن احسان مارا جاتا ہے، دوسرے حملے میں اس کا بھارتی دوست رنبیر سنگھ ہلاک ہو جاتا ہے۔ سیف پاکستان لوٹتا ہے اور اسے بھائی کی گمشدگی کا پتا چلتا ہے۔ ڈاکٹر سیف پنجاب (پاکستان) کے ایک سرحدی گاؤں کا باشندہ ہے۔ باپ زمین کے کچھ ٹکڑوں کا مالک ہے۔ بعد میں وہ پھیپھڑوں کی بیماری میں دنیا سے کوچ کر جاتا ہے۔ سیف کا چھوٹا بھائی عادل، ماجد کا دوست ہے اور ماجد، سیف کی کلاس فیلو ڈاکٹر حمیرا کا بھائی ہے۔ حمیرا کے باپ امجد کا لاہور میں کاروبار ہے۔ حمیرا اور سیف آپس میں ملتے ہیں اور ان کے درمیان پسندیدگی، پھر اُنسیت اور اس کے بعد تعلقِ خاطر محبت میں بدل جاتا ہے۔ وطن لوٹنے پر عادل کی گمشدگی پر سیف اس کی تلاش میں لگ جاتا ہے اس دوران اسے عادل کی لاش دیکھنا پڑتی ہے۔ ایسی لاش جو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق اندر سے خالی تھی۔ بدنصیب عادل کو لاش میں بدلنے سے پہلے مکروہ کھیل کے دوران اسے اہم اندرونی جسمانی اعضا سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ سیف بھائی کی قبر کی مٹی اُٹھا کر قسم کھاتا ہے کہ جن لوگوں نے ایسا بے رحمانہ کھیل کھیلا ہے، وہ انہیں تصویرِ عبرت بنا کے چھوڑے گا۔ اس کے بعد سیف کی زندگی کا ڈھب بدل کر رہ جاتا ہے۔ ایسے میں طارق مجید نامی ایک کرائم رپورٹر جو بیک وقت لڑائی بھڑائی میں بھی طاق ہے اور اس کی پارٹنر رومانہ عرف رومی، جس نے کرمنالوجی میں ماسٹر کیا اور انٹرپول سے متعلق تھی، آج کل یہ دونوں آرگن پائریسی اور انسانی اعضا کی اسمگلنگ کے ٹاسک پر کام کر رہے تھے۔ سیف جیسے عام مسیحا کو ان دونوں ''ٹاپ پروفیشنل'' کی ہم راہی مل جاتی ہے تو وہ کندن بننے لگتا ہے۔ تاہم حالات کی تلخیاں اور زہرناکیاں اس کی نفسیات پر عجیب اثر بھی ڈالتی ہیں جہاں وہ..... طارق اور رومی جیسے ٹاپ پروفیشنلو ساتھیوں کی سنگت داری میں جنگجو بننے لگتا ہے وہیں اس میں بدلہ بجی بھی پروان چڑھنے لگتی ہے۔ اب ان تینوں اور انسانی اعضا کی غیر قانونی پیوند کاری کرنے والے بین الاقوامی خونی سوداگروں کے بیچ ایک دھواں دھار رن پڑ چکا ہے۔ ان تینوں ساتھیوں کی مضبوط تکڑم...... ان خونی بیوپاروں کو تگنی کا ناچ نچاتی ہے، جن کا نیٹ ورک پاکستان میں بھی اس گھناؤنے کالا زار میں مصروف کار ہے۔ پاکستان میں ان کا سرغنہ فیروز شاہ المعروف گوہر شاہ اور اس کے خاص کار پرداز تاج کے ساتھ جنگ جاری تھی۔ سیف کو پتا لگتا ہے کہ ڈاکٹر رمیش نے اپنی بھیانک دشمنی نکالنے کے لیے انہی دونوں مذکورہ افراد کو عادل کا پتا دیا تھا۔ ڈاکٹر رمیش اگروال خونی سوداگروں کی ''بائیر اتھارٹیز'' سے تعلق رکھتا ہے اور اس میں اس کا باس سرجن امرناگ بھی شامل ہے۔ یہی لوگ دنیا بھر میں پھیلے ہوئے نیٹ ورک کو چلا رہے ہیں اور ان خونی بیوپاریوں میں..... شنکر چانکیہ، سہراب مجوٹہ، بنکاک اور دیگر چند ممالک کے زونل چیف احکامات دیتے اور انسانی اعضا کو چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر خصوصی چارٹرڈ طیارے ہائر کرنے اور مذکورہ بیمار افراد کو کروڑوں روپوں کے عوض اعضا لگانے کے پابند ہیں۔ پاکستان میں گوہر شاہ کے ساتھ جنگ کے دوران یہ لوگ حمیرا کے گھر والوں کے بھی دشمن بن جاتے ہیں۔ سیف کا دوست ایس پی شاداب اس کی مدد میں شامل ہے۔ حمیرا اور اس کا باپ ان کے ڈر سے یوکے شفٹ ہو جاتے ہیں اور اس طرح سیف اور حمیرا کی راہیں جدا ہو جاتی ہیں۔ ان تینوں ساتھیوں کی کوششوں کے سبب...... پاکستان میں ان خونی بیوپاریوں کے نیٹ ورک کا قلع قمع ہونے لگتا ہے لیکن سیف کو ابھی اپنے بھائی کے قاتلوں کی تلاش ہے۔ رومی اور سیف امارات کا رخ کرتے ہیں، یہاں سیف اپنے بھائی کے ایک دشمن سرجن امرناگ کو...... عبرت ناک موت سے ہمکنار کرتا ہے لیکن اصل دشمن ڈاکٹر رمیش اگروال فرار ہو کے بھارت جا کر اپنے گرو گھنٹال شنکر چانکیہ کے چرنوں میں پناہ لینے پر مجبور ہوتا ہے۔ اس کے تعاقب میں رومی اور سیف بھارت کا رخ کرنے والے ہیں لیکن بدقسمتی سے رومی کو تو بھارت چلی جاتی ہے لیکن سیف نہیں

جا سکتا۔ طارق اور رومی کے مشورے اور ہدایات کے مطابق ناچار سیف امارت سے پاکستان کا رخ کرتا ہے کہ طیارے کو کچھ نامعلوم دہشت گرد ہائی جیک کر لیتے ہیں۔ امدر کچھ ناخوش گوار واقعات کی وجہ سے طیارے کو کریش لینڈنگ کے عمل سے گزرنا پڑتا ہے اور وہ راجستھان کے صحرا میں تباہ ہو جاتا ہے۔ سیف اور اس کی دو بدنصیب مسافر ساتھی مالا اور شکنتلا زندہ بچتے ہیں مگر وائے نصیب کہ یہ تینوں صحرائی لٹیروں کے چنگل میں جا پھنستے ہیں۔ ایک اور ڈاکو گروہ جو ہیبت سنگھ کا ہے، پرانی دشمنی کی بنا پر سردار جگوان کے گروہ سے بھڑ جاتا ہے۔ اب آپ آگے کے واقعات پڑھیں۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

میں ایک دم سکتے میں آ گیا۔ صورتِ حالات ہی ایسی رنگین و سنگین تھی۔ روشنا جذبات تلے مخمور ہوئی جا رہی تھی، میں اس کے قریب...... بلکہ قریب بیٹھا تھا اور اس نے میرا ہاتھ اسی جذباتی انداز میں پکڑ رکھا تھا، ایسے میں جگوان سنگھ جیسا خطرناک سردار اچانک اور درانہ وار اندر داخل ہوا تھا۔

اس مردود کی ایسی دہشت مجھ پر سوار ہوئی تھی کہ میں چند لمحوں کے لیے ہک دک رہ گیا تھا اور روشنا...... اس کے لیے تو جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا...... اس نے اپنے شوہر کی جانب جیسے دیکھنا تک بھی گوارا نہ کیا نہ ہی اس کی آمد کا اس نے کوئی نوٹس بھی لیا ہو، ہاں...... مجھ سے اگلے ہی لمحے مخاطب ہو کے بولی۔

''ڈاکٹر...... ! تمہیں بھگوان کا واسطہ...... سچ سچ بتاؤ نا...... میرے پربھو...... کو کوئی خطرناک بیماری تو نہیں ہے نا......''

''بب...... بالکل نہیں ہے......'' میں نے بھی گھبرا کر کہہ دیا۔ نجانے یہ کم بخت پربھو کون تھا کیا تھا؟ اتنی ہندی تو مجھے بھی آتی نہیں تھی۔ کیا خبر مجھے ہی کہہ رہی ہو۔ ساتھ ہی میں نے آنکھ سے اسے جھونپڑ کے دروازے کی طرف بھی اشارہ دیا۔

''پربھو...... ! میرے پربھو...... !'' وہ محبت بھرے انداز میں چلائی اور میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ عقدہ کھلا کہ اس نے بغیر اُدھر دیکھے پہلے ہی خطرہ بھانپ لیا تھا اپنے شوہر کی موجودگی پر دانستہ لاعلمی ظاہر کرتے ہوئے اس نے بات ڈھک لی تھی۔ اس کا یہ چلتر تو مجھے تب پتا چلا جب...... سردار جگوان سنگھ نے اس کی بات سن کر وہیں کھڑے کھڑے بڑک مار کے کہا۔

''رانی! چنتا مت کر...... تیرے پربھو کو کچھ نہیں ہونے والا...... میں بالکل بھلا چنگا ہوں۔''

میں اس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے روشنا سے تھوڑا دور کھسکنے لگا۔ اس نے بھی غیر محسوس انداز میں مجھ سے فاصلہ بڑھا لیا تھا اور ساتھ ہی اپنی دونوں مرمریں بانہیں اپنے ''پربھو'' کی جانب پھیلا کر دنیا جہاں کی محبتیں چہرے پر سجائے اس سے بولی۔

''میرے پاس آ جاؤ پربھو...... ! مجھے تسلی دو کہ تم واقعی بھلے چنگے ہو، مجھ سے اپنی کوئی خطرناک بیماری تو نہیں چھپا رہے ہو نا؟''

روشنا کی چلتر کاری جاری تھی اور میں...... اسے اس کے پربھو کے رحم و کرم پر چھوڑنے کے لیے بالکل تیار...... اپنا دواؤں کا تھیلا سنبھالے کھڑا ہو گیا۔ دروازے کی جانب بڑھا ہی تھا کہ سردار جگوان سنگھ کی بڑک اُبھری۔

''ٹھہر جاؤ ڈاکٹر...... !'' میرے قدم وہیں جم گئے۔

''پہلے ہماری پتنی کو تسلی دو کہ ہمیں کوئی خطرناک بیماری نہیں ہے اور نہ ہی ہم اس سے کچھ چھپا رہے ہیں۔''

''بب...... بالکل...... بالکل......'' میں نے فوراً گردن موڑ اس کی تائید میں روشنا کی جانب دیکھتے ہوئے ہکلا کر کہا۔ ''سردار جگوان...... میرا مطلب ہے رانی جی! آپ کے پربھو کو کوئی بیماری نہیں ہے۔ بس، ذرا فشارِ خون بلند ہو گیا تھا، وہ اب کنٹرول میں ہے۔''

''ہاہا...... ہاہا...... بلند فشارِ خون تو ہمارا رہتا ہی ہے...... اس کی کیا چنتا کرنی......'' جگوان سنگھ غرور سے بولا اور اسی وقت میں نے دیکھا کہ روشنا مجھے جانے کا ایک خفیہ اشارہ کر رہی تھی۔

وہاں سے نکلتے ہی میں نے سکون کی سانس لی۔ روشنا جس قدر دل پھینک تھی اسی قدر ذہین بھی، وہ شاید اپنے ''پربھو'' کو رِجھانا ہی نہیں بلکہ اسے بے وقوف بنانا بھی خوب جانتی تھی۔ اس نے بڑی مکاری اور خوب صورتی سے ایک خطرناک صورتِ حال کو سنبھال لیا تھا۔

میں اپنے مسکن میں پہنچا تو حسبِ سابق شکنتلا اور مالا کو آپس میں کسی بات پر اُلجھے ہوئے پایا۔ ان دونوں کے

درمیان شاید کسی بات پر گرما گرمی ہوگئی تھی۔ اگرچہ یہ سب دھیمے دھیمے تھا اور باہر ان کی تو تکار کی آوازیں نہیں آرہی تھیں۔ بہرکیف...... اندر داخل ہوا تو میں نے دونوں کے چہروں پر درشتی محسوس کی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے شکنتلا نے میرے پسینے میں تر چہرے کو تکتے ہوئے طنزاً کہا۔ حالات کی سختی اور تیرہ بختی نے اسے بھی تلخ بنا ڈالا تھا۔

''یہ تمہیں کیا ہوا ہے ڈاکٹر؟ سردار کی بیوی کو کون سا انجکشن لگا آئے ہو؟''

''کک...... کیا مطلب؟'' میں نے گھور کر اس کی جانب دیکھا۔ وہ چپ ہو رہی۔ میں نے ڈپٹنے کے سے انداز میں ان سے پوچھا۔

''کیا بات ہے؟ تم دونوں کے درمیان پھر کوئی جھگڑا ہوا ہے؟''

''ڈاکٹر سیف! آخر یہ سلسلہ کب تک چلے گا؟ جگوان سنگھ تمہارا دوست بن چکا ہے، ہم چاہیں تو اب آسانی سے اسے بے وقوف بنا کر یہاں سے فرار ہو سکتے ہیں۔''

یہ مالا نے مجھ سے کہا تھا جو اتنا غلط بھی نہ تھا لیکن یہ اتنا آسان بھی نہ تھا جتنا وہ سمجھ رہی تھی۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟ تم کیا سمجھ رہی ہو کہ ہم نے ساری عمر ادھر ہی رہنے کا ارادہ کر رکھا ہے؟''

''تم جس طرح سردار اور اس کی خوب صورت بیوی کی تیمارداری میں لگے ہوئے ہو اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ تمہارا ادھر سے نکلنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔'' وہ جانے کس خطرناک غلط فہمی کا شکار تھی۔ جواباً میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''دیکھو تمہیں شاید ان خطرناک حالات کا اندازہ نہیں ہے...... یہاں سے فرار ہونا بے شک اب ناممکن نہیں رہا لیکن میں کسی جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہتا، ورنہ میرے پروفیشنل کے حوالے سے ہم تینوں کو جتنا موقع ملا ہوا ہے اسے غنیمت ہی سمجھو۔''

''تو پھر...... کیا مشکل ہے اب ہمیں......؟'' شکنتلا نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا۔

''ہاتھ پر ہاتھ دھرے میں بھی نہیں بیٹھا ہوں۔ کچھ نہ کچھ سوچتا اور موقع فرار کی راہ تلاش رہا ہوں میں۔''

''ہمیں اس موقع سے فائدہ اُٹھا لینا چاہیے۔ رات ہوتے ہی تاریکی میں نکل بھاگتے ہیں ان کے چنگل سے......'' شکنتلا بھی بے وقوفانہ باتیں کرنے لگی تھی۔ میں نے دھیمے لہجے میں انہیں سمجھایا۔

''یہ لوگ بہت ظالم اور خوں خوار ہیں اور حد سے زیادہ وحشی بھی۔ ہمیں سوچ سمجھ کر ہی کوئی ایسا قدم اُٹھانا ہوگا جو ناکامی سے دوچار نہ ہو، بہ صورت دیگر ہمارے پیروں میں دوبارہ آہنی زنجیریں پڑ سکتی ہیں۔''

''لیکن تب تک یہ وحشی لوگ کہیں ہم دونوں کو اپنی ہوس کا نشانہ نہ بنا لیں......'' مالا تشویش سے بولی۔ ''اتنی آزادی ملنے کے باوجود بھی یہ لوگ ہم دونوں کو بھوکی نظروں سے گھورتے رہتے ہیں۔ کسی بھی وقت...... ان کی نیت بدل سکتی ہے۔''

''اس کا خدشہ مجھے بھی ہے لیکن تم ذرا سوچو، اب تک تو تم دونوں کو بھی اس بات کا اندازہ ہو ہی چکا ہوگا کہ ہم ایک طویل و عریض صحرائی علاقے کی ایک چھوٹی سی نامعلوم ریاست میں مقید ہیں۔ یہاں ان وحشی ڈاکوؤں کے چنگل سے نکلنا تو ہمارے لیے شاید مشکل نہ ہو لیکن یہ بھی تو سوچو کہ ہم نکل کر جائیں گے کہاں؟ ہمیں راستوں کا بھی علم نہیں ہے۔ یہ لوگ ہمیں بہ آسانی دوبارہ پکڑ لیں گے اور پھر شاید بعد میں ہمیں کڑی سزا بھی بھگتنا پڑ جائے۔ تم نے دیگر فرار ہونے والے قیدیوں کا حشر نہیں دیکھا جنہیں دوبارہ دھر لیا گیا اور بعد میں ان پر کیسے کیسے ستم ڈھائے گئے؟''

''تو تم کرنا کیا چاہتے ہو؟'' مالا نے جھلا کر پوچھا۔

''میں کسی طرح سردار کی بیوی روشنا کو شیشے میں اُتارنے کے چکر میں ہوں۔'' بالآخر میں نے کہہ دیا اور وہ دونوں معنی خیز نگاہوں سے میرا چہرہ تکنے لگیں۔ میں نے جلدی سے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا۔

''روشنا کو بہلا پھسلا کر میں...... اریب قریب کے علاقوں اور محفوظ راستوں کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد انہی کے اُونٹوں اور سانڈنیوں پر یہاں سے ہم فرار ہو جائیں گے۔''

خدا کا شکر تھا کہ یہ بات شاید ان دونوں خواتین کی سمجھ میں آگئی تھی، کم از کم ان دونوں کی خاموشی سے تو مجھے یہی لگا تھا۔ یہ نہیں جانتا تھا کہ اگلے دن سورج ایک بھیانک انکشاف کے ساتھ طلوع ہوگا۔

☆☆☆

صبح آنکھ کھلی تو مالا غائب تھی۔ میں پریشان ہو گیا۔ شکنتلا بھی ہراساں نظر آنے لگی۔ پورے گروہ میں یہ خبر پھیل گئی۔ سردار جگوان سنگھ کا غصے اور طیش کے بُرا حال تھا۔ اس نے پورے صحرا میں اپنے سفاک ہرکارے دوڑا دیے، جو

بھوکے اور خوں خوار بھیڑیوں کی طرح مالا کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے تھے۔ مالا کے خوف اور اس کی جلد بازی نے اسے خود ہی ہلاکت میں ڈال دیا تھا۔

مجھے اور شکنتلا کو بھی اس کی طرف سے گہری تشویش لاحق ہونے لگی۔ سردار نے ہم دونوں کو بھی بلا کر اس بارے میں پوچھ گچھ کی تھی، ہم کیا جواب دیتے، یہی کہ ہمیں کچھ علم نہ تھا، صبح ہوئی تو اسے غائب پایا۔

''اس میں تمہاری غلطی بھی ہے۔'' میں نے اپنے جھونپڑے میں آکر شکنتلا سے کہا۔''میں تمہیں مالا سے زیادہ عقل مند سمجھتا تھا۔ تمہیں اس کے ساتھ لڑنے کے بجائے اسے سمجھاتے رہنا اور اس کی دل جوئی کرتے رہنا چاہیے تھا۔ وہ ایک طرف ہم سے بیزار تھی تو دوسری جانب اِن صحرائی لٹیروں سے خوف زدہ۔''

''میری بھلا کیا غلطی ہوئی اس میں......؟'' شکنتلا نے حیرت سے میری طرف دیکھ کر کہا۔''میں تو اسے سمجھاتی ہی تھی مگر وہ تھی ہی اس قدر مغرور کہ ناک پر مکھی ہی نہیں بیٹھنے دیتی تھی۔''

''لیکن تم کبھی کبھی اس کی باتوں پر ہاں میں ہاں بھی ملاتی تھیں۔'' میں نے اسے کل ہونے والی بحث کا حوالہ دیتے ہوئے کہا۔''وہ سمجھ رہی تھی کہ میں یونہی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا ہوں۔''

''وہ تمہاری طرف سے ایک اور غلط فہمی میں مبتلا تھی ڈاکٹر صاحب!'' شکنتلا نے معنی خیز مسکراہٹ سے کہا۔''وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ تم سردار کی بیوی روشا پر عاشق ہو چکے ہو اور زیادہ سے زیادہ یہاں وقت بِتانا اور رنگ رلیاں منانا چاہتے ہو۔''

''شِٹ۔'' میرے منہ سے نکلا۔

''وہ فلموں کی اداکارہ تھی نا...... اس کی سوچ بھی ایسی ہی تھی۔''

''تم بھی تو اس کی غلط فہمی میں آگئی تھیں۔'' میں نے اسے بھی ٹوک دیا۔

''یہ میری غلطی تھی لیکن تمہاری صفائی پیش کرنے کے بعد میں سمجھنے لگی تھی کہ تم ضرور کوئی چال کھیلنے والے ہو۔''

''کاش! تم مالا کو بھی یہ بات سمجھانے کی کوشش کر لیتیں۔''

المختصر ہم دونوں اب خدا سے یہی دعا کرنے لگے کہ مالا ان وحشی درندوں کے ہتھے نہ ہی چڑھے اور بہ خیر و عافیت کہیں دور نکل جانے میں کامیاب ہو جائے، جس کے امکانات بہت کم نظر آرہے تھے مجھے......

ادھر سردار مارے غیظ و غضب کے بُری طرح تلملا رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ مالا اس کے سامنے ہوتی اور وہ اس کی بوٹیاں نوچ لیتا۔ اس کے چنگل سے فرار ہونے والا کوئی بھی قیدی اس کی انا کو جھنجوڑ ڈالنے کے لیے کافی ہوتا۔ وہ اس دن یہی کچھ غصے سے بڑبڑاتا رہا۔

''جائے گی کہاں! دیکھنا اب اس کا کیا حشر کرتا ہوں، ساری عمر یاد رکھے گی۔''

اس دن حالات کچھ ایسے گمبھیر رہے کہ روشا نے مجھے بلایا نہ ہی میں اس کے پاس گیا۔

وہ دن گزرا، صبح ہوئی اور پھر دن چڑھ آیا تو شور مچ گیا۔ سردار جگوان سنگھ کے درندہ صفت ہرکارے واپس لوٹ آئے تھے۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ شکنتلا بھی متوحش نظر آنے لگی۔

ہم دونوں جھونپڑے سے باہر نکل آئے اور اپنی جگہ جیسے سُن ہو کر رہ گئے جب ہم نے وہ لرزہ خیز منظر دیکھا۔

سردار کے بے رحم ساتھیوں نے مالا کو بُری طرح دبوچ رکھا تھا اور اسے بالوں سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے لارہے تھے۔ اس غریب کی حالت بڑی ناگفتہ بہ ہو رہی تھی۔ اس کے جسم پر کپڑے نام کی کوئی شے تو کیا ایک تار تک نہ تھا۔ وہ روئے جارہی تھی، ہسٹریائی انداز میں چلاّتی رہی تھی۔ اس کا نرم و نازک جسم خاک آلود ہو رہا تھا۔

مالا کی یہ ہیئت کذائی اور عورت ذات کی تذلیل پر میرا جگر کٹنے لگا لیکن کیا کر سکتا تھا میں......؟

مالا کو اپنی بے وقوفی اور ضد کی سزا مل رہی تھی۔ اس نے جلد بازی میں آکر اور میرے سمجھانے کے باوصف غلط قدم اُٹھایا تھا۔

مالا کو سردار جگوان سنگھ کے قدموں میں لا پھینکا گیا۔ میں اور شکنتلا بھی وہیں کھڑے تھے۔ مجھ تماشا ئیے ہمیں دکھ بھی ہو رہا تھا اور شرمندگی بھی محسوس ہو رہی تھی لیکن یہ اس بدبخت سردار کا حکم تھا کہ ہمیں بھی دیگر قیدیوں کے ساتھ نہیں تو الگ ضرور کھڑا کرکے یہ ''نظارہ'' دیکھنا تھا۔ اپنی اس قبیح حرکت کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ دوسرے بھی عبرت پکڑیں۔

ہم سے مالا کی قابلِ رحم حالت دیکھی نہیں جارہی تھی۔

سردار جگوان سنگھ اپنے قدموں میں پڑی الم نصیب مالا کو قہر آلود نظروں سے چند ثانیے گھورتا رہا پھر اسے بالوں سے پکڑ کر نہایت بے دردی کے ساتھ کھڑا کر دیا۔ مالا کا چہرہ

بہت سوجا ہوا تھا۔ تھپڑوں اور لاتوں نے اس کا نچلا ہونٹ پھاڑ ڈالا تھا۔ بدن میں خراشیں بھی جابجا نظر آرہی تھیں۔

''لڑکی! تُو نے جرأت کیسے کی یہاں سے بھاگنے کی؟'' سردار نے اسے خوں خوار نظروں سے گھورتے ہوئے گرجدار لہجے میں کہا۔ ''تُو نہیں جانتی تھی کہ یہاں سے چڑیا کا بچہ بھی اُڑ کر نہیں جاسکتا۔'' یہ کہہ کر اس نے مالا کو کھینچ کر اپنے ساتھ بھینچ لیا اور اس کے گال پر اپنے دانت گاڑ دیے۔ مالا کے حلق سے لرزہ خیز چیخ اُبھری۔

اس جلاد نے مالا کے نرم و نازک گال کی ایک بوٹی اپنے دانتوں تلے نوچ کر چند لمحے اسے چباتا رہا اور پھر تھوک دیا۔ یہ ہولناک اور کریہہ منظر کی تاب وہاں قیدی عورتیں نہ لاسکیں اور کئیوں کو توتے بھی ہوگئی، کچھ مردوں کا بھی قریب قریب یہی حال ہونے لگا۔

میرے ساتھ کھڑی لرزہ براندام شکنتلا کو بھی الٹی آگئی تھی خود میرا اپنا جی بھی اس سفاک بربریت پر متلانے لگا تھا۔ میرے پورے وجود میں سردار جگوان سنگھ کے لیے پہلی بار انتہائی نفرت اور غم و غصے کی لہر اُبھری تھی اور میرا جی کیا کہ اس خبیث شیطان کو گولیوں سے بھون کر رکھ دوں۔

ہماری اس حالت کو بھانپتے ہی اس خبیث نے ایک زوردار غراہٹ بلند کرتے ہوئے ہمیں سیدھا کھڑے رہنے کا حکم دیا۔ اس کے بعد جگوان سنگھ نے مالا کو پرے دھکیل دیا۔

ہم سب اور دیگر قیدی بڑی غم ناک اور سراسیمہ نظروں سے مالا کا یہ عبرت ناک حشر دیکھ رہے تھے۔ پھر سردار جگوان سنگھ اپنے حواریوں سے تحکمانہ بولا۔

''آج مزے اُڑاؤ تم لوگ! تمہارا جشن ہے آج......''

اپنے سردار کی بات پر وہاں موجود اس کے اندازاً پچیس تیس خوں خوار حواریوں نے مالا کے ساتھ بہ یک وقت شیطانی کھیل شروع کر دیا۔ مالا کی چیخیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں۔ شکنتلا دہشت زدہ ہوکر مجھ سے چمٹ گئی۔ میرا اپنا سینہ مالا کے ساتھ ہونے والے اس انسانیت سوز ظلم پر چھلنی ہوا جارہا تھا۔

یہ حقیقت تھی کہ مجھ میں سردار کو للکارنے کی جرأت ہو سکی نہ ہی اس سے یہ درخواست کرنے کی کہ وہ ایک مجبور اور بے کس لڑکی کے ساتھ یہ سب نہ کرے، کیونکہ میں جانتا تھا کہ اس کا کوئی فائدہ نہ ہوگا، اُلٹا وہ مجھے اور شکنتلا کو بھی تختۂ مشق بنا سکتا تھا، بھلا اس جیسے خبیث شیطان سے کیا بعید تھا...... اتنی گزارش میں نے ہولے سے ضرور کر دی کہ میں اور شکنتلا خاموشی سے اپنے جھونپڑے کا رخ کرتے۔ سردار نے وحشیانہ مسکراہٹ اور سر کی جنبش سے ہمیں اس کی اجازت دے دی۔

میں شکنتلا کو لے کر جھونپڑے میں آگیا۔

☆☆☆

ظلم اور بربریت کا کھیل کافی دیر جاری رہا تھا۔ پھر وہی ہوا جس کی مجھے پہلے ہی توقع تھی۔

مالا اس قیامت خیز ظلم کو نہ سہہ پائی اور اس نے وہیں دم توڑ دیا۔ مجھے اس کے دردناک انجام کا ازحد دُکھ تھا۔ یہاں انسانیت کی جس طرح تذلیل کی جارہی تھی، اس پر میں اندر ہی اندر کھول رہا تھا، اُبل رہا تھا اور بس یہی کچھ میرے بس میں تھا۔

سردار جگوان سنگھ المعروف ظالم سنگھ اور اس کے بھیڑیا صفت حواری انسانیت کے نام پر ایک بدنما کلنک تھے۔

اب بے چاری شکنتلا، مالا کے اس بھیانک اور روح فرسا انجام پر بُری طرح سہم گئی تھی اور ایک خوف سا اس کے ساتھ چمٹ گیا تھا۔ وہ بُری طرح ہراساں اور دہشت زدہ نظر آرہی تھی اور میں اسے تسلیاں ہی دے سکتا تھا۔ ظلم و بربریت کا وہ دن اور رات تمام ہوئی۔

اگلے دن کی ابتدا اَن گنت خدشات اور وسوسوں کے ساتھ ہوئی۔ دن تک خیریت رہی۔ شام ہوئی اور پھر رات پڑی تو...... شکنتلا جو جانے انجانے خوف کے سبب ابھی تک سو بھی نہ سکی تھی، سرِ شام ہی خراٹے لینے لگی۔

رات دبے پاؤں سرک رہی تھی۔ باہر صحراؤں کی سرد ہوائیں سرسرا رہی تھیں۔ ہر سُو خاموشی کا راج تھا۔ معاً ایک آہٹ پر میں چونک پڑا۔

آنے والا وہی تھا جو سردار کی بیوی روشنا کی طرف سے بھیجا جاتا تھا اور میں اس کی اس وقت...... ''آمد'' کا مقصد سمجھ گیا۔

''سردارنی کی طبیعت ٹھیک نہیں، تمہیں بلایا ہے۔''

میں خاموشی سے اپنا میڈیکل باکس سنبھالے اور شکنتلا کو سوتا چھوڑ کر اس کے ساتھ ہولیا۔

وہ مجھے سردار کے جھونپڑے تک چھوڑ کر چلتا بنا۔ میں اندر داخل ہوگیا۔ چربی والے تیل کے چراغوں میں وہی ہوش رُبا ماحول میرا منتظر تھا اور روشنا کا اندازِ دلرُبائی بھی وہی تھا۔ اسی طرح وہ دھوتی کے انداز میں مہین سی ساڑی

باندھے ہوئے تھی اور کہیں کہیں سے جھانکتا ہوا اس کا سنولایا ہوا ابھرا ابھرا گداز عریاں بدن چربی والے تیل کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ اس کے سیاہ ریشمی کھلے ہوئے بال اس کی سبک کمر پہ جھول رہے تھے۔ میرا دل بجھا بجھا سا تھا۔

''آؤ ڈاکٹر...... آؤ نا قریب میرے......'' اس نے جذبات سے لبریز آواز میں مجھ سے کہا، ساتھ ہی اپنی دونوں مرمریں بانہیں بھی پھیلا دیں۔ میں باکس سنبھالے چند قدم اس کے قریب آیا اور بہانہ بناتے ہوئے کہا۔

''اس دن والا خوف ابھی تک میرے دل و دماغ پر حاوی ہے۔'' میری بات پر وہ ہنستے ہوئے بولی۔

''تو پھر کیا ہوا تھا؟ کچھ بھی تو نہیں...... میں نے حالات سنبھال لیے تھے۔''

''میں تمہاری ذہانت کی تعریف ہی کر سکتا ہوں۔'' میں نے اسے چڑھایا۔ ''لیکن اس وقت...... تمہارا اور میرا معاملہ اتنا قریب نہیں ہوا تھا، ورنہ تمہاری ذہانت بھی کام نہ آتی۔'' میں نے اس دن کے حوالے سے کہا، جب اس کا شوہر سردار ظالم سنگھ اچانک جھونپڑے میں داخل ہوا تھا اور روشنا نے بڑی محبت سے میرا ہاتھ تھام رکھا تھا۔

''تب بھی کچھ نہ ہوتا۔'' وہ عجیب سے انداز میں بولی۔

''کیا مطلب؟'' میں چونکا۔

''ہاں! اس لیے کہ وہ سب کچھ یہاں نہیں ہوتا۔ آؤ میرے ساتھ، آج موقع اچھا ہے۔'' کہتے ہوئے وہ جھونپڑے کے کونے والے ایک گوشے کی جانب بڑھی۔ جہاں ایک کھال سا پردہ جھول رہا تھا۔ اس کی دوسری جانب یقیناً کوئی الگ تھلگ گوشۂ خلوت اور بھی تھا۔ میں گھبرا گیا اور اٹکتے ہوئے بولا۔

''ٹھہ...... ٹھہرو......''

وہ رک گئی۔ سرو قد روشنا اسی طرح اپنی سبک کمر میری جانب کیے اور فقط اپنی صراحی دار گردن موڑے میری جانب تکنے لگی تو ایسے میں اس کی کمر کا قیامت خیز خم مجھے زیر وزبر کرنے لگا۔ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر میں بولا۔

''مم...... میں آج موڈ میں نہیں، خوف زدہ اور اس سے زیادہ دُکھی بھی ہوں۔'' میں نے بہانہ بنانے کی کوشش چاہی تھی، کیونکہ میں اسے ناراض بھی نہیں کرنا چاہتا تھا اور کام اس طریقے سے نکلوانا چاہتا تھا کہ...... ہینگ لگے نہ پھٹکری اور...... رنگ بھی آئے چوکھا......

''کیوں؟'' میری بات پر وہ میری جانب گھوم گئی اور میرا اندر بھی کچھ ہموار ہوا۔

''کمال ہے، تم سردار کی بیوی ہو اور تمہیں کچھ خبر نہیں کہ میری ایک ساتھی لڑکی مالا کے ساتھ کیسا ظلم ہوا ہے۔''

''اوہ...... ! تبھی......'' اس نے ایک ادا سے بھوں اُچکائی۔ ''لیکن اس میں مالا کی بھی غلطی تھی۔ اسے جلد بازی نہیں کرنی چاہیے تھی...... ویسے تم کیا اس سے محبت کرتے تھے؟''

''نہیں، لیکن وہ میری ساتھی تو تھی...... دکھ تو ہوتا ہی ہے نا!'' میں نے اس کوڑھ مغز اور پکے بدن کی حسینہ کو چلتر دیا۔ ''اب میری دوسری ساتھی شکنتلا بھی خوف کا شکار ہو گئی ہے۔ خود میں بھی پریشان ہوں کہ کیا خبر کس وقت سردار ظالم سنگھ مجھے بھی ہلاک کر ڈالے۔''

''جب تک میں تم پر مہربان ہوں، تم پر یہاں کوئی آنچ نہیں آئے گی۔'' وہ بولی۔ ''نہ ہی تمہیں یہاں کوئی کچھ کہے گا نہ کسی قسم کی کوئی تکلیف ہو گی تمہیں......''

''تو کیا ہمیں ساری عمر ادھر ہی رہنا ہو گا؟''

''اس میں حرج ہی کیا ہے؟ عیاشی کرو، مجھ سے دل بہلاتے رہو اور میں تم سے......'' وہ جیسے سیدھے سبھاؤ سودے بازی پر اُتر آئی۔

''میں تو تیار ہوں لیکن میں اپنی ساتھی کو کیسے سمجھاؤں؟ وہ ہر روز مجھے پریشان کرتی رہتی ہے کہ یہاں سے نکلنے کی کوشش کرو۔'' میں نے کہا۔

''وہ تم سے محبت کرتی ہے؟'' اُس نے معنی خیز انداز میں اپنے کندھے اچکائے۔

''ایسی بات نہیں۔'' میں نے ہولے سے جواب دیا۔

''اور تم......؟''

''میں بھی نہیں۔''

''تو پھر تمہیں اس کی اتنی چنتا کیوں کھائے جا رہی ہے؟''

''وہ میرے پاؤں کی زنجیر ہے۔''

''غلط، تم اس سے محبت کرتے ہو۔'' وہ بولی۔

''وہ بھاڑ میں جائے پھر...... لیکن میں کیا کروں؟'' میں نے جھلانے اور پریشان ہونے کی ایکٹنگ کی۔

''اس کا بندوبست میں کیے دیتی ہوں۔ تم تو ادھر رہنا چاہتے ہو نا؟'' اس نے کہا اور میں اندر سے لرز گیا۔ یقینی طور پر مجھ سے فاش غلطی ہو گئی تھی۔ نجانے یہ کم بخت ہوس کی ماری جنگلی بلی شکنتلا کے ساتھ نجانے کیا کرنے

والی تھی۔ میں تو اس لیے شکنتلا سے اپنی بیزاری ظاہر کر رہا تھا کہ یہ کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہو، اور اس کی ''سفارش'' مجھے حاصل رہے لیکن یہ تو الٹی چال گلے کو ہی آن پڑی تھی۔ اس پر میں نے جلدی سے کہا۔

''ونہیں...... نہیں...... تم شکنتلا کے ساتھ کچھ بھی نہ کرو، میں اُسے سمجھادوں گا۔''

میری بات پر اس کے چکنے پڑتے چہرے پر ایک بے تاثر سی مسکراہٹ اُبھری۔ ''چلو آؤنا...... اب یہ وقت کیوں کھوٹا کرنے پر تلے ہوئے ہو۔''

''دو...... دیکھو، پھر کبھی سہی...... میں نے کہا نا، کل والے واقعے کی دہشت مجھ پر طاری ہے وہ......'' میری بات حلق میں ہی اٹک گئی۔ وہ یک دم میری جانب بڑھی اور میرا ہاتھ دبوچ کے اندر لے گئی۔ میں ''ارے...... رے...... رے......'' کرتا رہ گیا۔

''میں تمہارے دل و دماغ میں ایسا نشہ بھر دوں گی کہ تمہارا سارا خوف اور ڈر جاتا رہے گا۔'' اس نے ہانپتے ہوئے جذبات سے بھرپور لہجے میں کہا اور اپنی مہین ساڑی کا اُوپری...... حصہ نوچ کر پھینک دیا۔

جھونپڑے کے اس مختصر سے گوشے...... میں مجھے پہلے ہی عجیب سی حیوانی بُو پھیلی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ فضا بھی گرم تھی۔ ماحول میں تراوٹ کا بھی سماں تھا جو حواسوں پر چھائے جا رہا تھا۔ ایسے میں ایک دلربا سی حسینہ نیم برہنہ میرے سامنے تھی، نہ صرف سامنے تھی بلکہ مجھ سے چپکنے کے لیے بھی بے تاب...... میں نے اپنے حلق میں اُترتی ہوئی کسی ریقق شے کو نگلا اور...... اسے خود سے دور کیا۔

''مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ سردار ظالم سنگھ واقعی سنگ دل اور بے رحم ہے۔''

''ضدمت کرو ڈاکٹر! میں نے کہا نا...... ایسا کچھ نہیں ہے۔ آؤ...... میں اندر ہی اندر بھنی جا رہی ہوں۔'' وہ بھرائی ہوئی اور بوجھل بوجھل سی آواز میں بولی۔ جذبات تلے اس کی آنکھوں کی پتلیاں چڑھنے لگی تھیں، گداز اور ادھ کھلے ہونٹوں پر ایک ارتعاش تھا۔ وہ اسی پنک میں بولے جا رہی تھی۔ ''تم کس قدر جوان، تندرست اور توانا ہو ڈاکٹر!''

''مم...... مم...... میں اس وقت بالکل بھی اپنے اندر تت...... تت...... توانائی محسوس نہیں کر رہا ہوں۔'' میں نے گھبرا کر کہا۔ ''لل...... لل...... لہٰذا میں اس وقت کچھ بھی نہیں کر سکتا۔''

''سب کچھ میں کروں گی...... تمہیں کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' کہتے ہوئے وہ اپنی ساڑی کا نچلا چست بند بھی کھولنے لگی۔ میں بار بار حلق سے کچھ نگلتا رہا بلکہ وہ بھی خشک ہو چکا تھا۔

''تت...... تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

''تم ٹھیک کر دو نا ڈاکٹر......!''

''مم...... میری اپنی طبیعت ٹھ...... ٹھ...... ٹھیک نہیں...... ...'' میں لکنت زدہ آواز میں بولا۔

اس کے بعد مجھے اور تو کچھ نہ سُوجھا اپنا میڈیکل باکس سنبھالا اور جھونپڑے سے دم دبا کر بھاگ نکلا تو اپنے جھونپڑے میں ہی آ کر دم لیا۔

☆☆☆

اگلے دن ہمارے جھونپڑے میں تین بردہ فروش داخل ہوئے۔ میں یہی سمجھا کہ ان کا کوئی ساتھی بیمار ہوگا اور وہ مجھے اور شکنتلا کو لینے آئے تھے۔

''اے لڑکی! چلو ہمارے ساتھ......'' ایک بردہ فروش نے شکنتلا کی طرف دیکھ کر کہا تو وہ سرتاپا لرز اُٹھی۔ خود میں بھی پریشان ہو گیا۔

''اِسے کہاں لے جا رہے ہو؟'' میں نے ذرا ہمت کر کے پوچھا۔ مجھے ڈر ہوا کہیں روشنا نے غصے اور رقابت میں شکنتلا کے خلاف کوئی گُل تو نہیں کھلا دیا؟

''قیدی عورتوں کے پاس......'' اس نے خشک لہجے میں جواب دیا۔

''کیوں......؟'' میں نے پوچھا تو وہ شیطانی مسکراہٹ سے بولا۔

''وہ عورتیں اسے دُلہن بنائیں گی۔ ہمارا سردار آج رات اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔''

اس انکشاف پر تو میں بُری طرح چونکا اور شکنتلا ایک خوف زدہ سی چیخ مار کر مجھ سے چمٹ گئی۔

''نن...... نہیں...... نہیں...... میں کہیں نہیں جاؤں گی......''

''تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہوگا، لڑکی......!'' وہ درشت لہجے میں بولا اور ساتھ ہی اپنے دونوں ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ اُنہوں نے لپک کر شکنتلا کو دبوچ لیا۔ میں نے مزاحمت کرنے کی کوشش چاہی تو مجھ پر یک بیک گنز تان لیں۔

''تمہیں جو کہنا ہے سردار سے جا کر کہو۔'' یہ کہہ کر وہ چیختی چلاتی شکنتلا کو بے دردی سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے جھونپڑے سے باہر لے گئے۔ شکنتلا مجھے مدد کے لیے

پکارتی رہ گئی۔

میں بھلا کیا اس کی مدد کرتا جو خود اس کا طلب گار بیٹھا تھا۔ تاہم کچھ نہ کچھ تو کرنا تھا، میں اس ناتے کہ ان میں معالج بھی تھا، غصے سے پیچ و تاب کھاتے اور اس مردود کی بدنیتی پر سو لعنتیں بھیجتا ہوا سیدھا سردار ظالم سنگھ کے جھونپڑے میں پہنچا۔ وہ شراب کے نشے میں بدمست پڑا ہوا تھا۔

مجھے پریشانی اور برہمی کی حالت میں اپنے سردار کے جھونپڑے میں داخل ہوتے دیکھ کر تین چار مسلح حواری بھی اندر چلے آئے۔ میں نے ان کی پروا کیے بغیر سردار سے کہا۔

''یہ میں کیا سن رہا ہوں سردار؟ تم میری ساتھی لڑکی سے زبردستی شادی رچانا چاہتے ہو؟''

اس نے پہلے تو ایک خرانٹ اور چبھتی ہوئی نظر مجھ پر ڈالی لیکن پھر اگلے ہی لمحے بڑی شرارت بھری مکارانہ مسکراہٹ سے بولا۔

''ہاں، تم نے ٹھیک سنا ہے۔'' وہ ہنوز نشے میں مست تھا۔

''کیوں......؟ ہم سے تمہیں کیا شکایت تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''ہماری مرضی......'' وہ خبیثانہ ڈھٹائی سے بولا۔ ''ہمیں تمہاری یہ ساتھی لڑکی بھا گئی ہے۔ ہمیں خدشہ ہے کہیں یہ بھی تمہاری دوسری لڑکی کی طرح یہاں سے فرار ہونے کی ناکام کوشش نہ کرے اور پھر اسی کی طرح ماری جائے۔ ہم اب اسے مستقل اپنی خدمت گزاری میں رکھنا چاہتے ہیں۔''

اس بدبخت کی بات پر میں غصے سے اپنے ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔ اس کے تینوں مسلح حواری میری جانب بدستور گھورے جا رہے تھے۔

''بڑے افسوس کی بات ہے سردار! تم نے میری خدمت کا یہ صلہ دیا؟ یہ تم اچھا نہیں کر رہے ہو۔''

میری بات پر اس کے منحوس چہرے پر ایک لمحے کو غصے کی سرخی چمکی تھی لیکن پھر جیسے اس نے اپنے طیش پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''ڈاکٹر! اپنی حیثیت پہچان کر بات کرو۔ مت بھولو یہ کہ ہم نے تمہارے پاؤں سے زنجیریں کھول دی ہیں تو تم خود کو آزاد سمجھنے لگے ہو۔ تمہاری حیثیت اب بھی یہاں ایک قیدی کی سی ہے...... لیکن اگر تم نے ہمارے حکم کے آڑے آنے کی ذرا سی بھی کوشش کی تو تمہاری حالت قیدیوں سے

بھی بدتر کردی جائے گی۔ جاؤاب یہاں سے......''

ناچار میں واپس اپنے جھونپڑے میں آ گیا۔ میں بس یہی کچھ کرسکا شکنتلا کے لیے......

اس بد طینت سردار سے گرما گرمی کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجھ پراب اپنے جھونپڑے سے باہر نکلنے پر پابندی لگا دی گئی۔ میں اب اپنے جھونپڑے میں محبوس ہوکر رہ گیا تھا۔

میرے دل و دماغ کی عجیب کیفیات ہونے لگیں۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ سردار ظالم سنگھ کو گولیوں سے بھون کر رکھ دوں، خیالوں میں ایسا کرنے میں کوئی قباحت نہیں سمجھتا تھا میں......

شام ہوئی تو مجھے اپنے جھونپڑے کے باہر آہٹ سی محسوس ہوئی۔ میں فوراً سنبھل کر بیٹھ گیا۔ دو بردہ فروش اندر داخل ہوئے۔

''چلو ہمارے ساتھ...... سردار کی بیوی کی طبیعت خراب ہے۔'' ایک نے مجھ سے تحکمانہ کہا۔ اس وقت میرا موڈ خراب تھا، لیکن روشنا کی طبیعت کا سن کر میرے اندر ایک پُرخیال سا جھما کا ہوا۔ مجھے اسے تڑپ کا پتا بتانے کے لیے کتنی محنت درکار ہوسکتی تھی، یہ سوچتا ہوا میں اپنا میڈیکل باکس سنبھالتا ان دونوں کے ساتھ باہر آ گیا۔

اگرچہ مجھے کل والا واقعہ بھی نہیں بھولا تھا۔ جب وہ جذبات تلے مری اور بقول اسی کے ''بھنی'' جارہی تھی تو میں بھاگ نکلا تھا، لیکن آج میں اس سے خود بھی ملنا چاہتا تھا، شکنتلا کے سلسلے میں شاید وہ... میری مدد کردیتی۔ ڈر بھی تھا کہ وہ...... پُرہوس بلی مجھ سے پہلے ''خراج'' بھی وصول کرے گی۔

مجھے سردار کے جھونپڑے کے دروازے پر چھوڑ کر دونوں ہرکارے چلے گئے۔ میں اندر داخل ہوگیا۔

سامنے روشنا کھڑی میری طرف معنی خیز نگاہوں سے تکے جارہی تھی۔ میں اسے اس طرح بالکل ہشاش بشاش کھڑے دیکھ کر ذرا ٹھٹکا۔ وہ مجھے کہیں سے بھی بیمار نظر نہیں آرہی تھی۔

''آؤ ڈاکٹر! دیکھ لیا نا...... مجھے ٹھکرانے کا انجام......'' وہ کینہ پرور سے لہجے میں میری طرف دیکھ کر بولی اور میں اس کا چہرہ تکتا رہ گیا۔ وہ دوبارہ اسی لہجے میں بولی۔

''تم نے مجھے اس لڑکی کی وجہ سے کل رات ٹھکرا دیا تھا نا! دیکھ لو میں نے کیسی پٹی پڑھائی اپنے پتی کو...... اب وہ بھی خوش اور میں بھی خوش...... اب تو تم اور میں تنہا ہوگئے۔ بولو...... اب ابھی وقت ہے، آؤ...... میرے ساتھ تنہائیاں بانٹ لو...... میرے پیار میں بہت تڑپ اور شدت ہے۔ ایک بار میرے بھرے بھرے شباب کا مزہ چکھ کے دیکھ لو ڈاکٹر! پھر تم میرا ہی دم بھرتے رہوگے۔''

''اوہ...... تو یہ تمہاری شرارت تھی۔'' میں نے غصے سے اسے گھورتے ہوئے دانت پیس کر کہا تو وہ بھی بہ دستور اپنے بھرے بھرے گداز لبوں پر عجیب سی مسکراہٹ سموتے ہوئے بولی۔

''بھول جاؤ سب کچھ...... اور صرف مجھے اور خود کو یاد رکھو۔ کیا اب بھی مجھے ٹھکراؤ گے ڈاکٹر...... ! یاد رکھو، سردار میری کوئی بات نہیں ٹالتا۔ ایسا نہ ہو پھر میں اسے تمہارے خلاف بھی بھڑکا دوں؟''

اس کی دھمکی نے مجھے سرتاپا لرزا دیا۔ وہ ایسا کرسکتی تھی بلکہ وہ سب کچھ کرسکتی تھی۔ وقت پڑنے پر مجھے یہاں سے فرار بھی کرواسکتی تھی۔

میرے اندر سائیں سائیں ہونے لگی۔ یہ حرافہ میرے لیے اب سردار ظالم سنگھ سے زیادہ خطرناک ثابت ہورہی تھی۔ اس نے رقابت میں آکر اپنے شوہر کو شکنتلا سے شادی کرنے کی پٹی پڑھا کر گویا اس طرح مجھے اپنی طرف مائل کرنے کی ایک بہت ہی اوچھی اور گھٹیا حرکت کی تھی مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ میں اس سے دشمنی مول لینا بھی نہیں چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔

''کیا تم اپنے شوہر کو میری ساتھی لڑکی سے شادی کرنے سے روک نہیں سکتیں؟''

''نہیں، اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ تم اب اپنے اور میرے بارے میں سوچو۔'' وہ بولی۔ ''آج رات تو جگوان سنگھ اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ کسی دوسرے جھونپڑے میں گزارے گا اور میں یہاں تنہا ہوں گی۔ بیماری کے بہانے تم یہاں مجھے دیکھنے آتے رہنا۔ آج میں تمہیں جانے نہیں دوں گی، بہت پیار دوں گی...... ہر طرح سے...... جو تم چاہو، جیسا تم چاہو......'' وہ آبرو باختہ ہی نہیں حواس باختہ بھی ہوئی جارہی تھی۔

میں بُری طرح پریشان ہوا اور سٹپٹا بھی گیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے کیا جواب دوں؟ تاہم خوف زدہ نظر آنے کی ایکٹنگ جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''تم نے میرے بارے میں غلط اندازہ لگایا تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ تمہاری جیسی دلربا اور آزاد خیال حسین عورت تو میری کمزوری ہے۔ (کہتے ہوئے میں نے دل ہی

دل میں لاحول پڑھی تھی) مگر کیا کروں ڈرتا ہوں میں تمہارے اس شوہر ظالم سنگھ سے......"

میری بات پر اس کی آنکھوں میں چمک سی اُبھری۔ وہ بے اختیار میرے قریب آ گئی۔ مجھ پر پھر گھبراہٹ سی طاری ہوگئی۔ اسے بس ایک ذرا شہ دینے کی دیر ہوتی اور وہ کمبل بننے لگتی، لیکن میں بھی اس بار کیل کانٹے کی طرح وہیں کھڑا رہا، یہ ضروری تھا اب کیا کرتا......؟ اس نے اپنی دونوں بانہیں میرے گلے میں ڈال دیں اور کم بخت چاہتی تھی کہ میرا بوسہ لے...... میں نے اسی وقت جان بوجھ کر کھانسی کا "ٹھسکا" مارا۔

"کیا ہوا؟" وہ بے چین ہوگئی۔

"گگ...... گلے میں خراش ہے اور شاید نزلہ بھی ہو رہا ہے۔ بڑا خطرناک وائرس ہے یہ کم بخت فلو...... تمہیں بھی ہو جائے گا۔" میں نے بہانہ بنایا اور اسے یاد دلایا کہ وہ اپنی بات پوری کرے تو وہ بولی۔

"ہاں! میں کہہ رہی تھی کہ تمہیں میرے شوہر سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ جتنا ظالم ہے اُتنا ہی بے وقوف بھی ہے، میں تو اسے نجانے کب سے اُلو بناتی آ رہی ہوں۔ آج رات وہ اپنی نئی نویلی دُلہن کے ساتھ دوسرے جھونپڑے میں سہاگ رات منائے گا۔ تم کیوں آج والے موقع کو ضائع کرتے ہو۔"

میں موقع ضائع کرتے ہوئے، آہستگی سے اس کی دونوں بانہوں کے قاتل حصار سے نکل آیا تھا۔ بدستور خوف زدہ لہجے میں بولا۔ "لیکن مجھے اس کے خوں خوار ساتھیوں سے بھی ڈر لگتا ہے؟ کیا خبر کب کوئی ہماری مخبری کر دے؟" میری بات پر وہ ہولے سے ہنسی۔

"ان کی طرف سے بے فکر رہو۔" وہ بولی۔ "ان میں کئی پہرے دار میرے بھی بے دام غلام ہیں۔ تمہیں ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آ جاؤ ظالم......! کیوں اتنا تڑپا رہے ہو مجھے۔" وہ مرغ بسمل نہیں بلکہ مرغی بسمل کی طرح میری جانب بڑھی تو میں نے پھر کھانسنا شروع کر دیا اور بولا۔

"دو...... دو...... دیکھو، اس وقت میری اپنی طبیعت خراب ہے۔ میں بھلا کہیں بھاگا تھوڑی جا رہا ہوں بلکہ بھاگنے پر مجھے ایک ترکیب سوجھی ہے، تم اگر سن لو تو......"

"ہاں! بولو...... مگر جلدی۔" وہ بے تاب ہوئی جا رہی تھی اور میں نے ہاتھ میں پکڑے میڈیکل باکس کو اس کے اور اپنے درمیان کر لیا اور بوکھلا کر بولا۔

"ٹھ ٹھ...... ٹھہرو تو ذرا...... میں ایک دوا کھا لوں، نزلے اور کھانسی کی......"

وہ رُک گئی۔ میں نے اطمینان کی سانس لی۔ اس نے مجھے اجازت دے دی۔

جیسا کہ مذکور ہو چکا جب انہیں معلوم ہوا تھا کہ میں ایک ڈاکٹر ہوں تو انہوں نے میری لکھی ہوئی ادویات کی فہرست کے مطابق بہت سی دوائیں لا دی تھیں۔

ان میں، میں نے بہ وقت ضرورت کچھ نیند اور بے ہوشی کی دوائیں بھی لسٹ میں لکھ دی تھیں کہ کہیں ان کی افادیت کام میں آ جائے۔ وہ سیرپ، گولیوں اور انجکشن کی صورت میں تھیں۔

میں اپنا میڈیکل باکس کھول کر وہیں بیٹھ گیا۔ وہ مجھ سے فاصلے پر بیٹھ کر غور سے مجھے دیکھنے لگی۔ اسی دوران میں نے اپنے ذہن میں پلنے والے منصوبے کے مطابق اس سے بات چھیڑی۔

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم دونوں ساری عمر ایک ساتھ رہیں۔ میاں بیوی کی حیثیت سے؟"

"بالکل ہو سکتا ہے، کیوں نہیں ہو سکتا۔" وہ ایک دم پھر فریفتگی کے عالم میں بولی اور بیٹھے بیٹھے میری جانب کھسکنے لگی۔ کم بخت کو ایک ذرا "چھیڑنے" کی دیر ہوتی اور وہ دوبارہ پھسلنا شروع کر دیتی مگر مجبوری تھی کہ اُسے "چھیڑے" بغیر اُلو بھی سیدھا نہ ہوتا۔

بہرکیف...... میں نے فوراً پھر میڈیکل باکس سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے کہا۔ "تو پھر ایسا کیوں نہیں کرتے کہ یہاں سے ہم دونوں بھاگ چلیں......"

"میں تیار ہوں لیکن اس کے لیے تھوڑا وقت چاہیے، یہ اتنا آسان نہیں۔" وہ بولی۔ "میں اکیلی نہیں ساتھ جاؤں گی تمہارے، بے شمار دولت بھی ساتھ لے کر جاؤں گی یہاں سے......"

"اچھا!" میں نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے دانستہ لالچی پن سے کہا۔ "یہ تو اور بھی اچھی بات ہوگی، ہم اس دولت سے کسی بھی اچھے اور بڑے شہر میں عیش و آرام کی زندگی گزار سکتے ہیں۔"

"ہاں! اب تم میرا ساتھ دو اور پہلے اپنی مجھ سے محبت کا ثبوت دو، وقت ضائع مت کرو اور جلدی دوا کھاؤ تاکہ ہم آج کی رات کو رنگین کر سکیں۔"

اس کم بخت کی سُوئی ایک ہی جگہ پر اٹکی ہوئی تھی۔ میں نے بالآخر ایک دوا نکال کر محض اسے دکھانے کے لیے...... اپنے منہ میں ڈالی اور کھانسنے کے بہانے وہ ایک

طرف تھوک بھی دی۔ ساتھ ہی میں نے ایک..... بے ہوشی کی پڑیا بھی نکال لی جس میں گولی پیس کر اس کا پاؤڈر میں نے بنا رکھا تھا۔ اس سے بولا۔

”ایسے موقع پر مشروب کا ہونا ضروری ہے۔“ وہ میرا اشارہ سمجھ گئی اور اُٹھ کر قریب دھری ربڑ کی صراحی لے آئی۔ اس میں شراب تھی۔ دو گلاس اس نے تیار کیے ایک میری جانب بڑھایا۔

میں نے کیا خاک پینا تھی البتہ بے ہوشی والی پڑیا کی دوا آنکھ بچا کر میں نے اس کے گلاس میں اُنڈیل دی۔

میں نے گلاس لیا اور اسے بھی تھما دیا۔ میں تو یونہی منہ مارنے لگا البتہ وہ لمبے لمبے گھونٹ بھر کے پورا چڑھا گئی اور لگی ڈولنے.....

”آؤ نا..... ڈاکٹر! میرے قریب..... مجھے تمہارا نشہ چڑھنے لگا ہے۔“ وہ مخمور لہجے میں بولی ہیں دل پر جبر کر کے اس کے قریب چلا گیا۔

وہ میری بانہوں میں آ گئی اور اول فول بکنے نہیں بلکہ گنگنانے لگی۔ میں نے اسے یونہی گنگنانے دیا اور..... انداز میرا ایسا ہی رہا جیسے میں اس کے ساتھ میل ملاپ کرنے لگا ہوں، جلد ہی وہ بے سُدھ ہو گئی اور میں نے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے اپنا میڈیکل باکس سنبھالا اور اس کے جھونپڑے سے باہر نکل آیا۔

اپنے جھونپڑے میں آ کر میں نے سر پکڑ لیا۔

میں شکنتلا کی طرف سے بے طرح پریشان ہو رہا تھا اور چشمِ تصور میں شکنتلا کی قابلِ رحم حالت کا تصور کرنے لگا کہ اس بے چاری کی کیا حالت ہو رہی ہو گی؟ ساتھ ہی مجھے سردار جگوان سنگھ المعروف ظالم سنگھ کی آبرو باختہ اور حواس باختہ بیوی روشا پر بھی بُری طرح طیش آ رہا تھا کہ اپنی گندی نفسانی خواہش میں اندھی ہو کر اس نے شکنتلا کو ایک بھیڑیے صفت مکروہ انسان کی بیوی بنانے کی سازش کی تھی۔ ابھی مجھے مالا کا ہی حشر نہیں بھولا تھا۔

”بھاڑ میں جائیں سب.....“ میں جھنجلا گیا۔ ”میرا بھلا مالا سے یا..... شکنتلا سے کیا رشتہ ہے۔ میں نے کسی کی جان بچانے کا کوئی ٹھیکا تو نہیں لے رکھا ہے۔ ہر کسی کو اپنی تقدیر کا لکھا بھگتنا ہی پڑتا ہے۔“

”تو پھر عادل کی تقدیر کا لکھا بھی بھول جاؤ سیف الدین.....!“ اچانک میرے اندر آواز اُبھری۔ ”اس کی تقدیر میں ایسی ہی دردناک موت لکھی تھی، پھر تم کیوں اس کے دشمنوں سے انتقام لینے کے لیے خوار ہو رہے ہو؟ اسے بھی تقدیر کا لکھا جان کر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھ جاؤ اور آرام و سکون کی زندگی بتاؤ۔“

مجھے ایک جھٹکا لگا۔ اس کے ساتھ ہی میرے چشم تصور میں مظلوم شکنتلا کا فریاد کرتا چہرہ رقص کرنے لگا، یوں جیسے وہ مجھے مدد کے لیے پکار رہی ہو۔ اُمید بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہی ہو۔ وہی آواز پھر میرے ضمیر سے آئی۔

”سیف! ظلم چاہے اپنے بھائی پر ہوتا دیکھو یا کسی اور بے کس و مجبور مظلوم پر تو اسے روکنے کی کوشش کرنا انسانی فریضہ ہے۔ رشتے صرف خونی ہی نہیں ہوتے، انسانیت کے ناتے بھی کچھ فرائض ایک انسان پر عائد رہتے ہیں۔ یاد رکھو! یہی وہ ہتھیار ہے۔ دوسروں کی مدد کرو گے تو خدا تمہاری راہیں اور منزلیں آسان کرے گا۔ یوں اپنی آنکھوں سے ظلم ہوتا دیکھو گے تو اپنوں کا بھی تماشا تمہاری آنکھوں کے سامنے جلد یا بدیر آ جائے گا۔

”اے خدایا! میری مدد فرما..... میں کیا کروں پھر؟“ میں نے بے اختیار دعائیہ لہجے میں کہا۔ ”میں خود لاچار و بے بس تھا۔ قیدی بنا ہوا تھا یہاں..... ایک اکیلا کیا بھاڑ جھونک سکتا تھا، اتنے سارے مسلح اور خونخوار گروہ کا تنِ تنہا بھلا کیسے مقابلہ کر سکتا تھا؟“

میں نے خود سے پوچھا۔ سچی بات یہی تھی کہ جب مالا کے ساتھ میری نظروں کے سامنے بہیمانہ اور ظالمانہ کھیل کھیلا گیا تھا تو میں بے بسی سے دیکھتا رہ گیا لیکن بعد میں میرے ضمیر نے مجھے بہت کچوکے لگائے تھے کہ میں..... مالا کے لیے کچھ نہ کر سکا۔

سوچ سوچ کر میرا دماغ پاگل ہو رہا تھا، کچھ سُجھائی نہیں دے رہا تھا کہ میں کیا کروں؟ اسی طرح رات کسی بھاری سِل کی طرح سر کے جا رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد جب میں..... جھونپڑے سے باہر نکلا تو کیا دیکھتا ہوں قیدی عورتوں نے شکنتلا کو دُلہن بنا رکھا تھا۔ وہ بے چاری بُری طرح رو رہی تھی۔ میں اس کی طرف بڑھا تو مجھے مسلح ہرکاروں نے بندوقوں کی نالوں سے ٹھوکے دے کر واپس جھونپڑے کے اندر محبوس ہونے پر مجبور کر دیا۔

میں اندر ہی اندر پھر کُڑھنے اور تڑپنے لگا۔ رات سر پر تھی۔ باہر سردار ظالم سنگھ اور شکنتلا کی ہونے والی شادی کا جشن منایا جا رہا تھا۔ میں اندر اپنے جھونپڑے کے دروازے کی جھری سے یہ سارا تماشا دیکھ رہا تھا۔

ایک بار جی میں سمائی کہ کسی ڈاکو کی گن جھپٹ کر اُن مردودوں پر گولیوں کی اندھا دھند بوچھاڑ کر ڈالوں مگر کب

تک؟ اس کے بعد یہ میرا کیا حشر کرتے؟ کچھ بھی نہیں ہوتا، میں مارا جاتا اور شکنتلا تب بھی زبردستی سردار ظالم سنگھ کی بیوی بنادی جاتی۔ یہ خودکشی کے مترادف ہی ہوتا۔

باہر شادی کا ہنگامہ جاری تھا اور سوچ سوچ کے میرا سر دکھنے لگا تھا۔ دفعتاً باہر گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ اُبھری اور اس کے ساتھ ہی چیخ و پکار مچ گئی۔

میں پہلے یہی سمجھا کہ ظالم سنگھ کے کارندے اپنے سردار کی شادی کی خوشی میں ہوائی فائرنگ کررہے ہیں لیکن جب میں نے جھونپڑے سے ذرا باہر جھانکا تو چند لمحوں کے لیے ہکا بکا رہ گیا۔

باہر مجھے پچیس تیس گھڑ سوار ہاتھوں میں رائفلیں اور مشعلیں تھامے بردہ فروش لٹیروں کے ساتھ برسرِ پیکار نظر آئے، وہ انہیں اپنی بندوق کی گولیوں سے نشانہ بنارہے تھے۔

حقائق جاننے کے لیے میں جلدی سے باہر نکلا اور ایک ٹیلے کی آڑ لے کر بہ غور حالات کا جائزہ لینے لگا۔ پہلے پہل مجھے یہی لگا تھا کہ کہیں ان کی آپس میں ہی نہ ٹھن گئی ہو، کیونکہ شادی اور شراب کے نشے میں سب بدمست ہورہے تھے۔ مگر فائرنگ کرنے والے شدید نفرت اور غیظ و غضب سے مغلوب تھے۔

یعنی چوروں کو پڑ گئے مور والی بات ہوگئی تھی۔ یہ بہرحال ایک سنہری موقع تھا۔ ان کے رنگ میں بھنگ پڑ گیا تھا۔ یوں سردار ظالم سنگھ کی ''شادی'' کھٹائی میں پڑ گئی تھی۔

یہی نہیں اِدھر قیدیوں کی بھی جیسے مراد بر آئی تھی۔ وہ سب چٹانی درزوں کے پیچھے چھپنے کے لیے دوڑے۔ ایسے میں شکنتلا کو میں تلاش کرتا ہوا باہر کی طرف لپکا۔

یکایک گویا میدانِ جنگ کا سا سماں پیدا ہوگیا تھا۔ شکنتلا کی تلاش کے دوران میں نے یہ احتیاط بھی رکھی تھی کہ کہیں نوارد حملہ آور گروہ کی گولی کا نشانہ نہ بن جاؤں اس لیے میں بچتا بچاتا ہوا ہی آگے بڑھنے کی کوشش کررہا تھا، میرے سامنے اور قریب بردہ بردشوں کی لاشیں پڑی تھیں، میں چاہتا تو ان کی گن اُٹھا سکتا تھا، مگر میں نے ایسا نہیں کیا مبادا وہ مجھے بھی انہی کا ساتھی سمجھ کر گولیاں برسانا نہ شروع کر دیں۔ اس طرح نہتا ہو کر میں کسی کی نگاہ میں آ بھی جاتا تو وہ مجھے ایک قیدی ہی سمجھتے۔

بالآخر میری پیہم کوشش رنگ لائی اور وہ مجھے ایک چٹانی درزے میں سکڑی سمٹی بیٹھی، تھرتھر کانپتی نظر آگئی۔ اس کے جسم پر ابھی تک دلہنوں والا لباس تھا۔ اس ہڑبونگ سے جہاں دوسرے قیدیوں نے فائدہ اُٹھایا، وہ بھی اس میں شامل رہی تھی۔

مجھے دیکھتے ہی پہلے وہ مجھ سے خوف زدہ ہوگئی لیکن پھر قریب آنے پر پہچانتے ہی جیسے جی اُٹھی اور ''ڈاکٹر'' کہتے ہوئے میری جانب لپکی۔

اس سے پہلے کہ وہ میرے گلے کا ہار بنتی، میں نے اسے روک کر اسی طرح ہمت و حوصلے سے کام لینے کی تلقین کی، ساتھ ہی اسے ابھی وہیں دبکے رہنے کی بھی ہدایت کی۔

''ی ی..... کیا ہورہا ہے؟'' گولیوں کی گھن گرج اور چیخ و پکار کی آوازوں کے درمیان اس نے لرزتی آواز میں پوچھا۔

''خوش قسمتی ہمارے دروازے پر دستک دے رہی ہے اور..... مکافاتِ عمل ہے۔''

''میں سمجھی نہیں۔'' اس بار اس نے حیرت سے کہا۔

''سمجھ جاؤ گی.....'' میں نے ہولے سے کہا اور گرد و پیش کا جائزہ لینے کے دوران ان سن گن بھی لیتا رہا۔

اب فائرنگ کی گھن گرج سے لگ رہا تھا کہ وہ دو طرفہ ہونے لگی تھی۔ جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ''مقابلہ'' شروع ہو چکا تھا، لیکن دیکھنے میں یہی آرہا تھا کہ شب خون مارنے والے اس نئے گروہ کو سردار ظالم سنگھ کے بردہ فروش گروہ پر فتح حاصل ہونے والی ہے۔

میں شکنتلا کے ساتھ ہی وہیں دبکا رہا۔ کچھ اور قیدی بھی ہماری طرح اس طوفان کے تھمنے اور نکل جانے کے منتظر تھے۔

کچھ دیر اور گزری تو..... لگا فائرنگ سمیت شور و غوغا تھمنے لگا ہے اور اس کے ذرا ہی دیر بعد کسی کی للکار سے مشابہ آواز اُبھری۔

''سردار جگوان سنگھ..... اگھے! تُو نے جرأت کیسے کی میری بہن کو ہاتھ لگانے کی؟ بول اب..... کیا حشر کروں تیرا.....؟''

یہ آواز ہمارے دائیں جانب ایک پہاڑی کے ٹیلے کی دوسری سمت سے آئی تھی جو تھوڑے ہی فاصلے پر تھی۔ اسی طرف روشنا کا جھونپڑا تھا۔ للکارتی آواز میں مجھے ایک طوفانی گھن گرج کے ساتھ انتقام کی چنگاریوں سے بھڑکتے لہجے کی بھی گونج محسوس ہوئی تھی۔

''بزدلوں کی طرح حملہ کرنے والے ہیبت سنگھ.....! میں تیرے کسی بھی سوال کا جواب دینے کے بجائے موت کو ترجیح..... دینا پسند کروں گا۔''

یہ سردار جگوان سنگھ عرف ظالم سنگھ کی آواز تھی۔ لہجے میں شکست خوردگی کا عنصر اپنی جگہ مگر آواز میں... بے خوفی صاف نمایاں تھی۔ البتہ میں...... ''ہیبت سنگھ'' کے نام پر ضرور چونکا تھا۔

اس نام کو سن کر مجھے وہ خوب صورت مگر دلیر عورت یاد آگئی جسے ظالم سنگھ نے ہم سے پہلے ہی اغوا کر رکھا تھا اور ہمارے سامنے اس دلیر لڑکی نے بردہ فروشوں کے سردار ظالم سنگھ کو ''چتاونی'' دیتے ہوئے غصے اور نفرت بھرے انداز میں جو الفاظ کہے تھے، وہ اب بھی میرے دل و دماغ پر نقش تھے۔

''تمہارے مہاراجا نے دلیار کے مہاراجا دلبیر سنگھ کی بہو کو اغوا کر کے بڑی سنگین غلطی کی ہے مگر کان کھول کر سن لو، میرا نام بھی پھولن بائی ہے اور مت بھولو کہ میں ایک غیرت مند بھائی ہیبت سنگھ کی لاڈلی بہن بھی ہوں جس کا ڈنکا دلیار سے لے گوالیار تک بجتا ہے۔''

اس کے بعد پھولن بائی کو اول الذکر مہاراجا رتنا سنگھ کے ہاتھ بھاری قیمت پر فروخت کر دیا تھا۔ تو گویا اسی لڑکی کا وہ غیرت مند بھائی ہیبت سنگھ اپنی بہن کی تلاش میں یہاں پہنچ چکا تھا، نہ صرف یہ بلکہ...... ان کا قصہ بھی تمام کرنے کے قریب قریب تھا، جس کا مطلب تھا، بالآخر پھولن بائی کی ''چتاونی'' سچ ثابت ہوئی تھی۔

ظالم سنگھ کی ڈھٹائی پر...... شاید ہیبت سنگھ کو طیش آ گیا تھا، کیونکہ اس کے فوراً ہی بعد سردار ظالم سنگھ کے کریہہ انگیز انداز میں چیخنے چلّانے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

میں تھوڑا اور آگے کو کھسکا تو سامنے خشک ٹیلوں کے درمیان مشعلوں کی روشنی میں مسلح لوگوں کا گھوڑے اور اونٹ سواروں کا مجمع دیکھا، ان میں ایک دراز قامت اور کسرتی جسم کا مالک شخص جو درمیانی عمر کا تھا، ایک اونٹ پر سوار تھا اور خاک پسر سردار ظالم سنگھ کو اس کے کھروں تلے روندے جا رہا تھا۔

سردار ظالم سنگھ اس وقت خود مظلومی کی تصویر بنا ہوا تھا۔ اس کے بعد کسرتی جسم والا ہیبت سنگھ اونٹ سے نیچے اُتر آیا۔

اس نے اپنے ہاتھ میں بندوق پکڑ رکھی تھی۔ وہ اس کے کندے سے اب ظالم سنگھ کو کوٹنے لگا۔

''بتا، کُتّے! ذلیل! جو تو نے میری بہن کو اغوا کرنے کا کارنامہ انجام دیا ہے وہ کہاں کی بہادری ہے؟ بول، میری بہن کہاں ہے؟'' اس نے خوفناک غراہٹ کے ساتھ ظالم سنگھ سے کہا۔

''بالکل نہیں بتاؤں گا، چاہے تُو مجھے گولی ہی کیوں نہ مار دے۔'' ظالم سنگھ بھی ایک ڈھیٹ ہڈی ہی تھا۔

یہی وہ موقع تھا جب میں نے بہ آواز بلند کہا۔ ''ہیبت سنگھ! تیری بہن پھولن بائی کے بارے میں تجھے میں بتاتا ہوں۔''

ماحول پر اچانک سناٹا چھا گیا، یوں جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ اس کے بعد... میں نے اسے اس کی بہن سمیت اپنی اور اپنی دونوں ساتھیوں کی بھی رام کہانی سنا دی۔

ہیبت سنگھ بھلا مانس ثابت ہوا، اس نے سارے قیدیوں کو رہا کرنے کا حکم دے دیا اور ہمیں بھی چھوڑ دیا۔

بچے کھچے بردہ فروشوں کو قیدی بنا لیا، سردار ظالم سنگھ کو بھی بیدردی سے موت کے گھاٹ اُتار دیا۔

رہا ہونے والے قیدیوں کو زادِ راہ سمیت اُونٹنیاں اور اونٹ دے دیے گئے۔

اس کے بعد ہم دونوں اس منحوس جگہ سے دور ہوتے چلے گئے۔

☆☆☆

چند میل کا سفر طے کرنے کے بعد ہم نے آگے جا کر ایک تنگ و تاریک پہاڑی ٹیلے کے غار میں رات گزاری اور پھر صبح ہوتے ہی ہم دونوں نے آبادی کا رخ کیا، جو یہاں سے چند میل کی مسافت پر تھی۔

یہ مہاراجا رتنا سنگھ کی ریاست تھی جس کے ہاتھوں ظالم سنگھ نے دلیار کے مہاراجا کی بہو اور ہیبت سنگھ کی لاڈلی بہن پھولن بائی کو فروخت کیا تھا۔

آبادی پہنچے تو وہاں مقامی آدمیوں کو سخت بے چین اور افسردہ پایا۔ میں نے ظالم سنگھ کے ڈیرے سے کچھ بھارتی روپے اُڑا لیے تھے جو اچھی خاصی بڑی رقم تھی۔ اس رقم سے میں نے سرائے میں ایک کمرا لیا پھر بازار سے اپنے اور شکنتلا کے لیے کچھ ڈھنگ کے کپڑے خریدے۔ نہا دھو کر ہم نے وہ نئے کپڑے پہن لیے۔

اس دوران اریب قریب سے میں نے ذرا سن گن لی، تو مجھے معلوم ہوا کہ پھولن بائی کا بھائی ہیبت سنگھ راتوں رات مہاراجا رتنا سنگھ کی قلعہ نما حویلی میں حملہ کرنے کے بعد اسے اور اس کے بیٹے گرنام سنگھ کو زخمی کر کے اپنی بہن پھولن بائی کو چھڑا لے گیا تھا اور ساتھ ہی ایک زبردست جنگ کی دھمکی بھی دے گیا تھا۔ یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ ہیبت سنگھ

درحقیقت خود بھی ایک صحرائی لٹیرا تھا مگر غریبوں کو لوٹنے کے بجائے وہ بدخصلت راجوں اور مہاراجوں کی حویلیوں میں شب خون مارا کرتا تھا، جس کا پس منظر بھی کچھ اس طرح تھا کہ رتنا سنگھ کا اکلوتا بیٹا گرنام سنگھ پھولن بائی سے شادی کرنا چاہتا تھا مگر کسی وجہ سے یہ رشتہ طے نہ پاسکا اور یوں وجہِ تنازعہ بنا۔

یوں اب راجستھان کی اس چھوٹی سی ریاست میں بھی پریشان کن بے چینی پھیلی ہوئی تھی کہ یہاں اب کسی وقت بھی بڑی خوف ناک جنگ چھڑنے والی تھی۔

''ہمیں یہاں رخ ہی نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' شکنتلا نے مجھ سے متوحش لہجے میں کہا۔

''قریب ترین آبادی یہی تھی اور کہاں جاتے؟'' میں نے جواب دیا۔

''بہرحال کچھ بھی سہی، ہمیں اب بھی خطرہ ہے یہاں، ہمیں جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہیے۔''

''ہاں! میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔'' میں نے کہا پھر کچھ سوچنے کے بعد مزید کہا۔ ''ٹھہرو ذرا، سرائے کا مالک سنتوش کمار مجھے چلتا پرزہ نظر آتا ہے، میں اس سے کچھ معلومات لینے کی کوشش کرتا ہوں۔''

سرائے کے مالک سنتوش کمار کی عمر چالیس، پچاس کے لگ بھگ تھی۔ وہ شادی شدہ اور تین بچوں کا باپ تھا۔

ایک روز میں نے یومیہ کمرے کا کرایہ ادا کرنے کے ساتھ اسے کچھ زائد رقم بھی دی تو وہ خوش ہوگیا۔ تب میں نے اس سے پوچھا۔

''لالہ جی! (یہاں عموماً ہندوؤں کو اسی لقب سے پکارا جاتا تھا) ہم غلطی سے پاکستانی سرحد عبور کرنے کے بعد اِدھر آنکلے تھے۔ اب واپس لوٹنا چاہتے ہیں، مگر ہمارے پاس سفری کاغذات بھی نہیں ہیں اس صورت میں ہم نہ آگے جاسکتے ہیں اور نہ ہی پیچھے...... تم ہی ہماری کوئی مدد کرو؟''

میری بات پر اس نے آہستگی سے میرا ہاتھ پکڑا اور سیدھا اپنے کمرے میں لے آیا۔ یہ ایک مختصر سا چھوٹا مگر صاف ستھرا کمرا تھا۔ یہاں ایک چارپائی پر بستر بچھا ہوا تھا۔ ایک کرسی بھی تھی۔ میں نے کرسی سنبھال لی۔ وہ چارپائی پر ٹانگیں جھلائے بیٹھ گیا پھر قدرے نیچی آواز میں مجھ سے بولا۔

''تمہارے کام کی ایک صورت ہے تو سہی...... پر تم شاید مانو کہ نہیں......؟''

''دیکھو لالہ سنتوش! ہمیں ہر صورت یہاں سے نکلنا ہے، تم بتاؤ تو سہی۔'' میں نے اس کی ہمت بندھائی تو وہ بولا۔

''مگر اس میں تم کو مال خرچ کرنا پڑے گا۔ کتنا پیسہ ہے تمہارے پاس؟''

جیسا کہ مذکورہ ہوا میں نے ظالم سنگھ کے ٹھکانے سے نکلتے وقت مالِ غنیمت کے طور پر کچھ رقم اور وہ زیور وغیرہ احتیاطاً ساتھ رکھ لیا تھا جو شکنتلا کو ظالم سنگھ کی دلہن بناتے وقت پہنایا گیا تھا، اگرچہ اس پر شکنتلا نے مجھے گھور کر دیکھا بھی تھا کہ اس منحوس زیور کو رکھنے کی کیا ضرورت ہے؟ مگر میں نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہ دی تھی۔ کیونکہ ہر وقت طیش اور غصے سے کام نہیں لیا جاتا، مشکل حالات میں کچھ حکمت عملی بھی کی جاتی ہے۔ تاہم میں نے زیورات کے بارے میں تو اسے کچھ نہیں بتایا اور رقم بھی نصف بتاتے ہوئے کہا۔

''لالہ! تم تو جانتے ہی ہو کہ ہم تباہ حال مسافر ہیں، بھلا ہمارے پاس کیا ہوسکتا ہے؟ ہاں پندرہ سولہ ہزار کے قریب رقم ہے۔ اب بتاؤ بھلا کیا صورت ہوسکتی ہے ہمارے یہاں سے نکلنے کی؟''

''پانچ ہزار تو تمہیں مجھے ابھی دینے ہوں گے۔'' وہ فوراً حریصانہ لہجے میں بولا۔ ''رہے دس ہزار تو شاید ان سے کام بن جائے...... تو غور سے سنو میری بات......'' وہ اتنا کہہ کر ذرا تھما تو میں بے چینی سے اس کے مزید بولنے کا منتظر ہو رہا۔

''میرے ایک اسمگلر سے تعلقات ہیں۔ وہ سرحد پار چور راستوں سے اچھی طرح واقف ہے اور کئی لوگوں کو غیر قانونی طور پر بڑی کامیابی کے ساتھ بارڈر کراس کراتا رہا ہے بلکہ اس کا تو دھندا ہی یہی ہے۔ وہ آج رات تین بجے یہاں آئے گا۔ میں اس سے بات کرکے دیکھتا ہوں، تم جاگتے رہنا۔ وہ آیا تو میں تمہیں بلا لوں گا، بس! وہ اتنے پیسوں میں مان جائے سُسرا......!''

اس نے آخر میں بڑی چالاکی سے منہ بنایا۔ اس کا ارادہ مجھ سے مزید پیسے اینٹھنے کا تھا۔ تاہم میں اس کی بات پر خوش ہوگیا اور پھر اپنے کمرے میں آگیا۔ جب میں نے شکنتلا کو یہ بات بتائی تو وہ بجائے خوش ہونے کے بولی۔

''میں بھلا تمہارے ساتھ پاکستان کیوں جاؤں گی؟''

''یہ کوئی خاص ایشو نہیں......'' میں نے کہا۔ ''اصل مسئلہ یہاں سے نکلنے کا ہے۔''

''اوکے...... لیکن اگلی ملاقات میں میرے بارے

میں بھی بات کر لینا۔ میں سری لنکا جانا چاہوں گی۔'' میں نے اس کی بات پر اثبات میں سر ہلا دیا، لیکن میں نے دیکھا کہ وہ..... جیسے یکایک کہیں کھو سی گئی۔

''اب کیا ہوا......؟'' میں نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''حیرت ہی کی بات ہے، اتنا بڑا مسافر بردار طیارہ کریش ہوا اور کوئی امدادی ٹیم تک یہاں نہیں پہنچی؟ ان کی بھی ہمیں مدد مل جاتی تو یہ سارا کشٹ کرنا ہی نہ پڑتا، کیونکہ اس میں رسک بھی ہے۔ غیر قانونی سرحد کراس کرنا سنگین جرم ہے۔''

''اس بارے میں کیا کہہ سکتے ہیں، ہاں! البتہ ایسی کوئی بات ہوئی بھی تو ہم بتا سکتے ہیں کہ ہم اس بدنصیب جہاز کے مسافر تھے۔'' میں نے کہا۔

''رنگے ہاتھوں دھر لیے جانے کے بعد کون ہماری اس بات پر یقین کرے گا؟'' اس نے میری جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ میں زچ ہو کر بولا۔

''جو ہوگا دیکھا جائے گا، ابھی سے سر کھپانے کا کیا فائدہ۔''

وہ بھی زیادہ مغز ماری کے موڈ میں نہیں تھی خاموشی سے بستر پر جا کر سوگئی۔

رات کے ٹھیک دو بجے میرے کمرے میں دستک ہوئی۔ شکنتلا تو سو چکی تھی، میں بھی کچی پکی نیند میں تھا۔ اُٹھ کر دروازہ کھولا تو سامنے سرائے کا مالک سنتوش کھڑا تھا، وہ خوشی سے بولا۔

''تمہاری قسمت اچھی ہے۔ سمجھو تمہارا کام بن گیا۔''

''اچھا......! وہ کیسے؟ کیا وہ آدمی آگیا ہے؟ جس سے تمہیں بات کرنی تھی۔''

''ہاں! آگیا ہے۔ اب تم پیسے دینے کی بات کرو؟''

''ارے لالہ جی! میں بھاگا تو نہیں جا رہا، میری بھی ذرا اس آدمی سے بات تو کراؤ...... پتا تو چلے وہ کس طریقے سے ہمیں سرحد پار کرائے گا؟''

''اچھا...... اچھا...... آجاؤ میرے ساتھ۔'' وہ جھینپی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

میں نے دروازہ بند کیا اور سنتوش کے ساتھ چل پڑا۔ مجھے اندرونی گوشے کے ایک کمرے میں لے آیا۔ وہاں ایک گھٹے ہوئے جسم کا سیاہ بھجنگ شخص چارپائی پر پاؤں لٹکائے اور بیڑی مٹھی میں دبائے گہرے گہرے کش لگا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں چھچھوندر جیسی تھیں اور چہرہ بھی صحرائی لومڑی کی طرح لمبوترا اور مکارانہ تاثرات لیے ہوئے تھا۔

سنتوش نے میرا اس سے تعارف کرایا پھر اس کا نام بھی بتایا۔ آنند نام تھا اُس کا...... سنتوش اسے میرا مسئلہ بتا چکا تھا۔ یوں وہ مجھ سے بولا۔

''اس بار تو مشکل ہے، اگلے چکر میں لے جاؤں گا۔''

''کیوں......؟'' سنتوش نے چونک کر پوچھا۔ میں بھی پریشان سا ہو گیا۔

''اس بار میرے ہمراہ پورے نو آدمی ہیں، حالانکہ یہ میرے اُصول کے خلاف ہے کیونکہ میں صرف ایک وقت میں چار سے پانچ افراد کو ہی سرحد پار کرا سکتا ہوں مگر چونکہ دو اضافی افراد ایک ہی خاندان سے متعلق رکھتے ہیں اس لیے میں نے مجبوراً حامی بھر لی۔''

میں نے اس سے کہا۔ ''آنند صاحب! ہم بھی صرف دو ہی آدمی ہیں مگر سمجھو تو میں ایک ہی ہوں، کیونکہ میری ساتھی پاکستانی نہیں ہے، پاکستان صرف میں ہی جانا چاہتا ہوں، جبکہ میری ساتھی، سری لنکا جانا چاہتی ہے۔ یوں بھی ہم زیادہ دن یہاں نہیں رہ سکتے...... کیونکہ یہاں جنگ کے بادل منڈلا رہے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے اسے مہاراجا دلبیر سنگھ اور مہاراجا رتنا سنگھ کے خوف ناک تنازع کے بارے میں بتا دیا۔

میری بات سن کر وہ کسی سوچ میں پڑ گیا۔ سنتوش کمار نے میری حمایت بھی کی، تب آنند بولا۔

''ٹھیک ہے مگر مجھے اس کا بہت رسک لینا پڑے گا اور ایک چھکڑے کا بھی اضافی بندوبست کرنا ہوگا۔ اس کے لیے تمہیں بیس ہزار اضافی دینا ہوں گے اور تمہاری ساتھی کے لیے بھی...... ایک پارٹی کی یہی صورتِ حال ہے۔ لہٰذا ...... اس کے بھی بیس ہزار اضافی ہوں گے۔''

میں سوچ میں پڑ گیا۔ اتنے پیسے میرے پاس نہیں تھے، یہ ساری کل رقم ملا کر دو لاکھ کے قریب بنتی تھی اور اسی میں سنتوش کا بھی کمیشن شامل تھا۔ لاکھ تک کی گنجائش ہو رہی تھی۔ میں نے کچھ سوچ کر ہامی بھر لی۔

زیورات اب کام میں لانے از بس ضروری ہو گئے تھے۔ مجبوری بھی کیا کرتا۔

آنند نے مجھے گرین سگنل دے دیا۔ میں جلدی سے اُوپر کمرے میں آیا۔ شکنتلا کو جگا کر اسے خوش خبری سنائی۔ ہم دونوں رقم کا حساب کتاب کرنے بیٹھ گئے۔

میں نے یہ سب سنبھالا اور شکنتلا کو لیے کمرے سے نکل آیا۔

☆☆☆

اگلے نصف گھنٹے بعد ہم دونوں آنند کے ساتھ سرائے سے نکل کر باہر تاریکی میں آ گئے۔

یہاں ایک اُونٹنی بندھی ہوئی تھی اور اس کے کوہان میں ایک چھوٹا سا کجاوہ بنا ہوا تھا۔ اس نے مجھے اور شکنتلا کو اس چوبی ہودے (کجاوے) کے اندر سوار کرا دیا اور پھر خود کجاوے کے کنارے تک کر مہاریں سنبھالے بیٹھ گیا۔

ذرا دیر بعد اُونٹنی ایک ہلکی سی بلبلاہٹ کے ساتھ اُٹھ کھڑی ہوئی اور ایک طرف چل پڑی۔

☆☆☆

آبادی سے نکل کر جب اونٹنی تاریک صحرا میں داخل ہوئی تو ہودے (کجاوے) پر ٹکے ہوئے آنند نے ذرا جھک کر بہ آواز بلند ہم سے کہا۔

''اب ذرا مضبوطی سے بیٹھو، میں اُونٹنی دوڑانے لگا ہوں۔''

اس کی ہدایت پر شکنتلا اور میں نے کجاوے کی کھپچیوں کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اُونٹنی جیسے صحرا میں فراٹے بھرنے لگی۔ وہ خاصی دیر تک اسی طرح اپنے چوڑے چوڑے اور لمبے پیروں سے تیز رفتاری سے دوڑتی رہی۔

میرا خیال تھا کہ یہ ابتدائیہ سفر مختصر ہوگا، لیکن یہ پہلا سفر ہی طویل ثابت ہوا حتیٰ کہ رات اپنے آخری پہر سے بھی ذرا آگے سرک آئی اور ذرا دیر بعد جب اُونٹنی کی رفتار ذرا کم ہوئی تو دُور مشرق کی سمت سے پو پھٹنا شروع ہوگئی۔

آسمان پر تارے ابھی چمک رہے تھے۔ چاند بھی دور کہیں جھکا پھیکا پھیکا سا پڑنے لگا تھا۔ حد نگاہ تک صحرا ہی صحرا دکھائی دے رہا تھا، پھر چند میل مزید چلنے کے بعد ایک نخلستان نظر آنے لگا۔ تھوڑا نزدیک پہنچے تو وہاں ایک دو ٹائروں والا لمبا سا چھکڑا دکھائی دیا۔ دراصل وہ ''اُونٹ ریڑھا'' تھا۔ اس پر دو خیمے اِستادہ تھے۔ چند لوگ بھی نظر آئے۔ سورج کی روشنی اب پھیلنے لگی تھی، ابھی اس میں تمازت نہیں تھی۔ قریب پہنچ کر آنند نے اُونٹنی کی مہاریں کھینچ لیں، اس کے بعد اُونٹنی کو مخصوص آواز میں ''ھشکارے'' دیتے ہوئے اسے زمین پر بٹھا دیا۔ پھر خود بھی نیچے چھلانگ مار کر اُتر آیا۔ میں اور شکنتلا بھی کجاوے سے کود کر نیچے اُتر آئے۔ وہ پانچوں افراد ہماری طرف تکنے لگے۔

میرا خیال تھا کہ اب شکنتلا اور ہماری منزلیں دو الگ سمتوں کی جانب مقرر ہونے والی تھیں۔

وہ پانچوں افراد ہمیں دیکھ کر چہروں سے بیزار کن سا تاثر دینے لگے۔

''کیا ان دونوں کو بھی ہمارے ساتھ چلنا ہوگا؟''

ایک جوان شخص نے ہم دونوں پر ایک نظر ڈالنے کے بعد آنند سے سوال کیا۔ جواب میں آنند نے محض اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا تو ایک دوسرا آدمی جو درمیانی عمر اور ٹھگنے قد کا تھا، ناگواری سے مجھے اور شکنتلا کی طرف دیکھ کر آنند سے ذرا برہم ہو کر بولا۔

''تم نے ان کی...... وجہ سے ہمارا سارا وقت ضائع کر دیا۔ تم تو ہم ساتوں پر یہ اعتراض کر رہے تھے کہ یہ بھی زیادہ ہیں، اب پھر ان دونوں کو......''

''تم اپنی چونچ بند رکھو!'' آنند نے اس کی بات کاٹتے ہوئے اسے جھڑکا۔ ''میں نے تمہاری بک بک بہت سن لی ہے۔ میری مرضی پر چلنا ہے تو چلو، ورنہ اپنی راہ ناپو......'' آنند کو بھی غصہ آ گیا۔ یہ بہرحال ان کا اپنا آپس کا معاملہ تھا۔ میں چپ رہا۔ البتہ آنند کے اس رویّے کے جواب پر تیسرے شخص کو غصہ آ گیا اور خود پر قابو نہ پاسکا، اس نے قریب آ کر آنند کے گریبان میں ہاتھ ڈال دیا۔

''تم نے ہم سے روپے بھی زیادہ اینٹھ لیے اور ہمارا وقت بھی ضائع کیا۔ ہم انہیں اپنے خیموں کے اندر ہرگز نہیں بیٹھنے دیں گے۔'' آنند نے ایک جھٹکے سے اپنا گریبان چھڑایا اور طیش بھرے لہجے میں اسے گھورتے ہوئے بولا۔

''اگر تم لوگ میرے ساتھ بدمعاشی کرو گے تو میں ہرگز آگے نہیں بڑھوں گا۔'' اس دوران اول الذکر افراد ان کے درمیان بیچ بچاؤ کرانے کی غرض سے آگے بڑھے اور ان تینوں نوجوانوں کو سمجھانے کی کوشش کرنے لگے۔

ان کا شاید ان تینوں نوجوانوں سے کوئی تعلق نہ تھا اس لیے وہ تینوں بھی دونوں پر چڑھ دوڑے۔ نوبت جب ہاتھا پائی تک پہنچنے لگی تو میرا دخل دینا ضروری ہوگیا۔ مجھے وہ تینوں نوجوان غصیلی طبیعت اور اکھڑ مزاج انسان نظر آتے تھے اس لیے میں نے بھی ان سے نرمی کے بجائے سخت لہجے میں کہا۔

''تم لوگ اسی طرح لڑو گے تو کسی کا مقصد بھی پورا نہ ہوگا۔ مت بھولو کہ ہم غیر قانونی طور پر سرحد پار کر رہے ہیں۔ یہ تو آنند کی مہربانی ہے کہ اس نے سرحد پار ہمیں پہنچانے کا بیڑا اٹھایا ہے۔'' میرے سمجھانے پر ایک غصہ ور نوجوان مجھ پر چڑھ دوڑا اور بدتمیزی سے بولا۔

''تم اپنی چونچ بند رکھو! یہ ہمیں مفت میں نہیں سرحد پار کروا رہا ہے۔ پیسے لیے ہیں ہم سے...... پورے ڈیڑھ

لاکھ......"

"میں تمہیں اس سے دُگنے پیسے دیتا ہوں، تم ہمیں سرحد پار کرادو۔" میں نے طنزیہ لہجے میں اس سے کہا۔ وہ لاجواب ہوکر بغلیں جھانکنے لگا تو اس کے دوسرے ساتھی مجھ پر چڑھ دوڑے۔

"ہم تمہیں اپنے ساتھ نہیں لے کر جائیں گے۔" یہ کہہ کر اس نے میرے سینے پر ہاتھ مار کر مجھے دھکا دینے کی کوشش چاہی تھی کہ میں نے بھی غصے سے دانت بھینچ کر اس کا گریبان کی جانب بڑھا ہوا ہاتھ پکڑ کر مروڑ ڈالا۔ اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ اس کے دونوں ساتھی غصے سے دانت کچکچاتے ہوئے جارحانہ انداز میں میری جانب بڑھے تو میں نے ایک کے سینے پر لات رسید کی اور دوسرے کے جبڑے پر مُکا مارا۔ میری دیکھا دیکھی میرے حمایتی دو افراد بھی ان تینوں کو سبق سکھانے کے لیے اُن پر پل پڑے۔

ہم تینوں نے ان کی خوب کٹائی لگا دی۔ ریڑھے پر بنے خیموں سے دو تین عورتیں اُتر کر ہمارے قریب آگئیں اور لگیں ہماری منتیں سماجتیں کرنے۔ آنند ایک جانب کھڑا بڑے انہماک سے یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد معاملہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ تینوں شرپسندوں کی بھی عقل ٹھکانے آگئی کہ ہم سب اب ایک ہی کشتی کے سوار تھے۔

ہم روانہ ہوگئے۔ شکنتلا نے آنند سے سوال کیا تھا کہ اس کی منزل کتنی دور ہے؟ اس نے جواب میں کہا کہ آگے ایک اور چھکڑا ملے گا۔ اسے اس میں سوار کرا دیا جائے گا۔

مقررہ مقام پر پہنچے تو وہ چھکڑا تیار کھڑا تھا۔ اس میں بھی ایک خیمہ ایستادہ تھا۔ اندر دو میاں بیوی اور ایک بچہ سوار تھے۔ شکنتلا یہاں مجھ سے الگ ہوگئی۔ میں نے بھی اسے خیر و عافیت کی دعاؤں کے ساتھ رخصت کر دیا۔

ہمارا سفر پھر شروع ہوگیا۔ میں اب تنہا تھا۔ مالا کے عبرت ناک انجام پر مجھے اب بھی افسوس تھا۔ اس بے چاری کی تقدیر میں ہی یہ سب لکھا تھا تو کیا کیا جاسکتا تھا۔

جب سورج سوا نیزے پر پہنچ کر آگ برسانے لگا تو دھوپ کی شدت سے ہمارا بُرا حال ہونے لگا۔ آنند چھکڑے کی کوچبان والی جگہ پر اُونٹنی کی مہاریں تھامے بیٹھا تھا۔

تھوڑا بہت زادِ راہ تھا جو استعمال ہو رہا تھا۔ آنند کے کہنے کے مطابق ہمیں راجستھان کی ایک سرحدی ریاست "گدرا" کے راستے پاکستانی سرحد تھر میں داخل ہونا تھا، کیونکہ اس کے خیال کے مطابق یہی راستہ اس وقت زیادہ محفوظ تھا اس لیے کہ وہاں بنجاروں کی ایک بستی واقع تھی اور یہاں سے سیکیورٹی فورسز والوں کی چیک پوسٹ بھی خاصی دور تھی لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہ تھا کہ چیکنگ کا خطرہ بالکل ہی نہیں تھا۔ بہ قول آنند کے بی ایس ایف کے اہل کار "کیکڑا" گاڑیوں میں گشت کرتے رہتے تھے۔

دھوپ خیموں کے اندر تو نہیں آرہی تھی مگر اس کی تپش محسوس ہو رہی تھی۔ گرمی سے ہمارا بُرا حال ہونے لگا تھا۔ آرام سے بیٹھے ہوئے تو تھے مگر پسینے سے بُری طرح شرابور ہو رہے تھے۔

اچانک خیمے سے باہر کسی کے زور زور سے بولنے کی آواز ابھری۔ میرے خیمے میں موجود دونوں ادھیڑ عمر افراد میں سے ایک صورتِ حال جاننے کے لیے خیمے سے باہر نکل گیا۔ مجھے اندازہ تو ہوا کہ آنند کے ساتھ دوبارہ وہ تینوں اکھڑ مزاج افراد اُلجھ نہ پڑے ہوں۔ ریڑھا بدستور دھیمی رفتار سے آگے بڑھ رہا تھا۔

میرا خیال درست ثابت ہوا۔ حالات کا جائزہ لینے والا شخص دوبارہ اندر داخل ہوا۔ باہر اب باتوں کی تیز آوازیں آنا بند ہو چکی تھیں۔ میں نے پوچھا۔

"کیا معاملہ تھا؟"

وہ تینوں خبیث ایک بار پھر آنند سے اُلجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"وہ کیوں؟" میں نے سوالیہ نظروں سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ "اب انہیں کیا مسئلہ پیش آگیا؟"

"وہ تینوں آنند پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ ہم ادھر کہیں نخلستان میں ٹھہر جائیں اور شام ہوتے ہی نکلیں۔" وہ بتانے لگا۔ میں بھویں سکیڑ کر اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ آگے بتا رہا تھا۔

"لیکن...... آنند انکاری تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہاں انڈین سیکیورٹی فورسز کے گشتی کیکڑا ٹرک سے مڈبھیڑ ہونے کا خطرہ ہے۔ اس کی بات درست تھی۔ بہرحال، شکر ہے کہ میں نے معاملہ رفع دفع کرا دیا۔

"وہ تینوں عجیب پاگل اور بد دماغ لوگ ہیں۔" مجھ سے نہ رہا گیا۔

"بے وقوف ہیں۔ کیا اتنی سی بات بھی ان کی سمجھ نہیں آرہی ہے کہ...... ہم سب اس وقت آنند کے رحم و کرم پر ہیں اور اسے اپنے کام کا زیادہ تجربہ ہے۔ ہمیں سرحد پار پہنچانا اسی کی ذمے داری ہے، وہی بہتر جانتا ہے کہ ہمیں کس وقت اپنا سفر جاری رکھنا چاہیے اور کب ٹھہرنا درست ہے۔"

''یقیناً۔'' میں نے اس کی تائید میں کہا۔ ''بلکہ مجھے تو ڈر ہے کہیں ان تین خبیثوں کی وجہ سے ہم سب کسی مصیبت کا نہ شکار ہو جائیں۔''

''ایسا ہو سکتا ہے، لگتا ہے انہیں ایک بار پھر سبق سکھانا پڑے گا۔'' پہلے والے نے غصے سے دانت پیستے ہوئے کہا۔

''ابھی رہنے دو۔'' میں نے معاملہ فہمی سے کہا۔ وہ خاموش ہو رہا۔

سورج ذرا جھکنے لگا اور بادِ سموم اب رفتہ رفتہ خنکی میں بدلنے لگی تو اچانک چھکڑا رک گیا۔ ہم لوگ خیموں سے نکل کر نیچے اُتر آئے۔

میں یہی سمجھا تھا کہ ہم کسی قریب آبادی تک پہنچ چکے ہیں، مگر یہاں تو مجھے ہر طرف وہی بیزار کن اور یکساں فضا اور ماحول والا لق و دق صحرا پھیلا ہوا نظر آیا۔

''اب کیا ہوا؟ رُک کیوں گئے؟'' ان تینوں اکھڑ مزاج آدمیوں میں سے ایک نے آنند سے تلخ لہجے میں سوال کیا تو وہ ناگواری سے بولا۔

''ہم گدرا کی ریاست میں پہنچ چکے ہیں۔ یہاں سے چند میل کے فاصلے پر پاکستانی سرحد کی حدود شروع ہو جائے گی۔''

''تو پھر چلتے رہتے...... رک کیوں گئے؟'' دوسرے نے کڑی نظروں سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ''اور...... ہمیں تو یہاں دور نزدیک کسی بھی آبادی کے آثار نظر نہیں آرہے ہیں؟''

''میں نے جان بوجھ کر آبادی سے دور کا راستہ اختیار کیا ہے۔ اب ذرا رات ہو لینے دو، تب ہی آگے بڑھا جا سکتا ہے۔''

''جب ہم قریب پہنچ ہی گئے ہیں تو رکنے کا کیا سوال؟ ہمیں سفر جاری رکھنا چاہیے، ہم رکیں گے نہیں......'' تیسرے نوجوان نے کہا تو آنند کے غصے کا اُبال عروج پر پہنچ گیا اور وہ اسی گرج دار لہجے میں بولا۔

''اگر تم لوگ اسی طرح میرے کام میں ٹانگ اڑاتے رہے تو میں تم سب کو یہیں چھوڑ کر چلا جاؤں گا...... سمجھے تم......!'' اس کی دھمکی پر وہ تینوں نوجوان غصے سے دانت پیس کر اس پر جھپٹے اور بلند آواز میں بولے۔

''تم نے ہم سے پیسے لیے ہیں۔ ہمیں کس طرح چھوڑ کر جا سکتے ہو اب؟ ہماری منزل قریب ہے، آگے بڑھو...... ورنہ اچھا نہ ہوگا۔''

خاصی بحث و تکرار کے بعد بالآخر سفر پھر شروع ہو گیا۔ منزل کے قریب ہونے کی وجہ سے ہم بھی کچھ نہیں بولے تھے کہ کہیں اس لڑائی جھگڑے میں اُلٹا کوئی مصیبت ہی نہ کھڑی ہو جائے مگر بہرحال آنند ابھی آگے بڑھنے کے حق میں نہ تھا اور شاید وہی اپنا کام بہتر اور محفوظ طریقے سے کرنا جانتا تھا مگر ان جھگڑالو افراد کی وجہ سے اسے مجبوراً سفر جاری رکھنا پڑا۔

لہٰذا سفر پھر شروع ہوا۔ شام اب جھکنے لگی۔ ہم خیموں کے اندر تھے۔ اُونٹنی مقدور بھر رفتار کے ساتھ ریڑھے کو ریت پر کھینچے دوڑی جا رہی تھی کہ اچانک ریڑھے کی رفتار کم ہونے لگی اور پھر وہ رک گیا۔ ہم چونک پڑے۔ خیمے سے باہر نکلے تو کیا دیکھتے ہیں کہ آنند...... ریڑھے سے اُتر کر ایک طرف ریت میں بے تحاشا دوڑا چلا جا رہا تھا۔ اس کا رخ ذرا فاصلے سے نظر آنے والے وہ خشک ٹیلے تھے، جن کی بھول بھلیوں میں شاید وہ گم ہو جانا چاہتا تھا۔

ہمیں اس کے یوں اچانک چھکڑا چھوڑ کر بھاگنے پر حیرت ہوئی مگر پھر دوسرے ہی لمحے ایک مسافر نے چیخ کر ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''وہ دیکھو......'' میں نے چونک کر اس کے اشارے کی سمت دیکھا تو میرے اوسان خطا ہو گئے۔ سینے میں دل جیسے رُک رُک کر دھڑکنے لگا۔

وہ تین چار کے قریب فوجی جیپیں تھیں۔ موٹے اور چوڑے ٹائروں والی، جن کے طاقت ور انجن کی مخصوص گڑگڑاہٹ دور سے ہی آتی سنائی دے رہی تھی۔

وہی ہوا جس کا ڈر تھا، بالآخر ان تینوں ہٹ دھرم افراد کی جلد بازی اور غصیلی طبیعت نے ہم سب کو مصیبت میں ڈال دیا تھا اور آنند خطرہ بھانپتے ہی ہمیں چھکڑے سمیت بے یار و مددگار چھوڑ کر بھاگ اُٹھا تھا۔

اچانک...... ان تینوں اکھڑ مزاج نوجوانوں میں سے ایک نے اُونٹنی کی مہاریں تھام لیں اور چھکڑے کو دوڑانا شروع کر دیا۔ اس کا رخ بھی انہی مذکورہ خشک اور بنجر ٹیلوں کی طرف تھا۔

وہ چاروں فوجی گاڑیاں اپنا مخصوص مونوگرام اور لہراتے پھریروں سے انڈین بارڈر سیکیورٹی فورسز کی ہی نظر آتی تھیں۔ انہوں نے سب سے پہلے تو ایک طرف دیوانہ وار دوڑتے ہوئے آنند کو اپنی دور مار آٹومیٹک رائفلوں کی گولیوں سے بھون کر رکھ دیا۔ پھر ہم پر بھی گولیاں برسانا شروع کر دیں۔

میں نے چلا کر اس نوجوان سے کہا۔
”چھکڑا روک دو...... ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے...... آنند کی طرح مفت میں مارے جائیں گے۔“
اس پر نوجوان کے دوسرے ساتھی نے مجھ سے غصیلے لہجے میں کہا۔ ”تم چپ کر کے بیٹھے رہو، یہ لوگ ہمیں ویسے بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“ اس پر اس کے تیسرے ساتھی نے دانت پیس کر اپنے ساتھی سے کہا۔
”یہ سب لوگ ہم پر بوجھ ہیں۔ ان کو چھکڑے سے دھکا دے دو۔ اس طرح چھکڑے کا وزن بھی کم ہو جائے گا اور یہ مزید تیز دوڑنا شروع کر دے گا۔“
اس نابکار کی بات پر میرے دو ساتھی مسافر جو ذرا ادھیڑ عمر کے تھے، خوف زدہ نظر آنے لگے۔ میں خود اس خبیث کی بات پر لرز اٹھا۔
وہ دونوں سب سے پہلے ادھیڑ عمر مردوں کو پکڑ کر ریڑھے سے نیچے دھکیلنے کی کوشش کرنے لگے، ان بے چاروں کی عورتیں چیخنے اور داد فریاد کرنے لگیں۔ میں ان کی مدد کو لپکا مگر میرے پہنچنے سے تک وہ دونوں بدبخت انہیں ریڑھے سے نیچے گرا چکے تھے، یہی حال ان کی عورتوں کا کرنے کے بعد میری جانب بڑھے۔
اس دوران ہم پر دور سے ہی انڈین بی ایس ایف کے سنگ دل اہلکاروں نے مسلسل فائرنگ جاری رکھی تھی۔ ریڑھا ٹیلوں کی بھل بھلیوں میں داخل ہو چکا تھا اور یہاں جا بجا گھاٹیں نظر آنے لگیں۔
چھکڑے کی تیز رفتاری اور زبردست ہچکولوں کی وجہ سے مجھے بھی توازن برقرار رکھنے میں دشواری پیش آ رہی تھی۔ وہ دونوں بے رحم مجھ پر پہلے ہی اُدھار کھائے بیٹھے تھے۔ میں بھی ان ظالموں کے انسانیت سوز ظلم پر کڑھ رہا تھا۔ پھر جیسے ہی وہ دونوں میرے قریب آئے، میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، ایک کے چہرے پر گھونسا رسید کر دیا۔ بھاگتے ریڑھے کے چوبی تختے پر قدم ڈگمگانے کی وجہ سے میرا گھونسا اس کے بجائے اس کے دوسرے ساتھی کے چہرے پر پڑا۔ بات وہی تھی مگر یہاں معاملہ تھوڑا خراب ہو گیا۔ پہلے والے کو مجھ پر حملہ کرنے کا موقع مل گیا اور اس نے مجھے دھکا دے دیا۔ میں ریڑھے سے نیچے جا گرا اور ریت پر نجانے کہاں تک لڑھکتا... چلا گیا، تب ہی میرا سر کسی ٹھوس شے سے ٹکرایا اور میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔

☆☆☆

ہوش آیا تو میرے اردگرد ملگجی سی سرد تاریکی کے سوا کچھ نہ تھا۔ سر میں شدید درد ہو رہا تھا اور جسم ٹوٹا ٹوٹا سا تھا۔ میں گول مول سا ایک کھڈ میں پڑا تھا۔ میرے اُوپر...... تاروں بھرا آسمان تھا۔ ہرسُو چٹکی ہوئی چاندنی بھی پھیلی ہوئی تھی۔ میرے منہ اور نتھنوں میں ریت بھری ہوئی تھی، ہوش میں آتے ہی میں نے دو تین چھینکیں ماریں تو دماغ کچھ کھلا اور سوچنے سمجھنے کے لائق ہوا۔
عقدہ کھلا کہ...... میرے پہلے والے گھونسے کا وار خالی جانا میرے لیے تقدیر کی مصلحت تھی۔ کیونکہ میرے مدِمقابل نے مجھے بے رحمی سے دھکا دے کر مجھ پر احسانِ عظیم کیا تھا۔ گرتے ہی میں کسی کھڈ میں جا گرا تھا، جہاں جھاڑیاں اور سبزہ اگا ہوا تھا۔ جس کے سبب میں شاید انڈین بی ایس ایف والوں کی...... بے رحمانہ فائرنگ سے بھی بچ گیا تھا۔
اگرچہ ہنوز مجھے اس بات کا اندازہ نہ ہو سکا کہ میں خطرے سے کس قدر بچا ہوا ہوں؟ تاہم بے ہوش ہونے سے پہلے اتنا یاد تھا کہ اس وقت شام کے سائے گہرے ہونے لگے تھے اور اب مکمل تاریکی تھی۔ خوش کن احساس تو ہوا کہ میں انڈین فوجیوں کے نرغے میں آنے سے بچ گیا ہوں، ورنہ اب تک یا تو عالمِ بالا میں میری آنکھ کھلتی یا پھر انڈین بی ایس ایف والوں کے عقوبت خانے میں......
میں مزید تھوڑی دیر اسی طرح اپنی قدرتی محفوظ پناہ گاہ میں گول مول سا پڑا رہا۔ پھر اُٹھا اور ذرا سا سر باہر نکالا......
چہار سُو پھیلی چاندنی میں غبار آلود سی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ یہاں سے وہاں تک ایک ہیبت ناک سی ویرانی تھی۔
سکوت بھرا ماحول خوف زدہ کر رہا تھا۔ اردگرد پھیلے خشک ٹیلے پُراسرار ہیولوں کے مانند نظر آ رہے تھے۔ معاً ایک ہلکی سی ”چوں...... چوں...... چک...... چوں...... چک......“ کی عجیب سی آواز سناٹے میں ابھری۔
یہ عجیب آواز کبھی تھم جاتی اور کبھی یکساں ردھم کے ساتھ دوبارہ سنائی دینے لگتی۔ رفتہ رفتہ ذہن کی بیداری کے ساتھ ہی مجھے یاد آتا چلا گیا کہ میرے ساتھ کیا ہوا تھا۔
میں کھڈے سے باہر نکل آیا۔ انڈین بی ایس ایف والوں کے چنگل میں آتے ہوئے شاید میں بچ گیا تھا۔ اس پر میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر بھی ادا کیا۔ اگر ان بے رحموں کے ہتھے چڑھ جاتا تو کب زندہ رہتا؟
ایک ذرا ذرا وقفے سے آتی ہوئی وہ پُراسرار سی آواز

ملک بھر میں جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ملنے میں اگر دشواری ہے تو مندرجہ ذیل نمبرز پر ہمارے نمائندوں سے رابطہ کیجیے۔

شہر	نمبر	شہر	نمبر	شہر	نمبر
کراچی	03002680248	گجرات	03016215229	منڈی بہاؤالدین	03460827027
لاہور	03004009578	وزیر آباد	03456892591	سیالکوٹ	0524568440
ملتان	03006301461	لالہ موسیٰ	03216203640	میر پور AK	03460397119
حیدر آباد	03213060477	خان پور	03337472654	اٹک سٹی	057210003
سرگودھا	03447475344	کوہاٹ	03325465062	دیپالپور	03004059957
پشاور	03005930230	ساہیوال	03446804050	لیہ	03002373988
کوئٹہ	03337805247	پاک پتن	0300694678	قصبہ ڈنگہ	03083360600
فیصل آباد	03006698022	مظفر آباد	03469616224	عارف والا	03008758799
راولپنڈی	03335205014	بورے والہ	03347193958	لورالائی	03023844266
نواب شاہ	03003223414	وہاڑی	03136844650	کوٹلہ ارب علی خان	03016299433
سکھر	03009313528	تونسہ شریف	03346712400	جلالپور پیروالا	03338303131
رحیم یار خان	03009672096	ڈیرہ غازی خان	03336481953	ہری پور	03321905703
بہاولپور	0622730455	بہاولنگر	03336320766	چکوال	03348761952
گوجرانوالہ	03316667828	بنوں شہر	03329776400	وہوا	03346383400
جہلم	03235777931	رائے ونڈ	03004719056	حافظ آباد	03006885976
سیالکوٹ	03008711949	ہڑپہ	03317400678	کوہاٹ	03325465062
جھنگ	0477626420	ڈیرہ اسماعیل خان	03349738040	ایبٹ آباد	0992335847
بھکر	03337979701	چشتیاں	03348761952	چونکی	03454678832
منڈی بہاؤالدین	0331-7619788	منچن آباد	0301-7681279	مانسہرہ	0333-5021421
ڈسکہ	0300-9463975	سمبڑیال	0333-8604306	کوٹ رادھا کشن	03004992290
حجرہ شاہ مقیم	03006969881	ٹوبہ ٹیک سنگھ	0315-6565459	قصور	0300-6575020

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی فون: 35895313
E-mail:jdpgroup@hotmail.com

دوبارہ آئی تو میں اس طرف بڑھا۔ چند قدموں کے فاصلے پر ہی مجھے چاند اور تاروں بھری روشنی میں ایک دردناک منظر دکھائی دیا۔

وہ اُونٹ ریڑھا اُلٹا پڑا تھا، جس پر میں یہاں تک پہنچا تھا۔ ہوا کے دوش پر اس کے ٹائر گھوم رہے تھے اور یہ آواز اسی سے آرہی تھی۔ اس کے اردگرد...... گولیوں سے چھلنی لاشیں پڑی تھیں۔ یہ انہی بدنصیب مسافروں کی لاشیں تھیں جو میری طرح بجھوڑے تھے، اور ان میں ان تینوں ہٹ دھرم نوجوانوں کی لاشیں بھی شامل تھیں۔ ان سب کو یقیناً انڈین بی ایس ایف والوں نے بڑی بے رحمی سے درندگی کا نشانہ بناڈالا تھا۔ اس جہنم زار منظر کو دیکھ کر میں ایک لمحے کے لیے سرتاپا کانپ گیا اور اللہ کا ایک بار پھر شکر ادا کیا کہ اس قادرِ مطلق نے مجھے...... کیسے ایک ذرا سی مصلحت ڈال کر ان انڈین درندوں کے ہاتھوں بے رحمانہ موت سے بچالیا تھا۔

اُونٹنی شاید مہاروں سے آزاد ہوکر کہیں جا چکی تھی۔ صحرا میں سردی کا احساس بھی بڑھنے لگا تھا۔ کچھ سوچ کر اُلٹے پڑے اس بدنصیب ریڑھے کے قریب آگیا تو دیکھا خیمے بھی ٹوٹ کر ریت پر بکھرے پڑے تھے۔ میں نے ضرورت کے مطابق گرم لحاف اور کچھ بچی کھچی کھانے کی اشیا سمیٹی اور دوبارہ کھڈ کی جانب آگیا۔

میں نے کچھ کھایا پیا اور...... پھر ایک موٹی سی چادر اپنے اوپر ڈال کر پاؤں سکیڑے بیٹھ رہا۔

ہوا سرسرا رہی تھی۔ صحرا پر موت جیسی خاموشی اور ویرانی کا راج بدستور طاری تھا۔ میں اسی طرح دھڑکتے دل اور سردی سے کپکپاتے وجود کے ساتھ سکڑا سمٹا بیٹھا رہا۔

میں محسوس کررہا تھا کہ ان غیر یقینی حالات اور ایک مخصوص ماحول کی ہیبت ناکی رفتہ رفتہ میرے دل و دماغ پر چھارہی ہے اور میرے اعصاب شل ہوتے جارہے ہیں۔

تقدیر بھی کبھی نہ مجھے بعض ایسے حالات سے دوچار ضرور کردیا کرتی تھی، جن کا میں عادی بھی نہ ہوتا، عادی تو میں خیر اب تک کے گزرے ہوئے حالات کا بھی...... نہ تھا، لیکن وہ...... مخصوص حالات... ایک تواتر کے ساتھ پیش آتے رہے تھے، پھر ان میں رومی اور طارق جیسے جاں نثار ساتھیوں کی بھی ہمراہی اور سنگت نصیب تھی، اسی لیے معاملہ ''چل'' گیا تھا، مگر اب...... میں جن حالات کے بھنور میں پھنس گیا تھا، وہ یکسر ہی غیر یقینی اور حد سے زیادہ خطرناک تھے۔ بے سروسامانی اور بے یارومددگار کے یہ لمحات...... اچھے بھلے آدمی کو بھی شل کردینے کے لیے کافی تھے۔

دیکھا جاتا تو میں بھی ایک عام سا ہی آدمی تھا۔ بے شک کچھ یاروں کی سنگت نے مجھے کسی حد تک ''یوزٹو'' کردیا تھا مگر...... اب میں دشمن سرزمین کے ایک خطرناک علاقے میں تھا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی گولیوں کا نشانہ بناسکتے تھے۔ پھر مجھے راستوں کا بھی کب تعین تھا؟ کہاں جاتا کس رخ پاؤں جماتا؟ مجھے بھلا کس کی رہنمائی حاصل تھی کہ میں اپنے وطن کی سرحد کا رخ کرتا یا پھر واپس دشمن ملک کی جانب جامڑتا، کچھ اندازہ نہ تھا مجھے۔ اس خوف ناک سے ماحول میں تنہائی کا احساس ہی مارے ڈال رہا تھا۔

یہی سبب تھا کہ میرا دل و دماغ ایک ڈر...... ایک جانے انجانے خوف اور ہراس کا شکار ہونے لگا۔ میں نے دل ہی دل میں آیاتِ کریمہ کا ورد... شروع کردیا جس سے ذرا ہی دیر بعد دل و دماغ کو سکون پہنچا اور یہ سوچ کر حوصلہ بھی ہوا کہ اللہ نے مجھے یہاں تک بچایا ہے تو وہی میری آئندہ بھی خیر ہی رکھے گا۔

میں اسی طرح موٹی گرم چادر اوڑھے نہ جانے کب سوگیا۔

☆☆☆

صبح تڑکے میری آنکھ کھلی۔ دور صحرا کے مشرقی اُفق سے سپیدۂ سحر پھوٹنے لگی تھی۔ دن کا اُجالا...... خاصا خوش گوار محسوس ہورہا تھا۔ میں ایک قریبی ٹیلے پر چڑھ کر چاروں طرف نظریں دوڑانے لگا تو ایک سمت سے مجھے آسمان پر پرندوں کی ڈاریں اُڑتی دکھائی دیں۔ یکایک میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔

اس ویران اور لق و دق صحرا میں ان پرندوں کی آزاد منش ڈاروں کا مطلب تھا کہ اس سمت ذرا دور یقیناً کوئی جھیل یا گھنا جنگل تھا یا پھر کوئی آبادی۔ بہرحال کچھ بھی تھا ایک خوش اُمیدی دل و دماغ میں گھر کرنے لگی تو کچھ اجنبی ماحول اور بے سروسامانی کا احساس جاتا رہا۔

صحرا کی مثال بھی ایک سمندر جیسی ہی ہوتی ہے۔ قطبی تاروں کی مدد سے جہاز راں منزلوں کا تعین کرتے ہیں اور قطبی تارے ساری رات سے لے کر سحر ہونے تک نظر آتے ہیں۔ میں نے ان پرندوں کی ڈاریں دیکھ کر اللہ کا نام لیے آگے بڑھنا شروع کردیا۔ حالانکہ میں جانتا تھا کہ یہ سارا علاقہ بھارت کی حدود میں ہی آتا تھا، جہاں اَن گنت راجوں مہاراجوں کی آزاد ریاستیں پھیلی ہوئی تھیں۔

حالات کے تھپیڑے مجھے کہاں سے کہاں لے جاتے

کچھ پتا نہ تھا۔ کہاں تو میرا ویزا نہیں لگ پارہا تھا اور میں واپس پاکستان عازم سفر ہورہا تھا کہ تقدیر نے مجھے ادھر ہی لا پھینکا۔ مایوسیوں کے اندھیاروں میں ایک اُمید افزا خیال یہ بھی آیا کہ کیا خبر تقدیر کا یہ بھی ایک بہانہ ہو کہ میں ویسے نہیں تو ایسے ہی سہی، ان خونی سوداگروں کی بیخ کنی کے لیے......

ان کے دیس میں قدم رکھ ہی چکا تھا تو پھر واپسی کی راہ کیوں اختیار کی جائے؟ کیوں نہ تقدیر کا شکر یہ ادا کر کے آگے ہی بڑھتے رہنا چاہیے؟ بس اب ایک اُمید کا سہارا تھا میرے پاس...... ایک یاس کا یارا...... کہ یہ ایک ایسی نادیدہ ڈور ہوتی ہے جو کبھی نہیں ٹوٹتی...... اُمید کی طرح دل و دماغ کے ساتھ بندھی رہتی ہے۔ شرط یہ ہے کہ مایوس نہ ہوا جائے ورنہ یہ ٹوٹنے میں بھی دیر نہیں کرتی۔ جو اسے تھامے رکھتے ہیں وہی کامیاب بھی ہوتے ہیں۔ میں نے اس غیر مرئی ڈور کو تھامے رکھا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ دور شمال مغرب کی سمت سے پرندوں کی ڈاریں اُڑتے دیکھ کر میرے دل میں آس کا دیا مزید روشن ہو گیا تھا کہ اس سمت ضرور کسی آبادی کے آثار مل سکتے تھے، جہاں سے میں آگے بڑھنے کی رہنمائی یا مدد حاصل کر سکتا تھا اور کچھ نہیں تو محفوظ پناہ گاہ ہی مل جاتی۔

اُونٹنی نجانے کہاں بھاگ گئی تھی ورنہ میں اس پر ہی سواری کر لیتا۔

یوں ریت کے سمندر میں میرا اب پیدل اور تنہا سفر جاری رہا۔ اندازاً کوئی لگ بھگ گھنٹے بھر بعد کبھی چلتے کبھی رکتے رہنے کے بعد مجھے سامنے ایک سیاہ پٹی سی دکھائی دینے لگی۔ جس کا مطلب تھا کہ میں بالکل صحیح سمت پر تھا۔

میری خوشی کا عالم بالکل اسی تباہ حال مسافر کا سا تھا جس کا جہاز سمندر میں غرقابی کا شکار ہو چکا ہو اور وہ کسی تختے پر اپنی زندگی کی گاڑی کھینچ رہا ہو، پھر جزیرے کے آثار دیکھتے ہی خوشی سے چلاّ اُٹھے۔ میں چلایا تو نہیں تھا البتہ میری کیفیات کچھ اسی قسم کی تھیں۔

سیاہ پٹی سے میرا فاصلہ گھٹتا جارہا تھا۔ اُمید کے سہارے...... میرے تھکے ماندے وجود میں ایک نئی طاقت بھر گئی تھی۔ پھر کچھ ہی دیر بعد مجھے اونچے اونچے پیڑ بھی نظر آنے لگے تھے۔ یہ ایک خاصے وسیع رقبے پر پھیلا ہوا جنگل سا تھا۔ دیکھنے میں نزدیک ہی نظر آتا تھا۔ مگر وہاں تک پہنچنے میں بھی مجھے مزید گھنٹا بھر لگ ہی گیا۔

گرتا پڑتا اور ہانپتا کانپتا اس کے مہربان دامن میں پہنچ کر گر گیا بلکہ...... تھک کر اس قدر چُور ہو گیا کہ...... نیم غنودگی چھا گئی اور میں نڈھال سا وہیں زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

جانے کتنی دیر بعد میری حالت سنبھلی تو مجھے ہوش آیا۔ یہ ایک خاصے وسیع رقبے پر پھیلا ہوا جنگل دکھائی دیتا تھا۔ جنگل اس وقت مختلف النوع اور خوش الحان پرندوں کی بھانت بھانت کی آوازوں سے گونج رہا تھا۔ ایک خوش گوار سا احساس دل و دماغ کو ہی نہیں بلکہ تھکے ماندے وجود کو بھی تقویت بخش رہا تھا۔

سامنے ہی نہر بہتی نظر آئی۔ اس کا پانی صاف تھا۔ پھر بھی میں نے تھوڑا سا پانی پیا، پھر میں نے...... ریت سے اٹے پڑے کپڑوں سمیت ہی اندر ڈبکی لگا دی۔ اس کے بعد نرم نرم گھاس پر بیٹھ گیا۔

کچھ پھل توڑ کر کھائے تھے، یہ بڑے رسیلے پھل تھے۔ میں پھر اِدھر اُدھر کا جائزہ لینے لگا۔ مجھے دو تین بے ترتیب سے پگڈنڈی نما بل کھاتے کچے راستے جنگل کے اندر بھی دور کہیں جاتے نظر آئے۔ ذرا مزید ستانے کے بعد میں نے پھر درختوں سے میٹھے رسیلے پھل توڑ کر کھائے اور ایک راستے کا انتخاب کر کے آگے بڑھ گیا۔

بہ ظاہر میری کوئی منزل نہ تھی لیکن بہر حال آگ برساتے جہنم زار صحرا سے نجات مل گئی تھی۔

جنگل میری توقع کے عین مطابق وسیع تر ہوتا جارہا تھا اور دل و دماغ ایک بار پھر گھبراہٹ اور انجانے خوف کی زد میں آنے لگا کہ مجھے اگر ادھر ہی رات ہو جاتی تو میں کیا کرتا؟ جنگل کی خوف ناک رات کا تصور ہی میرے لیے محال تھا۔

بقا کی جنگ نے میرے اندر ایک بار پھر عجیب سا جوش بھرا اور میں نے تیز تیز قدم اُٹھانے شروع کر دیے۔

میں مسلسل چلتا رہا۔ کچا بل کھاتا راستہ میری رہنمائی کر رہا تھا۔ سورج کی تیز روشنی چھدرے جنگل سے چھن کر اندر پڑ رہی تھی۔ میں کبھی ستانے کے لیے رک جاتا اور پھر چل پڑتا۔

آخر ایک مقام پر مجھے احساس ہونے لگا کہ اریب قریب کے درخت اور گھنی جھاڑیاں...... مجھ سے دور ہوتی جارہی ہیں۔ کچی اور گرد آلودہ زمین...... پر اب میرے پاؤں پڑنے لگے تھے۔ ایک لرزا دینے والا خیال یہ بھی اُبھرا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ جنگل کے اختتام پر کسی آبادی کے بجائے دوبارہ وہ منحوس صحرا نہ شروع ہو جائے۔

میں بہر حال یہ نخلستانی جنگل پار کر گیا مگر سامنے نگاہ پڑتے ہی میں بُری طرح ٹھٹک گیا۔ ایک قافلہ جنگل کے

قریب سے گزر کر آگے بڑھا چلا جا رہا تھا۔

میں ایک دم ایک درخت کے تنے کے عقب میں ہو گیا اور بہ غور قافلے کو تکنے لگا۔ قافلے کی سج دھج اور شان و شوکت سے کچھ ایسا ہی نظر آتا تھا جیسے کسی راجا مہاراجا کی سواری آرہی ہو۔

میرے ذہن میں ایک ترکیب سوجھی اور میں جھاڑیوں اور درختوں کی آڑ لیتا ہوا ان کے متوازی ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگا اور بالآخر...... آگے جا کر ان میں شامل ہو گیا۔

حیرت کی بات تھی کہ کسی نے میری جانب توجہ ہی نہ دی تھی، یا پھر دی بھی ہو تو اہمیت نہ دی ہو۔ ایک بھرے پُرے قافلے کی ہمراہی ملتے ہی میرے حوصلے مزید بلند ہو گئے۔

قافلے کا میں سرسری جائزہ لے چکا تھا۔ لگ بھگ کوئی تیس چالیس کے قریب افراد تھے۔ ان میں کچھ گھوڑوں پر بھی سوار تھے، باقی پیدل تھے۔ گھڑ سواروں کے جسم پر مخصوص وردیاں نظر آئی تھیں۔ ان کے کندھوں پر رائفلیں جھول رہی تھیں۔ سب سے آگے ایک ہاتھی تھا۔ اس پر بڑا سا چھپر کھٹ رکھا ہوا تھا۔ ہاتھی کی گردن پر ایک نیم برہنہ موٹا اور گنجا سا شخص ہاتھ میں ''آنکس'' پکڑے بیٹھا تھا۔ وہ مہاوت تھا۔ ہودے کے اندر کون سوار تھا؟ یہ بھلا میں کیا جانتا؟ پیادہ لوگ عام سے ہی نظر آتے تھے، میری طرح، گویا اِدھر اُدھر سے آکر قافلے میں شامل ہو گئے ہوں۔ بادیُ النظر میں تو مجھے یہ کسی مہاراج کا شاہی قافلہ ہی لگتا تھا۔

ایک بات البتہ میں نے محسوس کی تھی کہ ان سب لوگوں کے چہروں پر عجیب سی سوگواری عیاں تھی۔ وہ خاموش اور چپ چاپ جانے کس طرف چلے جا رہے تھے۔ پھر آبادی آگئی، میں قافلے سے کٹ گیا۔

اب میں ایک آبادی میں تھا۔ یہاں سب لوگ اپنی وضع قطع سے راجستھانی نظر آرہے تھے۔ گہرے رنگ کی دھوتیاں، اور پگڑیاں بھی انہوں نے پہن رکھی تھیں۔ ان میں دُبلے پتلے بھی تھے اور موٹے تازے لحیم شحیم بھی، رنگت ان کی خاکستری تھی۔ کئی چہرے سانولے تھے۔ عورتیں بہت مضبوط جسم و جان کی مالک نظر آتی تھیں۔ بدن اُن کے کسے ہوئے تھے۔ نچلے حصے خاصے تنگ تھے۔ اس پر مستزاد اس طرح کس کر اُونچی دھوتی نما ساڑی باندھی ہوئی تھی کہ ان کے قیامت خیز جسمانی نشیب و فراز کھل کر نمایاں ہو رہے تھے۔

میرے پاس کچھ رقم تھی۔ یہاں بھی ظاہر ہے بھارتی روپیہ ہی چلتا تھا۔ میں نے ایک دکان دار سے کچھ کھانے پینے کی اشیا خریدیں اور اسی تھڑے پر ستانے کے لیے بیٹھ بھی گیا۔

دکان دار کا نام مجھے وشنٹ معلوم ہوا۔ ایک دو اور گاہک بھی آئے اور آپس میں تبادلۂ خیال کرنے لگے تو میں چونک پڑا۔ پتا چلا کہ مہاراجا سخت بیمار تھا۔

جب دکان دار وشنٹ گاہکوں سے فارغ ہو کر بیٹھا تو میں اس کے قریب گیا اور پوچھا۔

''بھیا! کیا بات ہے؟ یہاں سب پر سوگواری کیوں طاری ہے؟'' وہ میری بات سن کر ایک گہری سانس لے کر بولا۔

''کیا پوچھت ہو بھایا......؟ ہمرا مہاراجا بہت سخت بیمار ہے۔ بڑے بڑے ڈاکٹروں، ویدوں اور حکیموں کو دکھلا چکے، پرنتو مرج بڑھتا ہی جاوت ہے۔ ایب بھگوان سے پرارتھنا ہی ہوسکت ہے۔''

''آخر کیا بیماری ہے، تمہارے مہاراجا کو......؟'' میں نے کسی خیال کے تحت پوچھ لیا۔ وہ جواباً بولا۔

''پتا نہیں، بس اٹوانٹی کھٹوانٹی لیے پڑت ہے، جیسے شریر میں آتما ہی نہیں، ایک حکیم کی تلاش میں مہارانی گُھد گئی تھی، یہ قافلہ اسی کا ہی تھا، پاتھی پر وہی تھیں۔ پرنتو حکیم نہ ملا۔ وہ گزر چکا تھا۔''

''اوہو...... ویسے میں بھی ایک ڈاکٹر ہوں، گوار داس پور کا رہنے والا ہوں۔ کم بخت لٹیروں نے راستے میں اس حال کو پہنچا دیا، سب کچھ میرا لوٹ کر لے گئے۔''

میری بات سن کر اس نے بھی روایتی انداز میں ایک ذرا افسوس کا اظہار کیا۔ اس کے بعد بولا۔

''ڈاکٹر ہو تو اچھا ہے بھایا! پرنتو، مہاراجا کو تو بڑے بڑے ڈاکٹروں نے دیکھ لیا۔''

''اللہ نے سب کے ہاتھ میں تو شفا نہیں رکھی ہوئی۔ میں کوشش کر کے دیکھ لوں گا تو کیا حرج ہے۔''

''بات تو تیری بُری نہیں۔'' وہ بولا اور پھر گردن دکان کے کھوکے سے ذرا...... باہر نکال کر کسی کو آواز دی۔ ایک نوعمر لڑکا آن دھمکا۔

''اوئے رامے! ذرا اِدھر دھیان رکھ، میں ابھی آتا ہوں۔'' وشنٹ نے اس سے کہا اور پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''چلو جی، اُٹھو...... آؤ میرے ساتھ......''

ہم دونوں دکان سے باہر آگئے۔ معلوم ہوا وہ مجھے

مہاراجا کے محل کی طرف ہی لے جا رہا تھا۔ مہاراجا کا نام وشنٹ نے ٹھاکر ہری داس بتایا تھا۔ یہاں کے لوگ متعصب نہ تھے۔ شاید اس کی وجہ یہی تھی کہ یہاں ہندو، مسلم، سکھ اور عیسائی سبھی آباد تھے اور ''ہندو مسلم سکھ عیسائی، سب ہیں آپس میں بھائی بھائی'' کے مقولے پر عمل ہوتا تھا۔

چلتے چلتے میں نے وشنٹ کو اچھی طرح کھنگال کر اور بھی باتیں پوچھ ڈالیں۔

مثلاً ٹھاکر ہری داس کی بیوی مہارانی کا نام دل آرام معلوم ہوا تھا۔ یہ ہری داس کی دوسری بیوی تھی۔ مگر اس..... سے کوئی اولاد نہ تھی۔ شادی کو تین برس ہو چکے تھے۔

ٹھاکر ہری داس کی پہلی بیوی چمپا بائی مر چکی تھی۔ اس کے دو جوان بیٹے اور دو جوان بیٹیاں تھیں۔ ایک بڑے بیٹے سرپنچ داس اور ایک بڑی بیٹی وشنی کی شادی ہو چکی تھی۔ جب کہ منوج اور کورا ابھی غیر شادی شدہ تھے۔

بہرکیف...... میں وشنٹ کے ساتھ مہاراجا ٹھاکر ہری داس کے عظیم الشان محل پہنچا تو اس کی شان و شوکت دیکھ کر ہی دنگ رہ گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں کسی مغل دور میں پہنچ چکا ہوں، یوں جیسے الف لیلہ کی داستان کا کوئی کردار ہوں۔

بڑے دیوہیکل قلعہ نما گیٹ کے سامنے موجود چوب دار اور محافظوں نے ہمارا راستہ روکا تھا، لیکن جب وشنٹ نے انہیں میرے بارے میں بتایا تو ایک خدمت گار کے حوالے ہمیں کر دیا گیا اور یوں ہمیں اندر جانے کی اجازت مل گئی۔

ہمیں سب سے پہلے ایک شاہانہ طرز کے مہمان کمرے میں بٹھایا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی ایک بڑی سج دھج والی دراز قامت خوب صورت سی عورت اندر داخل ہوئی۔ وشنٹ فوراً ہاتھ باندھے اُٹھ کھڑا ہوا۔ میں بھی احتراماً کھڑا ہو گیا۔

وشنٹ نے تو نہایت مؤدبانہ انداز میں ہاتھ باندھے اور اپنا چہرہ جھکا رکھا تھا لیکن میری نظریں حسین و جمیل مہارانی پر جمی رہی تھیں۔

مجھے اس کی عمر کا اندازہ بہ مشکل پچیس تیس کے لگ بھگ ہوا تھا۔ رنگت اس کی شہابی تھی، آنکھیں بڑی بڑی اور سیاہ تھیں، جن میں غضب کی مقناطیسی کشش تھی۔ وہ بلاشبہ بے داغ حُسن کی مالک تھی۔

اس نے مہارانیوں والا مخصوص گھیردار اور زرق برق لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ خود بھی وہ بڑی بارعب شخصیت تھی، صحت بھی قابلِ رشک اور جسم بھی اس کا تراشیدہ ہیرے کی طرح تھا۔ اس کے ہمراہ چار کنیزیں بھی تھیں۔ دو تو اس کے دائیں بائیں مؤدبانہ کھڑی اس کے گویا اشارۂ ابرو کی منتظر تھیں۔ جبکہ باقی دو کنیزوں نے عقب سے مہارانی کا سونے و جواہرات کے تاروں سے بنا ہوا گھرا تھام رکھا تھا۔

یہی مہارانی دل آرام تھی۔ میں نے ہولے سے مہارانی کو سلام پیش کیا۔ اس نے ایک اچٹتی سی نگاہ میرے چہرے پر...... ڈالی اور پھر وسط میں موجود ایک سنگھاسن پر بڑے کروفر کے ساتھ براجمان ہو گئی۔

''تم ڈاکٹر ہو؟'' اس کی آواز میں غضب کا لوچ اور نغمگی تھی، مگر اس وقت اس کا چہرہ اُداسی اور مغمومیت سے لبریز تھا۔ جی تو چاہا کہ کہہ دوں ''میں شاعر ہوں'' مگر نہ کہہ سکا۔

''جی مہارانی صاحبہ......! میں ایک ڈاکٹر ہوں اور مسافر بھی، ایک ایسا مسافر جو راہ میں لوٹ لیا گیا ہو اور بے سروساماں بھی کر دیا گیا ہو۔'' میں نے اپنی آواز میں دانستہ شاعرانہ پن سمونے کی کوشش کی تھی...... تاہم میں نے دیکھا کہ میرے اس ''بیان'' پر مہارانی کا سندر سندر چہرہ ذرا مسکایا ہو۔ کچھ بھی سہی بہلاوا ضروری تھا، تاکہ مجھ پر کسی قسم کا شبہ نہ کیا جاتا۔ کیونکہ میری اپنی حالت عجیب سی ہو رہی تھی اسی لیے یہ سب کہنا ازبس ضروری تھا۔ یوں میرا بیان جاری رہا۔

''جب میں نے سنا کہ یہاں کے مہاراجا ٹھاکر ہری داس کو کوئی لاعلاج بیماری لاحق ہو گئی ہے تو سوچا شاید میرے ہی ہاتھوں خدا نے ان کی شفا لکھی ہو۔ اس لیے یہاں چلا آیا۔ آگے آپ کا جو حکم ہو۔''

''تم مسلمان معلوم ہوتے ہو؟''

''جی ہاں، مہارانی صاحبہ! الحمدللہ مسلمان...... ہوں۔'' کہتے ہوئے میں نے پھر اس کے چہرے پر نظریں جما دیں۔

اس بار میں نے دیکھا کہ وہ بڑے غور سے میرے چہرے کو تک رہی تھی۔

''ٹھیک ہے...... آؤ ہمارے ساتھ......'' بالآخر وہ بولی۔ پھر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

میں اس کے ہمراہ ایک شاہانہ طرز کے آرام دہ کمرے میں آ گیا۔ یہاں جدید سہولتیں موجود تھیں۔ کمرے میں ائرکنڈیشن چل رہا تھا۔ ایک جہازی سائز اور نقشین

سرہانے اور پایوں والی خوب صورت آرام دہ مسہری پر ایک ادھیڑ عمر شخص لیٹا ہوا تھا۔

میں نے دیکھا یہاں اور بھی ڈاکٹر اور نرسیں موجود تھیں، جنھیں خاص طور پر شاید کسی بڑے شہر سے کال کیا گیا تھا۔ انہوں نے مجھے دیکھ کر ناک بھوں چڑھا کر یوں گھورا جیسے دل ہی دل میں استہزائیہ انداز میں کہہ رہے ہوں۔

''اونہہ...... بھلا یہ کل کا چھوکرا مہاراجا کا علاج کیا کرے گا؟''

وہاں ایک میز پر چند ضروری ڈاکٹری آلات رکھے ہوئے تھے۔ میں نے پہلے مہاراجا ہری داس کا بہ غور معائنہ کیا اور تقریباً آدھے گھنٹے معائنہ کرتا رہا۔

مجھے اپنے بارے میں کوئی دعویٰ تو نہیں لیکن...... میں بھی جگہ جگہ ہاسپٹلز میں کام کرتا اور تجربہ لیتا رہا ہوں۔

علاج معالجے کے سلسلے میں میرا ذاتی خیال ہے کہ سب سے پہلے ایک ڈاکٹر کو بیمار کا علاج کرنے کے بجائے ''بیماری'' کی درست تشخیص پر زور دینا چاہیے۔ دوا تجویز کرنا کوئی بڑی بات نہیں ہوتی، وہ تو آپ میڈیکل اسٹور جا کے بھی...... ان سے پوچھ سکتے ہیں کہ ''بھائی! کھانسی کی کوئی دوا تو دے دو...'' وہ آپ کو ایک سے ایک اچھا کھانسی کا سیرپ تھما دے گا، لیکن وہ ایک اچھے ڈاکٹر کی طرح یہ نہیں جان سکتا کہ کھانسی کی نوعیت اور قسم کیا ہے؟ لیکن ایک اچھا معالج تشخیص پر زور دیتا ہے۔ تب ہی پرانے سے پرانا مرض بھی پکڑا جاتا ہے اور اس کا درست علاج ہوتا ہے۔ آج کل عموماً ڈاکٹرز فوراً دوائی (نسخہ) تجویز کرنے پر زور صرف کرتے ہیں۔

نصف گھنٹا تسلی سے اور بہ غور معائنہ کرنے کے بعد میں نے مہاراجا کی لاعلاج بیماری بھانپ لی تھی۔ اسے بڑا تیز بخار چڑھا ہوا تھا اور پورا بدن بخار سے تپ رہا تھا۔

میں سمجھ چکا تھا کہ مہاراجا ہری داس ''ہائی گریڈ فیور'' میں مبتلا تھا، جس کی ''کاز'' (وجہ) اکثر ''اَن نون'' (نامعلوم) ہوتی ہے۔ یہ اگرچہ کوئی بیماری نہیں تھی بلکہ کسی اندرونی بیماری کی ایک سائن (نشانی) تھی، جو ابھی پوری طرح اُبھری نہیں تھی یا انسانی جسم کے قدرتی مدافعتی نظام نے اسے دبا رکھا تھا۔ ایسے میں جب تک بغیر دوا کے ٹمپریچر ڈاؤن نہ کیا جائے تو کوئی دوا کارگر نہیں ہوتی۔ یہاں میں نے دیکھا کہ دوائیوں پر زور تھا ایک بھرمار تھی۔ میں نے مہارانی سے کہا۔

''مہارانی صاحبہ! فوراً ایک سات فٹ لمبی اور تین فٹ چوڑی برف کی سل کا بندوبست کیا جائے۔''

مہارانی نے اسی وقت حکم صادر کیا۔ ایسے میں وہاں موجود ایک ڈاکٹر یا حکیم نے میرے قریب آکر سرگوشی میں کہا۔

''بھائی! یہاں بہت عیش و آرام ملے گا۔ مہاراجا کی بیماری کو جتنا طول دو گے، اتنا ہی عیش کی لمبی زندگی گزارو گے اور مال بھی ملتا رہے گا۔''

میں نے غصیلی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا اور وہ میرے چڑھے ہوئے تیور دیکھ کر گھبرا گیا اور پھر دور ہٹ گیا۔

بہرکیف...... فوراً سات فٹ لمبی برف کی سل کا بندوبست کر دیا گیا...... میں نے مہاراجا کو اُٹھا کر اس برف کی سل پر لٹانے کا کہا۔

''ارے بھیو...... ! کیا غضب کرتے ہو؟'' اسی وقت ایک وید چیخا۔ ''مہاراجا کو سخت تاپ (بخار) چڑھا ہوا ہے، اس قدر ٹھنڈ دو گے تو سرسام ہو جائے گا، نمونیا بھی ہو سکتا ہے اور دماغ پر بھی اثر پڑ سکتا ہے۔''

میں نے اس سے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ ''ترازو کا اگر ایک پلڑا بھرا ہوا ہو اور دوسرا خالی، تو کون سا پلڑا نیچے کو آئے گا؟''

''ظاہر ہے، بھرا ہوا......'' وید حیرت سے بولا۔

''اور اگر خالی پلڑا برابر کر دو تو......''

''تو کیا! دونوں برابر ہو جائیں گے۔'' وید بولا۔

''میں بھی یہی کر رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

میرے حکم کی تعمیل کرنے کے لیے مہارانی کا اشارہ کافی تھا۔ تیز بخار میں پھنکتے ہوئے بے ہوش مہاراجا کو چار چھ خدمت گاروں نے اُٹھا کر برف کی سل پر لٹا دیا۔

پھر کوئی لگ بھگ تین چار منٹ بعد میں نے دوبارہ مہاراجا کو برف کی سل سے مسہری پر لٹا دیا۔ بیس منٹ بعد میں نے پھر یہی عمل دہرایا۔

کم و بیش چار پانچ مرتبہ یہ عمل کروایا۔ اس دوران دوسرے مفت خور ڈاکٹرز... اور نرسوں نے مہارانی کو میرے خلاف ورغلانے کی بھی کوشش چاہی، مگر وہ کسی کے بہکائے میں نہیں آئی۔

تھوڑی دیر بعد... مہاراجا کا دوبارہ معائنہ کیا۔ اس کا بخار کافی حد تک اُتر چکا تھا۔ ہائی گریڈ فیور High (Grade Fever) کے اسٹیج سے اُترنے کے بعد میں نے دوا... کے ذریعے اس کا علاج شروع کر دیا اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد مہاراجا کو پانی بھی پلاتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد

ہی مہاراجا کو ہوش آ گیا اور اس نے کچھ کھانے کو مانگا۔

پورے محل میں کیا بلکہ سارے علاقے میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ مہارانی تو جیسے میرے آگے بچھ گئی۔ میری اتنی آؤ بھگت کی جانے لگی کہ میں خود کو اس قلعہ نما محل کا ہی فرد بلکہ مہاراجا محسوس کرنے لگا، بس ایک ''پگ'' سر پر رکھنے کی دیر تھی۔

میں نے سب سے پہلے مہارانی سے کہلوا کر سارے ڈاکٹرز اور نرسوں کو وہاں سے چلتا کر دیا۔ یہ صرف موج اُڑانے کے لیے یہاں بسے ہوئے تھے۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں یہ بغض میں آ کر کوئی گڑبڑ نہ کر ڈالیں۔ یہ پروفیشنل جیلسی کی بات نہ تھی۔ ایک انسان کی زندگی کا معاملہ تھا۔

مہاراجا ہری داس تیزی سے صحت مند ہونے لگا۔ بیماری نے اسے نچوڑ دیا تھا مگر اب وہ پھر سے صحت مند ہونے لگا تھا۔ اس کی عمر پچاس کے پیٹے میں تھی اور وہ اس عمر میں بھی پُر وجیہہ اور پُر وقار شخص تھا۔ مہاراجا اور مہارانی مجھ سے اس قدر خوش تھے کہ میرے آگے پیچھے بچھے جا رہے تھے۔

دونوں ہی نیک نفس اور فطرتاً نرم مزاج تھے۔ یہی سبب تھا کہ ریاست میں پوری رعایا ہی ان سے خوش تھی۔ مجھے شاہی مہمان خانے میں رکھا گیا تھا۔

ایک روز مہاراجا نے مجھ سے کہا۔ ''اے نوجوان......! تم نے ہمیں زندگی دی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس کے بدلے میں تمہیں ہم کوئی انعام نہیں دے سکتے، ہمیں اس کا افسوس ہے، ہم مہاراجا ہونے کے باوجود تمہارے اتنے بڑے احسان کا بدلہ اُتارنے میں غریب ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''مہاراجا صاحب......! زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ میں تو صرف ایک ذریعہ بنا ہوں۔ رہی بات انعام کی تو میں نے کسی انعام کے لالچ میں یہ سب نہیں کیا ہے۔ بلکہ اپنے پیشے کی لاج رکھی ہے۔''

''آفرین ہے تم پر...... نوجوان!'' مہاراجا ہری داس نے فراخ دلی سے کہا۔ ''ہمارا مطلب یہ نہ تھا کہ ہم تمہیں بالکل ہی خالی ہاتھ رکھنا چاہتے ہیں، یہ محل...... یہ ریاست، یوں سمجھو سب تمہاری ہے۔ ہماری خواہش ہے تم اِدھر ہی رہو، ہمارے پاس، اگر کسی دوسرے شہر میں تمہارے خاندان کے دیگر افراد رہتے ہیں تو انہیں بھی ہم اِدھر ہی بلوا لیتے ہیں۔''

میرے لیے اب اپنے مشن کے لیے کھلا آپشن تھا میں جانتا تھا کہ تقدیر نے مجھے پیچھے ہٹنے کے بجائے آگے بڑھنے کا ایک موقع دیا ہے۔ میں چاہتا تو واپس پاکستان کا رخ کر سکتا تھا لیکن میں نے اپنا ارادہ بدل دیا تھا۔

چنانچہ......اب دیکھنا یہ تھا کہ آگے بڑھنے کے لیے یہ میری کیا مدد کر سکتے تھے؟ یہ مجھے مہاراجا نہیں بتا سکتا تھا، آنے والا وقت بتاتا اس کے لیے......وقت اور حالات کے بہتے دھارے کو دیکھنا تھا۔ جلد بازی کھیل بگاڑ سکتی تھی۔ پاؤں ٹکنے کی جگہ مل گئی تھی تو عجلت کیسی؟ لہٰذا میں نے نہایت ممنون بھرے لہجے میں مہاراجا سے مخاطب ہو کے کہا۔

''میں آپ کا تہ دل سے مشکور ہوں مہاراجا صاحب! کہ آپ نے میرے لیے اتنا اچھا سوچا، حقیقت یہی ہے کہ حالات نے خود مجھے بھی اپنوں سے دور اور دربدر کر رکھا ہے، اپنے بھی کیا ہیں، چند ایک دوست ساتھی اور بس......خونی رشتے دنیا میں نہیں رہے، پھر ابھی میں شاید فوری طور پر کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر ہوں، اگر آپ چند دنوں کے لیے مجھے اپنے مہمان خانے میں جگہ عنایت فرما دیں تو آپ کا مشکور رہوں گا۔''

میں نے اپنی بات ختم کی تھی کہ مہاراجا نے فوراً کہا۔ ''مہمان خانہ کیوں.... اس پوری حویلی اور ریاست کے دروازے تمہارے لیے کھلے ہیں۔ جہاں جی چاہے جتنے دن چاہو رہو بلکہ ہم تو یہی کہیں گے کہ یہاں سے جانے کی ضرورت بھی کیا ہے؟ ہمارے شاہی دوستوں کی طرح رہو، ہم بہت دوست نواز ہیں۔''

''میں آپ کا مشکور ہوں مہاراجا صاحب! بس، اب...... میں اور کچھ نہیں کہہ پا رہا۔'' میں نے کہا۔ وہ جہاندیدہ تھا میرا مطلب سمجھ گیا۔

میں آزاد تھا۔ سر چھپانے کو ایک مضبوط ٹھکانا مل گیا تھا، نہ صرف یہ بلکہ مجھے یقین تھا وقت پڑنے پر...... مجھے یہاں سے آگے جانے کے لیے، جیسی میں چاہتا، پوری پوری مدد بھی مل سکتی تھی۔

القصہ...... مجھے رہنے کے لیے محل کا پورا ایک گوشہ دے دیا گیا لیکن میں نے مہمان خانے میں ہی رہنے کو ترجیح دی تھی۔

ایک دن تسلی سے گزرا اور اسی روز میں نے تنہا بیٹھ کر باریک بینی سے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے سوچا کہ مجھے اپنے اہم اور نیک مقصد کے لیے اس سنہرے موقع سے پورا پورا فائدہ اُٹھانا چاہیے...... کیونکہ ان خونی سوداگروں سمیت، ڈاکٹر رمیش اگروال اور شنکر جانکیہ کی سرکوبی کے لیے اس سے بہتر موقع مجھے اور کہیں نہیں مل سکتا تھا۔

اُس روز میں مہاراجا کی خواب گاہ میں اس کا معمول کا طبی معائنہ کررہا تھا۔ طویل بیماری کے بعد اس کا بلڈ پریشر لو رہنے لگا تھا۔ تاہم اس کی حالت اب پہلے سے کافی بہتر تھی۔

اس وقت مہارانی دل آرام حسب سابق وہیں موجود تھی۔ وہاں میری خواب گاہ میں موجودگی کے باجود وہ ہلکے نیلے رنگ کی مہین نائٹی میں ملبوس تھی۔ جس کے آر پار اس کا نرم و نازک اور لوچ و خم سا مرمریں اور شہابی بدن جھلک دکھلا رہا تھا۔

میں البتہ مہاراجا ہری داس کی طرف ہی متوجہ تھا۔ تاہم مجھے مہارانی کے اس لباس سے کوفت سی ہو رہی تھی۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ وہ مجھے کن انکھیوں سے دیکھتی بھی جاتی تھی۔ ایک موقع پر میری اس سے نگاہیں چار ہوئیں تو اس کے نرم و گداز ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ اُبھری تھی۔ تب ہی میں ایک دم مہاراجا ہری داس سے مخاطب ہو کر بولا۔

''مہاراجا صاحب! آپ سے ایک ضروری بات کرنا تھی۔''

''ہاں...... ہاں! ضرور کہو، کیا بات ہے......؟'' وہ فراغ دلانہ مسکراہٹ سے بولا۔

''پہلے میں یہ تسلی کرنا چاہوں گا کہ اس بات کو صرف آپ اپنے تک ہی محدود رکھ سکتے ہیں؟'' میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

مہارانی بھی اب میری بات دھیان سے سننے میں مگن تھی۔ وہ اس دوران اپنے قیامت خیز سراپا سمیت مسہری پر اپنے شوہر کے قریب بیٹھ چکی تھی اور میری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔

''تم کوئی چنتا کیے بغیر مجھ سے ہر قسم کی راز کی بات کر سکتے ہو۔'' مہاراجا ہری داس نے میری طرف دیکھ کر نہایت سنجیدگی سے کہا تو میں نے کہنا شروع کیا۔

''درحقیقت میں پاکستان کا رہنے والا باشندہ ہوں۔ میں یہاں ایک خاص مشن پر آیا ہوا تھا، لیکن میرا مشن لوگوں کی بھلائی کے سوا اور کچھ نہیں۔'' میں نے انہیں بتایا۔

''تم پاکستانی جاسوس تو نہیں ہو؟'' میری اتنی بات سنتے ہی مہاراجا ہری داس نے مشکوک نظروں سے میری طرف دیکھ کر کہا تو اس کی بات سن کر میں گھبرانے کے بجائے پوری تسلی کے ساتھ مسکراتے ہوئے انکار میں سر ہلا کر بولا۔

''بالکل نہیں......''

''دیکھو بات یہ ہے کہ......'' مہاراجا درمیان بول پڑا۔ اس کا لہجہ سنجیدہ تھا۔ وہ ایک ذرا توقف سے دوبارہ بولا۔ ''آج کل اس معاملے پر حکومتی سطح پر یہاں کی آزاد ریاستوں پر بھی کچھ دباؤ ہے۔ میں نے یہ بات اسی لیے ہی پوچھی تھی کہ اگر تمہارے سلسلے میں بھی ایسی کوئی بات ہے تو ابھی سے بتادو۔ کیونکہ ہم نہیں چاہتے کہ اپنے محسن کے سلسلے میں ہمیں کوئی دکھ اُٹھانا پڑے۔'' اس نے پورے مستحکم لہجے میں مجھ سے کہا۔

''مہاراجا صاحب! آپ بےفکر رہیں۔ میں آپ پر ایسی آزمائش کبھی نہیں آنے دوں گا بلکہ مجھے تو اس بات کا پورا یقین ہے کہ آپ اگر میرے نیک مقصد کے بارے میں جان گئے تو کھلے دل سے میری مدد کرنے پر بھی آمادہ ہو جائیں گے، ورنہ میں آپ سے سچ ہی کیوں بولتا۔'' میں نے کہا۔

''اچھا......! ایسی کیا بات ہے؟'' مہاراجا قدرے حیرانی سے بولا۔

''جی ہاں!'' میں نے کہا اور اسے ساری بات نہایت صراحت سے بتادی۔ دونوں میاں بیوی میری باتیں بڑے دھیان اور غور سے سنتے رہے۔ اُن کے چہروں پر حیرت و استعجاب کے تاثرات طاری ہو گئے تھے۔ پھر چند ثانیوں کی پُرسوچ خاموشی کے بعد مہاراجا کا چہرہ فرطِ جوش سے سرخ ہو گیا اور وہ اسی لہجے میں بولا۔

''نوجوان......! ہمیں تمہاری بات پر اب مکمل وشواس ہو گیا ہے۔ ہماری بھارت ماتا کی دھرتی پر ایسا گھناؤنا کاروبار ایک طویل عرصے سے پرورش پا رہا ہے۔ ہم تک بھی اس کی بازگشت پہنچتی رہتی ہے۔ تم ایک ڈاکٹر ہو اور ایک دردمند دل رکھنے والے اچھے انسان بھی۔ تمہارا یہ نیک مقصد کسی ایک ملک کے مفاد میں نہیں، بلکہ ساری قوموں، پورے عالمِ انسانیت کی خدمت کے لیے ہے، تم نے بھی واقعی اپنے مقدس پیشے کی لاج رکھ لی ہے۔ ہماری شبھ کامنائیں تمہارے ساتھ ہیں لیکن ایک بات ہماری سمجھ میں نہیں۔''

وہ ایک لمحہ رکا مگر میں بدستور اس کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھتا اور اس کے آگے بولنے کا منتظر رہا۔

''اگر یہ بات تھی تو پھر تم بھارت سرکار سے اس کام کی باقاعدہ اجازت کیوں نہیں لے لیتے......؟ اس طرح تمہارا کام اور بھی آسان ہو جائے گا اور بھارت سرکار بھی تم سے

خوش ہوگی۔ بہ صورتِ دیگر تمہارے لیے تو یہاں مصیبت کھڑی ہوسکتی ہے۔ کیونکہ وہ حقیقت جانے بغیر تمہیں سب سے پہلے دشمن ایجنٹ ہی سمجھیں گے۔''

''یہ بات میرے مفاد میں نہ ہوگی، حتیٰ کہ میں اپنی حکومت سے بھی ایسی کوئی بات کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ انسانی اعضا کا غیر قانونی کاروبار کرنے والے یہ خونی سوداگر نہ صرف بہت شاطر اور ہوشیار ہیں بلکہ خاصے اثر ورسوخ کے بھی مالک ہیں۔ میں یہ مشن خفیہ طریقے سے ہی نمٹانا چاہتا ہوں۔''

میری بات پر پہلی بار قریب بیٹھی مہارانی دل آرام نے لب کشائی کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔

''کیا تم تنہا یہ خطرناک کام کرلو گے......؟'' اس کے کھنکتے لہجے میں حیرت تھی۔

میں نے مسکرا کر کہا۔ ''یہ کام میرے تنہا ہی کرنے کا ہے مہارانی صاحبہ! تاہم میرے دو اور ساتھی اس نیک اور اہم مشن میں میرے ساتھ ہیں۔''

''ٹھیک ہے، اگر ہماری مدد کی ضرورت پڑے تو ہم بھی تمہارے اس نیک مقصد میں مدد کرسکتے ہیں۔'' مہاراجا نے آخر میں کہا تو میں بولا۔

''جی ہاں! شاید مجھے آپ کی مدد کی ضرورت پڑے۔''

''ہمیں اس نیک مقصد میں تمہاری مدد کرتے ہوئے خوشی ہوگی۔ کیونکہ ہم خود بھی یہی چاہتے ہیں کہ انسانی اعضا کا یہ گھناؤنا کاروبار کرنے والے ان خونی سوداگروں کا خاتمہ ہونا چاہیے جو پوری انسانیت کے لیے ناسور بنے ہوئے ہیں۔''

''میں آپ کے جذبے کی قدر کرتا ہوں، مہاراجا صاحب!'' میں نے ہنوز پُرتشکر لہجے میں کہا۔

☆☆☆

میرا خیال تھا کہ میں نے مہاراجا اور مہارانی کو سچ بتا کر اپنے آئندہ کے ''حادثاتی'' لائحہ عمل کی راہ آسان کرلی تھی۔

اب تقدیر نے جبکہ مجھے اس انداز میں ان بین الاقوامی خونی سوداگروں کا قلع قمع کرنے کا موقع دے ہی دیا تھا تو مجھے اس نادر موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے تھا۔

لہٰذا......اب دیکھنا یہ تھا کہ میں ان سے کیا اور کس قسم کی مدد لے سکتا ہوں؟ بہت غور وخوض کے بعد مجھے ان کی مدد کی آخری حدود کا اندازہ ہوچلا......وہ یہ کہ مہاراجا میری صرف اسی قدر ہی مدد کرسکتے تھے کہ میں جب تک چاہوں یہاں رہ سکتا تھا، مجھے یہاں کوئی تلاشنے اور پوچھ تاچھ کرنے والا نہیں تھا۔ یا زیادہ سے زیادہ سے یہ ہوسکتا تھا کہ وہ کچھ ایسا بندوبست کردیتے کہ میں انڈیا کے کسی بھی شہر کا رخ کرتا، وہ مجھے وہاں تک کسی بھی محفوظ طریقے سے پہنچا سکتے تھے۔

اس کے بعد میں اپنا ذمے دار خود تھا۔ یہ ان کے بس میں ہرگز نہیں ہوسکتا تھا اور نہ ہی میں انہیں ایک مشکل آزمائش میں ڈالنے کا سوچتا کہ یہ میرے یہاں انڈین شہری کے جعلی کاغذات تیار کروادیتے، تاکہ میں آزادی سے انڈیا میں اپنے مشن کی تکمیل کرتا۔

اب ایک ہی اور آخری راہ بچی تھی۔ کسی طرح میں...... یہاں بیٹھے بیٹھے ہی کسی نیٹ یا فون کے ذریعے...... طارق اور رومی سے رابطہ کرکے انہیں ساری حقیقت گوش گزار کردیتا اور وہ دونوں کچھ دیر تک غیر یقینی اور حیرت میں مبتلا رہنے کے بعد مجھے کوئی مشورہ دیتے۔

اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ کیا میرا طارق اور رومی سے رابطہ کرنا مناسب ہوگا یا نہیں؟ کیا خبر وہ دونوں چھوٹتے ہی مجھے وہی پہلے والے مشورے سے نواز ڈالیں کہ میں مہاراجا ہری داس کی مدد سے واپس پاکستان لوٹنے کی کوشش کروں...... پھر کیا ہوتا؟ ظاہر ہے مجھے ان کی بات ماننا پڑتی۔

میں ایک بار پھر شش وپنج کا شکار ہونے لگا۔ ذہنی اُلجھاوے میرے لیے پریشانی کا سبب بننے لگے تو...... میں نے...... سرِدست اس پر مزید سوچنا چھوڑ دیا۔ تاہم ایک ہی بات پر بار بار غور کرنا جھلاہٹ کا سبب بنتا ہے، تھوڑا ٹھہرنے اور کچھ وقت خالی الذہنی کی حالت میں رہنے کے بعد ایک دم کوئی نہ کوئی اچھی تجویز ذہن میں آہی جاتی ہے۔

لہٰذا وقت اور عارضی مجبوری کا ''شکریہ'' ادا کرتے ہوئے مجھے دوروز بیت چلے۔ اس دوران مجھے ایک عجیب سی حیرت آن لگی۔

جیسا کہ مذکور ہوچکا، میرے پہلے میزبان وشنٹ نے مجھے بتایا تھا کہ مہاراجا کی پہلی مرحومہ بیوی سے چار اولادیں تھیں۔ دو بیٹے اور دو بیٹیاں، ایک بڑے بیٹے سرنج داس اور ایک بڑی بیٹی وشنی کی شادی ہوچکی تھی۔ جبکہ منوج اور کورا نامی بیٹے بیٹی ابھی غیر شادی شدہ تھے۔ بڑی بیٹی وشنی... شادی شدہ تھی اور وہ اپنے سسرال میں ہی اپنے شوہر کے ساتھ رہتی ہوگی۔ لیکن سرنج داس کو تو اس نازک موقع پر

ادھر موجود ہونا چاہیے تھا، اپنی بیوی کے ساتھ...... پھر منوج اور کورا تو ابھی کنوارے تھے، پھر وہ دونوں اب تک کہاں اور کیوں غائب تھے......؟ کہیں ایسا تو نہ تھا کہ وہ کہیں سیر و تفریح کی غرض سے کسی دوسرے شہر گئے ہوئے ہوں؟

میں خود بھی ان کے بارے میں مہاراجا یا مہارانی وغیرہ سے پوچھنا مناسب خیال نہیں کرتا تھا، بہرحال یہ میرے لیے ایک عجیب اور پُراسراری بات تھی۔

خیر مجھے ان سے کیا لینا دینا۔ اس لیے میں نے اس معاملے پر زیادہ توجہ نہ دی۔ لیکن اس تھوڑے بہت گزرتے وقت کے ساتھ میں نے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ مہاراجا اور مہارانی اندر سے کچھ اُداس اُداس اور متفکر سے رہتے تھے۔ پہلے تو مہاراجا کی بیماری کی وجہ سے ان کی اُداسی کا سبب سمجھ میں آتا تھا، لیکن اب انہیں بھلا کیا مسئلہ تھا؟ میں کچھ اُلجھ کر سوچنے لگتا تو طارق اور رومی کی اُلجھن غالب آنے لگتی، میں ان سے رابطہ کرنے کے سلسلے میں جس شش و پنج کا شکار تھا، وجہ یہی تھی کہ اگر انہیں میری یہاں موجودگی کا علم ہوتا تو کہیں دونوں حسبِ سابق مجھے واپس پاکستان لوٹ جانے کی ہدایت نہ کر ڈالتے اور اب کم از کم میں تو واپس جانے والا نہیں تھا، تو پھر کیا کیا جائے؟ ان دونوں سے رابطہ بھی کرنا ضروری تھا۔ تب ہی میں نے تمام باتوں کو ذہن سے جھٹک دیا اور ان سے رابطہ کرنے کی ٹھان لی۔

میری خواہش پر مجھے ایک عدد لیپ ٹاپ دے دیا گیا تھا۔ وہ کھول کر میں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا۔

دھڑکتے دل کے ساتھ میں نے اپنی اسکائپ آئی ڈی اُوپن کی، کچھ دقت ہوئی اس لیے کہ کافی عرصے بعد میں نے اپنی آئی ڈی اوپن کی تھی اور پاس ورڈ مانگا گیا، جو مجھے یاد نہ تھا، اس کے لیے میں نے "فارگیٹ پاس ورڈ" پر کلک کیا اور پاس ورڈ میرے ای میل ایڈریس پر آنے کا میسج ملا۔ اپنے اسکائپ کا پاس ورڈ دیکھنے کے لیے میں نے اپنا ای میل ایڈریس کیا۔

اپنی ای میل آئی ڈی اوپن کرتے سے میرا دل لمحہ بھر کو زور سے دھڑکا تھا۔ کیونکہ میں جب بھی ایسا کرتا تو دل حسرتاں میں ایک خیال کلک ہوتا، کہ شاید حمیرا کی کوئی ای میل آئی ہو۔ اسے میرا ای میل ایڈریس یاد تھا۔

دل بھی بس ایک بنجارہ ہے۔ ہر بند راستوں اور گلیوں میں اُمید کی کوئی راہ ہی تلاشتا رہتا ہے۔ حقیقت یہی تھی کہ حمیرا کو میں یاد ہی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ یاد آتی تو میری طبیعت اُداس اور قنوطیت زدہ سی ہونے لگتی اور میں پھر خود کو کہیں کا نہیں سمجھتا۔ محبت چیز ہی ایسی ہے، اپنے سوا اور کہیں متوجہ نہیں رکھتی۔ تقدیر نے اگر ہمیں جدا کر ہی دیا تھا تو صحیح کیا تھا تو پھر میں کیوں اس کی آس لگائے بیٹھا ہوں؟ میں خود کو سرزنش بھی کرتا۔ وہ اگر مجھ سے دور چلی گئی تھی تو اس میں میری اپنی بھی تو مرضی شامل تھی۔ دشمن میری گھات میں تھے، خود اس کا جوان اکلوتا بھائی ماجد ان خونی سوداگروں کی بربریت کی بھینٹ چڑھ چکا تھا، اسے بائیک کے ایکسیڈنٹ کا حادثہ کروا کے مروا دیا گیا۔ تو کیا میں بھی یہی چاہتا تھا کہ خدانخواستہ حمیرا کے ساتھ بھی یہی ہو؟ ہرگز نہیں......

بہرکیف...... حمیرا کی کوئی میل نہیں آئی تھی البتہ میل باکس میں پہلے ہی سے...... رومی اور طارق کی ایک ایک ای میلز آئی ہوئی تھیں۔ میں نے پہلے وہ دیکھنا ضروری سمجھا۔ باری باری ان کے میسج اوپن کر کے پڑھے۔

سب سے پہلے رومی کی ایک مختصر سی میل تھی، میں اسے بہ غور پڑھنے لگا۔

"اُمید ہے تم ہماری نصیحت پر عمل کرتے ہوئے بہ خیریت پاکستان پہنچ چکے ہو گے۔ ہماری نیک تمنائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ میں انڈیا پہنچتے ہی طارق سے مل چکی ہوں۔ تم اب ہماری کامیابی کی دعا کرنا۔ ہماری فکر نہ کرنا۔"

"خدا حافظ!

رومی

رومی کی میل پڑھ کر میں نے منہ بسورا اور طارق کی میل کھول کے پڑھنے لگا۔ وہ قدرے طویل تھی۔

"رومی میرے پاس پہنچ چکی ہے، سیف! ہم بالکل ٹھیک ہیں۔ لیکن یار! تم تو اپنی خیریت کی میل کر دو، پاکستان تو پہنچ چکے ہو...گے نا تم؟ رومی کا مشورہ ٹھیک ہی تھا جو ہوا اسی میں کوئی بہتری تھی، یعنی تم انڈیا نہ آسکے، اس لیے کہ دشمنوں کو ہماری یہاں بھنک پڑ چکی ہے، یوں سمجھو سر منڈواتے ہی اولے پڑنے والی بات ہو گئی۔

وہ بدبخت ڈاکٹر رمیش اگروال پہنچتے ہی اپنے گرو گھنٹال شنکر چانکیہ کے چرنوں میں آن گھسا ہے۔ اس نے بھی پورے ذوق و شوق کے ساتھ اُسے بتا ڈالا ہے کہ ہمارا تین افراد کا گروپ ہاتھ دھو کر اور سر سے کفن باندھ کر ان کے پیچھے پڑ چکا ہے۔ شنکر چانکیہ ہماری سوچ سے بھی بڑھ کر خطرناک ثابت ہوا، وہ یہاں ایک بڑا "ڈان" کہلاتا ہے۔ تمہیں یہ سن کر بھی ایک تلخ سی حیرت ہو گی کہ گوہر شاہ اپنے مقربِ خاص تاج سمیت یہاں اس کی پناہ میں موجود ہے۔ رومی نے تو مجھے منع کر رکھا تھا کہ تمہیں میں یہاں کے متعلق زیادہ حالات سے

آگاہی نہ دوں، اُسے ڈر ہے کہیں تم جوش تلے، دوبارہ اب پاکستان سے یہاں پہنچنے کی کوشش نہ کرو، اسے تمہاری فکر ہو ہے۔۔۔۔۔۔'' یہاں اس نے معنی خیز سی اسمائلنگ دی تھی۔

میل پڑھنے کے بعد میں نے ہونٹ بھینچ لیے۔ گوہر شاہ اور تاج کی وہاں موجودگی کا سنتے ہی واقعی مجھے جوش سا چڑھنے لگا تھا۔

میں نے میل کھلی رہنے دی اور اسکائپ کا پاس ورڈ دیکھا، پھر اسے اوپن کیا اور اس کے ساتھ ہی میرے دل کے تار جیسے۔۔۔۔۔۔ سازِ سوز و گداز کی طرح۔۔۔ یکبارگی بج اُٹھے۔۔۔۔۔۔ دل و دماغ اُتھل پتھل ہونے لگا۔ دھڑکنیں بے طرح ہو گئیں۔ نارسا محبوب کی رسائی کا راستہ کھلا پایا تو مصلحتوں کی سل تلے دبے دبے جذبات نے کسی خوابیدہ آتش فشاں کی طرح انگڑائیاں لینا شروع کر دیں۔

حمیرا کا ایک نہیں پورے تین ٹیکسٹ میسج آئے ہوئے تھے۔ ایک تو مختصر ترین تھا اور وہ بھی شاعری کی صورت میں۔۔۔۔۔۔

بے وفا وقت تھا، تم تھے یا مقدر میرا
بات اتنی ہے کہ انجام جدائی نکلا۔۔۔۔۔۔

اس شعر کے نیچے آنسو بہاتے تین ایموجی دیے گئے تھے۔ میں اس شعر کو پڑھتے ہی تڑپ اُٹھا۔ اپنے وجود کی لرزش پر بہ مشکل قابو پاتے ہوئے میں نے اس کا اگلا میسج پڑھنا شروع کیا، وہ کچھ سطروں پر مشتمل تھا۔

''سیف! میری پہلی اور آخری چاہت۔۔۔۔۔۔ سوچا تھا تم سے کبھی رابطہ نہیں کروں گی، فائدہ بھی کیا تھا؟ سوائے دل جلانے اور تڑپنے کے۔۔۔۔۔۔ زندگی میں محبت کے علاوہ بھی تو اور کچھ ہے بلکہ بہت کچھ ہے۔ ہاں! انہی بہلاووں کا ہی تو اب مجھے سہارا لینا ہے اور شاید۔۔۔۔۔۔ تمہیں بھی کہ۔۔۔۔۔۔ ہمارا پروفیشن ہی ایسا ہے کہ ہمیں ہر قدم پر انسانی خدمت۔۔۔۔۔۔ کرنے کی اللہ نے توفیق بخشی ہے، یہ کیا کم خوش نصیبی کی بات ہے۔ معذرت کے میں نے بہلاوے کا لفظ استعمال کیا، اگرچہ یہی حقیقت بھی ہے۔ بہلاوا تو ہماری وہ محبت تھی جو ہمارے درمیان ایک کونپل کے مانند پھوٹی اور نصیب جلوں کی طرح پھوٹ بھی گئی۔ بس، دل بے قرار ہو گیا تھا تمہاری خیریت جاننے کے لیے۔ تمہارا نمبر بھی بند مل رہا تھا۔ سوچا ای میل کروں تو میری آئی ڈی ری کور نہیں ہو پا رہی تھی۔ یہی نہیں میری اسکائپ کی آئی ڈی بھی کرپٹ ہو چکی تھی، یہ نئی آئی ڈی بنائی ہے، اسی نام سے، مجھے ایڈ کر لینا۔ شکر تھا کہ مجھے تمہارا اسکائپ نیم یاد تھا۔

پڑھ لو تو اپنی خیریت بتا دینا، میں ہر دم تمہارے لیے دعاگو رہتی ہوں۔ پریشانی اور تشویش مجھے اسی بات کی رہتی ہے کہ تم نے جن بھیڑیا صفت اور سنگ دل دشمنوں کے ساتھ جنگ کر رکھی ہے۔ وہ تمہیں خدانخواستہ نقصان نہ پہنچا دیں۔''

حمیرا۔

یہ سب پڑھ کر میرا دل بوجھل ہونے لگا۔ یوں جیسے میرے وجود پر بھاری سل آن پڑی ہو۔ دل تک لرزتا محسوس ہونے لگا۔ راحت بھی ہوئی اور الم بھی محسوس ہونے لگا۔ میرا دھیان ہی نہیں گیا تھا کہ حمیرا کی یہ نئی آئی ڈی تھی۔ میں نے اسے فوراً ایڈ کر لیا۔ اگلا اور آخری ٹیکسٹ مقابلتاً طویل تھا۔

''سیف! میں یہاں لندن میں ہوں۔۔۔۔۔۔ شکر ہے کہ پاپا نے یہاں اپنا کاروبار جمانا شروع کر دیا ہے، ابھی ابتدا ہی ہے لیکن خوش آئند ضرور ہے۔ میں نے بھی انٹرنل میڈیسن میں ایم آر سی پی کر لیا ہے، اور ایم فل بھی۔۔۔۔۔۔ کارڈیالوجی میں بھی ہائر ڈگری لی ہے۔ یہاں ایک ہاسپٹل میں جاب بھی کر رہی ہوں۔ اتنے ہنگاموں کے بعد ہم دونوں باپ بیٹی کی

شادی

میاں جی کا نام گواہوں میں شامل کر لیا گیا تھا۔ وہ پیش ہوئے تو مخالف وکیل نے ان پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ نام پتے کی تصدیق کے بعد اس نے پوچھا۔ ''تم نے کبھی شادی کی؟''

''جی جناب۔'' میاں جی نے تحمل سے جواب دیا۔

''کس سے کی؟'' اگلا وار ہوا۔

''ایک عورت سے۔''

''ظاہر ہے کہ عورت ہی سے کی ہی گی۔'' وکیل نے طنز سے کہا۔ ''کیا تم نے کبھی کسی مرد سے شادی کے بارے میں سنا ہے؟''

''جی جناب! بالکل سنا ہے۔''

''یہ کیا بے ہودگی ہے؟'' جج نے مداخلت کی۔ ''ایسا واقعہ کہاں پیش آیا؟''

''میری بیٹی نے ایک مرد ہی سے شادی کی ہے، جناب عالی۔''

حسن ابدال سے مون سنگھ کا چٹکلہ

زندگی بہ ظاہر ایک ڈھب پر آتی محسوس ہوتی ہے لیکن پاپا کو ماجد بھائی کا غم نہیں بھولتا اور مجھے بھی...... لیکن تمہاری یاد بھی...... چھوڑو...... عجیب سا لگتا ہے یہ رونا دھونا...... مطلب یہ کہ میری زندگی انسانیت کی خدمت کے ایک دائرے میں گھوم رہی ہے۔ کچھ روز پہلے، ایک ملٹی نیشنل فارماسیوٹیکل کمپنی کی جانب سے پاکستان میں ایک میڈیکل سیمینار کے لیے مجھے آفر ہوئی تھی۔ پاکستان کے نام پر میرا دل بے اختیار دھڑک اُٹھتا ہے، اس دھڑکن کی وجہ تم ہی تو ہو...... مگر پاپا نے اجازت نہ دی اور سچی بات تھی خود میرا ابھی دل نہیں کیا، جب وہاں سے ہار کے چلے آئے تو دوبارہ وہاں جانے کی کیا خواہش رکھیں۔ پھر ابھی دنوں سری لنکا میں ایک سیمینار اٹینڈ کیا تھا، میرا طیارہ پاکستان کی فضاؤں سے گزرا تب بھی تمہاری یاد آئی اور دل کے ساتھ آنکھیں بھی بھر آئیں، اب دیکھو کچھ عرصے بعد انڈیا میں دل کے سوراخ کے متعلق ایک میڈیکل سیمینار متوقع ہے۔ ہاہاہا...... دل میں سوراخ......"

اس کے نیچے حمیرا نے بیک وقت روتے مسکراتے سیمبلز دیے تھے۔ میرا دل جیسے کسی مٹھی میں آ گیا تھا۔

آگے لکھا تھا۔

"تمہیں فرصت مل جائے یہ سب پڑھنے کی تو جواب سے نواز دینا۔ تسلی ہو جائے گی میرے دلِ نامراد کو......"

حمیرا۔

میری آنکھیں بھیگ گئیں، دل تھم تھم سا گیا۔ کیفیات کچھ سُن سی ہو کر رہ گئیں۔ یہ بھی یاد نہ رہا کہ میں رومی یا طارق کے لیے کوئی میسج سوچتا یا انہیں آن لائن ہوتے دیکھتا۔ مجھے تو کوئی جواب ہی نہیں سوجھ رہا تھا کہ حمیرا سے کیا کہوں؟ جواب تو دینا ہی تھا۔ سو ہمت کی، جذبات تلے خشک ہوتا حلق تر کیا اور ٹائپنگ شروع کی۔

حمیرا......! اللہ تمہیں جہاں بھی رکھے خوش اور تندرست و شاداب رکھے۔ تمہارا تہ دل سے مشکور ہوں کہ تم مجھے اپنی دعاؤں میں یاد رکھتی ہو اور مجھے ضرورت بھی اسی کی ہے۔ مبارک باد قبول کرو کہ انکل اور تم یو کے میں ٹھیک ٹھاک سیٹل ہو چکے ہو۔ اس بات کی تو بہت بہت مبارک ہے تمہیں کہ تم...... نے یو کے جاتے ہی اتنی ساری اضافی ڈگریاں بھی لے لیں، ریکوائرمنٹ تو تمہاری پوری تھیں۔ اچھی بات ہے کہ تم نے بلاتفریق انسانی خدمت کو اپنا شعار بنا لیا ہے۔ میرے لیے دعا کرتی رہنا۔ میرا اہم مقصد ابھی ادھورا ہے۔ اور کیا لکھوں؟

خدا حافظ!

سیف الدین۔

اس کے بعد میں چند ثانیے گہرے گہرے سانس لیتا رہا پھر ذرا ایک طرف ہو کے طارق کو میسج سوچنے لگا، رومی کو ابھی......... میں "ٹچ" نہیں کرنا چاہتا تھا، لیکن طارق کو لکھنے کے لیے میں نے جو میسج سوچا، وہ میں ٹائپ کرنا شروع کیا۔

"ڈیئر طارق!

خوش رہو۔ تمہارا میسج پڑھ کر خوشی اور طمانیت ہوئی کہ تم اور رومی خیریت سے ہو۔ میں بھی پاکستان میں ہوں لیکن تم نے یہ نہیں بتایا کہ وہاں تم اس وقت کہاں اور کس پوزیشن میں ہو؟ دشمن تک تمہاری کہاں تک رسائی ممکن ہو سکی ہے؟ کامیابی کی کتنی اُمید ہے؟ پاکستان میں میرے لائق کوئی لائحہ عمل ہو تو بتاؤ۔ اگر میں بھارت یاترا کی کوشش چاہوں تو تمہارا مشورہ کیا ہو گا؟ جواب ضرور دینا۔ ابھی تو میں دیکھ رہا ہوں کہ تم یا رومی کوئی بھی آن لائن نہیں ہو۔ شاید رات میں ہو.... میں پھر بھی آج رات آن لائن رہوں گا۔ شاید تم سے بات ہو سکے۔"

خدا حافظ!

سیف الدین

میسج سینڈ کرنے کے بعد میں نے لیپ ٹاپ ایک جانب رکھ دیا۔

اسی رات جب میں دوبارہ لیپ ٹاپ لیے بیٹھنے لگا تا کہ طارق یا رومی سے بات کر سکوں کہ اچانک مہاراجا ہری داس کی طبیعت پھر بگڑ گئی۔

مہارانی خود مجھے لینے آئی۔ اس کے سُندر چہرے پر پریشانی اور دُکھ کے آثار تھے۔ میں اس کے ساتھ...... خواب گاہ میں آ گیا۔

مہاراجا کو پھر بخار نے آلیا تھا۔ چند دواؤں کے نسخے میں نے لکھ کر منگوا لیے تھے تا کہ ایمرجنسی کے طور پر بروقت کام آ سکیں۔

میں نے مہاراجا کا معائنہ کیا اور پھر دوائیں تجویز کیں۔ اس کے بعد مہارانی کو تسلی بھی دی۔ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر مہاراجا کے بار بار بیمار پڑنے کی وجہ کیا تھی؟ ایک خیال یہ بھی میرے ذہن میں ابھرا تھا کہ کہیں مہاراجا کسی محلاتی سازش کا تو شکار نہیں، کیونکہ بہ ظاہر بھلے چنگے اور صحت مند شخص کے بار بار بیمار پڑنے کی کیا آخر کیا وجہ ہو سکتی تھی؟ یہاں لیبارٹری کی سہولت موجود نہ تھی، سب کچھ (clinical Diagnosis) پر ہی منحصر تھا۔

بہرکیف...... میں نے جب قریب ہی پریشان اور سوگوار کھڑی مہارانی دل آرام کو تسلی دیتے ہوئے اس سے

نیچے مت دیکھنا

سکتا ہے۔''

میری بات پر مہارانی نے اپنے حلق سے ایک گہری سانس خارج کی پھر میری طرف دیکھ کر عجیب سے یاس زدہ لہجے میں بولی۔ ''لیکن تم تو یہاں سے جانا چاہتے ہو؟ تم ہماری مدد کیسے کرسکتے ہو؟''

''یہ کوئی مسئلہ نہیں......'' میں نے ہولے سے مسکرا کر کہا۔ ''میں ہمیشہ کے لیے تو یہاں ویسے بھی نہیں رہ سکتا لیکن جب تک یہاں ہوں تو میں آپ کی کچھ نہ کچھ مدد تو کرہی سکتا ہوں۔''

وہ چند ثانیے کچھ سوچتی رہی۔ میری نظریں ابھی تک اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ صاف نظر آتا تھا کہ وہ اندر سے کسی سخت کشش و پیچ کا شکار ہے۔ ایک ذہنی دباؤ یوں جیسے ہاں، اور نہ کے درمیان اس کا ذہن اٹک گیا ہو۔ اس سے کچھ بولی۔

''تم ایک ڈاکٹر ہی نہیں بلکہ اچھے انسان بھی ہو۔ بہادر، دلیر اور مردانہ وجاہت کے حامل لیکن مجھے تم سے اپنے ذاتی معاملات پر گفتگو کرنی بھی چاہیے کہ نہیں۔'' وہ اُلجھی سی گئی تو میں نے کہا۔

''مہارانی صاحبہ......! اگر میں آپ کے کسی کام آسکتا ہوں تو بہ حیثیت انسان کے، میرے لیے یہ خوشی کی بات ہو گی لیکن اگر آپ کو اپنے کسی ذاتی راز سے مجھے بتانے پر تامل ہورہا ہے، تو آپ بے شک نہ بتائیں، البتہ اگر اس راز کا تعلق آپ کے پتی مہاراجا ہری داس سے ہے تو پھر میرا مخلصانہ مشورہ یہی ہوگا کہ آپ کو بتا دینا چاہیے کیونکہ ایسے ذہنی امراض میں دواؤں سے زیادہ مسئلے کے حل سے ہی فائدہ پہنچ

پوچھا کہ آخر مہاراجا کے بار بار بیمار پڑنے کی کیا وجہ ہوسکتی ہے تو اس کے حسین وجمیل چہرے پر اُداسی کی شام مزید گہری ہو گئی، پھر وہ میری طرف مغموم بھری نگاہ ڈال کے بولی۔

''میں تمہیں ان کی بیماری کی اصل وجہ ضرور بتاؤں گی......آخر کو تم ہی اس کے معالج ہو اور ایک معالج سے کچھ نہیں چھپانا چاہیے......آؤ......میرے ساتھ......''

یہ کہہ کر وہ خواب گاہ سے نکلی اور میں ان کے ساتھ چلتا ہوا دوسرے کمرے میں آگیا۔

یہ ایک شاہانہ طرز و آرائش کی نشست گاہ تھی۔ نقشین پایوں والے بیش قیمت لکڑی کا فرنیچر بڑے قرینے سے سجا کر رکھا گیا تھا۔

مہارانی نے حسبِ سابق مہین سا لباس پہن رکھا تھا۔ اس نے مجھے سامنے کی ایک نشست پر بیٹھنے کو کہا مگر میں اس کے براجمان ہونے تک احتراماً کھڑا رہا، پھر جب وہ سامنے والی نشست سنبھال چکی تو میں بھی بیٹھ گیا۔

وہ چند ثانیے تو اپنی کجراری آنکھوں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ اس کے بعد دھیمے سے بولی۔

''ڈاکٹر......! تم غیر ہو کر بھی پتا نہیں کیوں اپنے سے ہونے کا احساس دلاتے ہو، شاید اس کی وجہ تمہارا خلوص اور بے غرض جذبہ ہے جو تم نے ہمارے ساتھ روا رکھا ہے۔ پھر تم نے بھی ہم سے کچھ نہیں چھپایا اس لیے ہمارا دل بھی تم سے کچھ چھپانے کو نہیں چاہتا۔ مہاراجا کی بیماری کی اصل وجہ اس کی اولاد ہے۔''

وہ اتنا بتا کر ذرا خاموش ہوئی تو میں اس کی بات پر اندر سے چونکے بنا نہ رہ سکا تاہم سامع بنا خاموش رہا اور اس کے مزید بولنے کا منتظر رہا۔ چند لحظے کے توقف کے بعد وہ پھر

بن نہ پا رہا ہو۔ تب ہی چونکا۔ مہارانی کی آنکھیں بند ہونے لگیں، میں گھبرا گیا۔ لگا ایسا ہی جیسے وہ نشست پر بیٹھے بیٹھے سونا چاہتی ہو اور یہاں سونے کا مطلب میرے لیے خطرناک بھی ہو سکتا تھا۔ اگر تو وہ کسی ذہنی دباؤ کے سبب غش کھانے کی تیاریوں میں تھی تب بھی خجالت میرے ہی حصے میں آتی۔

چونکنے کے بعد مجھے اپنی نشست سے اُچھلنا بھی پڑ گیا، کیونکہ شاید میرا آخری الذکر خدشہ درست ثابت ہوا تھا، مہارانی صاحبہ کو شدید ذہنی دباؤ کے باعث غش آ گیا تھا اور اپنی نشست پر وہ ایک طرف کو لڑھک گئی تھی۔ میں گھبرا گیا۔

اُٹھ کر میں اس کو سنبھالنے کو لپکا۔ اسے سیدھا کیا اور پھر پانی کا گلاس لے کر چند چھینٹے اس کے چہرے پر پھینکے۔ بہ حالت مجبوری اس کے نرم و گداز رخسار تھپتھپائے۔ شکر ہوا کہ وہ ہوش میں آ گئی۔ اِدھر اُدھر سر مارنے کے بعد اس نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور ایک گہری سانس لی۔

''آ...... آپ ٹھیک ہیں نا...... مہارانی صاحبہ؟'' میں نے ہولے سے کہا۔

''ہاں!'' اس نے ہولے سے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی تھی۔

''میرا خیال ہے میں آپ کو کمرے تک چھوڑ آؤں، پھر کبھی اس موضوع پر بات کر لیں گے۔''

''نہیں، تم بیٹھو......'' اس نے سنبھالا لیتے ہوئے کہا۔ ''آج میں تمہیں اپنا درد بتا کر ہی رہوں گی ورنہ مجھے چین نہیں ملے گا۔''

میں خاموشی سے دوبارہ سامنے والی نشست پر جا بیٹھا۔ اس نے چند لمحے کے لیے تامل کیا پھر بتانے لگی۔

''سیف! ٹھاکر ہری داس مجھ سے بے اندازہ محبت کرتے تھے۔ اُنہوں نے جب مجھ سے شادی کی تو نہ صرف انہیں ریاست کے چند معتبر طبقوں کی بلکہ اپنی جوان اولادوں کی بھی سخت تنقید اور مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس لیے کہ میں ایک غریب شخص کی بیٹی تھی۔'' اس نے اپنے بارے میں بتانا شروع کیا۔

''ان باتوں کی مجھے پروا رہی نہ مہاراجا ہری داس کو...... میری سوتیلی اولاد، جس نے شروع ہی سے مجھے قبول نہیں کیا تھا، میرے خلاف محلاتی سازشوں میں مصروف ہو گئی، جو آج تک مصروف کار ہیں، میرا سوتیلا بیٹا منوج باپ سے ناراض ہو کر انوپ گڑھ جا بسا، میری بڑی سوتیلی بیٹی وشنی بھی اپنے پتی کے ساتھ بیاہ کر گئی تو آج تک نہیں پلٹی، چھوٹا سرنج اور چھوٹی کورا...... اپنے بڑے بھائی منوج کے پاس رہنے لگے۔ یہ ان لوگوں کی سازشوں کی پے در پے ناکامی کے بعد آخری چال تھی، کیونکہ وہ اپنے باپ کی اس کمزوری سے اچھی طرح واقف تھے کہ اولاد کی دوری ان سے برداشت نہ ہو گی۔ وہی ہوا، ہری داس کو یہی صدمہ اب ایک روگ کی طرح کھانے لگا ہے۔ مجھے ڈر ہے...... اگر کہیں انہیں کچھ ہو گیا تو میں بھی نہیں بچوں گی......'' وہ اتنا کہتے ہی رو دی۔ میں ہونٹ بھینچے یہ سب سنتا رہا۔ وہ آنسوؤں کے درمیان مجھ سے مخاطب ہو کے اور ملتجی لہجے میں دوبارہ بولی۔

''سیف! میری مدد کرو، ہری داس کو پھر سے بھلا چنگا کر دو، ان کے علاج پر پوری توجہ دو، جو تمہیں چاہیے وہ میں تمہیں دوں گی...... کیونکہ اگر انہیں کچھ ہو گیا تو میں اکیلی رہ جاؤں گی۔''

''آپ حوصلہ کریں مہارانی صاحبہ......!'' بالآخر میں نے کہا۔ ''میں ٹھاکر صاحب کا علاج کرنے کی پوری کوشش کروں گا لیکن آپ کو بہرحال اپنے مستقبل کے لیے بھی کچھ سوچنا چاہیے، آپ معمولی خاتون نہیں ہیں، مہارانی ہیں۔''

''میں کیا سوچوں؟ میری سوتیلی اولاد کھل کر میرے سامنے آ جائے گی، تم نہیں جانتے کہ مجھے خفیہ طور پر دو بار ہلاک کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔''

اس کے آخری انکشاف نے میرے پورے وجود میں سنسنی سی پھیلا دی۔ میں سمجھ سکتا تھا کہ یہاں کیا کھچڑی پک رہی ہے اور جیسا کہ اس مہارانی صاحبہ نے آخر میں ایک سنسنی خیز انکشاف کر کے میرا دل بھی دہلا دیا تھا تو مجھے سمجھ لینا چاہیے تھا کہ یہاں اب لینے کے دینے پڑنے میں چنداں دیر نہیں...... یعنی ان محلاتی سازشوں کے نرغے میں، خود میں بھی آ سکتا ہوں۔ مجھے ان محلاتی سازشوں سے بچنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ گویا اس سے پہلے کہ مہاراجا ہری داس انتقال فرما جائیں، مجھے جوان مہارانی صاحبہ کا نجات دہندہ بننے کے بجائے یہاں سے فی الفور کوچ کر لینا چاہیے۔ یہی میرے لیے بہتر ہوتا۔

ابھی میں یہاں سے کوچ کرنے کے بارے میں سوچ بچار ہی کر رہا تھا کہ اچانک حویلی میں شور مچ گیا۔

''مہاراجا ہری داس کا دیہانت ہو گیا ہے......''

یہ منحوس اعلان سنتے ہی میرے پورے وجود میں سنسنی دوڑ گئی اور میں حواس باختہ ہو گیا۔

ان دیکھے دشمنی کے جال میں جکڑے نوجوان کی مزید مشکلات آئندہ ماہ پڑھیں

او تے مانگ کا آبائی وطن منگولیا تھا۔ اس کے دادا
نے منگولیا سے ہجرت کی اور بہت طویل سفر طے کر کے وہ
تھائی لینڈ میں آباد ہوئے تھے۔ تھائی لینڈ کی نیشنلٹی حاصل
کرنے کے لیے اس کے دادا کو بڑی قربانی دینی پڑی تھی۔
انہوں نے اپنی دو بیٹیاں جن کی عمریں دس اور بارہ سال
تھیں، ایک مافیا کے حوالے کی تھیں۔ یہ مافیا بنکاک، پوکھیت
اور پتایا میں کئی مساج ہاؤس چلاتی تھی۔ اسی مافیا کے ذریعے
دادا کی پوری فیملی کو تھائی نیشنلٹی ملی تھی۔

انجام

احمد جعفری

اچھے کام کرنے والے خسارے میں رہتے ہوئے بھی فائدے میں رہتے
ہیں... اور بُرے کام کرنے والے عیش و عشرت کے مزے لینے کے باوجود
خسارے کا سودا کر بیٹھتے ہیں۔ پریوں اور تتلیوں کی سرزمین پر
محوِ پرواز کہانی کے مختلف رنگ...

عشق اور کام میں ڈوبے شخص کی نادیدہ منزلیں

اوتے مانگ اپنے حلقۂ احباب میں اوتے کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اوتے مانگ تھائی لوگوں کے برعکس اونچے قد، تقریباً چھ فٹ سے نکلا ہوا، صحت مند مضبوط جسم، سرخی مائل رنگ روپ کا حامل تھا جبکہ تھائی لوگوں کا رنگ پیلاہٹ لیے ہوئے ہوتا ہے۔ اوتے اسی بنا پر تھائی نوعمر لڑکیوں میں کافی مقبول تھا۔

اس کے باپ کی بنکاک میں پچ پوری روڈ پر ایک چھوٹی سی ٹریول اینڈ ٹورز ایجنسی تھی جب اوتے کے باپ کی ڈیتھ ہوئی اس وقت اس کی عمر پچیس سال تھی۔ اچھی یونی ورسٹی سے گریجویٹ تھا۔ بہت اچھی انگلش بولتا تھا۔ تھائی کے علاوہ آس پڑوس کے کئی ملکوں کی زبان سے بھی اچھی طرح واقف تھا۔

باپ کے مرنے کے بعد اوتے نے ٹریول ایجنسی کے بزنس کو کافی ترقی دی۔ اب اس کی ایجنسی پسنجرز کے علاقہ کارگو بزنس کو بھی ڈیل کرتی تھی۔

اوتے کی بیوی پاتھ کا آبائی تعلق ہونائے ویت نام سے تھا۔ جب ویت نام میں امریکا کی دراندازی بہت زیادہ بڑھ گئی تو پاتھ کا خاندان ہونائے سے ہجرت کر کے پہلے کمبوڈیا آیا پھر کچھ عرصے بعد تھائی لینڈ میں داخل ہو گیا۔ اوتے کی طرح پاتھ کی پیدائش بھی بنکاک میں ہوئی تھی۔

اوتے اور اس کی بیوی پاتھ دونوں بزنس مائنڈڈ تھے۔ دونوں ایجنسی کے بزنس کو آگے بڑھانے کے لیے بہت محنت کرتے تھے۔ پاتھ تھائی لڑکیوں کے مقابلے میں بہت خوب صورت تھی۔ لمبا قد، بھرا بھرا جسم، گداز ہونٹ! ایسی خوب صورتی تھائی لڑکیوں میں خال خال ہی نظر آتی تھی۔

پاتھ کے ساتھ شادی کے بعد بھی اوتے کی غیر اخلاقی سرگرمیاں جاری تھیں۔ وہ ہفتہ دس دن کے بعد کسی نہ کسی نو عمر لڑکی کے ساتھ چار پانچ گھنٹے کسی ہوٹل کے کمرے میں ضرور گزارتا تھا۔ اس غرض کے لیے بنکاک میں بہت ہوٹل تھے۔ ایسے ہوٹلوں کے نام کے بجائے نمبر ہوتے تھے جیسے ہوٹل 69، ہوٹل 39، ہوٹل 89 وغیرہ۔ ایسے ہوٹلوں کا کرایہ گھنٹوں کے حساب سے چارج ہوتا تھا۔ شراب اور کھانے پینے کے چارجز اس کے علاوہ تھے۔

پاتھ، اوتے کی ان سرگرمیوں سے خوب واقف تھی مگر مجبور تھی۔ تھائی لینڈ میں مرد اور عورت کی نسبت ایک اور تین کی تھی یعنی ایک مرد کے مقابلے میں تین عورتیں۔ اسی لیے لڑکیوں میں بوائے فرینڈ کے لیے اکثر جھگڑے ہوتے رہتے تھے۔

پاتھ بھی اس معاملے میں کچھ کم نہ تھی۔ اسے کوئی امریکن سیاح پسند آ جاتا تھا تو اس کے ساتھ پورے دن کے لیے نکل جاتی تھی۔ اکثر یہ بھی ہوتا تھا کہ امریکن یورپین سیاحوں کو کورل آئی لینڈز کی سیر کرانے کے لیے پاتھ ان کے ساتھ جاتی تھی۔ ایسے گروپس دو تین دن سمندر میں بوٹس پر گزارتے تھے۔ پاتھ کو شکار کھیلنے کا موقع مل ہی جاتا تھا۔

ان کی ٹریول اینڈ ٹورز ایجنسی کی انکم کافی تھی لیکن اخراجات بھی بہت تھے۔ چھ آدمیوں کا عملہ تھا۔ ایک سپروائزر تھا۔ نام تھا قسیم۔ وہ پاتھ کا کزن تھا اور زیادہ تر کارگو کا بزنس ڈیل کرتا تھا۔

پاتھ مطمئن نہیں تھی اس کے اونچے خواب تھے۔ وہ چاہتی تھی کہ ہماری انکم اتنی ہو کہ ہم دو لیٹسٹ ماڈل کی کاریں خرید سکیں اور ایک کار اور ایک کارگو ویگن ایجنسی کے لیے ہو۔ پوش علاقے میں فلی فرنشڈ ہاؤس ہو۔ گھر پر دو ملازم ہوں۔

ایک رات ڈنر کے بعد پاتھ نے کہا۔ ”اوتے ہمیں ہونائے ویت نام کا وزٹ کرنا ہے۔“

اوتے اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔ ”یہ تمہیں یکا یک ہونائے کی کیا سوجھی ہے۔ وہاں اب تمہارا کون ہوگا؟“

”اوتے اٹھ کر بیٹھو۔ میں تمہیں تفصیل سے بتاتی ہوں کہ ہمیں ہونائے کیوں جانا ہے۔ میرے دادا کے ایک بھائی کی فیملی ابھی تک ہونائے میں ہی ہے۔ ان کی اولادیں وہیں کھیتی باڑی اور مچھلیوں کے کاروبار سے منسلک ہیں۔ ان کی اولادوں میں سے ایک لڑکی میری ہم عمر ہے، اس کا نام نونگ ہے، اس نے کسی نہ کسی طرح میرا پتا نکالا اور سیل پر مجھ سے بات کی ہے۔ اس نے ہمیں انوائٹ کیا ہے۔“

”پاتھ وہاں جانے میں خرچہ بہت ہوگا اور فائدہ کچھ نہیں۔“

”اوتے ذرا دھیان سے سنو۔ نونگ نے بتایا ہے کہ وہاں اب حالات کافی بہتر ہیں لیکن نوجوان طبقہ مطمئن نہیں ہے۔ وہ زیادہ پیسے کمانے کے لیے مڈل ایسٹ یا یورپ جانا چاہتے ہیں لیکن حکومت کی طرف سے بہت سختی ہے۔ پاسپورٹ بہت مشکل سے ملتا ہے۔ ہم وہاں سے لیبر ہائر کریں گے اور ان کو یہاں لا کر تھائی پاسپورٹ پر مڈل ایسٹ بھجوائیں گے لیبر ویزے پر۔“

اوتے سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے کہا۔ ”دیکھو پاتھ میں ائر کوریا سے دو بزنس کلاس فری ٹکٹس

حاصل کر سکتا ہوں، آخر ہم انہیں بزنس دیتے ہیں لیکن کئی باتیں الجھن والی ہیں۔ نمبر ایک ہمیں ویت نام کا ویزا کیسے ملے گا۔ دوسرے ہم وہاں سے لیبر کیسے لائیں گے۔ پھر ان کے لیے تھائی پاسپورٹ اور ان کی مڈل ایسٹ میں نوکری وغیرہ۔''

پاتھ نے ٹھنڈی سانس بھری۔''اوتے، میں نے ان سب باتوں پر کئی دن تک سوچا ہے اور میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ یہ کام مشکل ضرور ہے لیکن ہم کر سکتے ہیں اس میں بہت پیسا ہے۔ میں تمہیں ایک ایک کر کے سمجھاتی ہوں۔ نمبر ایک ویت نام کا ویزا۔ میری کزن نونگ وہاں سے ہم دونوں کو انوائٹ کرے گی پھر ہمارے پاس اچھی خاصی بڑی ٹریول ایجنسی ہے اس کے کاغذات دکھائیں گے۔ ہمارے پاس ائرکوریا کے فری ٹکٹ ہوں گے۔ امید ہے ہمیں آسانی سے ویزا مل جائے گا۔ میری کزن نونگ وہاں ایک بڑی فیکٹری میں اونچی پوزیشن پر کام کر رہی ہے۔ ہم اسی کے گھر پر ٹھہریں گے۔ ہماری غیر موجودگی میں ٹریول ایجنسی میرا کزن تسیم سنبھالے گا۔ یہاں تک کلیئر ہو گیا۔''

''چلو پاتھ، ہم ہونائے پہنچ گئے پھر کیا ہوگا؟''

''اوتے وہاں ایسے نوجوانوں کی لائن لگی ہوئی ہے جو زیادہ پیسے کمانے کے چکر میں میڈل ایسٹ جانا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو نونگ کے ذریعے انٹرویو کے لیے بلایا جائے گا۔ نونگ اور تم ان سے انٹرویو کرو گے۔ وہاں کی زبان چینی اور تھائی سے تھوڑی ملتی ہے۔ جو لوگ 25 ہزار ڈالرز افورڈ کر سکتے ہیں ان کا پورا ڈیٹا بنا لینا ان سے کہنا کہ پہلے ہم لیبر ویزا پر ان کی نوکریوں کا بندوبست کریں گے پھر ان کو دس دس کے گروپس میں یہاں لے کر آئیں گے۔ زمینی راستے سے انہیں تم یہاں لے کر آؤ گے۔''

اوتے اچھل پڑا۔''زمینی راستے سے۔ پاتھ تمہارا دماغ درست ہے۔ زمینی راستہ کتنا خطرناک ہے۔ پورا راستہ خوفناک جنگلات سے بھرا ہوا ہے جہاں ہزاروں سانپ، اژدھے، ہاتھی، گینڈے اور جگہ جگہ دریا ندی نالے ہیں جن میں ہزاروں کی تعداد میں مگرمچھ منہ کھولے پڑے رہتے ہیں۔ پھر کمبوڈیا کے راستے تھائی لینڈ میں داخل ہونا ہو گا۔ کمبوڈیا کا علاقہ بہت لمبا ہے۔ میں اگر جنگل کے رینجرز کی گولیوں سے بچ بھی گیا تو کوئی نہ کوئی مگرمچھ مجھے ہڑپ کر جائے گا۔ تم یہاں تالیاں بجاتی رہنا۔''

''اوتے، اوتے اتنا مت ڈرو۔ میں نے گوگل ارتھ پر سرچ کر کے ایسے پوائنٹس نوٹ کر لیے ہیں جہاں سے ویت نام سے کمبوڈیا اور کمبوڈیا سے تھائی لینڈ میں داخل ہوا جا سکتا ہے۔ میں نے پورا نقشہ بنا لیا ہے جس میں جنگل کے اندر جگہ جگہ پگوڈا کی نشان دہی کی گئی ہے وہاں تم رات کو یا بارش میں ٹھہر سکتے ہو۔ عبادت گزار مونک کوئی سوال نہیں کرتے، وہ مسافروں کی مدد کر کے خوش ہوتے ہیں۔ جب تم دس لیبرز کے ساتھ یہاں پہنچ جاؤ گے تو ہم ان کے تھائی پاسپورٹ بنوائیں گے اس میں کافی ڈالرز خرچ ہو جائیں گے پھر نوکری دلوانے والی ایجنسیاں بھی خرچے کے علاوہ کافی ڈالرز اوپر سے لیں گی پھر ہم انہیں خلیج کے ملکوں میں بھیج دیں گے اس پورے چکر میں ہمیں دس سے پندرہ ہزار ڈالرز فی لیبر منافع ہوگا۔''

''پاتھ تمہارا دماغ ہے یا شیطان کا چرخہ۔ نہ بابا یہ بہت خطرناک مشن ہے پھر صرف دس بارہ ہزار ڈالر منافع۔''

''اوتے! ذرا حساب تو لگاؤ۔ ایک لیبر پر اگر دس ہزار ڈالرز بھی بچ گئے تو دس لیبرز پر ایک لاکھ ڈالرز کمائیں گے۔ پھر جہاں تک ممکن ہوا ہم اخراجات میں ڈنڈی ماریں گے۔ اگر تم نے ایک سال میں دس پھیرے بھی لگائے تو دس بارہ لاکھ ڈالرز کہیں نہیں گئے۔''

اوتے نے سوچتے ہوئے کہا۔''ہاں یہ تو اچھی خاصی رقم ہے۔ چلو پہلے ہم ہونائے کا وزٹ کرتے ہیں۔ پھر بات آگے بڑھائیں گے۔''

☆☆☆

ہونائے کا ائرپورٹ دیکھ کر اوتے مانگ کو بڑی مایوسی ہوئی۔ بنکاک کا ائرپورٹ جہاں 75 گیٹ تھے۔ سیاحوں کا ہجوم۔ ہر دومنٹ کے بعد فلائٹس کی لینڈنگ اور ٹیک آف۔ کہاں ہونائے کا تقریباً سنسان ائرپورٹ۔ ائرٹریفک تھا مگر بہت کم۔

دونوں امیگریشن اور کسٹم کی سخت چیکنگ کے بعد باہر آئے تو نونگ اور اس کا شوہر سویت ان کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ ابتدائی ہیلو ہائے کے بعد وہ نونگ کے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔

باہر بہت شدید بارش ہو رہی تھی جس کی وجہ سے موسم خوشگوار تھا۔ نونگ کی کار پرانی کسی کمیونسٹ ملک کی بنی ہوئی تھی مگر اچھی حالت میں تھی اور ائرکنڈیشنڈ تھی۔

نونگ کا گھر شہر سے باہر اچھے علاقے میں تھا اور بہت بڑے احاطے میں تھا۔ احاطے میں خوب صورت لان تھا اور چہار دیواری کے ساتھ کئی لیچی، ناریل اور پائن ایپل کے درخت تھے۔ باقی جگہ پر نونگ نے سبزیاں اگائی ہوئی

تھیں۔ مکان میں کئی بیڈ رومز تھے۔ وسیع سٹنگ ایریا تھا۔ لوکل میڈیا ٹی وی لگا ہوا تھا جس پر صرف مقامی پروگرام آتے تھے۔

لنچ کے بعد چند گھنٹے آرام کرنے کے بعد سٹنگ ایریا میں محفل جمی۔ بارش بند ہوگئی تھی گرمی تھوڑی سی بڑھ گئی تھی۔ نونگ اور اس کا شوہر سویت اچھی انگلش بولتے تھے ویسے بھی یہاں کی زبان چینی اور تھائی زبان سے بہت ملتی جلتی تھی۔

اوتے اور نونگ کا شوہر الگ بیٹھے ہوئے باتیں کررہے تھے۔ کچھ دیر کے بعد اوتے اپنی دلچسپی کے موضوع پر آگیا۔ ''سویت میں نے ہونائے ائرپورٹ اور راستے میں لڑکیاں دیکھی ہیں۔ یہاں کی لڑکیوں میں تیکھا پن ہے اور اٹریکشن ہے۔ رنگ و روپ سانولا مگر سرخی مائل ہے۔ ناک لمبی اور ستواں ہے، آنکھیں بڑی بڑی اور مقناطیسی ہیں۔ جسم بھی بھرا بھرا ہے جبکہ تھائی لڑکیوں کا رنگ پیلا آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور سینہ تقریباً سپاٹ ہوتا ہے۔''

سویت نے قہقہہ لگایا۔ ''اوتے تم نے خوب نقشہ کھینچا ہے۔ خاصے شوقین مزاج معلوم ہوتے ہو۔ ہاں یہاں بیس پچیس پرسنٹ لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں جیسا کہ تم کہہ رہے ہو۔ ان کی ہسٹری یہ ہے کہ ساٹھ ستر سال پہلے یہاں امریکن گھس آئے تھے۔ وہ دس بارہ سال تک یہاں ویت کانگ گوریلوں سے لڑتے رہے۔ آخر امریکن ساٹھ ہزار جانیں گنوا کر یہاں سے بھاگ گئے۔ امریکیوں نے یہاں قیام کے دوران ویتنامی لڑکیوں سے دوستیاں کیں، انہیں گرل فرینڈ بنایا۔ ان سے شادیاں کیں اور اولادیں بھی پیدا کیں لیکن جب امریکن بھاگے تو سب کو چھوڑ چھاڑ کر بھاگے۔ یہ خوب صورت لڑکیاں انہی کی نسل در نسل سے ہیں۔''

اوتے بڑی دلچسپی سے سویت کی باتیں سن رہا تھا، اس کی دلچسپی دیکھتے ہوئے سویت نے مزید کہا۔ ''اوتے میں یہاں مچھلیوں کا کاروبار کرتا ہوں۔ میرے پاس فرسٹ کلاس فشنگ بوٹ ہے۔ میرا ایک کزن اس کاروبار میں میرا شریک ہے۔ ایک پھیرا سمندر کا میں لگاتا ہوں اور پھر ایک پھیرا میرا کزن لگاتا ہے۔ ہمارا ایک پھیرا دو ڈھائی دن کا ہوتا ہے۔ مچھلیاں رکھنے کے لیے بوٹ میں کولڈ اسٹوریج ہے جب کولڈ اسٹوریج بھر جاتا ہے تو ہم مچھلیاں فش ہاربر پر جاکر ایک آڑھتی کے حوالے کردیتے ہیں۔ تمہاری دلچسپی کی بات یہ ہے کہ بوٹ پر بارہ افراد کا عملہ ہے۔ پانچ مرد اور سات نوعمر صحت مند اور خوب صورت لڑکیاں۔ سب کو آپریٹو اور تمہارے مطلب کی ہیں۔ کسی دن میرے ساتھ چلنا۔''

اوتے نے قہقہہ لگاتے ہوئے سویت کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ ''میں ضرور چلوں گا مگر پہلے پاتھ کا کام ہوجائے اس کے بعد ہمارا عیش ٹرپ ہوگا۔''

دوسرے کونے پر پاتھ اور نونگ سر جوڑے بیٹھی تھیں۔ پاتھ پہلے ہی نونگ کو اپنا پلان بتا چکی تھی۔ نونگ نے کہا۔ ''پاتھ اس میں بہت خطرہ ہے۔ پہلے مرحلے میں بالکل خاموشی سے دس ایسے آدمیوں کا اکٹھا کرنا جو پچیس ہزار ڈالرز افورڈ کرسکتے ہوں۔ پھر پیدل اوتے کی سربراہی میں پہلے کمبوڈیا اور پھر تھائی لینڈ میں داخل ہونا۔ پورا راستہ خوفناک جنگلات سے بھرا ہوا ہے۔ یہ بڑا لمبا راستہ ہے، میری مانو پاتھ تم کمبوڈیا کا راستہ مت اختیار کرو۔ یہ بہت لمبا راستہ ہے تقریباً بارہ چودہ سو کلومیٹر لمبا۔ تم لیبرز کو کمبوڈیا کے بجائے لاؤس کے راستے لے جاؤ۔ ویت نام اور تھائی لینڈ کے درمیان صرف دو ڈھائی سو کلومیٹر کا علاقہ لاؤس کا ہے۔ یہ بھی گھنے جنگلات سے پُر ہے مگر فاصلہ تو کم ہے جو صرف دو تین دن میں عبور کیا جاسکتا ہے۔ میں تمہیں نقشہ دکھاؤں گی۔''

نونگ نے نقشہ نکال کر پھیلایا۔ ''دیکھو پاتھ یہ ایکس ہونگ شہر ہے۔ یہ ویت نام اور لاؤس کی سرحد پر بارڈر سٹی ہے اور یہ دیکھو وان تین سٹی پر تھائی لینڈ کا بارڈر سٹی ہے۔ دونوں کا فاصلہ مشکل سے دو ڈھائی سو کلومیٹر ہے جو لاؤس کا علاقہ ہے۔ اب بولو کیا کہتی ہو؟''

پاتھ سوچ میں پڑ گئی۔ ''تمہاری بات میں وزن ہے۔ نونگ یہ نقشہ مجھے دے دو۔ میں رات کو اوتے کو دکھاؤں گی۔ دیکھیں وہ کیا کہتا ہے۔ نونگ دو باتیں ہیں جو میرے دماغ میں فٹ نہیں ہورہی ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے پچیس ہزار ڈالرز بڑی رقم ہے اتنی رقم وہ کیسے اکٹھی کریں گے اور جس کے پاس اتنی خطیر رقم ہوگی وہ باہر جاکر کیوں نوکری کرے گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان کے پاس تھائی پاسپورٹ ہوگا اگر یہ دو تین سال نوکری کرکے واپس تھائی لینڈ آگئے تو ہمارے لیے مصیبت کھڑی ہوجائے گی۔''

''پاتھ تم نے کئی باتیں ایک ساتھ پوچھی ہیں۔ میں ایک ایک کرکے بتاتی ہوں۔ یہ یہاں کی سختی سے پریشان اور اس گھٹن سے نکلنا چاہتے ہیں۔ دوسری بات، یہ لوگ بہ آسانی پچیس ہزار ڈالرز جمع کرلیں گے ان کا پورا خاندان جنگلی جانوروں کو پکڑتا ہے اور باہر کی پارٹیوں کو سپلائی کردیتا

ہے۔ اس کے علاوہ یہ لوگ گینڈے کا غیر قانونی شکار کرتے ہیں اور اس کا سینگ دس ہزار ڈالرز میں چینیوں کے ہاتھوں فروخت کر دیتے ہیں۔ چین میں یہ بات مشہور ہے کہ گینڈے کے سینگ کے سوپ میں ہر قسم کے کینسر کا علاج موجود ہے۔ اس لیے گینڈوں کا بے تحاشا شکار ہو رہا ہے اور ان کی نسل ختم ہوتی جا رہی ہے۔ اب رہی بات ان کے واپس آنے کی۔ ایک دفعہ یہ یہاں سے نکل گئے تو واپس نہیں آئیں گے۔ دو تین سال مڈل ایسٹ میں نوکری کر کے یہ آگے نکل جائیں گے، گریک، اٹلی کی طرف۔ تو پاتھ اس معاملے میں تم مطمئن رہو۔''

☆☆☆

ڈنر کے بعد اوتے اور پاتھ اپنے بیڈ روم میں چلے گئے۔ پاتھ نے کہا۔''اوتے! نوتنگ نے کچھ باتیں بتائی ہیں اور کچھ مشورے دیے ہیں جو مجھے بہت معقول لگے، تم بھی سنو اور اپنا مشورہ دو۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ لیبرز کے ساتھ پہلے کمبوڈیا میں داخل ہونا پھر پورے کمبوڈیا کو کراس کر کے تھائی لینڈ میں داخل ہونا بہت رسکی ہے اور بہت لمبا راستہ ہے۔ تقریباً پندرہ سو کلومیٹر طویل۔ اس نے مشورہ دیا کہ تم لیبرز کو لے کر لاؤس کے راستے تھائی لینڈ جاؤ۔ فاصلہ صرف دو سو کلومیٹر ہے جو دو تین دن میں طے کیا جا سکتا ہے۔ یہ دیکھو نقشہ۔ اس نے بارڈر سٹیز پر نشان لگا دیے ہیں۔''

اوتے نے بڑے غور سے نقشے کا مطالعہ کیا پھر بولا۔ ''نوتنگ درست کہتی ہے۔ تعجب ہے یہ راستہ ہمیں پہلے کیوں نہیں دکھائی دیا۔ یہ تو بہت مختصر راستہ ہے بس اس پر ڈن ہو گیا اور کیا کہا ہے تمہاری کزن نے۔''

''وہ کہتی ہے کہ وہ دس افراد کا گروپ اکٹھا کرے گی۔ ان سے پچیس ہزار ڈالرز وہ وصول کرے گی۔ جب تم گروپ کو لینے آؤ گے تو دو ہزار ڈالرز کاٹ کر تئیس ہزار ڈالر نی کس تمہارے حوالے کر دے گی۔ دو ہزار ڈالر اس کی فیس ہوگی اس لیے کہ فرنٹ لائن پر وہی ہوگی۔ باقی ذمے داری تمہاری ہوگی، ایگری؟''

''ایگری۔ پاتھ اب واپس چلنے کی تیاری کرو۔''

☆☆☆

نوتنگ نے بہت تیزی دکھائی۔ ایک ماہ کے بعد ہی اس کا فون آ گیا۔''دس آدمیوں کا گروپ بن گیا ہے۔ میں نے ہر ایک سے پچیس ہزار ڈالرز وصول کر لیے ہیں۔ اوتے مانگ کا انتظار ہے۔''

اوتے مانگ پہلے سے تیار حالت میں تھا۔ دیگر سامان کے علاوہ سانپ کے زہر کے توڑ کے انجکشن دوائیں، فولڈنگ چھتری۔ چھوٹی کلہاڑی، دوربین خرید کر اپنے رک سیک میں رکھ لیں۔

اتوار کی صبح دس بجے اوتے اور پاتھ بنکاک سے تھائی لاؤس کے بارڈر سٹی وان تین کی طرف روانہ ہوئے۔ وان تین تک سڑک بہت اچھی تھی۔ وہ شام پانچ بجے کے قریب وہاں پہنچ گئے۔ یہاں سرحدی چیک پوسٹ تھی۔ اس چیک پوسٹ سے اوتے کو گزرنا بھی نہیں تھا۔ وہ چیک پوسٹ سے لاؤس کی سرحد کے ساتھ ساتھ مشرق کی طرف دس کلومیٹر تک آئے۔ یہاں گھنا جنگل تھا۔ یہاں سے بہ آسانی لاؤس کی سرحد میں داخل ہوا جا سکتا تھا۔

پاتھ نے سرحد کے ساتھ کار روک دی۔''اوتے کیا فیل کر رہے ہو۔ سرحد کے پار جنگل ہے۔ دریا ندی نالے ہیں۔ اچھی بات یہ ہے کہ جگہ جگہ پگوڈا ہیں وہاں تم رات گزار سکتے ہو۔ مونک عبادت گزار حد تک بہت مہمان نواز ہوتے ہیں۔''

اوتے نے کہا۔''سچی بات ہے کہ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ جنگلی جانوروں کے علاوہ فورسٹ رینجرز کا بھی ڈر ہے۔ وہ تو دیکھتے ہی گولی مار دیتے ہیں۔ اس وقت تو رات ہو رہی ہے میرا خیال ہے کہ مجھے کل صبح چھ بجے سرحد کراس کرنی چاہیے۔ شام تک میں کافی فاصلہ کور کر لوں گا۔''

''ٹھیک ہے اوتے، رات کو ہم وان تین میں کسی ہوٹل میں ٹھہر جاتے ہیں۔ صبح میں تمہیں اسی پوائنٹ پر لے آؤں گی۔ اوتے ڈرومت۔ مجھے یقین ہے تمہیں کچھ نہیں ہو گا، تم خیریت سے ہونائے پہنچ جاؤ گے۔''

وہ رات انہوں نے ایک ہوٹل میں گزاری اور صبح اسی پوائنٹ پر آ گئے۔ اوتے نے پاؤں میں حفاظتی جوتے پہنے جن کی موٹائی دو انچ تھی تاکہ چھوٹے موٹے سانپوں کے دانت جلد تک نہ پہنچ سکیں۔ سر پر بھی حفاظتی ٹوپی تھی جو درختوں پر لٹکتے ہوئے سانپوں سے بچا سکتی تھی۔ ایک ہاتھ میں اسٹک پکڑی دوسرے ہاتھ میں کلہاڑی۔ لمبا کوٹ پہنا اور اپنے عقیدے کے مطابق دعائیں پڑھتا ہوا لاؤس کی سرحد میں داخل ہو گیا۔

پاتھ ایک گھنٹے تک وہاں رکی رہی پھر کار موڑ کر بنکاک کی طرف روانہ ہو گئی۔

اوتے مانگ کلہاڑی سے درختوں کی جھکی ہوئی شاخیں کاٹتا ہوا تیزی سے آگے بڑھتا رہا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ایک خاص قسم کی چھڑی تھی جس کا ایک بٹن دبانے

سے چھڑی کی نوک سے چنگاریاں نکلتی تھیں جن کو دیکھ کر سانپ اور دوسرے جانور بھاگ جاتے تھے۔ جنگل اتنا گھنا تھا کہ سورج کی روشنی بہت کم زمین تک پہنچ رہی تھی۔

اوتے چھ گھنٹے تک تیزی سے آگے بڑھتا رہا۔ بارہ بجے اس نے لنچ کے لیے وقفہ کیا اور ایک پہاڑی کی کھوہ میں بیٹھ کر کافی کے ساتھ سینڈوچز کھانے لگا۔ اسی وقت گرج چمک کے ساتھ موسلا دھار بارش شروع ہوگئی جو پندرہ منٹ تک جاری رہی پھر بادل کسی اور طرف نکل گئے۔ دھوپ دوبارہ نکل آئی۔ لنچ کے بعد اوتے نے دوبارہ سفر شروع کیا۔ اس کے پاس چھوٹا سا کمپاس تھا جس میں وہ سمت دیکھتا جارہا تھا۔

شام کو وہ ایک دریا کے کنارے پہنچا۔ دریا کے کنارے پر درجنوں مگرمچھ منہ کھولے ڈوبتے سورج کی آخری کرنوں کا مزہ لے رہے تھے۔ دریا کے پار ایک چھوٹی پہاڑی پر ایک پگوڈا کی عمارت صاف نظر آرہی تھی۔

اوتے سوچ میں پڑ گیا۔ پگوڈا تک کیسے پہنچا جائے۔ بیچ میں دریا تھا اور خوفناک مگرمچھ۔ اوتے کی خوش قسمتی کہ اسے دریا میں گزرتی ہوئی ایک کشتی نظر آئی۔ کشتی میں کیلے اور پائن ایپل لدے ہوئے تھے۔ اوتے نے زور زور سے چیخ کر کشتی والوں کو اپنی طرف متوجہ کیا اور اشاروں سے بتایا کہ دریا کے پار جانا چاہتا ہے۔ کشتی کے ملاح نے ہاتھ سے اشارہ کر کے اسے انتظار کرنے کو کہا اور کشتی کو موڑ کر دریا کے کنارے پر لگے ایک گھنے درخت کے نیچے لے آیا۔ درخت کی شاخیں کافی دور تک دریا کے پانی پر جھکی ہوئی تھیں۔ ملاح نے چیخ کر کہا۔ ''اس درخت پر چڑھ جاؤ اور شاخوں کے ذریعے اترتے ہوئے کشتی میں کود جاؤ۔ کشتی مگرمچھوں کی وجہ سے کنارے پر نہیں آسکتی۔''

اوتے کو بات سمجھ میں آگئی۔ اس نے اپنے رک سیک کی بیلٹس اچھی طرح کسیں اور درخت پر چڑھ گیا۔ درخت پر بندروں کے ایک خاندان نے بسیرا جمایا ہوا تھا۔ انہوں نے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھالیا۔ اوتے نے اپنی چھڑی ان کی طرف کر کے بٹن دبا دیا۔ چھڑی سے چنگاریاں سی نکلیں۔ بندر ڈر کر دوسرے درختوں پر کود گئے۔ اوتے آرام سے تنے سے ہوتا ہوا شاخ پکڑ کر کشتی میں کود گیا۔ اس کا چہرہ سفید پڑا ہوا تھا اور پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ ملاح نے فوراً ناریل کا ڈاب کاٹ کر اسے دیا۔ ڈاب کا پانی اتنا ٹھنڈا اور میٹھا تھا کہ اوتے کی تمام تھکن دور ہوگئی۔ اس نے ملاح کو بتایا کہ وہ دوسرے کنارے پر بنے پگوڈا پر عبادت کے لیے جانا چاہتا ہے۔

کشتی نے پانچ منٹ میں ہی دریا کے دوسرے کنارے پر پہنچا دیا۔ یہاں مگرمچھ نہیں تھے۔ اوتے نے اپنی خفیہ جیب سے پانچ سو تھائی بھات (تھائی کرنسی) نکال کر ملاح کو دیے۔ ملاح بہت خوش ہوا اور سلام کرتا ہوا رخصت ہوگیا۔

رات کی سیاہی پھیلنی شروع ہوگئی تھی۔ اوتے جلدی جلدی قدم اٹھاتا ہوا چھوٹی سی پہاڑی پر چڑھ کر پگوڈا کے دروازے پر پہنچ گیا۔ اس نے رسی کھینچ کر پگوڈا کی گھنٹی بجائی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک نوجوان مونک جو ہلکے براؤن لباس میں تھا، دروازے پر نمودار ہوا۔ اوتے نے بڑے ادب سے اسے سلام کیا اور پناہ کی درخواست کی۔ مونک اسے اندر لے گیا۔ اندر بہت بڑا ہال تھا، جگہ جگہ چراغ جل رہے تھے۔ ہال میں قالین بچھا ہوا تھا۔ اوتے نے جوتے اتارے، اپنا رک سیک ایک طرف رکھا اور قالین پر بیٹھ گیا۔ اس وقت سب مونک کھانا کھا رہے تھے۔ اوتے کے سامنے بھی ایک تھالی رکھ دی گئی، اس میں ابلے ہوئے چاول تھے اس کے اوپر گاڑھا گاڑھا سوپ تھا۔ اوتے نے لکڑی کے چمچے سے چاول کھانے شروع کیے۔ سوپ کے ساتھ چاول بڑے ذائقے دار لگ رہے تھے۔

کھانے کے بعد ایک نوجوان مونک اس کے سامنے آکر بیٹھ گیا۔ اس نے کہا۔ ''آپ مجھے تھائی معلوم ہوتے ہیں۔ عام طور پر ہم مسافروں سے کوئی سوال نہیں کرتے بس انہیں آرام پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ میرا تعلق بھی تھائی لینڈ سے ہے۔ میں گریجویٹ ہوں۔ میرے فادر کی سورت چائی شہر میں کئی سو ایکڑ زمین ہے۔ میرے فادر نے مجھے یہاں مونک کی دو سالہ ٹریننگ کے لیے بھیجا ہے۔ ہماری ٹریننگ میں چھ ماہ تک بھیک مانگ کر پیٹ بھرنا بھی شامل ہے۔''

یہ سن کر اوتے بہت حیران ہوا۔ ''بھیک مانگ کر پیٹ بھرنا۔ میں سمجھا نہیں اس ٹریننگ کا کیا مقصد ہے؟''

''اس کے پیچھے ایک فلسفہ ہے۔ جب ایک آدمی بھیک مانگتا ہے تو اس کی انا اس کے نفس کی سرکشی بالکل ختم ہو جاتی ہے۔ ہم صبح کسی بھی قصبے کے مین بازار میں جاکر خاموشی سے ایک لائن میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ عورتیں آتی ہیں اور ہمارے کشکول میں ایک دو چمچے ابلے ہوئے چاول ڈال کر چلی جاتی ہیں۔ جب ہمارے کشکول بھر جاتے ہیں تو ہم اپنے ٹھکانے پر آجاتے ہیں۔ سوپ ہم جنگل

کی جڑی بوٹیوں سے بناتے ہیں۔‘‘

اس کے خاموش ہونے کے بعد اوتے نے کہا۔’’آپ بھی تھائی ہیں اس لیے آپ کو بتانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ میں دراصل زمینی راستے سے ویت نام جارہا ہوں۔ وہاں نوجوان طبقہ بہت پریشان ہے، وہ ویتنام سے نکل کر زیادہ پیسے کمانے کے لیے میڈل ایسٹ جانا چاہتے ہیں۔ میں ان کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔‘‘

’’یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ صبح میں آپ کو ایسا راستہ بتاؤں گا جو محفوظ بھی ہے اور بہت مختصر بھی ہے۔ آپ پانچ چھ گھنٹے میں ہی ویت نام کی سرحد میں داخل ہو جائیں گے۔ آپ تھکے ہوئے ہیں۔ سو جائیے صبح ملاقات ہوگی۔‘‘

اوتے واقعی بہت تھکا ہوا تھا، لیٹتے ہی گہری نیند میں ڈوب گیا۔

☆☆☆

صبح ناشتے کے بعد اوتے مانگ روانگی کے لیے تیار تھا۔ وہی تھائی مونک اسے باہر چھوڑنے آیا اور پہاڑی کی دوسری سائڈ پر لے گیا۔ یہاں سے بڑا مسحور کن منظر نظر آرہا تھا۔ میلوں دور تک چراگاہ نظر آرہی تھی۔ لمبی لمبی گھاس کا فرش بچھا ہوا تھا، کہیں کہیں اونچے درخت بھی نظر آرہے تھے۔ چراگاہ میں سیکڑوں ہرن زیبرا، ضرافے تھے۔ دو ایک ہاتھیوں کے خاندان اور کچھ گینڈے بھی گھاس چر رہے تھے۔

تھائی مونک نے کہا۔’’اگر تم اس چراگاہ کے کنارے کنارے سفر کرو گے تو دو گھنٹے کی واک کے بعد گھنا جنگل شروع ہو جائے گا۔ وہ جنگل عبور کرتے ہی ویت نام کی سرحد شروع ہو جائے گی، اس طرح تم پانچ چھ گھنٹے میں ہی ویت نام میں داخل ہو جاؤ گے۔ ہاں ایک بات کا خیال رکھنا۔ ہاتھی یا گینڈے سے کم از کم سو میٹر دور رہنا۔ ان کی نظر کمزور ہوتی ہے لیکن سونگھنے کی حس بہت تیز ہوتی ہے۔ اچھا گڈ بائی۔ مجھے بھیک مانگنے جانا ہے۔‘‘

اوتے اس سے رخصت ہو کر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا چراگاہ کے کنارے اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔ دو ڈھائی گھنٹے کے بعد چراگاہ ختم ہوگئی اور گھنا جنگل شروع ہو گیا۔ اوتے نے اپنی کلہاڑی نکالی اور شاخیں کاٹتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔

چار گھنٹے تک چلنے کے بعد اوتے نے محسوس کیا کہ اب جنگل ذرا چھدرا چھدرا ہوتا جارہا ہے۔ کچھ دور اور چلنے کے بعد جنگل تقریباً ختم ہو گیا۔ اب اوتے کے سامنے ایک سڑک تھی جس پر وقفے وقفے سے گاڑیاں گزر رہی تھیں۔

اوتے نے اپنا چھوٹا سا کمپاس نکالا اور سمت کا تعین کیا۔ اس کے حساب سے ہونائے شہر یہاں سے مغرب کی سمت ہونا چاہیے۔

اوتے نے سڑک کے کنارے کنارے مغرب کی طرف اپنا سفر شروع کیا۔ آدھے گھنٹے کے بعد ایک بڑی جیپ اس کے پاس آکر رکی۔ جیپ ڈرائیور نے پوچھا۔

’’مسٹر کہاں جاؤ گے؟‘‘

’’ہونائے۔‘‘

’’اوہ! ہونائے تو پچاس کلومیٹر دور ہے۔ آجاؤ گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ تمہیں ہونائے پہنچا دیتا ہوں مگر تمہیں پیسے دینے ہوں گے۔‘‘

اوتے نے اثبات میں سر ہلایا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔

اوتے ویتنامی زبان سے خوب واقف تھا۔ اوتے نے ڈرائیور کو بتایا۔’’وہ ٹریک کی تلاش میں آگیا تھا۔ پھر رستہ بھول گیا۔‘‘

ڈرائیور نے کوئی سوا گھنٹے میں اوتے کو ہونائے کے مین بازار میں پہنچا دیا۔ اوتے نے جیپ سے اُتر کر ڈرائیور کو اچھی خاصی رقم ویت نامی کرنسی میں دے دی۔ ڈرائیور خوش ہو کر آگے روانہ ہو گیا۔ یہاں سے اوتے نے نونگ کے شوہر کو فون کیا۔ وہ اپنی گاڑی لے کر آیا اور اسے گھر لے گیا۔

گھر پہنچ کر اوتے نے کہا۔’’نونگ میں بڑا لمبا خطرناک سفر کر کے آیا ہوں۔ پہلے میں نہاؤں گا پھر کھانا کھا کر سو جاؤں گا۔ بزنس کی باتیں رات کو ہوں گی۔‘‘

رات کے دس بج رہے تھے۔ اوتے مانگ لمبی نیند لے کر اٹھا تو بالکل تازہ دم تھا۔ ڈنر ٹیبل پر نونگ نے بتایا کہ دس لیبرز کا گروپ بالکل تیار ہے۔ پیسے بھی مل گئے ہیں۔ اب تم بتاؤ کہ واپس کب روانہ ہو گے۔

’’نونگ ابھی تو میں دو تین دن آرام کروں گا بہت تھکا ہوا ہوں۔ تم ہر چیز تیار رکھنا۔‘‘

نونگ کے شوہر سویت نے کہا۔’’گڈ! اوتے کل میں تمہیں اپنی فشنگ بوٹ پر لے جاؤں گا۔ ہمارا ٹرپ دو دن کا ہوگا۔ سمندر کی ٹھنڈی ہوا میں تمہاری تمام تھکن دور ہو جائے گی۔‘‘

صبح سویت، اوتے کو اپنی بوٹ پر لے گیا۔ سویت کی بوٹ بہت شاندار تھی۔ اس پر کام کرنے والی تمام لڑکیاں خوب صورت، صحت مند اور نو عمر تھیں۔ اوتے کی خوشی سے

باچھیں کھل گئیں۔ بوٹ میں دو چھوٹے چھوٹے ائرکنڈیشنڈ کیبن تھے۔ ملازمین کے لیے علیٰحدہ سے کورڈ حصہ تھا۔

بوٹ نے دو سو سمندری مائل دور جاکر لنگر ڈال دیا۔ شام ہوگئی تھی۔ سمندر میں جال ڈال دیا گیا۔ سویت نے کہا۔ ”اس حصے میں بڑے سائز کی بہت مچھلیاں ہیں۔ اب ہم صبح جال سمیٹیں گے۔ یہ لڑکیاں مچھلیاں چھانٹ چھانٹ کر کولڈ اسٹوریج میں ڈالیں گی۔“

رات کو لڑکیوں نے ڈنر تیار کیا۔ ہر ڈش مچھلی کی بنی ہوئی تھی اور بہت مزیدار تھی۔ ڈنر کے بعد شراب کا دور چلا۔ سویت نے کہا۔ ”اوتے تم نے کوئی لڑکی پسند کی۔ یہ سب لڑکیاں بہت کوآپریٹو ہیں۔“

اوتے نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”بھئی سویت سبھی لڑکیاں بہت خوب صورت ہیں۔ تم ہی میرے لیے چوز کرو۔“

سویت نے سب سے کم عمر لڑکی چنی۔ وہ شاور لے کر اسکرٹ بلاؤز پہن کر اوتے کے کیبن میں آگئی۔

صبح جب لڑکی جانے لگی تو اوتے نے زبردستی دس ڈالر کا نوٹ اس کی جیب میں ڈال دیا۔ لڑکی خوشی خوشی رخصت ہوگئی۔

اوتے ناشتا کرکے کیبن سے باہر آیا تو جال سمیٹا جاچکا تھا۔ عرشے پر مچھلیوں کا ڈھیر تھا۔ تمام لڑکیاں نیکر اور بنیان پہنے مچھلیاں چھانٹنے میں مشغول تھیں۔ بڑی مچھلیاں کولڈ اسٹوریج میں پھینک رہی تھیں اور چھوٹی مچھلیوں کو لنچ اور ڈنر میں استعمال کرنے کے لیے علیٰحدہ جمع کررہی تھیں۔ ایک دفعہ میں ہی کولڈ اسٹوریج آدھے سے زیادہ بھر گیا۔ سویت نے بوٹ اسٹارٹ کروائی اور وہاں سے تقریباً سو میل دور جاکر لنگر ڈال دیا۔ شام کو پھر انہوں نے سمندر میں جال پھیلایا۔

رات کو عیش وعشرت کی محفل جمی۔ اوتے مانگ بہت خوش تھا۔ دوسری صبح جال سمیٹا گیا تو اس میں بڑی مچھلیوں کی بہتات تھی۔ بوٹ کا کولڈ اسٹوریج پوری طرح بھر گیا۔ سویت بھی بہت خوش تھا۔ انہوں نے واپسی کی راہ پکڑی اور مچھلیاں فش ہاربر پر مخصوص آڑھتی کے حوالے کیں اور شام تک گھر پہنچ گئے۔

☆☆☆

دوسرے دن صبح سویرے اوتے دس مزدوروں کا گروپ لے کر روانہ ہوا۔ نوتگ نے اپنا کمیشن کاٹ کر دو لاکھ تیس ہزار ڈالرز اس کے حوالے کردیے تھے۔ اوتے نے تھائی موتک کا بتایا ہوا راستہ اختیار کیا۔ وہ دو دن میں بغیر کسی حادثے کے لاؤس کا علاقہ عبور کرکے تھائی لینڈ کے بارڈر سٹی وان تین پہنچ گئے۔ اوتے پہلے ہی پاتھ کو انفارم کرچکا تھا۔ پاتھ بڑی وین لے کر بارڈر پہنچ چکی تھی۔ پاتھ کا کزن قسیم بھی اس کے ساتھ تھا۔ صبح سے شام تک کی ڈرائیو کے بعد وہ بنکاک میں اپنے گھر پہنچ گئے۔ ویتنامی مزدوروں کو دوسرے مکان میں ٹھہرایا گیا۔

پاتھ کا کزن قسیم ہرفن مولا تھا۔ اس کے تعلقات ہر محکمے میں تھے۔ اس نے دوسرے دن سے ہی بھاگ دوڑ شروع کردی۔ پہلا مرحلہ لیبرز کا تھائی پاسپورٹ بنوانے کا تھا۔ پاسپورٹ والے تین ہزار ڈالرز پر ہیڈ مانگ رہے تھے۔ قسیم نے بارگیننگ کرکے دو ہزار ڈالرز فی کس پر سودا ڈن کردیا۔ ایک ہفتے میں مزدوروں کے ارجنٹ پاسپورٹ بن کر آگئے۔ دوسرا مرحلہ مڈل ایسٹ میں نوکریاں دلوانے کا تھا۔ ایک ایجنسی کے پاس میڈل ایسٹ کی ایک شپنگ کمپنی کے جہازوں پر کام کرنے والے بندوں کے لیبر ویزے آئے ہوئے تھے۔ ایجنسی سے قسیم نے اخراجات کے علاوہ ایک ہزار ڈالرز پر بات پکی کی ہوئی تھی۔ ایجنسی نے ایمبیسی سے لیبر ویزے حاصل کیے اور مزدوروں کو خلیج کے ایک ملک بھجوادیا گیا۔ ائرپورٹ پر امیگریشن والوں کو بھی ایک ہزار ڈالر فی کس دینے پڑے۔ اس طرح پندرہ دن میں یہ مشن پوری طرح مکمل ہوگیا۔

پاتھ اور اوتے نے اطمینان کا سانس لیا۔ اب تینوں یعنی پاتھ، اوتے اور قسیم بیٹھ کر حساب لگانے لگے کہ اس مشن پر کتنے اخراجات ہوئے اور فی کس کتنے ڈالرز نیٹ بچت ہوئی۔ پاتھ نے کہا۔ ”نوتگ نے ہمیں فی کس 23 ہزار ڈالرز دیے تھے جن میں سے دس ہزار ڈالرز فی کس مختلف مد میں خرچ ہوگئے اور ہمیں ایک لیبر پر تیرہ ہزار ڈالرز کی بچت ہوئی جن میں سے میں تین ہزار ڈالرز قسیم کو دوں گی پورا فیلڈ ورک اسی نے کیا ہے۔ اس کے علاوہ ہم نے جو ائرٹکٹس خریدے ہیں اس پر ائرلائنز ہمیں پندرہ پرسنٹ کمیشن دے گی اس کا حقدار بھی قسیم ہوگا۔ اس طرح ہمیں پورے گروپ پر ایک لاکھ ڈالرز کی نیٹ بچت ہوگی۔“

اوتے نے قہقہہ لگایا۔ ”لے بھئی قسیم تیرے تو مزے آگئے، موج کر۔“

قسیم بہت سنجیدہ تھا۔ اس نے کہا۔ ”پاتھ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمیں ایک گروپ پر بھاری منافع ہوا ہے لیکن پاتھ اس میں بہت خطرہ ہے۔ پاسپورٹ آفس اور ائرپورٹ پر امیگریشن ڈیپارٹمنٹ سے میں نے ڈیل کی ہے اگر کہیں

بھی ذرا سی مخبری ہوگئی تو یہاں کی خفیہ پولیس ہمارے پیچھے لگ جائے گی اور ہم تینوں بیس سال کے لیے جیل میں بیٹھے ہوں گے، انسانی اسمگلنگ بہت بڑا جرم ہے۔''

پاتھ سوچ میں پڑ گئی۔ ''ہاں قسیم تم صحیح کہتے ہو پھر تمہارا کیا مشورہ ہے؟''

''پاتھ دو کام کرو۔ نمبر ایک اوتے مانگ ہر ماہ ویت نام کا چکر لگانے کے بجائے، دو ماہ میں ایک چکر لگائے اور ادھر نونگ سے کہو کہ اب فی کس پچیس ہزار کے بجائے تیس ہزار ڈالر وصول کرے۔ اس طرح رسک بھی کم ہو جائے گا اور ہر پھیرے پر منافع بھی بڑھ جائے گا۔''

اوتے نے کہا۔ ''میں قسیم سے فلی ایگری کرتا ہوں۔ ہر ماہ چکر لگانے سے ہم جلدی خفیہ پولیس کی نظروں میں آجائیں گے۔''

پاتھ کچھ سوچ کر بولی۔ ''ٹھیک ہے قسیم، اب اوتے دو ماہ میں ایک چکر لگائے گا اور اب ہمارا ریٹ تیس ہزار ڈالرز فی کس ہوگا، میں نونگ کو انفارم کردوں گی۔ میں دراصل اتنی رقم جمع کرنا چاہتی ہوں کہ تھائی لینڈ کے واحد ہل اسٹیشن چنگ مائی میں بزنس جما سکوں۔ بنکاک کی آب و ہوا مجھے بالکل پسند نہیں ہے۔ یہاں کی ہماری ٹریول اینڈ ٹورز کمپنی ملکیت کے حقوق کے ساتھ قسیم کے حوالے کردوں گی۔''

قسیم نے کہا۔ ''پاتھ میرا خیال ہے تم ایک سال میں دس لاکھ ڈالرز کے قریب جمع کرلو گی جو چنگ مائی میں نئے سرے سے بزنس سیٹ کرنے کے لیے کافی ہوں گے۔ اوتے تم کیا کہتے ہو؟''

''ہاں تم درست کہتے ہو۔ ہم ایک سال میں دس لاکھ ڈالرز جمع کرسکتے ہیں۔ اب میں ہر دو ماہ کے بعد ویت نام کا پھیرا لگایا کروں گا۔''

اوتے دو ماہ کے بعد پرانے روٹ سے براستہ لاؤس ویت نام روانہ ہوگیا۔ ایک سال میں اس نے چھ پھیرے لگائے۔ پاتھ کے پاس ڈالروں کی شکل میں موٹی رقم جمع ہو گئی تھی تو انہوں نے ویت نام سے لیبرز لانے کا بزنس ختم کردیا۔

☆☆☆

پاتھ اور اوتے بزنس کا جائزہ لینے کے لیے چنگ مائی روانہ ہوئے۔ چنگ مائی کوئی ہزار میٹر کی بلندی پر تھائی لینڈ کا واحد ہل اسٹیشن ہے۔ آب و ہوا بنکاک کے مقابلے میں بہت اچھی ہے۔ چھوٹا سا شہر ہے کھلا کھلا اور نہایت صاف ستھرا۔ اوتے کے لیے خوشی کی بات یہ تھی کہ یہاں کی لڑکیاں سرخی مائل رنگت کی اور صحت مند تھیں۔

دونوں ایک ہوٹل میں چیک اِن ہونے کے بعد شہر کا سروے کرنے کے لیے نکلے۔ انہوں نے نوٹ کیا کہ یہاں امریکن، یورپین اور جاپانی سیاح بہت کثرت سے آتے ہیں۔ جنگل میں بہت بڑی تعداد میں بٹر فلائی گارڈن ہیں، ان میں مری ہوئی تتلیوں کو حنوط کرنے والی فیکٹریاں بھی ہیں جہاں مری ہوئی خوب صورت تتلیوں کو حنوط کر کے شیشے کے فریموں میں لگایا جاتا ہے۔ سیاح ایسے فریم کثرت سے خریدتے ہیں انہوں نے یہاں کئی ٹریول کمپنیوں کا بھی وزٹ کیا۔

رات کو ڈنر کے بعد ہوٹل کے کمرے میں پاتھ نے کہا۔ ''اوتے یہاں ٹریول بزنس کے چانس بہت کم ہیں۔ سیاح بہت آتے ہیں لیکن سب اپنے پروگرام کے مطابق ریٹرن ٹکٹس لے کر آتے ہیں۔ اس لیے انٹرنیشنل ٹکٹس کی سیل نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہاں تمام ایجنٹس صرف ڈومیسٹک ٹکٹ سیل کرتے ہیں۔ اس لیے میں نے ٹریول بزنس کا آئیڈیا بالکل ڈراپ کردیا ہے۔''

''پاتھ میں نے بھی یہی بات نوٹ کی ہے، اب ہمیں دیکھنا ہوگا کہ کون سا بزنس یہاں شروع کیا جائے۔'' پاتھ سوچ میں پڑ گئی پھر بولی۔ ''مجھے یاد آرہا ہے۔ یہاں میری ایک دوست بھی ہے۔ کالج میں میرے ساتھ تھی۔ یوآنا اس کا نام ہے۔ اس کا فون نمبر میری ڈائری میں ہے، میں ابھی اسے فون کر کے اس سے مشورہ کرتی ہوں۔''

اوتے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ''یوآنا وہی تو نہیں جو ایک مرتبہ ہمارے گھر آئی تھی۔ خاصی لمبی ہے۔ بھاری بدن کی، پھولے ہوئے سرخ سرخ گالوں والی۔''

''ہاں وہی۔ اوتے تمہاری یادداشت لڑکیوں کے بارے میں بہت تیز ہے۔ اس کی ماما نے ایک امریکن سے شادی کی تھی جو تھائی لینڈ میں امریکن ایمبیسی میں تعینات تھا۔ یوآنا جب کالج میں پڑھ رہی تھی اسی زمانے میں اس کا باپ سانپ کے ڈسنے سے ہلاک ہوگیا تھا۔ میں ابھی اس کو فون کرتی ہوں۔ دیکھیں وہ کیا کہتی ہے۔''

پہلی ہی بیل پر یوآنا نے فون اٹینڈ کرلیا۔ پاتھ کی آواز پہچانتے ہی وہ چیخ پڑی۔ ''پاتھ...... پاتھ ہی ہو ناں، کتنے عرصے کے بعد تمہاری آواز سنی ہے۔ میری جان تم کہاں ہو؟''

پاتھ نے اس سے بڑی لمبی بات کی اور اپنا مسئلہ پوری تفصیل کے ساتھ اسے سمجھا کر اس کا مشورہ مانگا۔

یوآنا نے کہا۔ ”ڈیئر پاتھ تمہیں اگر میرا مشورہ درکار ہے تو تمہیں میرے گھر آنا پڑے گا اپنے عاشق مزاج شوہر کے ساتھ۔ تم دو تین دن میرے گھر مہمان رہو۔ ایسا شاندار مشورہ دوں گی کہ تمہارے تمام مسئلے حل ہو جائیں گے۔“

یوآنا نے پاتھ کو اپنے گھر کا پتا سمجھایا۔ ”میرا پتا بہت آسان ہے۔ چنگ مائی سے 115 میل کی دوری پر بنکاک، چنگ مائی ہائی وے پر ایک بڑا ہوٹل ہے۔ ہوٹل کا نام پرنس یوآنا ہوٹل ہے۔ پرنس میرے شوہر کا نک نیم ہے۔ یہ میرا ہوٹل ہے۔ تم بڑی آسانی سے یہاں پہنچ جاؤ گی۔ پاتھ آجاؤ، میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔“

صبح انہوں نے ہوٹل سے چیک آؤٹ کیا اور ٹیکسی کے ذریعے دو ڈھائی گھنٹے میں پرنس یوآنا ہوٹل پہنچ گئے۔

یوآنا انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور اوتے مانگ اپنی عادت کے مطابق یوآنا کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ لمبا قد، بھرا بھرا جسم، سرخ گال اور سرخ گداز ہونٹ۔ تھائی لڑکیوں میں ایسی خوب صورت شکلیں کم ہی نظر آتی ہیں۔

یوآنا کا ہوٹل خوب چل رہا تھا۔ ہوٹل کے بیس کمرے ہر وقت سیاحوں سے بھرے رہتے تھے۔ ہائی وے سے گزرنے والے سیاح ایک دو دن کے لیے یہاں ضرور ٹھہرتے تھے اور جنگل میں بنے ہوئے درجنوں بٹر فلائی گارڈن کی سیر کرتے تھے۔ پندرہ آدمیوں کا عملہ تھا جن میں دس نوعمر لڑکیاں تھیں۔

یوآنا انہیں ہوٹل کے قریب بنے ہوئے اپنے گھر لے آئی۔ مکان بہت بڑے احاطے میں بنا ہوا تھا۔ احاطے میں بہت وسیع لان تھا جہاں یوآنا کی دو بچیاں جن کی عمریں پانچ چھ سال ہوں گی، کھیل رہی تھیں۔ دونوں یوآنا کی طرح گول مٹول سرخ وسفید تھیں۔ یوآنا بچیوں سے ملوا کر انہیں فرسٹ فلور پر لے آئی۔ یہاں چھ بیڈ روم تھے۔ گراؤنڈ فلور پر سٹنگ ایریا تھا اور دو کمرے گھر کی ملازماؤں کے تھے۔

پاتھ اور اوتے نے اپنے بیڈ روم میں سامان سیٹ کیا اور شاور لے کر نیچے آگئے۔

پاتھ نے کہا۔ ”یوآنا تمہارا ہوٹل، مکان اور دو خوب صورت بچیاں دیکھ کر دلی خوشی ہوئی لیکن ابھی تک تمہارے شوہر پرنس کے درشن نہیں ہوئے۔“

اتنے میں دو ملازم لڑکیاں ریفریشمنٹ کے لوازمات لے کر آگئیں۔ ان کے جانے کے بعد یوآنا نے کہا۔ ”پاتھ تمہیں پرنس کے بارے میں تفصیل سے بتاؤں گی اس کے ساتھ ہی تمہارے مسئلے کا حل بھی جڑا ہوا ہے۔ دراصل پرنس تین سال کے لیے اسٹوڈنٹ ویزے پر کیلی فورنیا امریکا گیا تھا۔ اسے کیلی فورنیا یونی ورسٹی سے ہوٹلنگ میں ڈپلوما کورس کرنا تھا۔ دو سال کے بعد اس نے امریکن سٹیزن شپ لینے کے لیے ایک امریکن لڑکی سے شادی کر لی۔ اس کے بعد اسے امریکا کا گرین کارڈ اور سٹیزن شپ مل گئی۔ پرنس نے اس کے بعد لڑکی کو بیس ہزار ڈالرز دے کر فارغ کر دیا۔ اب وہ مجھے اور بچیوں کو امریکا بلا رہا ہے۔ اس نے کیلی فورنیا کے نزدیک ہی ایک چھوٹا سا ہوٹل بھی خرید لیا ہے۔ میرے ویزے کا تمام پیپر ورک مکمل ہو گیا ہے اور میں یہاں سے وائنڈ اپ کر کے دو ماہ کے اندر امریکا شفٹ ہو رہی ہوں۔ میں یہ مکان اور ہوٹل فروخت کر دوں گی۔ پاتھ یہ مکان اور ہوٹل تم خرید لو، یہ تمہارے مسئلے کا بہترین حل ہے۔ بولو کیا کہتی ہو؟“

پاتھ اور اوتے سوچ میں پڑ گئے۔ کچھ دیر کے بعد پاتھ نے کہا۔ ”یوآنا ان دونوں کے لیے تمہاری ڈیمانڈ کیا ہے؟“

”پاتھ تم دو دن یہاں رک کر میرے ہوٹل کا بزنس اچھی طرح دیکھ لو۔ ہوٹل ہمہ وقت سیاحوں سے بھرا رہتا ہے۔ اکوپینسی ریٹ تقریباً سو فیصد ہے۔ روزانہ ہمیں کچھ سیاحوں کو سوری، نو ویکنسی کہنا پڑتا ہے۔ ہم سالانہ تقریباً ڈیڑھ لاکھ ڈالرز کا منافع کماتے ہیں۔ میری ڈیمانڈ چھ لاکھ ڈالرز ہے۔ تمہارے لیے خصوصی رعایت کر دوں گی مگر پیمنٹ امریکن ڈالرز میں لوں گی۔“

”یوآنا ہم ایک دو دن میں اپنی پیشکش تمہیں بتا دیں گے۔ ہمیں سوچنے کا موقع دو۔ میری ہمیشہ سے خواہش ہے کہ میں چنگ مائی میں سیٹل ہوں یہاں کی آب و ہوا مجھے سوٹ کرتی ہے مگر تمہاری ڈیمانڈ بہت بھاری ہے۔“

”پاتھ اور اوتے مانگ سوچ سمجھ کر ایک فیصلہ کر لو۔ تمہارے لیے خصوصی رعایت کر دوں گی۔“

☆......☆

رات کو اپنے بیڈ روم میں دونوں نے اس ڈیل کے ہر پہلو پر بہت غور کیا اور پانچ لاکھ ڈالرز کی پیشکش کو فائنل کر دیا۔

یوآنا کو بھی امریکا جانے کی جلدی تھی۔ اس نے بغیر کسی حیل وحجت کے اس آفر کو قبول کر لیا اور دو ہفتے کے اندر اندر اپنے وکیل کے ذریعے ملکیت کے کاغذات تیار کرا کر ملکیت ان کے نام ٹرانسفر کرا دی اور خود امریکا روانہ ہو

گئی۔

قبضہ ملتے ہی پاتھ نے ہوٹل میں کئی تبدیلیاں کیں۔ ہوٹل کا احاطہ بہت وسیع تھا۔ پاتھ نے مہمانوں کی گاڑیوں کی پارکنگ ہوٹل کی پشت پر شفٹ کردی۔ سامنے کی طرف لان بنوایا۔ لان کے بیچ میں سوئمنگ پول اور تین شاور کیبن بنوائے۔ ایک سائڈ پر بار، کافی شاپ اور ریسٹورنٹ بنوایا۔ ریسٹورنٹ کے اوپر اوتے کا شاندار آفس اور ریسٹ روم بنوایا۔ کمروں کی تعداد بیس سے بڑھا کر تیس کر دی گئی۔ مزید عملہ بھرتی کیا۔ عملے کی تنخواہ میں دس فیصد اضافہ کردیا گیا جس کا بہت اچھا اثر پڑا۔

ہوٹل کی چھت پر بڑا سا نوین سائن لگوایا جس پر ہائی وے ہوٹل بار اینڈ ریسٹورنٹ کے الفاظ جگمگاتے رہتے تھے۔ ایک بورڈ اسی نام سے ہائی وے کے کنارے لگوایا۔ اب ہوٹل کی شان ہی کچھ اور ہوگئی تھی۔ گورے سیاحوں کی ریل پیل بہت بڑھ گئی۔ جن سیاحوں کو رکنا نہیں ہوتا تھا وہ بھی کافی پینے یا کھانا کھانے آتے تھے۔

پاتھ اور اوتے دونوں بہت خوش تھے۔ دو سال گزر گئے۔ اوتے بحیثیت جنرل منیجر خوب صورت سیاح عورتوں میں گھرا رہتا تھا اور بہت خوش تھا۔ پاتھ ایک خوب صورت بچے کی ماں بن گئی تھی۔

ایک صبح انہیں پریشان کن خبر ملی۔ بنکاک سے قسیم کا فون تھا۔ ”کزن! پرابلم پرابلم پرابلم۔ کزن میں بہت پریشان ہوں۔“

”قسیم ہوا کیا ہے جو اتنے بوکھلائے ہوئے ہو۔“

”پاتھ جن ویت نامی لیبرز کو ہم نے میڈل ایسٹ بھیجا تھا ان میں سے تین واپس آگئے ہیں۔ ان کے پاس تھائی پاسپورٹ ہیں اس لیے ائرپورٹ پر امیگریشن سے کلیئر ہوکر سیدھے میری ٹریول ایجنسی آگئے ہیں۔ فی الحال تو میں نے ان کو ایک مکان میں ٹھہرا دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے نوکری سے جتنا کمانا تھا کما لیا اب ہم واپس ویت نام جا کر اپنا کاروبار کرنا چاہتے ہیں۔ کزن میں بہت پریشان ہوں اگر وہ پولیس کے ہتھے چڑھ گئے تو مصیبت کھڑی ہو جائے گی اور ہم سب جیل میں ہوں گے۔“

پاتھ سوچ میں پڑ گئی۔ ”قسیم! پیارے کزن اتنا پریشان مت ہو۔ پریشانی میں کوئی حل نہیں سوجھتا۔ کزن سب سے پہلے تم ایک کام کرو۔ ان سب سے تھائی پاسپورٹ واپس لے کر جلا دو۔ دوسرا کام یہ کرو کہ ان کو تھوڑی تھوڑی لاؤس اور ویت نام کی کرنسی دے کر ان کو لاؤس کے بارڈر سٹی وان تین کے قریب لے جا کر ان سے کہو کہ جس رستے سے تم اوتے مانگ کے ساتھ تھائی لینڈ آئے تھے اسی راستے سے جنگل سے گزرتے ہوئے ویت نام چلے جاؤ۔ جنگل سے گزرنے کا ضروری سامان تمہارے پاس ہے ہی، وہ ان کے حوالے کردو۔ میرا خیال ہے کہ وہ خوشی خوشی واپس چلے جائیں گے۔“

”کزن میں یہی کروں گا، تم بےفکر رہو۔“

کچھ دنوں کے بعد قسیم کا پھر فون آیا۔ ”پاتھ تمہارے دماغ کا بھی جواب نہیں ہے۔ میں نے انہیں لاؤس کی سرحد تک لے جا کر چھوڑ دیا تھا۔ وہ تو خوشی خوشی روانہ ہوگئے۔ انہوں نے کہا کہ ہم تو جنگل کے باسی ہیں۔ ہم بہ آسانی ویت نام پہنچ جائیں گے۔ میرا خیال ہے کہ وہ اب تک ہونائے پہنچ چکے ہوں گے۔“

”چلو یہ مسئلہ بھی حل ہوا۔ آئندہ بھی کوئی آئے تو اسے جنگل کا راستہ دکھا دینا۔ پریشان مت ہوا کرو۔“

اوتے نے کہا۔ ”تم نے میرا آفس بہت اچھی جگہ بنوایا ہے۔ اس کی کھڑکی سے سوئمنگ پول کا سین نظر آتا رہتا ہے۔ میں سیاحوں کو تیرتے ہوئے دیکھتا رہتا ہوں۔“

”اوتے تم اپنے آفس کے ساتھ بنے ہوئے ریسٹ روم میں جو حرکت کرتے رہتے ہو وہ سب مجھے معلوم ہے۔ ہوٹل کی تقریباً سب ملازمائیں تمہارے ریسٹ روم کی سیر کر چکی ہیں۔ کچھ سیاح لڑکیاں بھی تمہارے ریسٹ روم سے نکلتے ہوئے دیکھی گئی ہیں۔ اوتے اب یہ حرکتیں چھوڑ دو ورنہ کسی دن مصیبت میں پڑ جاؤ گے۔“

☆☆☆

ایک صبح ایک کار ہوٹل کے احاطے میں داخل ہوئی۔ ایک امریکن فیملی تھی۔ ایک مرد جو سر سے تقریباً گنجا تھا، اس کی بیوی اور پندرہ سولہ سال کی نہایت خوب صورت بیٹی کار سے نکل کر ہوٹل کا باہر سے جائزہ لینے لگی۔

اوتے مانگ فوراً اپنے آفس سے نکل کر ان کی طرف آیا۔ اس نے اپنا تعارف کرایا اور انہیں ویلکم کیا۔ مرد نے ایک دن ہوٹل میں رکنے کی خواہش ظاہر کی۔ اوتے کے اشارے پر ایک کارندہ آیا اور ان سے گاڑی کی چابیاں لے کر کار کو پارکنگ ایریا میں لے گیا۔ اوتے امریکن فیملی کو لے کر ہوٹل کے ریسپشن کاؤنٹر پر آیا اور ان کی انٹری کرا کے ان کو ہوٹل کے بہترین کمرے میں اکوموڈیٹ کرا دیا۔

دو گھنٹے کے بعد پوری فیملی سوئمنگ کاسٹیوم میں باہر آئی اور شاور لے کر سوئمنگ پول میں کود گئی۔ اوتے اپنے

آفس کی کھڑکی سے ان کا نظارہ کررہا تھا۔ اوتے نے دل میں کہا۔ ”بیٹی تو بیٹی، ماں بھی قیامت سے کم نہیں۔“

پوری فیملی نے لنچ بھی سوئمنگ پول کے کنارے پر ہی کیا پھر ریسٹ کرنے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

شام کو پوری فیملی دوسرے سیاحوں کے ساتھ ہوٹل کی بڑی وین میں بٹر فلائی گارڈن کی سیر کرنے کے لیے روانہ ہوئی۔ اوتے بھی ان کے ساتھ تھا۔ وہ سب کو بتاتا جاتا تھا کہ جنگل کے کون سے حصے میں ہاتھی ہیں۔ کہاں دوسرے جانور ہیں اور کہاں کہاں بٹر فلائی گارڈنز ہیں جہاں مردہ بٹر فلائز کو مشینوں کے ذریعے حنوط کر کے خوب صورت فریموں میں سجا کر فروخت کیا جاتا ہے۔ پوری فیملی اوتے کی انگلش کو بہت انجوائے کر رہی تھی۔ ان کی بیٹی نے کئی خوب صورت بٹر فلائی فریم خریدے۔ شام کو واپسی ہوئی۔

ڈنر کے بعد تقریباً گیارہ بجے وہی لڑکی ایک مردانہ قمیص پہنے سوئمنگ پول پر آئی۔ اس نے منی اسکرٹ پہنا ہوا تھا۔ اوتے اسے دیکھ کر اپنے آفس سے نکل کر پول کے کنارے بچھی ہوئی ایک ایزی چیئر پر بیٹھ کر سگریٹ پینے لگا۔ اس کے سامنے دوسری چیئر پر لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ دونوں نے باتیں شروع کر دیں۔ لڑکی نے بتایا۔ ”میرا نام پامیلا عرف پامی ہے۔ ہم شگاگو سے آئے ہیں۔ یہاں کی دھوپ بہت اچھی ہے۔“

کچھ دیر کے بعد لڑکی نے اسکرٹ کی جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور اس میں سے کالے رنگ کا پتلا سا سگریٹ نکال کر اپنے گلابی ہونٹوں میں دبایا اور اسکرٹ کی جیب میں لائٹر تلاش کرنے لگی۔

اوتے نے اٹھ کر اپنے لائٹر سے جلدی سے اس کا سگریٹ سلگایا۔ لائٹر پر ہوٹل کا مونوگرام چھپا ہوا تھا۔ اوتے نے لائٹر ہتھیلی پر رکھ کر لڑکی کو پیش کیا۔ ”ہوٹل کی طرف سے امریکن خوب صورت لڑکی کو چھوٹا سا گفٹ۔“ لڑکی نے تھینک یو کہہ کر لائٹر رکھ لیا۔

”میں ڈیڈی سے چھپ کر سگریٹ پیتی ہوں۔ ماما کھلے دل کی ہیں ان کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی ہلکی سی ڈرنک بھی کر لیتی ہوں۔“

اوتے اسے تھائی لینڈ کے بارے میں بتاتا رہا۔ وہ دونوں بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اوتے نے بتایا۔ ”میں رات کو اپنے آفس کے ساتھ بنے ریسٹ روم میں ہی سوتا ہوں۔ ریسٹ روم میں ہر سہولت ہے منی بار بھی ہے۔ ہفتے میں صرف ایک بار گھر جا کر اپنی بیوی کے ساتھ سوتا ہوں۔“

لڑکی ہنستے ہوئے بولی۔ ”تو باقی راتیں آپ کی سونی سونی گزرتی ہیں۔“

”نہیں کبھی کبھی کوئی سیاح لڑکی مہربان ہو جاتی ہے تو میری رات بہت اچھی گزر جاتی ہے۔“

پامی نے کہا۔ ”اف بارہ بج گئے مجھے نیند آرہی ہے۔ چلیے آج رات آپ کی مہمان بن جاتی ہوں۔ وہاں تھوڑی سی اسکاچ بھی پی لوں گی۔“

”تمہارے ڈیڈی ماما؟“

”دونوں کو سلیپنگ پلز لے کر سونے کی عادت ہے۔ بے خبر سو رہے ہیں۔ اب ان کی صبح دس گیارہ بجے ہوگی۔ چلیے مسٹر اوتے مانگ۔“

پامی ننگے پاؤں تھی۔ اوتے نے اوپر آکر اپنے اسسٹنٹ کو مخصوص اشارہ کیا اور پامی کو لے کر ریسٹ روم میں گھس گیا۔

صبح جب اوتے کی آنکھ کھلی تو پامی جا چکی تھی۔ اس کا سگریٹ کا پیکٹ اور انڈر گارمنٹ کرسی پر پڑا تھا۔ اوتے نے دونوں چیزوں کو اپنی الماری میں رکھ دیا اور شاور لے کر ناشتے کے لیے ریسٹورنٹ میں آگیا۔ گزری رات کا نشہ اس کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ کافی ہاؤس میں اس وقت بہت کم سیاح تھے۔ وہی تھے جن کو فوری طور پر روانہ ہونا تھا۔ باقی سب سوئے ہوئے تھے۔

دس بجے کے قریب کافی ہاؤس اور ریسٹورنٹ سیاحوں سے بھر گیا۔ ان میں پامی کے ممی ڈیڈی بھی تھے۔ پامی نہیں تھی۔ اوتے نے بڑی گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا۔ ”آپ کی بیٹی نظر نہیں آرہی۔“

”وہ سو رہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے وہ تمام رات اپنے سیل فون سے کھیلتی رہی ہے۔ ہم نے یہاں ایک دن اور رکنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ اچھی جگہ ہے۔“

لنچ کے بعد اوتے سوئمنگ پول کے کنارے رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ کر سگریٹ پینے لگا۔ اس وقت کچھ سیاح مرد اور خواتین پول میں نہا رہے تھے۔ کچھ دیر کے بعد پامی کی ماما آتی نظر آئی اس نے سوئمنگ کاسٹیوم پر گاؤن پہنا ہوا تھا۔ اس نے آتے ہی اوتے کو ہیلو ہیلو کہا اور گاؤن اتار کر پول میں اتر گئی۔ ایک گھنٹے تیرنے کے بعد وہ سوئمنگ پول سے نکل کر گاؤن پہن کر اوتے کے سامنے بیٹھ گئی۔ ”مسٹر اوتے مانگ میرا نام شیرن ہے۔ بیٹی کا نام پامیلا اور میرے شوہر کا نام آرتھر ہے۔ وہ شیئرز کا کاروبار کرتا ہے۔ اس وقت بھی

اپنے لیپ ٹاپ پر شیئر کا حساب کتاب کرنے میں مشغول ہے۔ ہم یہاں سے مالی جائیں گے۔ وہاں کا ساحل بھی بہت اچھا ہے۔ وہاں لڑکیاں دست کاری کا کام بھی بہت اچھا کرتی ہیں۔ ہم ایسے کپڑے بڑی تعداد میں خریدیں گے، امریکا میں ان کی بڑی مانگ ہے۔''

اوتے نے کہا۔ ''شیرن آپ نے اپنے آپ کو بہت اچھا رکھا.... ہوا ہے۔ آپ پامیلا کی ممی کے بجائے اس کی بڑی بہن لگتی ہیں۔''

شیرن مسکرائی۔ ''شکریہ! ویسے مسٹر اوتے مانگ آپ بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ صنفِ نازک کے لیے آپ میں کافی اٹریکشن ہے۔ میں نے تھائی لینڈ میں ایسے مرد کم ہی دیکھے ہیں۔''

''شیرن آپ نے تھائی لینڈ کے کون کون سے حصے دیکھے ہیں؟''

''صرف بنکاک اور اب چنگ مائی۔ یہاں سے مالی ہوتے ہوئے امریکا چلے جائیں گے۔''

''ارے آپ لوگ تھائی لینڈ کے جنوبی حصے میں نہیں گئے۔ جنوب میں پوکھیت اور پٹایا بہترین ٹورسٹ اسپاٹ ہیں۔ پٹایا کا ساحل اور وہاں کی نائٹ لائف تو پوری دنیا میں مشہور ہے۔ وہاں آپ کو ضرور جانا چاہیے۔ میرے ریسٹ روم میں تھائی ٹورسٹ اسپاٹس کے بہت سے پمفلٹ ہیں اگر آپ کو دیکھنا ہے تو میرے ریسٹ روم چلیں۔ ڈرنک میری طرف سے ہوگی۔''

شیرن نے اوتے کی آنکھوں میں جھانکا۔ دونوں کی آنکھوں میں خاص چمک تھی۔ شیرن نے کہا۔ ''آپ کی دعوت قبول ہوئی مگر ایک گھنٹے سے زیادہ نہیں دوں گی۔ چلیے۔''

اوتے پہلے اسے اپنے آفس لایا پھر اپنے اسسٹنٹ کو مخصوص اشارہ کر کے شیرن کے ساتھ ریسٹ روم میں گھس گیا۔ ریسٹ روم میں گھستے ہی شیرن نے اپنا گاؤن اتار کر ایک طرف ڈال دیا۔

جوش و خروش کے بعد شیرن نے سوئمنگ کاسٹیوم پہنا اور گاؤن چڑھا کر اس نے منی بار سے وہسکی کا جام بنا کر گھونٹ بھرا۔ ''اوتے مانگ وہ تمہارے پمفلٹس کہاں ہیں؟''

اوتے نے بیڈ پر لیٹے لیٹے کہا۔ ''اس الماری میں ہیں۔ اسے کھول کر انہیں نکال لو۔''

شیرن نے الماری کھولی اور کچھ پمفلٹس نکال کر میز پر ڈال دیے۔ الماری کے دوسرے ریک پر نظر ڈال کر وہ

انوکھا لاڈلا

بیٹا گہری نیند سو رہا تھا۔ ماں نے سرہانے جا کر پیار سے کہا۔ ''اٹھ جاؤ، بہت دیر ہوگئی ہے، تمہیں اسکول جانا ہے۔''

''نہیں، میں آج اسکول نہیں جاؤں گا۔''

''تم دو دن سے غیر حاضر ہو.... یہ بہت بُری بات ہے۔'' ماں نے قدرے خفگی سے کہا۔ ''تم اسکول جانے سے کیوں جی چراتے ہو؟''

''میں اسکول جاتا ہوں تو وہاں سب بچے اور استاد مجھ سے نفرت کرتے ہیں... وہاں میرا دل نہیں لگتا... آخر میں اسکول کیوں جاؤں؟''

''میرے پیارے بیٹے... اسکول جاؤ، اس لیے کہ اب تم باون سال کے ہوگئے ہو اور تم اس اسکول کے پرنسپل ہو، آج کل گھوسٹ اسکولوں کے ساتھ گھوسٹ ٹیچرز کی بھی شامت آئی ہوئی ہے۔''

رحیم یار خان سے سلیم کی بے بسی

ساکت ہوگئی۔ وہاں پامی کا سگریٹ کا پیکٹ اور انڈر گارمنٹ رکھا ہوا تھا۔ اس کے برابر میں اوتے کا پستول پڑا ہوا تھا۔ شیرن نے سگریٹ کا پیکٹ اور انڈر گارمنٹ اچھی طرح دیکھا۔ ''ارے یہ تو میری بیٹی پامی کا پیکٹ ہے اور انڈر گارمنٹ بھی اسی کا ہے۔ میں نے ہی سی این اے اسٹور سے خرید کر اسے دیا تھا۔'' پھر اس نے اوتے سے کہا۔ ''مسٹر اوتے مانگ کیا تم بتانا پسند کرو گے کہ یہ پامی کی چیزیں یہاں کیوں ہیں اس کا مطلب بالکل واضح ہے۔'' پستول سنبھال کر وہ اوتے کی طرف گھومی۔ اتنی دیر میں اوتے شارٹ اور بنیان پہن کر بستر پر بیٹھ گیا تھا۔ شیرن کا چہرہ غصے سے سرخ تھا۔ اس نے پستول کا رخ اوتے کی طرف کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم مجھے بتاؤ گے کہ سولہ سالہ پامی کے بعد اس کی چالیس سالہ ماں کیسی لگی۔ تمہیں رشتوں کا خیال بھی نہیں رہا۔ میں تمہیں اس قابل ہی نہیں چھوڑوں گی کہ تم آئندہ ایسی حرکت کرسکو۔ مجھ پر کوئی الزام نہیں آئے گا۔ کہہ دوں گی کہ پستول سے حادثاتی طور پر گولی چل گئی۔''

اوتے کا چہرہ خوف سے سفید پڑ گیا.... شیرن نے

پامی کی چیزیں اپنے گاؤن میں چھپائیں اور پستول سے اوتے کی ناف کے نیچے کا نشانہ لے کر گولی چلادی اسی وقت اوتے بستر سے اٹھ رہا تھا۔ گولی ناف کے نیچے لگنے کے بجائے اس کے گھٹنے پر لگی۔ اوتے کی چیخ اور گولی چلنے کی آواز ایک ساتھ بلند ہوئی۔ اوتے بستر پر گر کر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ شیرن نے پستول پھینکا اور ریسٹ روم سے نکل آئی۔

اوتے کا اسسٹنٹ دہشت زدہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ شیرن نے کہا۔ ''مسٹر مجھ سے اچانک گولی چل گئی ہے۔ اوتے مانگ شدید زخمی ہیں فوراً ایمبولینس کو کال کرو۔ میں چینج کر کے آتی ہوں۔'' یہ کہہ کر شیرن سیڑھیوں سے اترتی چلی گئی۔

اسسٹنٹ نے اندر جا کر دیکھا۔ اوتے گھٹنا پکڑے بستر پر تڑپ رہا تھا اور بڑا تکلیف میں تھا۔ اس وقت بھی اسے اپنے ہوٹل کی ساکھ کا خیال تھا۔ اس نے بڑی تکلیف سے کہا۔ ''شیرن سے غلطی سے گولی چل گئی تھی۔ تم فوراً ایمبولینس منگواؤ۔ بہت بلیڈنگ ہو رہی ہے۔''

اسسٹنٹ نے فوری طور پر ایمرجنسی نمبر پر چینگ مائی جنرل اسپتال فون کیا۔ وہاں سے جواب دیا گیا کہ چینگ مائی سے تمہارا ہوٹل بہت دور ہے۔ ہوٹل کے نزدیک ہی جنگل میں اینیمل ریسرچ سینٹر ہے وہاں ایک ڈاکٹر اور دو نرسیں ہر وقت موجود رہتی ہیں وہاں سے ایمبولینس صرف دس پندرہ منٹ میں ہوٹل پہنچ جائے گی، ہم انہیں انفارم کر رہے ہیں۔ تم خون روکنے کی کوشش کرو۔''

گولی کی آواز اور اوتے کی چیخ و پکار سُن کر پاتھ بچے کو آیا کے سپرد کر کے آگئی تھی۔ دو ملازم بھی ساتھ تھے۔ اوتے تکلیف کے باوجود ہوش میں تھا۔ اس نے پاتھ کو بھی یہی بتایا کہ شیرن سے حادثاتی طور پر میرے پستول سے گولی چل گئی لیکن پاتھ سب سمجھ گئی تھی۔ سب خون روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔

اتنی دیر میں ریسرچ سینٹر کی ایمبولینس ڈاکٹر اور ایک نرس کے ساتھ وہاں پہنچ گئی۔ ڈاکٹر نے سب کو باہر نکال کر اوتے کو خون روکنے کا انجکشن لگایا۔ ایک درد کش انجکشن لگایا۔ ہلکی سی بینڈیج کی اور اوتے کو لے کر چینگ مائی روانہ ہو گیا۔ ایمبولینس میں پاتھ بھی ساتھ تھی اور مسلسل روئے جا رہی تھی۔

چینگ مائی جنرل اسپتال پہنچ کر ڈاکٹرز اوتے کو فوراً آپریشن روم میں لے گئے۔ پاتھ باہر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنے کزن قسیم کو فون کر کے حادثے کی اطلاع دی۔ قسیم نے کہا۔ ''کزن فکر مت کرو۔ میں شام کی فلائٹ سے بیوی کے ساتھ چینگ مائی آ رہا ہوں۔ بیوی گھر اور بچے کو سنبھال لے گی۔ ہم دونوں اسپتال میں رہیں گے۔''

اتنی دیر میں پولیس بھی پاتھ کا بیان لینے اسپتال پہنچ گئی تھی۔ پولیس پہلے ہی ہوٹل میں شیرن کا بیان لے چکی تھی۔ یہاں پاتھ نے بھی یہی بیان دیا کہ گولی حادثاتی طور پر چل گئی تھی، پستول اوتے مانگ کا تھا۔ تھائی لینڈ کی پولیس سیاحوں کے لیے سوفٹ کارنر رکھتی ہے۔ پاتھ کے بیان کی روشنی میں پولیس نے شیرن اینڈ فیملی کو کلیئر کر دیا اور سفر جاری رکھنے کی اجازت دے دی۔

اوتے کو چار گھنٹے کے بعد آپریشن روم سے نکال کر ریکوری ایریا میں شفٹ کر دیا گیا۔ اوتے دواؤں کے زیر اثر بے ہوش تھا۔ سرجن نے پاتھ کو صوفے پر بٹھا کر بڑی تفصیل کے ساتھ اوتے کی کنڈیشن کے بارے میں بریف کیا۔ ''گولی نے مسٹر اوتے مانگ کے گھٹنے کی ہڈی اور جوڑ کو بالکل چکنا چور کر دیا ہے۔ ہم نے صفائی کر کے وقتی طور پر ہلکا پلاستر کر دیا ہے۔ مجھے خدشہ ہے کہ مسٹر اوتے مانگ کی ٹانگ گھٹنے کے اوپر سے کاٹنی پڑے گی۔ ایک ہفتے کے بعد سینئر سرجنز کی ٹیم ان کا معائنہ کر کے فیصلہ کرے گی۔ ان کی جان کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ ہوش میں آنے کے بعد انہیں کمرے میں شفٹ کر دیا جائے گا۔''

رات کو قسیم اپنی بیوی کے ساتھ چینگ مائی پہنچ گیا اور بیوی کو پاتھ کے گھر چھوڑ کر اسپتال آ گیا۔ قسیم کے آنے سے پاتھ کو بہت ڈھارس ہوئی۔

☆☆☆

ایک ہفتے کے بعد اوتے کی ٹانگ گھٹنے کے اوپر سے کاٹ دی گئی۔ اس کے بعد بھی وہ ایک ماہ تک اسپتال میں رہا پھر اسے گھر شفٹ کر دیا گیا۔ اب وہ مستقل طور پر وہیل چیئر پر آ گیا تھا۔ روزانہ ایک نرس آتی تھی جو اسے ایلومینیم کی بنی بیساکھیوں کے سہارے چلنے کی پریکٹس کراتی تھی۔

پاتھ نے اس کے آفس کے ساتھ ایک چھوٹی سی لفٹ بنوا دی تھی جس کے ذریعے اوتے اپنی وہیل چیئر پر اپنے آفس آ جاتا تھا۔

کبھی کبھی وہ وہیل چیئر کو کھڑکی کے پاس لا کر سیاحوں کو سوئمنگ پول میں نہاتے ہوئے بڑی حسرت سے دیکھا کرتا تھا۔ وہ اکثر سوچتا تھا کہ اس نے زندگی کو بہت انجوائے کیا۔ کبھی نہ کبھی تو اسٹاپ لگنا ہی تھا۔ کسی نے سچ کہا ہے بُرے کام کا انجام بھی بُرا ہی ہوتا ہے۔

❖❖❖

دشمنِ جاں

فہمی فردوس

جرم کرنے والا کتنا ہی شاطر کیوں نہ ہو... لاشعوری طور پر یا نادانستگی میں کوئی نہ کوئی ایسی حرکت کر جاتا ہے... جو قابلِ گرفت ٹھہرتی ہے... قتل کی ایک ایسی ہی واردات... قاتل جائے وقوعہ پر موجود تھا... مگر نظروں سے اوجھل تھا...

بصیرت اور بصارت سے کام لینے والوں کا نکتہ رس مشاہدہ......

بارسلے اپنے دفتر میں کمپیوٹر ٹیبل پر بیٹھا، کمپیوٹر کے کی بورڈ پر تیزی سے انگلیاں چلارہا تھا۔ اُس کے باس کو ہر روز اس پر ناراض ہونے کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ ہاتھ آجاتا تھا۔

اور آج وہ دل میں تہیہ کیے ہوئے تھا کہ باس کو ایسا کوئی بہانہ مہیا نہیں کرنا، جس کی آڑ لے کر وہ اس پر برسنا شروع کردے۔

کام کرتے کرتے اچانک اس کی نگاہ، اس کے کیبن میں موجود کھڑکی کی طرف اٹھی تو نظروں میں فکرمندی سی سمٹ

آئی۔

اس وقت باہر کا موسم ابر آلود تھا۔

پچھلے دو دن سے لاس ویگاس شہر کا موسم اپنے شہریوں سے آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔ ہر طرف عجیب سی دھند اور کہرے کا راج تھا، کبھی کبھار چند لمحوں کے لیے ہلکی دھوپ اپنی چمک دکھا جاتی اور پھر سے بادل چھا جاتے۔

آج صبح دس گیارہ بجے تک دھند تو چھٹ چکی تھی مگر بادلوں کا راج بدستور قائم تھا۔

”لگتا ہے...... تھوڑی دیر تک بارش شروع ہو جائے گی۔“ وہ زیرِ لب بڑبڑایا اور کھڑکی سے نظر ہٹا کر کام میں مصروف ہو گیا۔

اسی وقت میز پر رکھا اس کا سیل فون بجنے لگا۔

اس نے فون اٹھا کر اسکرین پر کال کرنے والے کا نمبر دیکھا تو اس کے بڑے بھائی اینڈرسن کا نام جگمگا رہا تھا۔

اُس کے چہرے کی بیزاری میں مزید اضافہ ہو گیا۔

”اب اس کو مجھ سے کیا کام آن پڑا؟“ اس نے کال ریسیور کرتے ہوئے کہا۔

”ہیلو...... ہاں بولو اینڈرسن؟“

”تم مجھ سے ملنے آ سکتے ہو...... ابھی اور اسی وقت؟“ اس کا لہجہ خوفزدہ اور التجائیہ تھا۔

”میں اس وقت تمہیں ملنے کیسے آ سکتا ہوں...... مصروف ہوں۔“ بارسلے کے منہ میں کڑواہٹ گھل گئی۔

”تمہارا مجھ سے ملنا بہت ضروری ہے بارسلے۔ میں اپنے گھر میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ میری جان کو خطرہ ہے۔ جلد از جلد میرے پاس آ جاؤ۔ تمہیں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔“ اینڈرسن کی بات سن کر بارسلے چونک گیا۔

”کون ہے وہ...... جس سے تمہاری جان کو خطرہ ہے...... جلدی بتاؤ؟“ بارسلے نے تیزی سے پوچھا۔

”فون پر نہیں بتا سکتا...... تم جلدی سے آ جاؤ...... میں تمہارا منتظر ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

بارسلے چند لمحوں تک موبائل کی تاریک اسکرین کو گھورتا رہا۔ پھر فون جیب میں رکھا، اور اپنی ضروری چیزیں سمیٹنے لگا۔ اور ساتھ ہی باس سے چھٹی مانگنے پر جواباً جھڑکیاں اور لعن طعن سننے کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کرنے لگا۔

اس کی توقع کے عین مطابق جب اس نے باس کے سامنے فوری چھٹی کی درخواست رکھی تو سامنے بیٹھا کرخت صورت باس تو جیسے ہتھے سے اُکھڑ گیا۔

”اب اچانک ایسی کیا اُفتاد آن پڑی کہ تم سارا کام چھوڑ کر بھاگنے کی تیاری کرنے لگے؟“ وہ خشمگیں نگاہوں سے اسے گھور رہا تھا۔

”میں ساری بات واپس آ کر آپ کو بتا دوں گا۔ پلیز ابھی میرا جانا بہت ضروری ہے۔ میرا بھائی میرا انتظار کر رہا ہے۔ ایمرجنسی والی صورتِ حال پیدا ہو گئی ہے۔“ اتنا کہہ کر وہ باس کے کیبن سے باہر نکل گیا۔ وہ باس کے فضول قسم کے سوال و جواب میں اپنا مزید وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔

حالانکہ اسے اینڈرسن کی کال پر سو فیصد یقین نہیں تھا کہ وہ سچ بول رہا ہے۔ کیونکہ وہ پکا شرابی تھا۔ جب بھی حد سے زیادہ مے نوشی کر لیتا تھا تو اسی طرح کی اول فول بکنا شروع کر دیتا تھا۔

اس سے پہلے بھی وہ شراب کے نشے میں دھت ہو کر، بارسلے کو اس طرح کی کالز کر کے پریشان کر چکا تھا۔

اور جب بارسلے ہنگامی حالات میں اس کے گھر پہنچا، تو آگے سے کھلکھلا کر ہنسنے لگتا اور شرابیوں کی طرح پورے گھر میں جھوم جھوم کر گا رہا ہوتا۔

مگر آج اینڈرسن کے لہجے میں کچھ ایسی بات تھی کہ جسے محسوس کر کے بارسلے سارے کام چھوڑ چھاڑ کر فوری طور پر ایکشن لیتے ہوئے اس کے گھر کی طرف روانہ ہو رہا تھا۔

آج اسے اینڈرسن کی آواز میں کسی قسم کا نشیلا پن محسوس نہیں ہو رہا تھا بلکہ اس کا لہجہ گھبرایا ہوا اور خوف زدہ سا تھا۔

اینڈرسن اس سے دس سال بڑا تھا۔ دونوں بھائیوں کی طبیعت اور مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

اینڈرسن ایک کامیاب بزنس مین تھا۔ وہ اپنے بزنس پارٹنر کارلوس کے ساتھ ایک کامیاب بزنس جمائے بیٹھا تھا جبکہ بارسلے ایک نجی کمپنی میں اوسط درجے کی جاب کرتا تھا۔

وہ ایک خوددار اور سیلف ریسپکٹ آدمی تھا۔ جتنا کماتا تھا، اس میں خوش تھا۔ شادی جیسے جھنجھٹ سے ابھی تک دور تھا۔ اس لیے قلیل تنخواہ میں بھی اچھی گزر بسر ہو رہی تھی۔

اس کی طبیعت قناعت پسند اور ضرورتیں محدود تھیں۔ اس لیے کبھی اپنے بزنس مین بھائی کے سامنے اپنی کسی ضرورت کے لیے ہاتھ پھیلانے کی نوبت نہیں آئی تھی۔

ویسے بھی دونوں بھائیوں کی آپس میں بنتی نہیں تھی۔ دونوں شہر کے مختلف حصوں میں رہتے تھے۔

اینڈرسن چالیس کے قریب پہنچ چکا تھا مگر وہ بھی ابھی تک غیر شادی شدہ تھا۔ اور اس کے شادی نہ کرنے کی سب سے بڑی وجہ اس کی آوارہ مزاجی اور عیاش فطرت تھی۔

اس کے دفتر سے اینڈرسن کی رہائش گاہ آدھے گھنٹے کی ڈرائیو پر تھی۔

ابھی دفتر سے روانہ ہوئے اسے پانچ منٹ ہی گزرے تھے کہ بونداباندی شروع ہوگئی۔ اس نے ونڈو اسکرین پر وائپر چلادیے۔

اینڈرسن کا گھر شہر سے باہر مضافات میں واقع تھا۔ وہ شہر سے باہر نکلنے والی سڑک پر رواں دواں تھا۔ اب شہری آبادی پیچھے رہ گئی تھی اور مضافاتی علاقہ شروع ہوگیا تھا۔ تھوڑا آگے جاکر مرکزی شاہراہ سے ایک ذیلی سڑک دائیں طرف جاتی دکھائی دی۔

بارسلے نے اپنی گاڑی اس ذیلی سڑک پر موڑ دی۔

یہ شہر سے ہٹ کر ایک پُرسکون ٹاؤن تھا۔ جہاں مصنوعی ٹیلے اور پہاڑیاں بنا کر علاقے کی خوبصورتی میں اضافہ کیا گیا تھا۔

یہاں اِکا دُکا گھر دکھائی دیتے تھے، جو ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر تھے۔

یہ ذیلی سڑک بل کھاتی اور موڑ کاٹتی ہوئی اس ٹاؤن کے بیچوں بیچ سے گزرتی تھی۔

بارسلے کی گاڑی نے ایک موڑ کاٹا، تو اس کے بھائی کا گھر سامنے دکھائی دینے لگا۔

گھر سے باہر سڑک پر ایک اور گاڑی بھی کھڑی تھی جس کی ہیڈ لائٹس ابھی روشن تھیں۔ گاڑی کا رخ چونکہ اسی کی جانب تھا، لہٰذا وہ ونڈ اسکرین پر چلتے ہوئے وائپر بھی بہ آسانی دیکھ سکتا تھا۔

اور اس کا مطلب یہی نکلتا تھا کہ وہ گاڑی بھی ابھی ابھی وہاں پہنچی تھی۔ مگر یقیناً وہ مخالف راستے سے آئی تھی۔ اگر اس راستے سے جاتی تو بارسلے کی نگاہوں سے اوجھل نہ رہ پاتی۔

بارش کی شدت میں قدرے اضافہ ہوچکا تھا۔

بارسلے نے اپنی گاڑی اس گاڑی کے مقابل جاکر کھڑی کردی اور اپنی گاڑی کی کھڑکی کا شیشہ نیچے کرکے اس گاڑی کے اندر جھانکنے لگا۔

گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر اینڈرسن کا بزنس پارٹنر کارلوس بیٹھا تھا۔ اس کی نظر بارسلے کی نظر سے ٹکرائی، تو اس کے چہرے پر ایک خیر مقدمی مسکراہٹ پھیل گئی۔

”آپ کب آئے مسٹر کارلوس؟“ بارش کی تیز آواز میں بارسلے کو قدرے چلا کر پوچھنا پڑا۔

”ابھی ابھی آیا ہوں...... تم دیکھ رہے ہو کہ ابھی میری گاڑی کا انجن بند نہیں ہوا۔“ مسٹر کارلوس نے بھی اونچی آواز میں جواب دیا۔

دونوں نے اپنی گاڑیوں کے انجن سوئچ آف کیے اور باہر نکل آئے۔

بارش میں بھیگتے ہوئے وہ تیزی سے مکان کے اندر داخل ہوئے، اور تقریباً دوڑتے ہوئے پورچ میں پہنچے۔

پورچ میں اینڈرسن کی بلیک کار کھڑی تھی۔ جس کا مطلب یہی تھا کہ وہ گھر کے اندر موجود ہے۔

بیرونی گیٹ کھلا ہونے کی بھی یہی توجیہ ہوسکتی تھی۔

دونوں نے اپنے بھیگے ہوئے کپڑوں سے پانی کے قطروں کو ہاتھوں سے جھاڑا۔ اور داخلی دروازے کی طرف بڑھے۔

پہلے بارسلے نے اس خوبصورت چوبی دروازے کو دھکیلا اور اندر داخل ہوا۔ اس کے پیچھے کارلوس تھا۔

دونوں اب سٹنگ روم یا ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوئے۔

یہاں کوئی ذی نفس دکھائی نہ دیا تو بارسلے اپنے بھائی

ترکیب

کیلی فورنیا کی عدالت میں فضا سازگار نہیں تھی۔ وکیل کو یقین تھا کہ اس کا مؤکل مقدمہ ہار جائے گا۔ اس نے اپنی فرم کے سینئر وکیل سے مشورہ کیا کہ جج سگاروں کا شوقین ہے۔ اسے ہوانا کے قیمتی سگاروں کا ایک بکس تحفے میں بھیج دیا جائے تو کیسا رہے گا۔ سینئر وکیل نے اسے سختی سے منع کرتے ہوئے بتایا کہ جج بہت ایمان دار ہے۔ اس نے ایسی حرکت کی تو وہ جیتا ہوا مقدمہ بھی ہار جائے گا۔

اگلی سماعت میں وکیل مقدمہ جیت گیا تو سینئر وکیل نے کہا کہ اگر وہ سگار بھیج دیتا تو ضرور مقدمہ ہار جاتا۔

وکیل نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”میں نے سگاروں کا بکس بھیج دیا تھا... اپنی طرف سے نہیں، فریقِ مخالف کی جانب سے۔“

امتیاز احمد، کراچی کی حوصلہ مندی

کے بیڈروم کی طرف بڑھا۔

بیڈروم بھی خالی تھا۔

اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ آخر پورا گھر کھلا چھوڑ کر اینڈرسن کہاں چلا گیا۔

ان دونوں نے اس مختصر گھر کا چپّا چپّا چھان مارا، مگر اینڈرسن کہیں نہ ملا۔

''کہاں جا سکتا ہے وہ......؟'' بارسلے زیرِلب بڑبڑایا۔

''ہو سکتا ہے وہ اچانک کہیں چلا گیا ہو۔'' کارلوس نے خیال آرائی کی۔

''مگر...... اچانک بھی جاتا تو گھر کھلا چھوڑ کر کیوں جاتا...... اور ویسے بھی اس نے مجھے فون کر کے بلایا ہے۔ اسے میرا انتظار کرنا چاہیے تھا۔ مجھے بلا کر خود غائب ہو گیا۔ کمال ہے۔'' بارسلے اپنی دو انگلیوں اور انگوٹھے سے پیشانی کو مسلنے لگا۔

''حیرت ہے...... آپ کو بھی اینڈرسن نے فون کر کے بلایا، اور مجھے بھی کال کر کے بلایا، اور ہم دونوں ایک ساتھ ہی آ گئے۔ مگر اب وہ خود غائب ہے۔'' مسٹر کارلوس کے چہرے پر بھی تفکر کے سائے لہرا رہے تھے۔

''اوہ...... ایک جگہ تو ہم نے دیکھی ہی نہیں...... گھر کا ڈرائنگ روم ہم نے ابھی تک کہیں دیکھا۔'' بارسلے تیز تیز قدموں سے ڈرائنگ روم کی طرف بڑھا۔

ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولتے ہی ایک لرزہ خیز منظر اس کی آنکھوں کے سامنے آ گیا۔

اس کے بھائی کی خون میں لت پت لاش سامنے ہی صوفے پر موجود تھی۔

اس کی کنپٹی میں پستول کی گولی اتاری گئی تھی، جو کھوپڑی کو توڑتے ہوئے دوسری طرف مغز کو بہاتی ہوئی باہر نکل گئی تھی۔

اینڈرسن مردہ حالت میں سامنے صوفے پر بیٹھا، بائیں طرف کو جھکا ہوا تھا۔

اس کا سر گولی لگنے سے پاش پاش ہو چکا تھا۔

سر سے نکلنے والے خون اور مغز سے صوفہ بُری طرح لتھڑ چکا تھا۔

''اوہ مائی گاڈ'' کارلوس کے منہ سے سرسراتی آواز نکلی۔

''یعنی اینڈرسن سچ کہہ رہا تھا۔ اس کی جان کو واقعی خطرہ تھا۔ مگر افسوس...... میں بروقت نہ پہنچ سکا۔ قاتل اپنا کام کر کے نکل گیا۔ میں نے آنے میں دیر کر دی۔'' بارسلے کے حلق سے غم و اندوہ میں ڈوبی آواز نکلی۔

''مسٹر کارلوس آپ کو میرے بھائی نے فون پر کیا بتایا تھا......؟'' بارسلے اب اپنی کیفیت پر کسی حد تک قابو پا چکا تھا۔

وہ دونوں ڈرائنگ روم سے باہر آ چکے تھے۔

''مجھے مسٹر اینڈرسن نے یہی کہا تھا کہ جلد از جلد میرے پاس پہنچو کوئی ضروری بات کرنی ہے...... اس سے زیادہ تو کچھ نہیں بتایا تھا۔''

''کتنی عجیب بات ہے...... ہم دونوں کو بلایا مگر بلانے کا مقصد نہیں بتایا۔ اور ہمارے پہنچنے سے پہلے قاتل اپنا کام کر گیا۔ کیا آپ کوئی اندازہ لگا سکتے ہیں مسٹر کارلوس...... کہ میرے بھائی کو اس حال تک کس نے پہنچایا ہوگا؟''

''میں کیا بتا سکتا ہوں مسٹر بارسلے۔ مسٹر اینڈرسن جیسے آدمی کا اگر کوئی دشمن ہے تو یہ تعجب خیز بات ہے۔ کیونکہ وہ ایک خوش مزاج اور بے ضرر انسان تھا۔ پچھلے پانچ سال سے وہ میرا بزنس پارٹنر تھا۔ مگر مجھے اس سے کبھی کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ وہ ایک ایمان دار اور شفاف آدمی تھا۔''

دونوں باتیں کرتے کرتے باہر پورچ میں آ گئے۔

بارش وقتی طور پر رک چکی تھی۔

''آپ کے خیال میں اب ہمارا اگلا قدم کیا ہونا چاہیے......؟'' بارسلے کھوجتی ہوئی نظروں سے مسٹر کارلوس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''وہی کرنا چاہیے جو ایک قانون پسند شہری کو کرنا چاہیے...... میرا مطلب ہے، اس واقعے کی فوری طور پر پولیس اسٹیشن میں اطلاع دینی چاہیے۔''

بارسلے اپنی جیب سے سیل فون نکال کر پولیس اسٹیشن کا نمبر ملانے لگا۔

اور پندرہ منٹ بعد مقامی پولیس موقع پر موجود تھی۔

☆☆☆

پولیس کی فرانزک ٹیم نے ضروری کارروائی کے بعد جائے وقوعہ کو سیل کیا اور لاش پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال روانہ کر دی۔

''آپ دونوں کو اپنے بیانات ریکارڈ کرانے کے لیے ہمارے ساتھ پولیس اسٹیشن چلنا ہوگا۔'' انسپکٹر ڈیرن اُن دونوں سے مخاطب تھا۔

پولیس اسٹیشن پہنچ کر بارسلے اور کارلوس کو ان کے کوائف درج کرنے کے بعد دوبارہ کسی بھی وقت طلبی پر پیش ہونے کی شرط کے ساتھ جانے کی اجازت دی تو بارسلے کہنے لگا۔

’’انسپکٹر...... میرے بھائی کا قاتل آپ کے سامنے بیٹھا ہے۔اور آپ اسے جانے کی اجازت دے رہے ہیں؟‘‘

’’میں سمجھا نہیں۔‘‘ انسپکٹر چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

جبکہ اس کی بات سن کر ساتھ بیٹھا ہوا کارلوس یوں اُچھلا، جیسے کسی بچھو نے پاؤں پر ڈنگ مار دیا ہو۔ وہ کرسی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

’’کیا بکواس کر رہے ہو مسٹر بارسلے! تمہارا اشارہ کس کی طرف ہے؟‘‘

’’میرا اشارہ تمہاری طرف ہے مسٹر کارلوس...... تم نے میرے بھائی کو قتل کیا ہے۔ انسپکٹر اسے گرفتار کر لیں۔ میں آپ کو ثبوت مہیا کرتا ہوں۔‘‘

کارلوس نے بھاگنے کی کوشش کی مگر دروازے کے پاس کھڑے کانسٹیبلوں نے اسے جکڑ لیا۔

☆☆☆
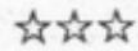
اس کے خلاف تمام ثبوت اور آلۂ قتل بھی مل چکا تھا۔

انسپکٹر ڈیرن نے اپنے مخصوص طریقہ کار اور شواہد کی بنا پر اسے جلدی ہی سچ بولنے پر مجبور کر دیا تھا۔

اس نے نہ صرف اقبالِ جرم کر لیا تھا بلکہ قتل کے محرک پر بھی تفصیلی روشنی ڈالی تھی۔ جو کاروباری لین دین کے کچھ گنجلک مسائل پر مبنی تھی۔

آج اینڈرسن کے قتل کا تیسرا دن تھا۔

کارلوس حوالات میں ایک لکڑی کی بینچ پر سر جھکائے بیٹھا تھا۔

قدموں کی چاپ سنائی دی تو اس نے جھکا ہوا سر اٹھایا۔ اس کے سامنے سلاخوں کے اس پار بارسلے کھڑا شرربار نگاہوں سے اسے گھور رہا تھا۔

بارسلے کو سامنے کھڑا دیکھ کر کارلوس اپنی جگہ سے اٹھا اور آہستگی سے چلتا ہوا اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

اس کے ذہن میں ایک بہت بڑی اُلجھن تھی جو صرف بارسلے ہی دور کر سکتا تھا۔

دونوں چند لمحوں تک ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتے رہے پھر بارسلے بولا۔

’’قاتل جتنا مرضی ہوشیار ہو مگر کوئی نہ کوئی غلطی ضرور کر جاتا ہے۔ اگر وہ جان بوجھ کر کوئی غلطی نہ بھی کرے تو قدرت کی طرف سے کوئی نہ کوئی ایسا اشارہ مل جاتا ہے، جس کی وجہ سے وہ قانون کی گرفت میں آ جاتا ہے۔‘‘

’’میں جاننا چاہتا ہوں...... کہ مجھ سے ایسی کیا غلطی ہوئی تھی کہ تم فوراً ہی بطور قاتل مجھے پہچان گئے اور کمال ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے مجھے گھیر گھار کر پولیس اسٹیشن تک بھی لے آئے۔‘‘

’’چھوڑو کیا کرو گے جان کر...... تم قاتل ہو اور یہ بات میں ثابت کر چکا ہوں۔ تمام ثبوت تمہارے خلاف ہیں، اور سب سے بڑی بات...... تم اقبالِ جرم بھی کر چکے ہو۔ اب یہ بات جاننا تمہارے لیے قطعی غیر ضروری ہے۔‘‘

’’جانتا ہوں اب اِن باتوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ مگر پھر بھی حقیقت جاننا چاہوں گا۔ کیوں کہ یہ سوال مجھے بہت بے چین کیے رکھتا ہے۔‘‘

’’تو پھر سنو...... تمہاری وہاں موجودگی مجھے پہلے ہی شک میں مبتلا کر رہی تھی۔ مگر جب پولیس اینڈرسن کے گھر پہنچی اور موقع کی کارروائی میں مصروف ہوگئی، تو میں سب کی نظر بچا کر چند منٹ کے لیے گھر سے باہر نکل گیا۔

’’تمہاری گاڑی کے نیچے جھک کر دیکھا تو میرا شک یقین میں بدل گیا۔ مجھے اس بات کا یقین ہو گیا کہ میرے بھائی کا قاتل تمہارے سوا کوئی اور نہیں ہے۔‘‘ اس کے الفاظ جیسے زہر میں بجھے ہوئے تھے۔

’’مگر کیسے...... یہی تو میں جاننا چاہتا ہوں۔‘‘ اس نے بے تابی سے پوچھا۔

’’تمہیں یاد ہے...... اُس دن بارش ہو رہی تھی۔ اور ہم دونوں برستی بارش میں وہاں پہنچے تھے۔ یہ بات ذہن میں رکھی جائے تو ہماری گاڑیوں کے نیچے والی جگہ گیلی ہونی چاہیے تھی۔ جبکہ اس کے برعکس تمہاری گاڑی کے نیچے زمین بالکل خشک تھی۔ یعنی تم بارش ہونے سے پہلے وہاں پہنچے تھے۔ اور غالباً اینڈرسن کو قتل کرنے کے بعد واپس جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ جب میں نے تمہیں چھاپ لیا۔

’’تمہاری ذہانت کو داد دینا پڑے گی کہ مجھے اچانک اپنے سامنے دیکھ کر بھی تم نروس نہ ہوئے۔ بلکہ اپنی اندرونی کیفیت پر کمال خوبصورتی سے قابو پاتے ہوئے، بعد میں ہونے والی میری ہر کارروائی میں شامل رہے۔ ویلڈن مسٹر کارلوس! مگر قسمت سے کون جیت سکتا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ میں نے اپنے بھائی کے قاتل کو کیفرِ کردار تک پہنچا دیا۔ مجھے آنے میں اور اسے بچانے میں بے شک دیر ہوئی مگر اس کے قاتل کو پکڑنے میں دیر بالکل نہیں ہوئی۔‘‘

یہ کہہ کر بارسلے تیز قدم اٹھاتا ہوا تھانے سے باہر نکل گیا اور کارلوس وحشت زدہ نظروں سے اُسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔

❖❖❖

سرورق کی پہلی کہانی

لہولہان رشتے

یعقوب بھٹی

بے لوٹ رشتے بڑے قیمتی ہوتے ہیں جو زندگی میں نہ صرف گرنے سے... ڈوبنے سے بچاتے ہیں... بلکہ ہر مصیبت کا سامنا کرنے کے قابل بھی بناتے ہیں... ایسے ہی پُرخلوص... جاندار رشتوں کی تباہی و بربادی سے شروع ہونے والی دردناک کہانی... ایک ہنستے بستے آشیانے پر عقاب صفت درندے نے ڈیرا ڈال لیا تھا... دبے پاؤں موت نے آن دبوچا... بنا کسی آہٹ کے... تیز رفتار کہانی کے ایسے پیچ و خم جو آپ کو آخری سطر تک اپنے سحر میں جکڑے رکھیں گے۔

نفرت و انتقام کے درمیان چھپی دردمندی و جرأت مندی کا امتحان

مجھ پر ٹوٹی قیامت کو چار روز بیت چکے تھے۔

دماغ ابھی تک سائیں سائیں کر رہا تھا۔ لگ رہا تھا، میں کوئی بھیانک خواب دیکھ رہا ہوں۔ ابھی آنکھ کھلے گی اور نورانی چہرے والی، تسبیح گھماتی ماں...... مجھ پر کوئی آیت پڑھ کر پھونکتے ہوئے کہے گی۔ ”بیٹا! گھر جلدی آجانا۔ صائم بھی اب دیر سے آنے لگا ہے، اُس کی بھی آج کلاس لو۔“

کتاب پڑھتے ہوئے بابا، عینک کے اوپر سے دیکھیں گے۔ ”یار! میرے لیے کچھ میٹھا لے آنا۔“

ماں فوراً ٹوکے گی۔ ”اور استعمال کرے گی۔“ ”کوئی ضرورت نہیں۔ اپنے شوگر لیول کے مطابق فرمائش کریں۔“

ماں اور بابا میں نوک جھوک شروع ہو جائے گی۔ ہم باپ، بیٹے آنکھوں ہی آنکھوں میں سب کچھ طے کر لیں گے۔ کسی کونے سے بارہ سالہ فاطمہ بھاگی آئے گی۔ ”بھائی! میں بھی ساتھ چلتی۔“ ساتھ وہ آنکھیں معنی خیز انداز میں گھمائے گی۔ ”میں جانتی ہوں، آپ کہاں جا رہے ہیں۔“

دروازہ بند کرتے ہوئے چندو حسبِ عادت آواز دبا کر صائم کے بارے میں نئی خبر دے گا۔ ”صاحب دیر سے آنے کے بعد بھی دیر تک فون پر مصروف رہتے ہیں۔“

میں نے اضطراری کیفیت میں دو، تین دفعہ آنکھیں زور سے بھینچ کر کھولیں مگر یہ خواب نہیں تھا جو ٹوٹ جاتا۔ دماغ کی اسکرین پر چندو کی تصویر نمایاں ہوئی۔ اس کی چاندی سی پیشانی کے عین درمیان ایک سیاہ بدصورت داغ تھا جس پر خون بہہ کر اس کی کنپٹی اور رخسار پر جم کر سیاہ ہو گیا تھا۔ اس کی کھلی آنکھوں میں شدید ترین حیرت کا عکس جیسے مجسم ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ ملازم تھا مگر گھر کے فرد جیسا تھا۔

پھر ایک اور تصویر ابھری۔ یہ بابا تھے۔ وہ اوندھے پڑے تھے۔ گولیوں نے ان کی پشت چھید دی تھی۔ سفید قمیص خون سے تربتر تھی۔

اگلے پل بابا کی جگہ ماں تھی۔ خون آلود چھاتی اور کھلے بازو۔ جیسے آخری لمحوں میں کسی کے لیے بازو وا کر رکھے ہوں۔ کچن میں کٹی پھٹی فاطمہ اور داخلی دروازے کے باہر صائم خون سے لت پت، کھلی آنکھوں سے نہ جانے کیا دیکھ رہا تھا۔

ان مناظر سے گھبرا کر میں نے سر ستون سے ٹکرا دیا۔ درد کی تیز لہر نے سب کچھ گڈمڈ کر دیا۔

فائزہ کی کرلاتی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ”کب تک خود کو اذیت دیتے رہو گے، اپنے ساتھ مجھے بھی مار دو گے۔“ وہ روہانسی سی ہو گئی تھی۔

درد نے سینے کے درد کو کچھ دیر کے لیے دبا لیا تھا۔
میں نے سہارے کے لیے صوفے کو پکڑنا چاہا تو وہاں صوفہ تھا ہی نہیں۔ اس سے پہلے کہ میں لڑکھڑا کر گر جاتا، فائزہ نے بڑھ کر مجھے تھام لیا۔ میرے قدم متوازن ہوئے تو وہ مجھ سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میری آنکھوں سے بھی دوبارہ آنسو رواں ہو گئے۔
مجھ پر بیتی جہاں کربناک تھی، وہیں بے حد حیرت ناک بھی تھی۔ جذبات کا ریلا گزرا تو میں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش شروع کر دی۔ میں نے تو خود کو آئینے میں نہیں دیکھا تھا مگر فائزہ میرا عکس تھی۔ ان چار دنوں میں اس کا پنک کلر بدھم پڑ گیا تھا۔ آنکھوں کے نیچے حلقے نمودار ہو گئے تھے اور شہد رنگ بال روکھے ہو رہے تھے۔ ملگجے سے لباس میں وہ حسرت و یاس کی تصویر نظر آ رہی تھی۔
میں صوفے پر گر سا گیا۔ وجود میں نقاہت نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ میرے حلق سے بمشکل الفاظ ادا ہوئے۔ ''تھوڑا سا پانی تو دو۔''
وہ دوپٹے سے آنکھیں خشک کرتی...... تیزی سے کچن کی طرف بڑھ گئی۔ تھوڑی دیر میں وہ پانی کے بجائے جوس لے آئی۔ میں نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا۔ گزشتہ چار دنوں میں یاد نہیں تھا کہ میں نے ڈھنگ سے کچھ کھایا، پیا ہو۔
فائزہ دوسرا گلاس لے آئی۔ دوسرا گلاس میں نے گھونٹ گھونٹ کر کے پیا۔
فائزہ، میرے پاس آ بیٹھی۔ ''میں کھانا لگاتی ہوں۔''
''مجھے بھوک نہیں ہے۔''
''میری خاطر!'' وہ میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھے ملتجی ہوئی۔
''لے آؤ۔''
اس نے خوش ہو کر میرا ہاتھ چوما اور کچن کی طرف اٹھ گئی۔
زبردستی کے چند نوالے معدے میں اترے تو نقاہت پسپا ہونے لگی۔ کھانے کے بعد فائزہ نے میری پیشانی کا جائزہ لیا۔ وہاں ایک چھوٹا سا گومڑ نمایاں ہو چکا تھا۔ اس پر فائزہ نے کوئی دوا لگا دی جس کے سبب متاثرہ جگہ پر ٹھنڈک سی محسوس ہونے لگی تھی۔
فائزہ برتن سمیٹ کر آئی ہی تھی کہ ڈور بیل بجی۔ وہ داخلی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ تھوڑی دیر بعد واپس آئی تو اس کے ساتھ تین رکنی پولیس ٹیم تھی۔
پولیس ٹیم کا انچارج ایک اسمارٹ سا نوجوان اے ایس پی تھا۔ دوسرا، روایتی توند اور سرخ چہرے والا جہاندیدہ سب انسپکٹر تھا جو یقیناً محکمے میں 20 سال تو گزار ہی چکا تھا۔ تیسرا مسکین سی صورت والا ارد لی تھا۔
تعارف، رسمی تعزیت کے بعد اے ایس پی جس نے

اپنا تعارف طارق سیال کے نام سے کروایا تھا، بولا۔ ''آپ کے ساتھ پیش آنے والے سانحے پر مجھے دلی افسوس ہے۔ یہ کربناک واقعہ بے حد حیرت انگیز بھی ہے۔ صائم کی جنونی کیفیت نے بہت سے سوالات کو جنم دیا ہے۔ ان سوالات کے جواب ڈھونڈنے کے لیے ہمیں آپ کا تعاون درکار ہے۔''

میرے سینے سے افسردہ آہ نکل گئی۔ ''مجھے خود یقین نہیں آرہا۔ میرے لیے یہ بھیانک خواب جیسا ہے۔ میں سمجھ نہیں پایا کہ آپ سے کیا تعاون کروں۔ میری تو دنیا ہی لٹ گئی ہے۔'' آخر میں میری آواز رُندھ گئی۔

اے ایس پی اٹھ کر میرے پاس آبیٹھا۔ حوصلہ دینے والے انداز میں اس نے مجھے بازو کی گرفت میں لے لیا۔ ''صبر، حوصلہ جیسے الفاظ آپ کے دکھ کے سامنے معنی کھو بیٹھتے ہیں۔ میری درخواست ہے کہ خود کو سنبھالیں۔ میری چھٹی حس مسلسل سگنل دے رہی ہے۔ یقیناً اس انہونے واقعے کے پیچھے بہت کچھ پوشیدہ ہے۔'' آپ کے مضبوط اعصاب کی گواہی تو بار کونسل کے سینئر وکیل اور سپریم کورٹ کے جج صاحبان تک دے رہے ہیں۔ خود کو سنبھالیں اور ہمارے ساتھ تعاون کریں۔''

میں نے صوفے کی پشت سے کمر لگانے کی کوشش کی تو اے ایس پی اٹھ کر اپنی سابقہ جگہ پر جا بیٹھا۔ میں نے کہا۔ ''حکم کریں، میں ہر تعاون کے لیے حاضر ہوں۔''

اس موقع پر فائزہ کو اپنے میزبان ہونے کا خیال آیا تو اس نے مداخلت کی۔ ''آپ لوگ تسلی سے اس معمے کو حل کرنے کی کوشش کریں، مجھے بتائیں کہ چائے، کافی یا کچھ اور...... کیا چلے گا؟''

اے ایس پی نے بے تکلفی سے چائے کے لیے بول دیا۔

فائزہ نے ایک دفعہ پھر کچن کا رخ کر لیا۔

اے ایس پی دوبارہ سے میری طرف متوجہ ہوا۔ ''سب سے پہلے ہم صائم کا شخصی خاکہ بنا رہے ہیں۔ چند سوالوں کے آپ سے بے لاگ جوابات مل جائیں تو یہ خاکہ مکمل ہو جائے گا۔''

''شروع کریں۔''

مسکین صورت ریڈر نے ایک چھوٹا مگر حساس ریکارڈنگ کا آلہ آن کر کے میرے سامنے ٹیبل پر رکھ دیا۔ سب انسپکٹر اور اے ایس پی کے درمیان مدھم آواز میں کوئی مکالمہ ہوا، پھر اے ایس پی بولا۔ ''ہمسائے وغیرہ تو اسے خاموش سا نوجوان سمجھتے تھے۔ دوستوں میں اسے خوش مزاج اور یاروں کا یار کہا جاتا ہے۔ بطور بھائی، آپ نے صائم کو کیسا پایا؟''

میری آنکھوں کے سامنے چھم سے صائم آگیا۔ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، روشن پیشانی، بڑی بڑی شفاف آنکھیں، سرخ و سفید چہرے پر ہلکی ہلکی داڑھی مونچھیں کتنی جچتی تھیں اُس پر۔ ''بھائی! میں دوستوں کے ساتھ آزاد کشمیر جا رہا ہوں، کچھ پیسے اور آپ کی گاڑی چاہیے۔''

''پیسے تو لے، لے یار گاڑی مشکل ہے۔ کورٹ کے علاوہ اکثر دوسرے شہروں میں بھی جانا ہوتا ہے۔''

صائم نے ٹیبل پر پڑی گاڑی کی چابی اُچک لی تھی۔ ''بابا کی مہران سے کام چلائیں اور...... اور ہماری ہونے والی بھابی کی گاڑی کس دن کام آئے گی۔''

اس ظالم کا ذکر ہوا تو خیالات کی رو کہیں سے کہیں بہہ گئی۔ پولیس ٹیم، میرے بولنے کی منتظر تھی۔ سینے میں ہلچل مچانے والی دلدوز آہ کو دباتے ہوئے میں نے کہا۔ ''لائق بچہ تھا۔ غصے کا تھوڑا تیز تھا۔ مجھے اور والدین کو اس سے کچھ خاص شکایت نہیں تھی۔ تھوڑی بہت شکایت تھی تو اس کی ضرورت سے زیادہ دوستیوں سے...... اس بارے میں وہ کسی کی نہیں سنتا تھا۔ ویسے اس کے زیادہ تر دوست میرے دیکھے بھالے ہی ہیں۔ سمجھ نہیں آتی اسے کیا ہوا تھا۔ گھر سے باقاعدہ اجازت اور گاڑی لے کر وہ ہیپی نیو ایئر نائٹ کے لیے نکلا تھا۔''

اے ایس پی بولا۔ ''گھر سے جانے اور واپس آنے کا درمیانی وقت، سب سے زیادہ اہم ہے۔ اس بارے میں بعد میں بات کرتے ہیں۔'' لمحاتی وقفے کے بعد وہ دوبارہ بولا۔ ''گھر والوں کی طرف سے اس پر کوئی خاص دباؤ تھا؟''

میری سوالیہ نظروں کو سمجھتے ہوئے اس نے وضاحت کی۔ ''میرا مطلب ہے کسی دوست وغیرہ کے لیے اسے سختی سے منع کیا گیا ہو، کسی خاص جگہ شادی کے لیے زور ڈالا جا رہا ہو...... تعلیم یا کسی بھی حوالے سے اس پر آپ لوگوں کا دباؤ ہو؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں، ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔''

''صائم نے پیسوں یا اپنی کسی ضرورت کے لیے آپ لوگوں سے کہا ہو اور آپ لوگوں نے اسے منع کر دیا۔ اس حوالے سے اس کا اصرار مسلسل جاری ہو؟''

میرا جواب ایک دفعہ پھر نفی میں تھا۔
''کوئی لڑکی کا چکر...... اس کا شادی کے لیے اصرار...... آپ لوگوں کا سختی سے انکار؟''
''ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ کسی لڑکی کے ساتھ اس کی دوستی وغیرہ ہو سکتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے یہ دوستی ایک سے زیادہ لڑکیوں سے ہو۔ پچھلے دو ماہ میں خاصا مصروف رہا ہوں۔ اس پر خاص توجہ نہیں دے سکا۔ یہ میرے علم میں ضرور آیا تھا کہ وہ دیر سے گھر آنے لگا ہے اور رات دیر تک فون پر بھی مصروف رہتا ہے۔''
اے ایس پی کی آنکھیں پُرسوچ رنگ اختیار کر گئیں، بولا۔ ''وہ کوئی نشہ وغیرہ کرتا تھا؟''
میں نے کہا۔ ''باقاعدہ تو نہیں، میرے علم میں آیا تھا۔ دوستوں کے ساتھ کبھی کبھار شیشہ وغیرہ پی لیتا ہے۔ اس حوالے سے میں نے ڈانٹ ڈپٹ کی تھی۔''
اس دوران فائزہ چائے لے آئی تھی۔ چائے وغیرہ سرو کر کے وہ، میرے پاس ہی صوفے پر ٹک گئی۔ چائے کا سپ لے کر اے ایس پی نے چائے کے ذائقے کی تعریف کی اور بولا۔ ''اب دوسری طرف آتے ہیں...... کیا آپ کے علم میں ہے کہ صائم پپی نیو ایئر نائٹ پر ہلّے گلّے کے لیے گھر سے نکلا تو کن لوگوں کے ساتھ اور کہاں تھا؟''
میں نے جواب دیا۔ ''دوستوں کے ساتھ ہی ہوگا۔ تھوڑا سنبھل جاؤں تو اس کے دوستوں کو چیک کرتا ہوں۔ اس کے پاس پسٹل کہاں سے آیا؟ یہ بھی پتا کرنا ہے۔''
''صائم کے دوستوں کے نام لیں۔''
میں نے اس کے قریبی دوستوں کے نام بتا دیے۔
اے ایس پی اور سب انسپکٹر کے درمیان ایک دفعہ پھر مدھم آواز میں کچھ مکالمہ ہوا۔ سب انسپکٹر نے اپنے موبائل فون کی غالباً نوٹ بک چیک کر کے اے ایس پی کو بریف کیا۔
اے ایس پی مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''مسٹر عاصم چوہدری صاحب! آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ مذکورہ لڑکوں کے علاوہ دیگر چار لڑکے بھی اس وقت تھانے میں ہیں۔ صائم اُس رات ان میں سے کسی کے ساتھ بھی نہیں تھا۔ تقریباً سبھی اس کے دوستوں کا کہنا ہے کہ گزشتہ کئی ہفتوں سے وہ دوستوں سے کچھ کھچا کھچا اور دور، دور سا تھا، یہ تبدیلی یقیناً اس ٹائم فریم کی ہے جب آپ خاصے مصروف رہے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ اس بات سے بھی بے خبر ہیں کہ وہ ''آئس'' کی لت میں مبتلا ہو چکا تھا۔''

یہ خبر میرے لیے شاک جیسی تھی۔ ''یہ اطلاع غلط ہے۔ کسی نے غلط خبر دی ہے آپ کو۔''
اے ایس پی نے کپ کے اوپر سے میری طرف دیکھا۔ ''اس کے دو قریبی دوستوں نے اسے ''آئس'' کے ہوش رُبا فوائد کا ذکر کرتے سنا ہے۔ ان میں سے ایک نے تو اس کے پاس آئس دیکھی بھی ہے۔''
میں نے بے اختیار اپنا سر تھام لیا۔ ایک خیال آنے پر میں چونک سا گیا۔ ''کہیں وہ اس وقت نشے کے زیرِ اثر تو نہیں تھا۔ نشے کی زیادتی سے اس کا دماغ الٹ گیا ہو اور......'' میرے الفاظ میرا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔
فائزہ بھی چونک سی گئی تھی۔ یقیناً اس کا دماغ بھی اس ڈگر پر دوڑنا شروع ہو گیا تھا۔
اے ایس پی بولا۔ ''ایسا ہوتا تو یہ عام سا کیس ہوتا اور میں یہاں نہ بیٹھا ہوتا۔ میڈیکل ایگزامنر کے مطابق اس کے خون میں معمولی سی الکحل کے اثرات تھے۔ اس کے علاوہ اس نے کسی قسم کا نشہ نہیں کر رکھا تھا۔ محض معمولی مقدار میں شراب یا بیئر کے ایک دو ٹن پینے سے آج تک کوئی اس طرح کی جنونی کیفیت کا شکار نہیں ہوا کہ ہر سامنے آنے والے کو جھنجھوڑ ڈالے اور اپنے ہی پیاروں کو......'' آخر میں اس نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔
میرے لیے یہ ایک اور شاک تھا کہ صائم ڈرنک بھی کرتا تھا۔ فائزہ بھی یہ سن کر ہونٹ چبانے لگی۔
اے ایس پی نے گفتگو کو ایک نیا رخ دیتے ہوئے کہا۔ ''چوہدری صاحب! آپ جہاندیدہ آدمی ہیں۔ بہت سا سرد و گرم بھی آپ نے دیکھ رکھا ہے۔ بطور پیشہ ور وکیل انسانی رویّے اور نفسیات سے بھی آپ بخوبی واقف ہوں گے۔ اس حیرت انگیز واقعے کے بارے میں کیا رائے ہے آپ کی؟'' ساتھ ہی اس نے فائزہ کی طرف دیکھا۔ ''مس فائزہ حمید صاحبہ! میں، آپ کی رائے اور خیالات بھی جاننا چاہوں گا۔ مجھے یقین ہے، آپ لوگوں کی مدد سے ہی اس الجھی گتھی کو سلجھایا جا سکتا ہے۔''
ذہنی رو کے دوبارہ اس سمت جاتے جاتے ہی سر درد سے پھٹنے والا ہو گیا تھا۔ میں نے سر تھامتے ہوئے کہا۔ ''میری ذہنی کیفیت فی الحال ایسی نہیں کہ کوئی اندازہ قائم کر سکوں۔ کچھ دنوں تک دوبارہ آپ سے ملاقات کروں گا۔''
''ضرور، ضرور...... آپ خود کو ریلیکس رکھیں۔'' اس کی نظریں اب فائزہ پر تھیں۔
فائزہ کی آنکھیں سوچ کی گہرائیوں میں اتری ہوئی

تھیں، وہ بولی۔ ''مجھے یقین کی حد تک گمان ہے کہ نشے کی زیادتی کے سبب صائم کا دماغ الٹ گیا تھا۔''

اے ایس پی نے اس کی بات کاٹی۔ ''پلیز اس تھیوری کو ذہن سے نکال دیں، میڈیکل......''

اس دفعہ فائزہ نے اس کی بات رد کرتے ہوئے کہا۔ ''میڈیکل ایگزامنر کو لے کر آپ اس پہلو کو بالکل ہی چھوڑ نہ دیں۔ رپورٹ غلط بھی ہو سکتی ہے اور ممکن ہے ایگزامنر سے کوئی کوتاہی ہو گئی ہو۔ میں جانتی ہوں سرکاری میڈیکل ایگزامنر پر کام کا کتنا دباؤ ہوتا ہے۔ نمونے آپ کے پاس ہوں گے۔ انہیں کسی مستند لیبارٹری کو دوبارہ تجزیے کے لیے دیں۔ ایسا کیسے ممکن ہے کہ ایک اچھا بھلا انسان اچانک ہی وحشت کی انتہائی حدوں کو چھونے لگے۔ گھر آنے سے پہلے بھی وہ زخمی تھا۔ ضرور کسی سے جھگڑ کر آیا تھا۔ صائم پولیس والوں کی گولیوں کا نشانہ بنا ہے۔ اس بات میں بھی کوئی شک نہیں کہ یہ گولیاں اپنی حفاظت کے لیے چلائی گئی تھیں مگر میں سمجھتی ہوں کہ صائم اور ہمارے گھر کے دیگر افراد کے اصل قاتل وہ لوگ ہیں جنہوں نے صائم جیسے ہونہار بچے کو منشیات کی خطرناک اور تباہ کن لت میں مبتلا کیا تھا اور ابھی ہزاروں گھرانے ان کے نشانے پر ہوں گے۔'' فائزہ بولی تو پھر بولتی چلی گئی۔

اے ایس پی نے توصیفی نظروں سے فائزہ کی طرف دیکھا۔ ''میڈیکل ایگزامنر والا نقطہ واقعی آپ نے کمال کا اٹھایا ہے۔ اس پر مزید کام کرنے کی ضرورت ہے۔'' ساتھ ہی اس نے اپنی نشست چھوڑ دی۔ سب انسپکٹر بھی اٹھ کھڑا ہوا اور ریڈر نے آگے بڑھ کر ریکارڈنگ والا آلہ اٹھالیا۔

''اگر آپ کا منشیات کی زیادتی یا اس کے استعمال کے ردِعمل والا کلیہ درست ہے تو آپ لوگ دیکھیں گے۔ صائم کو اس لت پر لگانے والے جلد ہی قانون کے شکنجے میں ہوں گے۔'' اے ایس پی کا لہجہ اس کے ارادوں کی خبر دے رہا تھا۔

سب انسپکٹر نے اے ایس پی کی طرف جھک کر کچھ کہا۔ اے ایس پی سر کو اوپر نیچے حرکت دیتا رہا پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''چوہدری صاحب! آج کے دور میں انسان کے سب سے زیادہ قریب اس کا موبائل فون ہوتا ہے۔ قریب بھی اور ہم راز بھی۔ ہمیں صائم کا موبائل فون درکار ہے۔ موبائل فون نہ اس کی ڈیڈ باڈی کے ساتھ ملا ہے اور نہ ہی اس کے زیرِ استعمال گاڑی میں۔''

میرے لیے یہ خبر حیرت کا باعث تھی۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ موبائل تو ہر وقت اس کے ہاتھ یا پاکٹ میں ہوتا تھا۔''

''ہم موبائل فون کو ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ممکن ہے صائم کا گھر آنے سے پہلے کسی اور کے ساتھ بھی جھگڑا ہوا ہو اور موبائل فون وہیں گر گیا ہو۔ ایک مفروضہ یہ بھی ہے کہ صائم کی ڈیڈ باڈی کی منتقلی کے دوران کسی ورکر نے موبائل فون ''پار'' کرلیا ہو۔ ہم دونوں سمتوں میں کام کر رہے ہیں۔ آپ بھی گھر میں اس کا فون ڈھونڈیں۔ شاید کسی کونے کھدرے میں پڑا ہو۔ ہماری ٹیم کو تو گھر سے نہیں ملا۔ فون نہ ملے تو اس کا ڈبا ہمیں درکار ہوگا۔ ڈبے سے آئی ایم ای آئی لے کر فون کو ٹریسنگ پر لگائیں گے۔''

''میں دیکھوں گا۔''

کھڑے کھڑے اے ایس پی نے مزید کہا۔ ''ہمارے پاس صائم کے دو نمبرز ہیں۔ ان کی مدد سے ہم بہت کچھ جان لیں گے۔ ان دو نمبرز کے علاوہ کوئی اور نمبر ہے تو وہ لکھوا دیں پلیز۔''

سب انسپکٹر نے دو مختلف نمبرز بتائے۔

میں نے کہا۔ ''نہیں، اس کے علاوہ اور کوئی نمبر نہیں ہے۔''

اے ایس پی بولا۔ ''آپ کے تعاون کا شکریہ۔ جلد ہی دوسری ملاقات ہوگی۔''

رسمی الوداعی کلمات کے بعد پولیس ٹیم رخصت ہوگئی۔

فائزہ دوبارہ..... میرے قریب آ بیٹھی اور اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

☆☆☆

مرنے والوں کے ساتھ کوئی مر نہیں جاتا، سبھی کو اپنے معمولاتِ زندگی کی طرف لوٹنا پڑتا ہے۔ میں بھی دو ہفتوں کے بعد ہائی کورٹ اپنے آفس آگیا۔ اس سے پہلے بار کونسل میں میری فیملی کے لیے فاتحہ خوانی کی گئی تھی۔

میری فیملی کے بارے میں جس نے بھی سنا تھا، وہ شاکڈ رہ گیا تھا۔ میرے ہی چھوٹے بھائی نے نامعلوم وجوہات کی بنا پر جنونی کیفیت میں اپنے ہی ماں، باپ اور چھوٹی بہن کو مار ڈالا تھا اور پھر خود بھی پولیس کی گولیوں کا نشانہ بن گیا تھا۔

صائم کی جنونی کیفیت نے ڈھیروں قیاس آرائیوں کو جنم دیا تھا۔ غالب اکثریت کو یقین تھا کہ صائم کی جنونی کیفیت نشے کی زیادتی کا ردِعمل تھا۔ میرا ذاتی خیال بھی کچھ اسی سے ملتا جلتا تھا۔

رات سونے سے پہلے میں نے ایک فیصلہ کیا تھا جن

لوگوں نے صائم کو نشے کا عادی کیا تھا، میری نظر میں وہی صائم سمیت میری فیملی کے قاتل تھے اور قاتل کی منزل تختہ دار ہوتی ہے۔ بے شک ان کو تختہ دار پر کھینچنے میں بے شمار قانونی سقم تھے مگر ضروری تو نہیں ہر قاتل کی منزل تختہ دار ہی ہو۔ زندگی دینے کے بہت سے طریقے تھے تو زندگی چھین لینے کے بھی درجنوں طریقے تھے۔

میں فیصلہ کر چکا تھا۔ میری فیملی کے قاتل زیادہ دن تک اس دھرتی کے اوپر نہیں رہیں گے۔

میری غیر موجودگی میں فائزہ نے آفس کو بہتر طریقے سے سنبھالے رکھا تھا۔ وہ، میری ہونے والی نصف بہتر بھی تھی اور آفس کے نصف سے زیادہ کام بھی اسی نے سنبھالے ہوئے تھے۔ وہ مضبوط اعصاب کی سمجھ دار لڑکی اور ایک کامیاب وکیل تھی۔ جاندار آواز اور ٹھوس لہجے میں بات کرنے کے سبب وکلا کے حلقے میں اسے ''دبنگ لیڈی'' بھی کہا جاتا تھا۔

آفس آنے کے دو گھنٹوں میں ہی جب میں نے کام کا تمام تر بوجھ فائزہ کی طرف منتقل کیا تو وہ چونک گئی۔ ''تم کیا کرنے جا رہے ہو؟'' اس نے مجھے کھوجتی نظروں سے دیکھا۔

''وہی جو تم سمجھ رہی ہو۔'' میں نے ٹائی کی گرہ ڈھیلی کر کے کرسی کی پشت سے کمر لگائی۔

وہ بڑے عزم سے بولی۔ ''تو پھر میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔ آفس کے معاملات عدنان دیکھ لے گا۔''

میں نے اسے پیار بھری نظروں سے دیکھا۔ ''اب تم ہی تو میرے ساتھ ہو۔ فی الحال تم آفس دیکھو، مجھے جہاں تمہاری ضرورت ہوئی، فوراً آواز دے لوں گا۔''

''نہیں، میں ایک منٹ کے لیے بھی تمہیں تنہا نہیں چھوڑوں گی۔'' وہ بچی کے مانند ٹھنکی۔

''ارے میری جان! میں لندن تو نہیں جا رہا۔ یہیں تمہارے ساتھ ہی ہوں۔ بس، جب تک ان درندوں کو کیفر کردار تک نہیں پہنچا لیتا، آفس نہیں آؤں گا۔ یہاں بیٹھ کر تم زیادہ بہتر طریقے سے میری مدد کر سکتی ہو۔ جیسے صائم والے کیس کی ایف، آئی آر...... پولیس ضمیمے، میڈیکل ایگزامنر کی رپورٹ وغیرہ۔''

''یہ سب میں نے منگوا لیے ہیں۔'' اس کا منہ بدستور پھولا ہوا تھا۔

''گڈ گرل! تمہارا یہ پھولا ہوا منہ بالکل اچھا نہیں لگ رہا۔ جلدی سے اپنے پیارے پیارے ہاتھوں سے کافی بنا کر لے آؤ پھر میں نے کچھ اور کام تمہارے ذمے لگانے ہیں۔''

وہ خاموشی سے اٹھ گئی۔ آفس میں ہی ایک چھوٹا سا صاف ستھرا کچن تھا۔ میں جب آفس میں ہوتا تھا تو میرے لیے چائے، کافی وہ خود ہی بناتی تھی۔

میں، اس کی خفگی کی وجہ سمجھ رہا تھا۔ اس جذباتی لڑکی کے لیے میری فیملی اس کی فیملی کی طرح تھی۔ ''مشترکہ فیملی'' کے قاتلوں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے اسے بیک فٹ پر رہنا بالکل پسند نہیں آ رہا تھا۔ وہ، میرے شانہ بشانہ چلنا چاہتی تھی۔

کافی پیتے ہوئے میں نے اُسے سمجھایا، تو اس کا موڈ کچھ بہتر ہو گیا۔ میرے کہنے پر اس نے آفس بوائے سے ایف آئی آر کی کاپی اور دیگر کاغذات کی کاپی منگوا لی۔ کاغذوں کے اس پلندے کے ساتھ ایک یو ایس بی بھی تھی۔

میں نے یو ایس بی کے بارے میں استفسار کیا تو فائزہ نے بتایا کہ اس میں رہائشی کالونی میں لگے مختلف کیمروں کے فوٹیج تھے۔

میں نے پہلے کاغذات پر نظر ڈالی۔ وہاں صرف خانہ پُری تھی۔ ایف آئی آر کی رُو سے صائم مجرم تھا جس نے جنونی کیفیت میں اپنے گھر والوں کو مار ڈالا پھر پولیس پر حملہ آور ہوا تو جوابی کارروائی میں خود بھی مارا گیا۔ ٹائیں ٹائیں فش...... کیس ختم، فائل داخلِ دفتر۔

رپورٹ میں لکھ دیا گیا تھا کہ قاتل کو جن لوگوں نے منشیات کی لت پر لگایا، انہیں ٹریس کیا جا رہا ہے۔ مجھے اے ایس پی طارق سیال کا خیال آیا۔ وہ نوجوان اور گرم خون کے ساتھ پولیس کے محکمے میں نیا آیا تھا اور ابھی محکمے کی کان میں رہ کر نمک نہیں ہوا تھا۔ اس سے ہونے والی ملاقات یاد آئی تو اس کا عزم بھی یاد آ گیا۔ دل میں امید جاگی کہ وہ ضرور کچھ نہ کچھ کارکردگی دکھائے گا۔

ساتھ ہی یاد آیا کہ اس نے صائم کے موبائل فون کے حوالے سے مجھے کچھ ذمے داری دی تھی۔ اپنے گھر جانے سے پہلے میں نے یو ایس بی اپنے لیپ ٹاپ کے ساتھ لگائی۔ تھوڑی دیر میں مختلف کیمروں کی فوٹیج کو یکجا کر کے جو فوٹیج ایڈٹ کی گئی تھی، وہ میرے سامنے اسکرین پر چلنے لگی۔

شام کے دُھندلکے میں صائم کو گھر سے نکل کر پارکنگ لاٹ کی طرف جاتا دکھایا گیا تھا۔ اس کا موبائل فون اس کے کان سے لگا ہوا تھا اور وہ خوشگوار موڈ میں گاڑی

کی چابی اپنی انگلی میں گھما رہا تھا۔
دل سے ایک ہُوک سی اٹھی۔ کاش وقت کو کسی طرح موڑا جاسکتا تو میں اس پل صائم کو گھر سے نکلنے سے روک لیتا۔
میں، صائم سے پہلے گھر سے نکل گیا تھا۔ فائزہ اور میں نے نئے سال کو اکٹھے خوش آمدید کہنے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔
فائزہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ والدین فریضۂ حج کی ادائیگی کے دوران بھگدڑ کے سبب شہید ہو گئے تھے۔ اس کے بعد نوعمر فائزہ کو خالہ نے سمیٹ لیا تھا۔
اپنی جمع پونجی اور اپنے آبائی گھر کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم سے فائزہ نے ایک کثیر المنزلہ بلڈنگ میں اپارٹمنٹ خریدا تھا۔ اسے بلندی اچھی لگتی تھی اور آٹھویں منزل کا یہ اپارٹمنٹ اس کے خوابوں کا محل تھا۔ اس نے رفتہ رفتہ اس محل کو سجایا، سنوارا تھا۔
سرپرائز کی غرض سے اس نے سب کچھ مجھ سے پوشیدہ رکھا تھا۔ سال کے آخری دن جب وہ ہاسٹل سے اپنے خوابوں کے محل میں منتقل ہوئی تو یہ سب مجھ پر آشکار ہوا تھا۔ اس رومان پرور سرد شام میں ہم نے اکٹھے قدم سے قدم ملا کر بیک وقت اس اپارٹمنٹ میں قدم رکھا تھا۔ اس موقع پر فائزہ بے حد جذباتی ہو رہی تھی۔
فائزہ کے ہاتھ کے بنے کھانوں سے لطف اندوز ہو کر ہم نے ڈھیروں، ڈھیر باتیں کی تھیں اور اکٹھے ہی مستقبل کے خواب بُنے تھے۔
اپارٹمنٹ کی بالکونی کو فائزہ نے پھول، پودوں سے سجایا تھا۔ یہیں ایک آرام دہ جھولا تھا۔ اس جھولے میں ایک ہی کمبل میں لپٹ کر، ایک، دوسرے کو ڈرائی فروٹ کھلاتے ہوئے، پٹاخوں کے شور اور آتش بازی کی قوسِ قزح کے سائے میں ہم نے عہد کیا تھا کہ اس سال ہم "ایک" ہو جائیں گے۔
علی الصباح ہم کہیں سوئے تھے۔ دونوں کے موبائل فون سائلنٹ پر تھے۔ اس دوران قیامت آکر بیت گئی اور ہم بے خبر رہے تھے۔
میری نظریں لیپ ٹاپ کی اسکرین پر تھیں اور دماغ کہیں اور چلا گیا تھا۔ سر جھٹک کر میں نے اپنی توجہ مرکوز کی۔ شام کے دُھندلکے میں رخصتی کے بعد علی الصباح صائم کی واپسی ہوئی تھی۔ گاڑی اس نے پارکنگ ایریا کے عین وسط میں کھڑی کر دی تھی۔ کیمرے کی کوالٹی اچھی تھی۔ گاڑی کی ٹوٹ پھوٹ واضح نظر آ رہی تھی۔
قریب موجود گارڈ غالباً غلط پارکنگ کے سبب اس طرف متوجہ ہوا تھا۔ صائم گاڑی سے باہر نکلا۔ قریب لگا کیمرا اسے صاف طور پر دکھا رہا تھا۔ خدا کی پناہ یہ میرا معصوم اور ہینڈسم بھائی تو نہیں تھا۔ اس کا چہرہ پھولا، پھولا سا تھا اور آنکھیں حلقوں سے باہر اُبلی پڑی تھیں۔ اس کے شفاف لباس پر خون کے دھبے تھے اور ایک بازو سے خون بہہ رہا تھا۔ جینز کی بیلٹ میں اس نے پسٹل اُڑس رکھا تھا۔
گارڈ، اسے زخمی سمجھ کر تیزی سے اس کے قریب آیا تو صائم کسی درندے کے مانند اس پر جھپٹ پڑا اور اس کے کندھے پر دانت جما دیے۔ لمبا، چوڑا پٹھان گارڈ، اس دبلے پتلے نوجوان کی وحشت کا مقابلہ نہیں کر سکا۔ پہلے تو اس نے مقابلہ کرنے کی کوشش کی اور صائم کو جکڑنا چاہا مگر اس کے جسم میں تو جناتی طاقت محسوس ہوتی تھی۔ اس نے کسی کھلونے کے مانند گارڈ کو اٹھا کر پٹخ دیا تھا۔
گارڈ نے اٹھ کر بھاگ جانے میں عافیت سمجھی تھی۔ اب صائم کے ہاتھ میں پسٹل نظر آ رہا تھا۔ اس نے گارڈ پر دو فائر جھونک دیے۔ گارڈ کی خوش قسمتی گولیاں اسے چھونے میں ناکام رہی تھیں۔ صائم بے ڈول انداز میں چلتا ہوا گھر کی طرف آیا۔ یہاں داخلی دروازے پر کیمرا تھا۔ بیل بجانے کے بجائے صائم نے دروازہ پیٹ ڈالا تھا۔
دروازہ کھولنے والا چندو تھا۔ صائم پسٹل پہلے ہی سیدھا کر چکا تھا۔ کوشش کے باوجود آنکھیں کھلی رکھنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ میں نے چند لمحوں کے لیے آنکھیں موند لیں۔
گولی چلنے کی مدھم آواز کیمرے تک پہنچ گئی تھی۔ صائم گھر کے اندر خون کی ہولی کھیل رہا تھا۔ فائرنگ کے ساتھ ہی کسی نے پولیس کو فون کر دیا تھا۔ پٹرولنگ اسکواڈ فوراً ہی موقع پر پہنچ گیا تھا۔ صورتِ حال جانتے ہی پٹرولنگ اسکواڈ کے دو جوان صائم کو چھاپنے کے لیے گھر کے بیرونی دروازے کے دائیں، بائیں گھات لگائے ہوئے تھے۔ صائم گھر سے نکلا تو ایک خون آشام درندے کے مانند نظر آ رہا تھا۔ اس کے تمام کپڑے، ہاتھ حتیٰ کہ چہرہ تک اپنوں کے خون سے لتھڑا ہوا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں پسٹل اور دوسرے ہاتھ میں خون آلود چھری تھی۔
اس کی تاک میں کھڑے پٹرولنگ اسکواڈ کے دونوں اہلکار اس پر جھپٹ پڑے تھے۔ آخری لمحے میں صائم ان کی جھپٹ سے باخبر ہو گیا تھا۔ اس نے کسی پھرتیلے درندے

کے مانند جھک کر خود کو توازن کیا۔ ایک اہلکار کی آنکھوں میں اس نے انگلیاں ماریں اور دوسرے کے پیٹ میں بیدردی سے چھری گھونپ دی۔ اسی وقت بیک اپ پر موجود دوسرے اہلکاروں نے فائرنگ کر دی تھی۔

صائم متعدد گولیاں لگنے کے باوجود اپنے قدموں پر کھڑا تھا۔ میں نے پہلے کرب سے آنکھیں اور پھر لیپ ٹاپ بند کر دیا۔

تھوڑی دیر آنکھیں موندے میں اپنی کیفیت کو معمول پر لانے میں لگا رہا۔ اس کے بعد فائزہ کے ساتھ میں نے اپنے گھر کا رخ کیا، گھر جانے کے خیال سے ہی وحشت ہو رہی تھی۔

فائزہ گھر جانے کا مقصد جانتی تھی۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی بولی۔ ''گھر کی صفائی کرواتے ہوئے میں نے سارا گھر دیکھا ہے۔ صائم کا موبائل وہاں نہیں ہے۔''

میں نے کہا۔ ''میرا بھی یہی اندازہ تھا۔ اس کے موبائل کا ڈبا دیکھ لیتے ہیں۔ آئی ایم ای آئی ہمارے بھی کام آئے گا اور اے ایس پی کو بھی دینا ہے۔''

''دونوں کام ہو چکے ہیں۔ صائم کے موبائل کا میک اور ماڈل، مجھے معلوم تھا۔ آئی ایم ای آئی پولیس والوں کے پاس پہنچ گیا ہے۔''

میں نے گاڑی کا انجن بند کر دیا۔ ''پھر تو گھر جانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ ویسے بھی وہاں جانے کے خیال سے ہی مجھے وحشت سی ہو رہی ہے۔''

فائزہ نے دکھی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ''میں سمجھ سکتی ہوں۔''

دکھ کی نئی لہر میں ڈوبنے سے بچنے کے لیے میں نے کہا۔ ''آئی ایم ای آئی سینڈ کرو۔ آئی پی پی او آفس میں راجا شاہد ہے وہ سارا ڈیٹا نکال دے گا۔''

اس دفعہ وہ دھیمے سے مسکرائی۔ ''یہ کام بھی ہو چکا ہے۔ شام تک ڈیٹا فراہم کرنے کا وعدہ کیا ہے راجا صاحب نے۔''

میں نے اُسے محبت پاش نظروں سے دیکھا۔ ''میرے کرنے کے لیے تو کوئی کام چھوڑا نہیں ہے جناب نے۔''

وہ اٹھلائی۔ ''دیکھ لو، تمہارے خیال میں تو میری جگہ صرف آفس ہے۔''

میں نے بے اختیار سر کھجایا۔ ''ٹھیک ہے، آفس عدنان کے حوالے سمجھو۔''

گاڑی کے اردگرد لوگ نہ ہوتے تو یقیناً وہ، میرے گلے لگ جاتی۔ اس نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

کئی دنوں سے اس کے مرجھائے چہرے پر تازگی دیکھ کر مجھے بہت اچھا لگا تھا۔

اس کے موبائل پر میسج ٹون آئی تو اس نے چونک کر موبائل سنبھالا۔ چند لمحے اس کی نازک انگلیاں سبک خرامی سے اسکرین پر کچھ ٹائپ کرتی رہیں پھر بولی۔ ''صائم کے دوستوں کو پولیس نے ریلیز کر دیا ہے۔ اس کے سب سے قریبی دوست شوبی کو میں نے ملنے کے لیے بلایا تھا۔ اسی کا میسج تھا۔ اسے میں نے ''لیک ویو'' پر بلالیا ہے۔'' لیک ویو، ہمارا پسندیدہ ریستوران تھا۔

''شوبی، ہماری کیا مدد کر پائے گا؟ جو کچھ وہ جانتا تھا، وہ پولیس رپورٹ میں دیکھ تو لیا ہے ہم نے۔''

''ممکن ہے کوئی بات دباؤ کے سبب اس کے دماغ سے نکل گئی ہو۔ کھلے ماحول میں زیادہ آزادی سے بات کرے گا وہ۔ تم گاڑی نکالو، یہاں سے۔''

تھوڑی دیر میں ہم شہر سے باہر جانے والی نیشنل ہائی وے پر تھے۔ صائم کی حالت کے ذمے داروں تک پہنچنے کے لیے فائزہ کی تڑپ شاید مجھ سے زیادہ تھی۔ یہ بتا کر اس نے مجھے حیران کر دیا کہ صائم کے دو اور قریبی دوستوں سے وہ مل بھی چکی تھی۔

ان دوستوں سے کوئی خاص بات معلوم نہیں ہو سکی تھی۔ گزشتہ چند ہفتوں سے صائم قریبی دوستوں سے کٹا ہوا تھا۔ باہمی رابطے اور ملاقاتیں کم ہی ہوتی تھیں۔ کورونا کی وبا کے سبب تعلیمی ادارے بند تھے۔ کالج کے دوستوں سے بھی صائم کا ملنا، ملانا برائے نام ہی تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں لیک ویو ریستوران پہنچ گئے۔ کسی زرخیز دماغ نے زمین کے نشیب اور زیرِ زمین پانی کی بلند سطح کا بہترین استعمال کرتے ہوئے اس بے آباد جگہ پر خوب صورت رنگ بھر دیے تھے۔ وسیع جھیل میں درجنوں سنگ مرمر کے چبوترے بنا دیے تھے جن کے گرد حفاظتی ریلنگ تھی۔ یہ سبھی چبوترے سنگی روشوں سے باہم منسلک تھے۔ ہر چبوترہ اپنی جگہ مکمل پرائیویسی مہیا کرتا تھا۔ جہاں خوب صورت وڈ ورک والی چھت اور فرنیچر تھا۔ جس کے سبب فیملیز کے لیے یہ بڑی آئیڈیل جگہ تھی۔ شام کے اوقات میں اکثر اپنی باری کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔

لنچ ٹائم میں یہاں زیادہ رش نہیں تھا۔ سپروائزر نے انہیں ''لوبرڈ'' جان کر ایک چھوٹا چبوترہ بک کر دیا۔ یہاں

چار افراد کے بیٹھنے کا پھر بھی انتظام تھا۔
جنوری کی چمکیلی دھوپ جھیل پر پھیلی ہوئی تھی۔ لکڑی کی چھت کے نیچے، پانی کے درمیان اس جگہ پر بیٹھنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ فائزہ کی رہنمائی میں شوبی بھی ان تک پہنچ گیا تھا۔ اس نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ آئمہ شاہ بھی اس کے ساتھ آ رہی ہے۔ آئمہ، صائم کے خاصی قریب تھی۔ دو، تین دفعہ گھر بھی آ چکی تھی۔ میں پہلے بھی اس سے مل چکا تھا اور میرا اندازہ تھا کہ صائم اور وہ...... ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ شوبی قدرے گہری رنگت کا مضبوط جسم کا لڑکا تھا۔ ٹی شرٹ میں اس کے رگ و پٹھے دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ باقاعدگی سے جم جاتا ہے۔ پولیس اسٹیشن کی یاترا کا اثر ابھی تک اس کے چہرے پر ہراس آمیز خوف کی صورت میں نظر آ رہا تھا۔
آئمہ، دبلی پتلی اور بے حد گھنے بالوں والی خوب صورت لڑکی تھی۔ نظر کا سیاہ چشمہ نہ صرف اس کی صاف رنگت پر خوب جچتا تھا بلکہ اسے ایک مدبرانہ سی لُک بھی دیتا تھا۔ اس وقت اس کی صاف رنگت میں زردی نمایاں تھی۔
دونوں خاموش خاموش سے ہمارے سامنے بیٹھ گئے۔ میں نے اور فائزہ نے ان سے دوستانہ انداز میں کچھ باتیں کیں تو وہ قدرے ریلیکس نظر آنے لگے۔ جس کا اثر فوراً ہی آیا۔ انہوں نے مجھ سے رسمی تعزیت کی۔
لنچ ٹائم تھا۔ فائزہ نے کھانے کا پوچھا تو انہوں نے انکار کر دیا۔ میں نے خوش دلی سے کہا۔ ”آپ لوگوں کی مرضی...... ہم تو آئے ہی کھانے کے لیے تھے۔ اب اچھا نہیں لگے گا تم دونوں بیٹھ کر ہمارے نوالے گنو۔“
آئمہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ چمکی۔ ”اب ایسا بھی نہیں ہے۔ میں بھی کچھ نہ کچھ کھا لوں گی۔“
فائزہ نے کھانے کا آرڈر کر دیا۔ کھانا کھانے تک وہ دونوں ہمارے ساتھ خاصے گھل مل گئے تھے۔ آئمہ، مجھے بڑی اپنایت سے بھائی جان کہنے لگی تھی اور فائزہ کو بھابی۔ بھابی کے لقب نے فائزہ کے چہرے پر رنگ سے بکھیر دیے تھے۔
کھانے کے بعد گفتگو کا رخ خود بخود صائم کی طرف مڑ گیا۔ صائم کی جنونی کیفیت اور اس کیفیت کے زیر اثر فعل...... ان دونوں کے لیے بھی ناقابل یقین تھا۔ ان دونوں کو بھی سب کی طرح نشے کی زیادتی والی تھیوری پر یقین تھا۔
آئمہ بولی۔ ”مجھے یقین اب بھی نہیں آتا کہ صائم اتنا خطرناک نشہ کرنے لگا تھا۔ حالانکہ ہمارے درمیان خاصی انڈراسٹینڈنگ تھی۔ میں سمجھتی تھی کہ اس کا کچھ بھی مجھ سے پوشیدہ نہیں ہے......لیکن......“ اس نے پُرتاسف انداز میں سر ہلاتے ہوئے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔
شوبی نے کہا۔ ”میرے خیالات بھی آئمہ سے ملتے جلتے ہی ہیں۔ یقیناً اسے کچھ ایسے لوگوں کی کمپنی مل گئی تھی جنہوں نے اسے اس جان لیوا نشے پر لگا دیا۔ اسی سبب وہ، ہم سے کھچا کھچا اور دور دور رہنے لگا تھا۔“
فائزہ بولی۔ ”ہم ان لوگوں تک پہنچنا چاہتے ہیں جو صائم کی حالت کے ذمے دار ہیں۔ اس کے لیے ہمیں آپ کی مدد درکار ہے۔“
آئمہ نے پُرعزم لہجے میں کہا۔ ”میں ہر قسم کی مدد کے لیے حاضر ہوں۔ میرے ماموں ایک حساس ادارے میں کلیدی عہدے پر ہیں۔ ضرورت پڑنے پر ان کی مدد بھی لی جا سکتی ہے۔ ان درندوں کو عبرت کا نشان بنانے کے لیے میں ہر حد تک جانے کے لیے تیار ہوں۔“
شوبی نے بھی کچھ ایسے ہی عزائم کا اظہار کیا۔
میں نے کہا۔ ”آپ لوگوں کی اپنایت سر آنکھوں پر مگر ہمیں صرف آپ لوگوں کی اتنی مدد درکار ہے کہ آپ کی دی معلومات کی روشنی میں ہم ان موت کے سوداگروں تک پہنچ جائیں۔ جن کے سبب ہم سب نے قیامت سے پہلے قیامت دیکھ لی ہے۔ ہماری کوشش ہوگی کسی اور صائم کے ہاتھوں نئی قیامت برپا نہ ہو۔“
میرے لہجے کے درد نے ان دونوں کے ساتھ، ساتھ فائزہ کے نقوش کو بھی گداز کر دیا تھا۔ آئمہ ہاتھ مسلتے ہوئے بولی۔ ”کم از کم میرے پاس تو ایسی کوئی معلومات نہیں ہے جو موت کے سوداگروں تک پہنچنے میں مددگار ہو۔ ہوتی تو میں پہلے پولیس کے ساتھ شیئر کر چکی ہوتی۔ دیگر دوستوں کی طرح صائم، مجھے بھی اگنور کر رہا تھا۔ سچ پوچھیں تو گزشتہ دو ہفتوں سے اس کے رویّے سے دلگرفتہ ہو کر میں نے اس سے کوئی رابطہ ہی نہیں کیا تھا اور لگتا تھا میری اُسے ذرا بھی پروا نہیں ہے۔ اس کی طرف سے بھی مکمل خاموشی تھی۔“
شوبی بھی صائم کی نئی دلچسپیوں اور نئے حلقۂ احباب سے متعلق کوئی نئی بات نہیں بتا سکا تھا۔ مجھے مایوسی کا احساس ہوا۔ فائزہ نے گھما پھرا کر ان سے بہت سے سوالات کیے مگر نتیجہ صفر ہی رہا۔ اس ملاقات کا انجام مایوس کن تھا۔
آگے بڑھنے کی کوئی راہ نہ پا کر مجھ پر جھنجلاہٹ سی سوار ہونے لگی تھی۔ میں جلد از جلد اپنے خاندان کے قاتلوں

تک پہنچنا چاہتا تھا۔

فائزہ، میری مزاج آشنا تھی۔ وہ امید افزا باتوں سے میری جھنجلاہٹ دور کرنے میں لگ گئی۔ اس دوران فائزہ کے موبائل فون پر اے ایس پی طارق سیال کی کال آ گئی۔ وہ، میرا موبائل فون نمبر مانگ رہا تھا۔ فائزہ نے اپنا موبائل مجھے تھما دیا۔

میری آواز پہچانتے ہی اے ایس پی بولا۔ ''چوہدری صاحب! دو مستند ترین لیبارٹریوں کی رپورٹ میرے سامنے پڑی ہے۔'' اس کا لہجہ سنسنا رہا تھا۔ ''صائم معمولی الکوحل کے علاوہ کسی قسم کے نشے میں نہیں تھا۔ دوسرے لفظوں میں کہوں گا...... اس کا فعل مکمل طور پر ہوش وحواس کے دائرے میں آتا ہے اور یہ بات بہت سے لوگوں کے لیے ناقابل یقین ہی ہے۔''

نشے کی زیادتی والی تھیوری کے یکسر غلط ہونے کی مستند خبر سے مجھے جھٹکا سا لگا۔ ''یہ کیسے ممکن ہے سیال صاحب! ایک نارمل انسان مکمل طور سے ہوش وحواس میں بنا کسی شدید ترین قسم کے جذباتی سبب کے اپنے ہی پیاروں کو مار ڈالے۔ آپ نے سی سی ٹی وی فوٹیج تو دیکھے ہی ہوں گے۔ واضح طور پر وہ کسی خوفناک قسم کی نشیلی کیفیت میں تھا۔ میں دنیا کی کسی بھی لیبارٹری کی رپورٹ کو نہیں مانتا۔ میرے بازوؤں میں دم ہے۔ اپنے مجرموں سے میں خود ہی نمٹ لوں گا۔'' جذباتی کیفیت میں، میں اپنے عزائم آشکار کر گیا۔

دوسری طرف ایک لمحہ خاموشی رہی۔ پھر اے ایس پی کی گمبھیر آواز ابھری۔ ''آپ جیسے ہوش مند قانون دان سے مجھے کسی جذباتی قدم کی امید نہیں ہے۔ آپ کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے میں ان الفاظ کو نظرانداز کر رہا ہوں۔'' میں نے سختی سے ہونٹ بھینچ لیے۔ فائزہ بھی ناراض نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

لمحے بھر کے توقف کے بعد اے ایس پی کی آواز دوبارہ سنائی دی۔ ''ہمارے ملک کے ایک بڑے سائنٹسٹ ڈاکٹر ہدایت علی صاحب نے صائم والے کیس میں خاصی دلچسپی لی ہے۔ آپ کی اجازت سے ہم صائم کی قبر کشائی چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو کچھ اور نمونے درکار ہیں۔''

میں نے بجھے دل کے ساتھ اجازت دے دی۔ نمبرز کے تبادلے کے ساتھ ہی اے ایس پی نے رابطہ منقطع کر دیا۔ میں نے فائزہ کی طرف موبائل بڑھایا تو موبائل تھامتے ہوئے اس نے کہا۔ ''کیا ضرورت تھی اے ایس پی کے سامنے کھلنے کی۔'' وہ بدستور ناراض تھی۔

مجھے کچھ دیر اس کی خفگی دور کرنے میں لگی۔

شام کو آر پی او آفس سے صائم کا کال ریکارڈ اور لوکیشنز وغیرہ کا ریکارڈ آ گیا تھا۔ اس میں صرف ایک نمبر اہمیت رکھتا تھا۔ اس نمبر پر صائم گزشتہ تین ماہ سے رابطے میں تھا اور دو ماہ سے تو رات گئے تک لمبی لمبی کالز کا ریکارڈ تھا۔

وہ نمبر رشیدہ بی بی کے نام پر رجسٹرڈ تھا۔ رشیدہ بی بی کے شناختی کارڈ کی کاپی بھی ہمراہ تھی جس پر اس کی تصویر بھی تھی۔ وہ ایک غریب صورت بیوہ تھی۔ عمر 55 سال تھی اور ایڈریس وہاڑی کے ایک دور دراز گاؤں کا تھا۔

حیرت انگیز طور پر رشیدہ بی بی والا نمبر کسی اور سے رابطے میں نہیں تھا۔ وہ نمبر صرف صائم سے رابطے کے لیے استعمال ہوا تھا۔

مجھے فوراً ہی اندازہ ہو گیا کہ رشیدہ بی بی کو ڈھونڈنے کا کوئی فائدہ ہونے والا نہیں ہے۔ اس کے نام پر صرف رجسٹرڈ سم کارڈ استعمال ہوا ہے۔ سم کارڈ باقاعدہ بائیومیٹرک تھا۔ یقیناً ایک سادہ لوح بیوہ کو امداد یا پھر انعام کا جھانسا دے کر اور اس کا انگوٹھا لگوا کر سم کارڈ رجسٹرڈ کیا گیا تھا یا پھر سلیکون کے جعلی انگوٹھے کا استعمال ہوا تھا۔ بعدازاں میرا یہ اندازہ بالکل درست ثابت ہوا۔ فائزہ کے دباؤ پر میرا ایک جونیئر وکیل برق رفتاری سے رشیدہ بی بی تک پہنچ گیا تھا۔ اس نے بتایا کہ کچھ عرصہ پہلے اگم سپورٹس کی ایک ٹیم ان کے گاؤں آئی تھی۔ انہوں نے دیگر کئی خواتین کے ساتھ اس کا انگوٹھا بھی ایک مشین پر لگوایا تھا اور اسے بہت جلد حکومتی امداد ملنے کی نوید سنائی تھی۔

رشیدہ بی بی اور اس جیسی کئی خواتین آج بھی اس ''امداد'' کی منتظر تھیں۔

صائم کے فون ریکارڈ سے البتہ ایک معمولی سا کلیو ملا تھا۔ صائم کی کال کی آخری لوکیشن گرین ٹاؤن کی تھی۔ یہ وسیع وعریض مضافاتی علاقہ تھا جہاں اکثریت امرا کے فارم ہاؤسز کی تھی۔

شہر سے دور بلند وبالا دیواروں کے درمیان جو کچھ ہوتا تھا، اس کی اُڑتی اُڑتی سی کہانیاں باہر آتی رہتی تھیں۔ پپی نیو ایئر نائٹ جیسی پارٹیوں کے لیے یہ فارم ہاؤسز آئیڈیل تھے۔ صائم کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا تھا۔ یقیناً ایسے ہی کسی فارم ہاؤس میں ہوا تھا۔

میں نے رشیدہ بی بی والا نمبر ڈائل کیا تو حسب توقع وہ پاور آف ملا۔ صائم کے ساتھ انہونا ہاتھ کرنے والے بڑے محتاط رو ثابت ہو رہے تھے۔ کوئی کھوج، کھرا ہی نہیں چھوڑا

تھا انہوں نے۔

اپنے گھر کا خیال آتے ہی مجھ پر وحشت سی سوار ہونے لگتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اب دوبارہ کبھی بھی اپنے گھر میں قدم نہیں رکھ پاؤں گا۔

فائزہ، میرے کپڑے وغیرہ لے آئی تھی۔ میرا قیام اسی کے اپارٹمنٹ میں تھا۔ ہمارے درمیان کوئی شرعی رشتہ نہیں تھا۔ بظاہر ہمارے اکٹھے رہنا معیوب بات تھی۔ اس حوالے سے یقیناً چہ میگوئیاں بھی جنم لے رہی تھیں مگر میرا ضمیر مطمئن تھا۔ ہمارے درمیان آج بھی وہ اخلاقی فاصلہ قائم و دائم تھا جس کا تعین ہم نے باہمی رضامندی سے کیا تھا۔

فائزہ تھکی ہوئی تھی۔ وہ جلد ہی سو گئی تھی۔ میں نے اپنے لیے کافی بنائی اور چادر لپیٹ کر بالکونی میں آگیا۔ میرا ذہن مسلسل موت کے سوداگروں کی طرف ہی لگا ہوا تھا۔ کافی کے سپ لیتے ہوئے اچانک مجھے ایک خیال آیا۔ میرا موبائل چارجنگ پر لگا ہوا تھا۔ میں جا کر موبائل لے آیا۔

مجھے یاد تھا کہ معروف کرائم رپورٹر قاضی واجد کا نمبر میرے موبائل میں سیو ہے۔ ایک کیس کے سلسلے میں، میں نے قاضی کی خاصی مدد کی تھی۔ وہ میرا ممنون تھا۔ اس نے اپنا نمبر مجھے دیتے ہوئے کہا تھا کہ وہ، میرے کسی بھی کام آکر بے حد خوشی محسوس کرے گا۔

رات بارہ بجے کے بعد کسی کو کال کرتے ہوئے اخلاقیات میرے ذہن سے محو ہو چکی تھیں۔ تیسری ہی گھنٹی پر کال ریسیو کرلی گئی۔

میری آواز پہچانتے ہی اس کی آواز میں ہمدردی عود آئی۔ ''یار چوہدری!'' اس نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ ''پہلے تو بہت ساری معذرت۔ میں، بچوں کے ساتھ چھٹیوں پر مالم جبہ وغیرہ کی طرف نکلا ہوا ہوں۔ تمہارے ساتھ ہونے والی ٹریجڈی کی خبر نیوز چینلز پر دیکھی تھی۔ تمہارا نمبر شاید میں جی میل پر محفوظ نہیں کر سکا۔ نہیں تو تعزیت کا فون ضرور کرتا۔''

''کوئی بات نہیں قاضی صاحب!'' میں نے رسمی طور پر اس کی خفت دور کرنے کے لیے کہا۔ ''میری حالت بھی ایسی نہیں تھی کہ آپ کو جنازے وغیرہ کی اطلاع دے پاتا۔''

''یار چوہدری! یہ سب کیا ہوا ہے؟ جو کچھ سنا اور دیکھا ہے وہ یقین کرنے والا نہیں ہے۔''

میرے سینے سے ٹھنڈی آہ نکل گئی۔ ''یقین تو مجھے بھی ابھی تک نہیں آیا لیکن قسمت میں یہی لکھا تھا۔ چھوٹا، موت کے سوداگروں کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ کہیں کوئی ''آئس'' وغیرہ کی زیادہ ڈوز کے سبب اس کا دماغ الٹ گیا اور......'' باقی کے الفاظ میرے سینے میں گھٹ کر رہ گئے۔

قاضی، افسوس کا اظہار کرتا رہا۔ وہ کرائم رپورٹر تھا۔ یقیناً بہت سے سوالات اس کے دماغ میں ادھم مچا رہے تھے مگر میری بے وقت کی کال کو اہم جان کر وہ اس طرف آیا۔

''میں واپس آجاؤں تو پھر تفصیلی ملاقات ہوگی۔ فی الحال تو تمہاری آدھی رات والی کال نے مجھے حیران کر دیا ہے...... سب خیریت تو ہے نا؟''

''ہاں، خیریت ہی ہے۔ مجھے کچھ معلومات چاہئیں جو مجھے یقین ہے آپ کو میسر ہے۔''

''جان جی! معلومات کیا تم جان مانگ لو قاضی تو تمہارے بچوں کا بھی نوکر ہے۔''

اس کے انداز نے میرے لبوں پر دھیمی سی مسکراہٹ دوڑا دی۔ یقیناً صائم والے واقعے کے بعد میں آج مسکرایا تھا۔ ''کیوں شرمندہ کرتے ہیں قاضی صاحب!''

''شرمندگی کو چھوڑو، بس حکم کرو۔''

میں سیدھا ہی اپنے مقصد کی طرف آیا۔ ''ہمارے شہر کے بڑے منشیات کے سپلائر کون کون سے ہیں؟ خاص طور پر ''آئس'' کے سپلائر؟''

دوسری طرف لمحے بھر کے لیے خاموشی چھا گئی پھر قاضی کی گمبھیر آواز ابھری۔ ''تمہارا مقصد سمجھ رہا ہوں مگر یاد رکھنا، یہ بھڑوں کا چھتا نہیں...... اژدھوں کا غار ہے۔ کوئی جذباتی قدم نہ اٹھانا۔'' یہ قاضی نہیں، ایک کرائم رپورٹر کا تجربہ بول رہا تھا۔

''آپ کی فکرمندی کا شکریہ۔ میں ٹین ایجر نہیں ہوں۔ دیکھ بھال کر ہی چلوں گا۔''

قاضی کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی۔ ''بہت سے لوگ اس مکروہ دھندے میں ملوث ہیں۔ علاقے بٹے ہوئے ہیں۔ تمہیں، کس کس کا نام بتاؤں؟''

اس کے سوال نے مجھے ایک نئی راہ دکھا دی۔ ''گرین ٹاؤن کا علاقہ کس کے پاس ہے؟''

قاضی چونکا۔ ''لگتا ہے کام شروع کر چکے ہو؟'' اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''کوئی خاص نہیں۔ بس اندھیرے میں ہاتھ، پاؤں مار رہا ہوں۔''

''میری نیک خواہشات تمہارے ساتھ ہیں۔'' پھر اس کی آواز مدھم ہوئی۔ ''گرین ٹاؤن، آئس کا گڑھ ہے۔

وہاں آبرو باختہ لڑکیوں کے علاوہ آئس کی عادی اچھے اچھے گھروں کی بچیاں موت کے سوداگروں کے ہاتھوں میں کھلونا بنتی ہیں۔ اخلاق سوز ناچ، گانے کی محفلیں بھی یہیں سجتی ہیں اور بھی بہت کچھ ان فارم ہاؤسز کی تاریکیوں میں ہوتا ہے۔''

''آپ نے اس بارے میں کوئی رپورٹ وغیرہ تیار نہیں کی؟''

''کی تھی۔'' قاضی کا لہجہ تلخ ہوا۔ ''وہ رپورٹ آج بھی میرے میڈیا ہاؤس کے مالک کی میز پر پڑی ہے۔ آن ایئر جانے کے لیے ''مناسب وقت'' کا انتظار ہے۔ اپنی جان جوکھم میں ڈال کر وہ رپورٹ تیار کرنے کے ''انعام'' کے طور پر مجھے اصل کام سے ہٹا کر جعلی پیر، فقیروں سے متعلق ایک طویل پروجیکٹ سونپ دیا گیا ہے۔ ہر ہفتے ایک جعلی پیر کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ۔ اسی سے جان چھڑا کر بچوں کے ساتھ نکلا ہوں۔''

گفتگو ایک تلخ ترین حقیقت کی جانب نکل پڑی تھی۔ میں بمشکل قاضی کو اصل موضوع کی طرف لایا تو وہ بولا۔ ''گرین ٹاؤن اور اس سے ملحقہ مسلم ٹاؤن وغیرہ کا علاقہ گلزار عرف گلزاری ملک کے پاس ہے۔ یہ نام سنا ہے کبھی؟''

میرے دماغ کی اسکرین پر کچھ مدھم سے نقوش ابھرے۔ ''یہ وہی گلزاری تو نہیں ہے موٹا اور سرخ چہرے والا۔ ہاتھوں میں قیمتی پتھروں کی کئی کئی انگوٹھیاں پہن رکھی ہوتی ہیں؟''

قاضی کی آواز پُرجوش ہوئی۔ ''صحیح پہنچے ہو، وہی لعنتی ہے۔ کیسے جانتے ہو اُسے؟''

''ضلع کچہری میں دو، تین پیشیوں پر دیکھا ہے اُسے۔ عدالتوں میں کئی زیرِالتوا کیس ہیں اس کے۔ بڑی ٹور سے پیشی پر آتا ہے۔ وہ تو سنا ہے قبضہ مافیا کا بندہ ہے۔''

دوسری طرف سے غالباً قاضی نے گہرا سانس لیا تھا۔ ''جان جی! آج کل سب سے زیادہ پھل پھول یہ مافیا ہی رہے ہیں۔ قبضہ مافیا منشیات کا مکروہ بزنس بھی کر رہا ہے اور منشیات مافیا، زمینوں پر قبضے بھی کر رہا ہے۔''

گلزاری کا فارم ہاؤس بھی گرین ٹاؤن میں تھا۔ اس کا محلِ وقوع مجھے قاضی نے بتا دیا تھا۔ دل میں ایک لہر سی اٹھی اور میں اسی وقت گرین ٹاؤن جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ کوئی واضح مقصد نہیں تھا۔ میرا بھائی گرین ٹاؤن ہی میں کسی انہونی کا شکار ہوا تھا اور موت کے سوداگروں کا گڑھ بھی یہی علاقہ تھا۔ ممکن تھا قدرت رہنمائی کرتی اور کوئی غیر متوقع کلیو ہاتھ آ جاتا۔

میں نے سیاہ جینز کے ساتھ گہرے رنگ کی جیکٹ پہن لی۔ کانوں کے گرد ایک مفلر سا لپیٹ لیا۔ بہ وقت ضرورت اس مفلر سے چہرہ بھی ڈھانپا جا سکتا تھا۔ سردی کی شدت کے سبب یہ حلیہ مناسب ہی تھا۔ میرا لائسنسی بیریٹا میری گاڑی میں تھا اور گاڑی میرے گھر والی رہائشی عمارت کے پارکنگ ایریا میں کھڑی تھی۔ میں فائزہ کی گاڑی سے ہی کام چلا رہا تھا۔

گرین ٹاؤن کی طرف جاتے ہوئے میری گھر والی رہائشی عمارت راستے میں ہی پڑتی تھی۔ میں نے اپنی گاڑی سے بیریٹا لینے کا ارادہ باندھ لیا۔

اپنی گاڑی کی چابیوں کے ساتھ میں نے سوئی ہوئی فائزہ پر ایک پیار بھری نظر ڈالی اور بڑی آہستگی سے اس کے اپارٹمنٹ سے باہر نکل آیا۔

چاند کی شاید آج بارہ تھی۔ مطلع صاف تھا۔ فضا میں معمولی سا کہر تھا۔ اس کہر میں لپٹا چاند کسی بزرگ کے مانند محسوس ہو رہا تھا۔ جس کے گرد ستارے بچوں کے مانند بیٹھے کوئی الف لیلوی داستان بڑے انہماک سے سن رہے تھے۔

سردیوں کی پورے چاند کی راتیں میری کمزوری تھیں۔ دل چاہا سب کچھ بھول کر اس رات کے فسوں میں کھو جاؤں مگر سینے میں جلنے والی آگ نے اس چاندنی رات کے جادو کو شکست دے دی۔

میں نے فائزہ کی گاڑی نکالی اور اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گیا۔ اپنے گھر والی عمارت کے داخلی گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی دل کی دھڑکن بڑھ گئی تھی۔ بے نام سی وحشت دوبارہ حملہ آور ہو گئی جس سے جھگڑتے ہوئے میں نے گاڑی کا رخ پارکنگ ایریا کی طرف کر دیا۔

جلد ہی مجھے اپنی گاڑی نظر آ گئی۔ میں نے گاڑی روکی اور نیچے اتر کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھا۔ اسی وقت قریب موجود رات کے گارڈز میں سے ایک نے مجھے پہچان کر سلام کیا۔ میں نے خوش دلی سے اس کے سلام کا جواب دیا اور پھر اپنی گاڑی سے بیریٹا نکال کر جیکٹ کی جیب میں ڈال لیا۔ اضافی میگزین میں نے دوسری جیب میں ڈالے تھے۔ میں گاڑی سے نکلا تو میری نظر دوسرے گارڈ پر پڑی۔ تیز روشنی والے بلب کے عین نیچے وہ ایک کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ اس کے منہ سے رال بہہ رہی تھی۔ چہرے

پر واضح سوجن تھی اور لگتا تھا جیسے اس کا منہ لقوے کے مریضوں کے مانند ایک طرف سے ٹیڑھا سا ہو گیا ہے۔

مجھے اس کا چہرہ شناسا سا لگا۔ اچانک ہی ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ یہ وہی پٹھان گارڈ تھا جس کے ساتھ صائم کی جھڑپ ہوئی تھی اور صائم نے اس کے کندھے پر دانت گاڑ دیے تھے۔ اس وقت اس گارڈ کی حالت مجھے عجیب سی لگی۔ میں نے قریب موجود دوسرے گارڈ کی توجہ اس کی جانب مبذول کرواتے ہوئے کہا۔ ''اسے کیا ہوا ہے؟ مجھے تو یہ بیمار لگ رہا ہے۔''

''ہاں صاحب! اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ دو دنوں سے لگتا ہے اس کا دماغ بھی خراب ہو گیا ہے۔ بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے۔''

''اس حالت میں تو اسے ڈیوٹی پر نہیں ہونا چاہیے تھا۔''

''غریب آدمی کیسے چھٹی کرے صاحب! سرکاری نوکری تو ہے نہیں، اضافی چھٹی پر تنخواہ کٹتی ہے۔'' دوسرے گارڈ نے افسردہ سے لہجے میں کہا۔

تنخواہ کٹنے والی بات نے مجھے طیش میں مبتلا کر دیا۔ ''میں ابھی بلڈنگ انتظامیہ سے بات کرتا ہوں، دیکھتا ہوں کون کاٹتا ہے اس کی تنخواہ۔''

''یہ غضب نہ کرنا صاحب گارڈ گھبرا گیا۔'' یہ تو میں نے آپ کو اندر کی بات بتائی ہے۔ اس کے ساتھ میری بھی نوکری چلی جائے گی۔''

''گھبراؤ نہیں، تمہارے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہو گی۔''

اگلے پندرہ منٹ کا ذکر فضول ہے۔ بیمار گارڈ والا معاملہ نمٹا کر میں نے گرین ٹاؤن کا رخ کیا۔ رات کے اس پہر ویران سڑکیں تیز رفتاری کے لیے معاون تھیں۔ آدھے گھنٹے میں ہی گرین ٹاؤن پہنچ گیا۔

یہ خاصا سرسبز علاقہ تھا۔ کبھی یہاں کی ساری زمین زرعی ہوتی تھی جسے اب تعمیرات نے ہڑپ کر لیا تھا۔ اس کے باوجود کئی جگہوں پر فصلیں وغیرہ نظر آ رہی تھیں۔ مجھے سرسوں کے چند پیلے کھیت بھی نظر آئے جو اس سرد چاندنی رات میں اداس اداس سے محسوس ہو رہے تھے۔

میں گرین ٹاؤن کی ویران سڑکوں پر گشت کرتا رہا۔ کمرشل ایریا میں چند فوڈ پوائنٹس پر کچھ چہل پہل تھی اس کے علاوہ ہر طرف ویرانی ہی تھی۔ حیرت انگیز طور پر پٹرولنگ کی کوئی گاڑی بھی نظر نہیں آئی تھی۔ قاضی کی بتائی نشانیوں کی مدد سے جلد ہی میں نے ''ملک فارم ہاؤس'' ڈھونڈ لیا۔ یہی بدنام زمانہ منشیات ڈیلر اور قبضہ مافیا کے رکن گلزاری ملک کا ڈیرا اور یقیناً اس کی مکروہ سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ کم از کم ایک ایکڑ کا رقبہ، بلند و بالا سیاہ گیٹ، اونچی دیواریں اور ان پر لگی خاردار تاریں، یہ تھا ملک فارم ہاؤس۔ حیرت انگیز طور پر گیٹ کے باہر کوئی سیکیورٹی گارڈ نہیں تھا۔ اس کا مطلب تھا سیکیورٹی کے معاملات کو مخفی رکھا گیا تھا۔ سرسری طور پر دیکھنے سے سیکیورٹی کیمرے بھی نظر نہیں آئے تھے۔

میں نے رفتار دھیمی رکھتے ہوئے فارم ہاؤس کے گرد چکر لگایا۔ سن گن لینے کی غرض سے میں نے اپنی طرف کا شیشہ بھی نیچے کر لیا۔ شیشہ نیچے کرتے ہی مجھے کتوں کے بھونکنے کی جارحانہ آوازیں سنائی دیں۔ جو ملک فارم ہاؤس کے اندر سے آ رہی تھیں پھر گولی چلنے کی آواز سنائی دی پھر متعدد ہتھیار گرجے تھے اور رات کا سکوت درہم برہم ہو گیا۔ ملک فارم ہاؤس میں یقیناً کوئی گڑبڑ چل رہی تھی۔ میرے لیے یہ احساس بڑا سنسنی خیز تھا۔ میں نے رفتار مزید کم کر دی۔ گولیاں چلنے کا سلسلہ چند سیکنڈ بعد ہی تھم گیا۔ البتہ کتوں کے بھونکنے کی جارحانہ آوازیں بدستور آ رہی تھیں۔

میں فارم ہاؤس کی بغلی سڑک پر تھا اور سر جھکائے ونڈ اسکرین کے پار سے گڑبڑ کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہی وقت تھا جب میں نے ایک حیرت انگیز منظر دیکھا۔ ایک سیاہ ہیولا سا بڑے سے پرندے کے مانند فارم ہاؤس کی خاردار تاروں والی اونچی دیوار کے اوپر ہوا میں نظر آیا۔ کسی ماہر جمناسٹر کی طرح اس نے ہوا میں اپنے جسم کو موڑا اور خاردار تاروں سے خود کو بچاتے ہوئے فارم ہاؤس کے ساتھ والی کچی جگہ پر گرا۔ گرتے ہی اس نے ماہرانہ انداز میں زمین پر قلابازی کھائی اور خود کو متوازن کرتے ہوئے سڑک پر عین میری گاڑی کے سامنے آ گیا۔

میں نے بے اختیار بریک لگایا۔ وہ سرتاپا چست سیاہ لبادے میں تھا۔ حتیٰ کہ اس کے چہرے پر بھی سیاہ نقاب تھا۔ پسٹل کے بجائے اس کے ہاتھ میں اگر تلوار ہوتی تو وہ ہوبہو معروف فلمی کردار ''ننجا'' کے مانند نظر آ رہا تھا۔

گاڑی کے سامنے آتے ہی اس سیاہ پوش نے اپنے پسٹل کا رخ میری طرف کر دیا تھا۔ میں نے تعاون کرنے والے انداز میں دونوں ہاتھ سر سے بلند کر دیے۔

اگلے ہی پل وہ فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول کر میرے برابر میں بیٹھ چکا تھا۔ پسٹل کی سرد نال میرے پہلو سے آ لگی۔ ''زندہ رہنا چاہتے ہو تو گاڑی پوری اسپیڈ سے

بھگاؤ۔'' ایک بیٹھی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ مجھے احساس ہوا کہ یہ آواز میں نے پہلے بھی سنی ہے یا پھر بولنے والے نے آواز بدلنے کی کوشش کی تھی۔

میں نے لمحوں میں گاڑی کو برق بنا دیا۔ روڈز کی سمتیں ایسی تھیں کہ فارم ہاؤس کے مین گیٹ سے گاڑیوں کو نکل کر اس جگہ پر پہنچنے میں خاصا وقت لگتا۔ لمحوں میں کتوں کے بھونکنے کی آوازیں غائب ہوگئیں۔

''پسٹل میری پسلیوں سے ہٹالو، میں پورا تعاون کررہا ہوں۔'' میں نے سر گھما کر اس کی طرف دیکھنے کی کوشش کی۔

پسٹل کا دباؤ مزید بڑھ گیا۔ ''توجہ ڈرائیونگ پر رکھو اور گاڑی لیفٹ والے روڈ پر ڈال دو۔''

سامنے مسلم ٹاؤن بائی پاس کا روڈ نظر آرہا تھا اور نیشنل ہائی وے سے فاصلہ 14.5 کلومیٹر تھا۔ میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ بائی پاس سنسان پڑا ہوا تھا۔ میں نے رفتار کی سوئی 120 تک پہنچادی۔

سیاہ پوش نے نئی ہدایت جاری کی۔ ''گاڑی کی رفتار کم کرو اور تمام لائٹس بجھادو۔''

میں نے رفتار کم کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ حماقت ہوگی۔ ہم کسی حادثے کا شکار ہوسکتے ہیں۔'' اس دوران میرا دماغ مسلسل اس کی آواز میں اُلجھا ہوا تھا۔

''تمہاری گاڑی دیکھ لی گئی ہوگی۔ ہرکارے کتّے نکل پڑے ہوں گے۔ میں نہیں چاہتا کہ تم بے موت مارے جاؤ۔'' بات فوراً ہی میری سمجھ میں آگئی۔ میں نے گاڑی کی تمام تر لائٹس بند کردیں۔ چاندنی رات کے سبب ڈرائیونگ زیادہ مشکل نہیں تھی۔

سیاہ پوش کسی تیندوے کے مانند چوکنا نظر آرہا تھا۔ وہ، میری طرف سے بھی غافل نہیں تھا اور مسلسل عقب نما آئینے پر بھی نظر رکھے ہوئے تھا۔

زیادہ دیر نہیں گزری تھی۔ عقب نما آئینے میں متعدد روشنیاں چمکیں۔ سیاہ پوش نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ ایک لمحے کے لیے وہ، میری طرف سے غافل ہوا۔ میں چاہتا تو پل بھر میں اس کے پسٹل والے ہاتھ کو گرفت میں لے کر اس پر جھپٹ سکتا تھا۔ میں کوئی تر نوالہ نہیں تھا۔ زندگی کا ایک ہنگامہ خیز دور میں نے گزارا تھا۔ ہتھیار کا سامنا کرنا میرے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس کے علاوہ ہاتھوں، پیروں کا بھی میں بخوبی استعمال کرلیتا تھا مگر سیاہ پوش کے حوالے سے میں متجسس تھا۔ دل کہہ رہا تھا مجھے بس کلیو کی تلاش ہے۔ وہ میرے سامنے آگیا تھا۔ اس کے علاوہ اس کی آواز بھی کچھ جانی پہچانی سی تھی۔ لگتا تھا وہ اپنی شناخت چھپانے کی کوشش کررہا تھا۔

بائی پاس کے دونوں اطراف سروقد فصلیں تھیں۔ تعاقب میں نکلی گاڑیوں کو ہم تک پہنچنے میں زیادہ دیر لگنے والی نہیں تھی۔ اس ادراک نے سیاہ پوش کی بے چینی بڑھادی تھی۔

میں نے کہا۔ ''تمہاری اجازت ہو تو تعاقب میں آنے والے ہماری گرد کو بھی نہیں پہنچ سکیں گے۔ نیشنل ہائی وے زیادہ دور نہیں ہے۔ تمہیں کوئی پرابلم نہ ہو تو وہاں قانون نافذ کرنے والے ادارے بھی ہماری مدد کو موجود ہوں گے۔''

''نہیں، وہ لوگ پاگل ہورہے ہیں۔ دوسری کوئی پارٹی یقیناً ہائی وے کی طرف بھی نکلی ہوگی۔ انہوں نے گولی چلانے میں دیر نہیں کرنی اور تمہاری گاڑی بکتر بند تو ہے نہیں۔'' اس دوران سیاہ پوش کی تیز نظریں اطراف کا جائزہ لے رہی تھیں۔ وہ جیسے کسی فیصلے پر پہنچ کر بولا۔ ''گاڑی دائیں طرف والی پگڈنڈی پر اتارلو۔''

میں نے اختلاف کے باوجود اس کی ہدایت پر عمل کیا اور گاڑی کچی پگڈنڈی پر اتار لی۔ گاڑی ہچکولے کھاتی آگے بڑھی۔ تھوڑی دور ایک عمارت کے آثار نظر آرہے تھے۔ قریب پہنچے تو وہ عمارت ایک متروک ڈیرا ثابت ہوئی جس کی چھتیں گری ہوئی تھیں۔ صرف دیواریں سلامت تھیں۔ ان میں سے بھی کھڑکیاں اور دروازے وغیرہ غائب تھے۔

ٹاہلی کے چند درختوں کے نیچے اس نے گاڑی روکنے کے لیے کہا۔

گاڑی روکتے ہوئے میں نے کہا۔ ''چاندنی رات ہے۔ ممکن ہے ان لوگوں نے گاڑی کو نیچے اترتا دیکھ لیا ہو۔ ہمارے نقش پا پر چلتے ہوئے وہ تھوڑی دیر میں اس جگہ پر ہوں گے۔''

''جانتا ہوں۔'' اس نے مجھے پسٹل کی زد پر رکھتے ہوئے اطراف کا جائزہ لیا۔ ''فی الحال یہاں سے نکلو تمہاری گاڑی کی ذمے داری میری ہے۔ اسے صبح دیکھیں گے۔''

اس کے اشارے پر میں نے گاڑی سے نکلتے ہوئے کہا۔ ''واہ کیا بات کی ہے۔ میں، تمہارے نشانے پر ہوں اور میری گاڑی کے نقصان کی ذمے داری تم لے رہے ہو۔''

اس نے بڑے اعتماد سے پسٹل اپنی بیلٹ میں اُڑس

لیا۔ ”یہ لو، گاڑی یہاں چھوڑنے میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔ انہوں نے تمہیں میرا ساتھی سمجھ لیا تو صورتِ حال واضح ہونے تک تمہاری کھال ادھیڑ دیں گے۔ اس لیے بہتر ہے فی الحال میرے ساتھ رہو۔“

اس پل میں چاہتا تو اسے نشانے پر لے سکتا تھا۔ بیریٹا پل بھر میں میرے ہاتھ میں آسکتا تھا مگر فی الوقت مجھے بھی اس کا ساتھ درکار تھا۔ میں نے کہا۔ ”یہ کون لوگ ہیں؟ تمہارا کیا معاملہ ہے ان کے ساتھ؟“

”بتاتا ہوں۔ فی الحال گاڑی لاک کرو اور میرے ساتھ آؤ۔“

تھوڑی دیر بعد ہم اوس میں بھیگی ہوئی قدِ آدم فصلوں میں تھے۔ اسی وقت متعدد گاڑیوں کی لائٹس نظر آئیں اور دو گاڑیاں برق رفتاری سے نیشنل ہائی وے کی جانب بڑھ گئیں۔

سیاہ پوش بولا۔ ”نیچے اترتے ہوئے انہوں نے ہمیں نہیں دیکھا لیکن یہ جلد ہی واپس آئیں گے۔ آؤ میرے ساتھ۔“

ہم دونوں فصلوں کے درمیان سے ہی نیشنل ہائی وے کی طرف بڑھے۔ شکر کا مقام تھا فصلیں تیار تھیں۔ اگر انہیں پانی وغیرہ لگا ہوتا تو ہمارا چند قدم چلنا بھی دوبھر ہو جاتا۔

”تم کون ہو؟ اور رات کے اس پہر یہاں کیا کر رہے تھے؟“ سیاہ پوش کی طرف سے سوال آیا۔

اس دفعہ اس کی آواز نے شناسائی کا احساس بڑھایا۔ میں نے کہا۔ ”محض چاندرات میں آوارہ گردی۔“

”آوارہ گرد لگتے تو نہیں ہو۔ تمہاری خوداعتمادی بھی قابلِ تعریف ہے۔ کوئی عام بندہ ہوتا تو میرے پسٹل ہٹاتے ہی بھاگ کھڑا ہوتا۔“

میں نے کہا۔ ”بے شک تم کوئی کمانڈو ٹائپ کی شے ہو مگر تمہاری خوداعتمادی ضرورت سے زیادہ بڑھی ہوئی ہے۔“ ساتھ ہی میں نے بیریٹا اس دفعہ اس کی پسلیوں سے لگا دیا۔

قدم آگے کی طرف بڑھاتے ہوئے وہ دھیرے سے ہنسا۔ ”تم بھی یہ ڈراؤنی شے لیے پھرتے ہو...... گڈ!“ بظاہر اس نے پسٹل کی ذرا بھی پروا نہیں کی تھی۔

”اب بتاؤ تم کون ہو؟“ میرے لہجے نے رنگ بدلا تھا۔ ”میرا اندازہ ہے کہ تم کسی حساس ایجنسی کے بندے ہو اور منشیات فروشوں کی ٹوہ لیتے پھر رہے تھے۔ جہاں سے تم کودے ہو، وہ بدنام زمانہ منشیات ڈیلر کا ڈیرا ہی ہے۔“

”تمہارے اندازے کی درستگی کی داد دینی پڑے گی۔ پسٹل ہٹا لو، میری پسلیاں نازک سی ہیں۔“

”ہٹ جاتا ہے پہلے ذرا ”دیدار“ تو کروا دو۔ مجھے جانے پہچانے سے لگ رہے ہو۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے اپنا ہاتھ اس کے نقاب کی طرف بڑھایا۔

اگلے ہی پل جیسے پھلجھڑی سی چھوٹی۔ سیاہ پوش برق کے مانند حرکت میں آیا۔ ایک ہاتھ سے اس نے میرا اپنے چہرے کی طرف بڑھتا ہاتھ جھٹکا۔ ساتھ ہی اس کی کہنی پسٹن کے مانند حرکت میں آئی۔ ضرب کی شدت سے میرے ہاتھ سے بیریٹا گر گیا۔

بھنا کر میں نے اس کے چہرے پر ٹکر ماری۔ پیچھے ہٹتے ہوئے اس کے پاؤں کی ضرب میری ناف پر لگی۔ تکلیف کی شدت سے میں جھکا تو وہ بالکل سیاہ تیندوے کے مانند مجھ پر جھپٹا۔ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اس کی جھپٹ سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ ہدف میری گردن ہے۔ اگر میری گردن اس کی گرفت میں آجاتی تو وہ لمحوں میں مجھے زیر کر سکتا تھا۔

بالکل آخری لمحے میں، میں اس کے بازو کے حلقے اور اپنی گردن کے درمیان اپنا ایک بازو حائل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اگلے ہی پل ہم دونوں فصلوں کے درمیان گتھم گتھا ہو گئے تھے۔ میرے بازو کے سبب وہ، میری گردن پر مطلوبہ دباؤ ڈالنے میں کامیاب نہ ہوا تو اس نے گردن چھوڑ کر مجھے گھونسوں پر رکھ لیا۔ مجھے اپنے حلق میں اپنے ہی خون کا نمکین ذائقہ محسوس ہوا تو طیش کی بلند و بالا لہر نے مجھے ڈھانپ لیا۔ میں نے تابڑ توڑ حملے کیے مگر کم بخت نہ جانے کس مٹی سے بنا تھا یا پھر اس کی تربیت کا اعجاز تھا۔ اس نے بڑی مہارت سے میری ضربات کو بلاک کیا۔ اس کشمکش کے دوران اس کا چہرہ نزدیک آیا تو مجھے پوائنٹ برابر کرنے کا موقع مل گیا۔ میرے سر کی دھواں دھار ٹکر نقاب میں چھپی اس کی ناک پر لگی تو اس کے حلق سے کراہ نکلی اور اس نے ایک علاقائی زبان میں مجھے گالی دی۔ اس پل وہ آواز تبدیل کرنا بھول گیا تھا۔ سرائیکی سے ملتی جلتی یہ علاقائی زبان جھنگ کے اطراف میں بولی جاتی تھی۔ مجھے پتا چل گیا تھا کہ میرا مدِمقابل کون ہے۔ اس آگاہی نے میرے ہاتھوں کو شل کر دیا تھا۔ جس کا سیاہ پوش نے فائدہ اٹھایا۔ اگلے ہی پل میں اس کے نیچے دبا ہوا تھا اور اس کی غضب ناک ضربات کا نشانہ بن رہا تھا۔ وہ اپنے جسم کو ایک خاص ترتیب میں لا رہا تھا جس کے بعد وہ میری پسلیوں کو گھٹنے کی

تباہ کن ضرب کا نشانہ بنا سکتا تھا۔ اس ضرب سے بچنے کے لیے میں نے اس کے کان کے قریب ہانپی ہوئی سرگوشی کی۔ ’’بس کریں اے ایس پی طارق سیال صاحب! میں نے پہچان لیا ہے آپ کو۔‘‘

برق رفتار مشین کی جیسے برقی رو معطل ہوگئی تھی۔ سیاہ پوش ساکت رہ گیا تھا۔ مجھے موقع میسر آ گیا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر آخری دیوار بھی گرا دی۔ نقاب کے عقب سے طارق سیال کا خوبرو چہرہ ہی برآمد ہوا تھا۔ اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ، میرے پہلو میں گر کر سانسیں درست کرنے لگا۔ اسی وقت ایک دفعہ پھر گاڑیوں کی روشنیاں نظر آئیں۔ یہ وہی گاڑیاں تھیں جو تھوڑی دیر پہلے برق رفتاری سے گزری تھیں۔ واپسی پر ان کی رفتار خاصی مدھم تھی۔ ہم اپنی جگہ ساکت ہوگئے تھے۔

کم ہوتے ہوتے دونوں گاڑیاں رک گئیں۔ یقیناً پگڈنڈی پر انہوں نے ٹائروں کے تازہ نشان دیکھ لیے تھے۔ اس دوران ہم اٹھ بیٹھے تھے۔ اے ایس پی کی سرسراتی آواز ابھری۔ ’’گاڑی ملتے ہی انہیں یہاں ہماری موجودگی کا یقین ہو جائے گا۔ وہ، ہمیں گھیرنے کی کوشش کریں گے۔ ہمیں آگے بڑھنا چاہیے۔‘‘

آنے والے لمحوں کی سنگینی کا احساس ہوتے ہی میں نے اپنے بیریٹا کی تلاش میں اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ بے شک چاندنی رات تھی مگر ان قدِ آدم فصلوں میں اسے ڈھونڈنا بھوسے کے ڈھیر میں سے سوئی ڈھونڈنے جیسا تھا مگر قسمت نے یاوری کی مجھے اس کا نقرئی رنگ کا دستہ چمکتا ہوا نظر آ گیا۔ میں نے لپک کر اسے اٹھا لیا۔ ہتھیار ہاتھ میں آتے ہی اپنی طاقت دوچند محسوس ہوئی۔ اس پر لگی مٹی میں نے جینز سے رگڑ کر صاف کی۔ منہ میں ابھی تک خون کا ذائقہ تھا۔ میں نے خون تھوکا تو اتفاق سے اے ایس پی کی نظر پڑ گئی۔ اس کے چہرے پر پشیمانی نظر آئی۔ منہ سے وہ کچھ نہیں بولا۔

ہم فصلوں ہی فصلوں میں سر جھکائے تیزی سے آگے بڑھے۔ ایک خیال آنے پر میں نے کہا۔ ’’گاڑی ملنے کے بعد ان کی تمام تر توجہ اس طرف ہی ہوگی۔ کیوں نہ ہم سڑک پار کر کے دوسری طرف ہو جائیں۔‘‘

’’اچھا خیال ہے۔‘‘ اے ایس پی نے توصیفی انداز میں کہا۔ ’’دوسری طرف ہمارے لیے زیادہ محفوظ رہے گی۔‘‘

آگے ایک خم کے سبب اگر سڑک پر کھڑی گاڑیوں کے نزدیک کوئی تھا بھی سہی تو سڑک پار کرتے ہوئے ہم، اس کی نظروں میں نہیں آ سکتے تھے۔ ہم نے اطمینان سے سڑک کراس کی اور دوسری جانب کی فصلوں میں آ گئے۔

میں نے کہا۔ ’’آپ اسکواڈ کو کیوں نہیں طلب کرتے؟ ہمیں چوروں کی طرح چھپنے کی کیا ضرورت ہے؟‘‘

’’میں ڈیوٹی پر نہیں ہوں۔ اس کے علاوہ کچھ رازداری کا بھی تقاضا ہے۔ میں اس معاملے کو فی الحال پوشیدہ رکھنا چاہتا ہوں۔‘‘

میں نے حیرت سے اُس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ سوجی ہوئی ناک کے نیچے خون جما ہوا تھا اور چہرے پر اسرار کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

میرے ذہن میں کئی سوالات سر اٹھا چکے تھے مگر ان کے جوابات حاصل کرنے کا موقع نہیں تھا۔ البتہ مجھے یقین تھا کہ میں ان کے جوابات حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔

صبح پانچ بجے کے قریب میں اے ایس پی کے ساتھ اس کے پولیس لائن والے چھوٹے اور صاف ستھرے بنگلے میں موجود تھا۔ فائزہ کی گاڑی چوری ہونے کی رپورٹ درج ہو چکی تھی۔ ٹائم رات 10 بجے کا لکھا گیا تھا۔ یہ سب اے ایس پی کی وجہ سے ممکن ہوا تھا۔

گرم پانی سے نہا کر ہم دونوں نے کپڑے تبدیل کر لیے تھے۔ میرے جسم پر بھی اے ایس پی کی شلوار قمیص تھی۔ قد تو ہمارے تقریباً برابر ہی تھے۔ میرا جسم قدرے بھاری تھا اور کندھے بھی چوڑے تھے جس کی وجہ سے ان کپڑوں میں، میں خود کو ’’قید‘‘ سا محسوس کر رہا تھا۔

فائزہ کے لیے میں نے واٹس ایپ پر میسج چھوڑ دیا تھا کہ میں ایک ضروری کام سے نکلا ہوں۔ وہ، اس میسج سے مطمئن ہونے والی نہیں تھی مگر شکر کا مقام تھا کہ اس نے ابھی تک میسج دیکھا نہیں تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ ابھی خوابِ خرگوش کے مزے لے رہی تھی۔

اے ایس پی بیچلر تھا۔ الیکٹرک ہیٹر کے قریب ہم دونوں آرام کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ اس کا ملازم ہمارے لیے چائے بنا کر لے آیا تھا۔ ساتھ میں کچھ کیک وغیرہ بھی تھا۔

ایک ہنگامہ خیز رات نے میرے اور اے ایس پی کے درمیان ایک بے نام سا تعلق بنا دیا تھا۔ اس کا پتا نہیں...... مجھے یہ تعلق بڑا اپنائیت بھرا لگ رہا تھا۔ اس کے علاوہ اس کی ذات اسراریت کے پردے میں لپٹی ہوئی تھی۔ وہ ایک عام پولیس آفیسر ہرگز نہیں تھا۔

نرم کیک چباتے ہوئے میرا جبڑا دکھ رہا تھا۔ یہ اے ایس پی کے زوردار گھونسوں کے سبب تھا۔ اس کی ناک کے نیچے پائیوڈین کی زردی دیکھ کر جبڑے کی دکھن کم ہو گئی۔ حساب تقریباً برابر ہی تھا۔

اے ایس پی نے گفتگو کا آغاز کیا۔ ''آپ کہہ کر مخاطب کروں یا اس بے تکلفی سے جو ہمارے درمیان خود بخود ہی در آئی ہے؟''

''مجھے بے تکلفی اچھی لگتی ہے۔''

اے ایس پی نے چائے کا گھونٹ بھرا۔ ''اچھی بات ہے، تمہاری وہاں موجودگی کے اسباب کا مجھے کچھ کچھ اندازہ ہے۔ تمہارے ذہن میں جو سوالات ہیں۔ تم پوچھ سکتے ہو مجھ سے۔''

میں نے کہا۔ ''تم جو بتانا چاہتے ہو، خود ہی بتا دو.... میں کوئی سوال نہیں کرنا چاہتا۔''

اے ایس پی کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ نگاہیں جیسے میرے دماغ کی گہرائیوں کو ٹٹول رہی تھیں۔ گہرا سانس لے کر اس نے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ پہلے مجھے یہ بتا دو، صائم والے معاملے کا لنک گلزاری ملک سے جوڑ کر ہی تم وہاں سن گن لیتے پھر رہے تھے نا؟''

''ہاں۔'' میں نے اثبات میں جواب دیا۔ ''صائم کی آخری کال کی لوکیشن گرین ٹاؤن کی تھی اور مجھے سو فیصد یقین ہے کہ صائم والے سانحے میں کسی نہ کسی طور منشیات کا عمل دخل ہے۔ گرین ٹاؤن کے جس بدنام زمانہ فارم ہاؤس سے تم کود کر بھاگے تھے۔ وہ منشیات فروشوں کا گڑھ ہے۔ بس، ایک لہر سی اٹھی تھی اور میں رات گئے اس جگہ کے جائزے کے لیے نکل کھڑا ہوا تھا۔ نتیجے میں تم سے ملاقات ہو گئی۔''

میرے خاموش ہونے پر اے ایس پی بولا۔ ''تم نے اپنی جگہ خود ہی بنالی ہے۔ مجھے لگتا ہے تم پر نہ صرف اعتبار کیا جاسکتا ہے بلکہ ہم مل کر کام بھی کر سکتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''تمہیں ان الفاظ پر کبھی پچھتاوا نہیں ہو گا۔ مل کر کام کرنے کا فیصلہ شاندار رہے گا۔ تم، مجھے ایک مخلص اور جاں نثار ساتھی پاؤ گے۔''

میرے لہجے سے چھلکتی گرم جوشی نے اسے متاثر کیا۔ کیک کو دھیرے دھیرے چباتے ہوئے وہ چند لمحے الفاظ کو مجتمع کرتا رہا پھر اس نے دھماکا کیا۔ ''صائم والا سانحہ پہلا نہیں ہے۔''

میرے لیے یہ اطلاع بے حد سنسنی خیز تھی۔ میں نے سوال کی ٹانگ اڑانے کے بجائے اسے بولنے کا موقع دیا۔

''جسٹس خورشید آغا کا بیٹا بھی یہ قیامت برپا کر چکا ہے۔''

میرے ذہن کی اسکرین پر بہت کچھ اکٹھا ابھرا تو سب کچھ گڈمڈ ہو گیا۔ میں خود کو بولنے سے باز نہ رکھ سکا۔ ''میڈیا، سینہ گزٹ...... جہاں سے جو معلومات مجھ تک پہنچی ہے۔ وہ تو بالکل مختلف ہے۔ وہ تو کچھ جرائم پیشہ......'' اے ایس پی نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے بولنے سے روک دیا۔ ''حقیقت کو چھپانے کے لیے وہ کہانی گھڑی گئی تھی کہ کچھ جرائم پیشہ افراد جسٹس آغا کی رہائش گاہ میں گھس گئے تھے۔ وہ جسٹس آغا کو اغوا کرنا چاہتے تھے۔ مزاحمت پر دو گارڈز، جسٹس آغا کی اہلیہ اور بیٹا مارے گئے اور جسٹس آغا زخمی ہوئے۔ بعد میں جرائم پیشہ افراد موقع سے فرار ہو گئے۔'' چائے کا ایک گھونٹ بھرنے کے بعد اے ایس پی نے مزید بتایا۔

''درحقیقت گارڈز اور اپنی ماں کو گولیاں مارنے والا جسٹس آغا کا بیٹا سرمد آغا ہی تھا۔ جسٹس آغا نے زخمی ہونے کے بعد خود کو اسٹڈی میں بند کر لیا اور انہی کے حکم پر سرمد آغا کو گولی ماری گئی۔ وہ بالکل ہی دیوانہ ہو رہا تھا۔''

ایک جسٹس کی نیک نامی اور طوفانی اسکینڈل کو روکنے کے لیے جرائم پیشہ افراد والی کہانی گھڑی گئی تھی۔ جسٹس آغا میرے لیے بے حد قابلِ احترام ہیں۔ انہی کی خواہش اور حکم پر میں، سرمد والے واقعے کو بڑی رازداری سے دیکھ رہا تھا کہ صائم والا سانحہ پیش آگیا۔ جیسے جیسے تفتیش آگے بڑھی۔ دونوں واقعات میں مماثلت سامنے آنے لگی۔ صائم کی طرح سرمد بھی دوستوں سے چند ہفتوں سے کٹا ہوا تھا۔ وہ بھی ایک بالکل الگ تھلگ نمبر جو کسی سادہ لوح دیہاتی کے نام پر رجسٹرڈ ہے، کے ساتھ مسلسل اور طویل دورانیے کی کالز کر رہا تھا۔ دونوں کو ہی غالباً ایک یا زیادہ لڑکیوں کے ذریعے ٹریپ کیا گیا ہے۔ سیکیورٹی کیمروں کی مدد لی گئی تو دونوں کی ہی گرین ٹاؤن میں آمد و رفت کا ریکارڈ ملا ہے لیکن یہ پتا نہیں چل سکا کہ دونوں آتے کس فارم ہاؤس پر تھے۔ آکس اور گرین ٹاؤن کے حوالے سے میرا ذہن بھی گلزاری ملک کی طرف چلا گیا۔ وہ دو مہینوں سے منظر سے غائب ہے۔ اس کی سن گن لینے کی غرض سے میں پرندوں کے لیے خوراک لے جانے والے لوڈر میں چھپ کر فارم ہاؤس میں داخل ہوا۔ رات ہونے کے انتظار میں ایک گودام میں چھپا رہا۔ رات کو وہاں سے نکلا تو نگرانی کے کتوں نے میری بُو پالی۔ مارا ماری کے بعد بھاگا تو تعمیراتی لکڑی کے ایک ڈھیر پر چڑھ کر باہر کودنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ ڈھیر دیوار کے

بالکل ہی ساتھ پڑا ہوا تھا۔‘‘ اے ایس پی نے ایک ہی سانس میں اچھی خاصی تفصیل بتادی تھی۔

میرا ذہن سنسنا اٹھا۔ لگتا تھا کوئی بڑا گیم کھیلا جا رہا ہے مگر کوئی سرا ہاتھ میں نہیں آرہا تھا۔

اے ایس پی نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ’’عام لوگوں کے بجائے ایک جسٹس کے بیٹے اور ایک نامور وکیل کے بھائی کو ٹارگٹ کیا گیا ہے۔ اس کے پیچھے یقیناً کوئی نہ کوئی وجہ ہوگی۔ ہم اس وجہ کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہوگئے تو آگے بڑھنے کا راستہ مل جائے گا۔ تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے؟‘‘

میں نے چائے کا کپ ٹیبل پر رکھا۔ ’’فی الحال تو ذہن میں کوئی وجہ نہیں آرہی۔ جسٹس آغا کے پاس میرے چند کیس سماعت کے لیے لگے رہے ہیں۔ بار اور بینچ کے رسمی تعلق کے علاوہ میرا ان سے کوئی تعلق بھی نہیں رہا۔

اے ایس پی نے دلچسپی لی۔ ’’کس نوعیت کے کیس تھے؟ ان کے فیصلے تمہارے خلاف گئے یا حق میں؟‘‘

میں نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ’’فوجداری مقدمات تھے۔ ان کا ریکارڈ میرے آفس میں لازماً ہوگا۔ دو کا فیصلہ میرے موکلین کے حق میں آیا تھا اور ایک خلاف گیا تھا۔‘‘

اے ایس پی پُرجوش ہوگیا۔ ’’صبح ان مقدمات کا ریکارڈ نکالو اور فریقین کی لسٹ بھی بنوالو، ضرور کوئی نہ کوئی راہ نکل آئے گی۔‘‘

’’آفس کھلتے ہی یہ کام ہوجائے گا۔‘‘

اے ایس پی بولا۔ ’’جسٹس آغا کی درخواست پر ہی معروف سائنٹسٹ ڈاکٹر ہدایت علی نے ذاتی دلچسپی لی ہے۔‘‘ اس نے دیوار گیر گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ’’سرمد کی خفیہ طور پر قبر کشائی ہوچکی ہوگی یا ہو رہی ہوگی۔ اس کے نمونے لینے کے بعد دن کی روشنی میں صائم کی قبر کشائی کے بعد نمونے لیے جائیں گے۔ اس طرف سے بھی کوئی نہ کوئی سراغ ملنے کی امید ہے۔‘‘

ایک خیال آنے پر میں نے کہا۔ ’’اگر دونوں لڑکوں کو لڑکیوں کے ذریعے ٹریپ کیا گیا ہے تو فون کے علاوہ یقیناً ان کی ملاقاتیں بھی ہوتی ہوں گی۔ سیکیورٹی کیمروں والی بات سے خیال آیا ہے کہ کیوں نا ایسے ریسٹوران وغیرہ کے سی سی ٹی وی فوٹیج کیمروں کا ریکارڈ چیک کیا جائے۔ جہاں ’’لو برڈز‘‘ کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ خاص طور پر گرین ٹاؤن کے اطراف کے ریسٹوران وغیرہ۔‘‘

اے ایس پی کا چہرہ چمک اٹھا۔ ’’شاندار، تم نے نہایت اہم پوائنٹ کو اجاگر کیا ہے۔ ضرور کچھ نہ کچھ مل جائے گا۔‘‘ پھر اچانک ہی اس کے چہرے کی چمک ماند پڑنے لگی۔ وہ قدرے تردد سے بولا۔ ’’میرے پاس بااعتماد افرادی قوت کی کمی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ گلزاری ملک وغیرہ کو ذرا بھی بھنک پڑے کہ میں، ان کے تعاقب میں ہوں۔ میرا محکمہ کالی بھیڑوں سے بھرا ہوا ہے۔ یہ کام اگر تم کرسکو تو میرا بہت بڑا مسئلہ حل ہوجائے گا۔‘‘

میرے ذہن میں فائزہ اور اپنے جونیئر وکلا کے علاوہ صائم کے دوستوں کا خیال آیا۔ ان کی مدد سے یہ کام کیا جا سکتا تھا۔

میں نے ہامی بھرلی۔

اے ایس پی مطمئن نظر آنے لگا پھر بولا۔ ’’مس فائزہ والی گاڑی سامنے آنے کے بعد یقیناً تم، گلزاری ملک وغیرہ کے سامنے آجاؤ گے۔ گاڑی چوری ہونے والی گولی وہ نہیں نگلیں گے اس لیے ذرا احتاط ہی رہنا۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’بے فکر رہو، انہوں نے کوئی حماقت کی تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے انہیں۔‘‘

اے ایس پی نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا۔ ’’اب بہتر ہے تھوڑی دیر کے لیے سوجاؤ۔‘‘

’’نہیں، اب گھر جا کر ہی سوؤں گا۔ مجھے ڈراپ کروا دو۔‘‘

تھوڑی دیر میں اے ایس پی کی سرکاری جیپ نے مجھے فائزہ والے اپارٹمنٹ کی بلڈنگ کے مرکزی دروازے تک پہنچا دیا۔

بے حد آہستگی سے دروازہ کھول کر میں اندر داخل ہوا۔ یہ دیکھ کر مجھے خوشگوار حیرت ہوئی کہ فائزہ ابھی تک سو رہی تھی۔ میں اطمینان سے دوسرے کمرے میں کمبل اوڑھ کر سو گیا۔ گاڑی کے حوالے سے البتہ میں نے اس کے لیے ایک اور میسج ضرور چھوڑ دیا تھا۔

میں بارہ بجے کے لگ بھگ جاگا تو فائزہ کے خفگی بھرے میسجز کے درمیان خفگی میں چھپا ایک پیارا سا میسج بھی تھا۔ ’’ناشتا بنا کر چھوڑے جا رہی ہوں۔ گرم کر لینا اور ناشتے کے بعد مجھے کال کرنا۔‘‘

میں نے فریش ہونے کے بعد اس کی ہدایت پر پہلے ناشتا کیا۔ ناشتے کے دوران ہی اے ایس پی کی کال آگئی۔ میری آواز سنتے ہی بولا۔ ’’ایک بہت بڑی خبر ہے۔‘‘ اس کا لہجہ سنسنا رہا تھا۔

''جلدی بتاؤ، تجسس مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔'' یہ کہہ کر میں نے آخری نوالہ منہ میں ڈالا۔

اے ایس پی کی سرسراتی آواز ابھری۔ ''تمہارا بھائی اور جسٹس آغا کا بیٹا...... یہ بات یقینی ہوگئی ہے کہ کسی بھیانک تجربے کی بھینٹ چڑھے ہیں۔''

''کیا کہہ رہے ہو؟'' میں نے بمشکل نوالہ نگلا۔

''صحیح کہہ رہا ہوں۔ قبر میں دونوں کے اجسام جتنی تیزی سے گلے، سڑے ہیں، وہ رفتار ماہرین کے لیے بے حد حیران کن ہے۔ مہینوں کا عمل دنوں میں انجام پایا ہے۔ معاملہ اب ضرور ہائی لیول پر جائے گا۔ وفاقی ایجنسیاں حرکت میں آنے والی ہیں۔''

اس دوران کسی نے اے ایس پی کو مخاطب کیا تھا۔ اس نے دھیرے سے کہا۔ ''بعد میں بات کرتا ہوں۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے رابطہ منقطع کردیا۔

میرے سر میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ کسی نے میرے بھائی اور جسٹس آغا کے بیٹے کو ہی بھیانک تجربے کے لیے منتخب کیوں کیا تھا؟ وہ دونوں ''سوفٹ ٹارگٹ'' تو ہرگز نہیں تھے۔ ہمارا مشترکہ دشمن تھا تو کیوں تھا؟ یا پھر یہ محض اتفاق تھا۔

میں نے خود کو سنبھالا۔ اندھیرے میں چھپا کوئی دشمن تھا یا کوئی اور صرف اس کا خون ہی میرے سینے میں جلتے انگاروں کو بجھا سکتا تھا۔ وفاقی ایجنسیوں کے ہاتھ آنے سے پہلے مجھے اس سے اپنا حساب بے باق کرنا تھا۔

میں نے فائزہ کو کال کی۔ وہ خفا تھی مگر میری بے پناہ سنجیدگی کو محسوس کرتے ہی یہ خفگی پس منظر میں چلی گئی۔

میں نے جو کام اس کے ذمے لگانے تھے، وہ لگا کر فون بند کردیا۔

تھوڑی دیر میں اے ایس پی کا میسج آگیا۔ اس نے اپنی لوکیشن بھیجی تھی اور مجھے فوراً پہنچنے کے لیے کہا تھا۔ میں آن لائن ٹیکسی منگوا کر مطلوبہ لوکیشن پر پہنچ گیا۔ پرانے ڈیفنس کی یہ ایک وسیع وعریض کوٹھی تھی۔ اے ایس پی گیٹ پر ہی بے چینی سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے لے کر وہ ایک وسیع وعریض ڈرائنگ روم میں آیا اور دھیمی آواز میں بولا۔

''یہ ڈاکٹر ہدایت علی کی رہائش گاہ ہے۔ ان سے اجازت لے کر ہی میں نے تمہیں بلایا ہے۔ وہ ابھی لیبارٹری میں ہیں۔''

میں نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''اس نئی خبر نے تو مجھے چکرا کر رکھ دیا ہے۔ میری کسی سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے۔ بطور وکیل اگر کسی کو میری ذات سے نقصان پہنچا ہے تو جس قبیل کے لوگوں سے ہمارا عدالتوں میں واسطہ رہتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ پسٹل لے کر میرے سامنے آجاتا۔ گولی مار دیتا۔ اس چھپے دشمن کا کیلیبر تو بالکل ہی مختلف ہے۔ میرے بھائی کو ٹریپ کر کے اس کا ذہن ماؤف کر کے اسے ایک پاگل درندے کا روپ دینا اور یہ قبر کشائی کے بعد جو نئی بات سامنے آئی ہے۔ مجھے نہیں لگتا یہ کوئی ذاتی دشمنی کا شاخسانہ ہے۔''

اے ایس پی کے چہرے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ نیند کی کمی کا شکار ہے۔ اس کی ناک کی سوجن ابھی تک برقرار تھی۔ وہ بولا۔ ''ڈاکٹر صاحب کی رپورٹ کے بعد یہ کیس ایک وفاقی ایجنسی کو چلا جائے گا۔ وہ لوگ بہترین افرادی قوت کے ساتھ حرکت میں آئیں گے تو چند دنوں میں ہی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوجائے گا۔ ہم بھی اپنے طور پر لگے رہیں گے۔ رات جن پوائنٹس پر ہم متفق ہوئے تھے، ان پر کام شروع کیا تم نے؟''

''ہاں، تینوں کیسوں والی رپورٹ شاید مکمل ہو چکی ہو۔ ریستوران کے سی سی ٹی وی فوٹیج کا ریکارڈ چیک کرنے کے لیے یقیناً کچھ بااعتماد لوگ حرکت میں آچکے ہوں گے۔''

اے ایس پی مطمئن نظر آنے لگا پھر بولا۔ ''میں اس کیس پر شروع سے کام کر رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ وفاقی ایجنسی جو تحقیقاتی ٹیم تشکیل دے گی، مجھے ضرور اس میں پولیس کی نمائندگی دی جائے گی۔ ہمارا پہلا ٹارگٹ گلزاری ملک ہوگا۔ اس کے ہاتھ آتے ہی اس کیس کی پہلی گرہ کھل جائے گی۔''

''تمہارے شامل ہونے سے میں بھی پیشرفت سے باخبر رہوں گا اور اگر گلزاری ملک کے فارم ہاؤس پر ہی صائم اور سرمد کے ساتھ کچھ ہوا ہے تو آگے بڑھنے کا راستہ وہیں سے ہی نکلے گا۔''

اسی وقت سفید اوور ہال اور چہرے پر حفاظتی شیلڈ لگائے ڈاکٹر ہدایت علی ڈرائنگ روم میں وارد ہوئے۔ ہم دونوں بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے اب تک انہیں تصویروں یا پھر ٹی وی پر ہی دیکھا تھا۔ وہ اکہرے بدن کے سرخ وسفید آدمی تھے۔ عمر یقیناً ساٹھ سال کے قریب تھی مگر جوانوں کے مانند کر سیدھی اور خاصے چست نظر آتے تھے۔ حفاظتی شیلڈ کے پیچھے ان کی آنکھوں کی چمک نمایاں تھی۔

کورونا وبا کے پیشِ نظر انہوں نے سماجی فاصلہ برقرار

رکھتے ہوئے ہم سے علیک سلیک کی اور حفاظتی ماسک نہ لگانے پر محبت بھری ڈانٹ ڈپٹ بھی کی۔

ان کے اشارے پر ہم بیٹھ چکے تو ڈاکٹر صاحب نے میرے اہلِ خانہ کے لیے فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ دعا کے بعد انہوں نے مجھ سے رسمی تعزیت کی۔

میں، ان کی پُر وقار اور گھنی چھاؤں جیسی شفقت بھری شخصیت سے بے حد متاثر ہوا تھا۔ اے ایس پی پہلے مل چکا تھا۔ یقیناً اس کی کیفیت بھی مجھ سے مختلف نہیں تھی۔

ہم دوبارہ بیٹھ چکے تو ڈاکٹر ہدایت کے شفاف چہرے پر فکر مندی کا سایہ لہرا آیا۔ وہ پُر اندیش انداز میں بولے۔ ''دونوں بچوں کے واقعات اور پھر ان کی قبر کشائی کے نتیجے میں جو کچھ سامنے آیا ہے، اس نے مجھے بے حد فکر مند کر دیا ہے۔ دونوں کی باقیات سے مجھے ایک نئی قسم کا جرثومہ ملا ہے جو بڑی حد تک ''ریبیز'' کے جرثومے سے مشابہت رکھتا ہے۔ ریبیز کے بارے میں تو تم لوگ جانتے ہی ہو گے؟''

ہمارے جواب دینے سے پہلے ہی انہوں نے اپنے سوال کی خود ہی وضاحت کر دی۔ ''یہ جرثومہ پاگل کتے کے لعاب میں پایا جاتا ہے اور جسے وہ پاگل کتا کاٹ لے یہ جرثومہ اس میں منتقل ہو جاتا ہے۔ علاج نہ ہونے کی صورت میں متاثرہ شخص کی جان بھی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ پاگلوں کی سی حرکتیں کرتا ہے۔ کسی کو کاٹ لے تو یہ جرثومہ آگے بھی منتقل ہو جاتا ہے۔ خیر ریبیز قابلِ علاج مرض ہے۔'' لمحاتی وقفے کے بعد انہوں نے دوبارہ کہا۔ ''مجھے یقین کی حد تک شک ہے کہ یہ نیا جرثومہ قدرتی نہیں ہے۔ ضرور اسے تخلیق کیا گیا ہے۔ یہ اپنی تعداد تیزی سے کبھی بڑھا رہا ہے اور کبھی گھٹا رہا ہے۔ یقیناً یہ ابھی تجرباتی سطح پر ہے۔ خدانخواستہ اس کا مکروہ تخلیق کار اسے وائرس کی شکل دینے میں کامیاب ہو گیا تو ایک ''قیامتِ صغریٰ'' برپا کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ ''زومبا'' ٹائپ کی جتنی بھی تم لوگوں نے فلمیں دیکھی ہیں۔ وہ سب حقیقت کا روپ دھار لیں گی۔ ہمیں فوری طور پر اس عذاب کے سدباب کی ضرورت ہے۔''

اے ایس پی نے مداخلت کی۔ ''سر! آپ کا کھینچا نقشہ تو بے حد خوفناک ہے۔ ہمیں شاید عالمی ادارہ صحت کو اس بارے میں آگاہ کرنا پڑے گا۔''

ڈاکٹر ہدایت علی کی آنکھیں جیسے سوچ کی گہرائیوں میں اتر گئیں، وہ بولے۔ ''میرے بچے! میں جو دیکھ اور محسوس کر رہا ہوں۔ وہ میرے کھینچے نقشے سے بھی خوفناک ہے۔ دونوں بچوں کے عمل تغیر (گلنے، سڑنے کا عمل) کی ناقابلِ یقین تیز رفتاری بہت سے خوفناک اندیشوں کو جنم دے رہی ہے۔ اتفاق سے میرے دو چینی ہم پیشہ دوست اسلام آباد آئے ہوئے ہیں۔ میں انہیں بلانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ یہ بے حد سنگین معاملہ ہے۔ ہمارے حساس اداروں کو جلد از جلد اس واقعے کے ذمے داروں تک پہنچنا ہوگا۔''

ریبیز اور کاٹنے کے عمل سے میرے ذہن میں کچھ چبھ سا رہا تھا۔ لاشعور مسلسل کچھ سامنے لانے کی کوشش کر رہا تھا پھر اچانک ہی لاشعور سے نکل کر کچھ سامنے آ گیا۔ میں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب! میرے بھائی صائم نے جنونی کیفیت میں ایک گارڈ کو کاٹ لیا تھا۔ اتفاق سے میرا اس گارڈ سے سامنا ہوا ہے۔ میں نے اسے عجیب اور بہکا ہوا سا دیکھا ہے۔ اس کے منہ سے رال بھی بہہ رہی تھی۔ کہیں صائم سے وہ جرثومہ اس گارڈ میں تو منتقل نہیں ہو گیا؟''

ڈاکٹر ہدایت کا پورا وجود ہی جیسے ایک ہیجان کی لپیٹ میں آ گیا۔ ''یقیناً ایسا ہوا ہے۔ مجھے وہ گارڈ فوراً اپنی تحویل میں چاہیے۔ یہ نہ ہو کہ وہ بھی کوئی قیامت ڈھا دے۔''

اے ایس پی تیزی سے کھڑا ہو گیا۔ ''کہاں ہے وہ گارڈ؟''

میری دی ہوئی معلومات کی روشنی میں اے ایس پی فون پر تیزی کے ساتھ مصروف ہو گیا۔

ڈاکٹر ہدایت بے چینی سے وسیع ڈرائنگ روم میں ٹہلنے لگے تھے۔ ٹہلتے ٹہلتے ان کا رخ ہماری طرف ہوا تو بولے۔ ''نہ جانے کیوں...... میرے ذہن میں ڈاکٹر رام پرکاش کا نام آ رہا ہے۔ دنیا میں ریبیز پر جتنا کام ڈاکٹر پرکاش نے کیا باقی کوئی اس کے ایک چوتھائی کو بھی نہیں پہنچا۔ ویانا میں ایک کانفرنس کے دوران میں میرا واسطہ پڑا ہے اس بندے سے۔ نسلی تفاخر اور منفی سوچ اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ یہ نیا جرثومہ کہیں اسی کم بخت کی ایجاد ہی نہ ہو۔ اپنے مکروہ عزائم کے ساتھ اس نے ہماری پاک سرزمین کو تجربے کے لیے نہ چن لیا ہو۔ فطری کمینگی اُسے یہاں کھینچ لائی ہو۔''

ڈاکٹر صاحب کی خیال آرائی میری طرح اے ایس پی کے دل کو بھی لگی، وہ بولا۔ ''اس بھیانک تجربے کے لیے کیا ڈاکٹر پرکاش کا یہاں ہونا ضروری ہے؟''

''یقیناً...... یہ جرثومہ ابھی ابتدائی مراحل میں ہے۔

اس میں ہونے والی تبدیلیوں اور جس پر تجربہ کیا گیا ہو، اس کے مشاہدے کے لیے تخلیق کار کا قریب ہونا ضروری ہے۔ ڈاکٹر پرکاش کو میں نے ڈکلیئر نہیں کیا۔ صرف ایک ذہن میں آنے والا خیال تمہارے ساتھ شیئر کیا ہے۔''

اے ایس پی پُرجوش ہو گیا۔ ''ڈاکٹر پرکاش یقیناً ایک نامور شخص ہوگا۔ انڈیا میں اس کی موجودگی کا پتا لگانا بے حد آسان ہے۔ ہماری ایجنسیاں وہاں خاصی فعال ہیں۔ اس کی کھوج چند گھنٹوں میں لگ سکتی ہے۔''

''کوشش کرو۔'' یہ کہہ کر ڈاکٹر صاحب نے دعائیہ انداز میں ہاتھ اٹھائے۔ ''خدا کرے میرا اندازہ غلط ثابت ہو۔''

میرا ذہن ڈاکٹر پرکاش میں اُلجھا ہوا تھا۔ اگر یہ بھیانک تجربہ اسی نے کیا تھا تو اس کے لیے ایک جسٹس اور ایک وکیل کے خاندان کے فرد کو ٹریپ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ سوفٹ ٹارگٹ اسے بڑے آرام سے مل سکتے تھے۔ ہم سے اسے کیا دشمنی ہوسکتی تھی۔ میں یہ اُلجھن زبان پر لایا تو ڈاکٹر صاحب نے بڑی سادگی سے اپنی رائے دی۔

''ڈاکٹر پرکاش نے مقامی سہولت کار بھی تو خریدے ہوں گے۔ ممکن ہے ایسے کسی سہولت کار نے تم سے اپنی دشمنی نکالی ہو۔ یعنی ایک تیر سے دو شکار۔''

یہ سادہ سے الفاظ نہیں، سبک خرام انگلیاں تھیں۔ جنہوں نے میرے ساتھ اے ایس پی کے دماغ کی بھی بہت سی گرہیں کھول دی تھیں۔

میری اور اے ایس پی کی نظریں ٹکرائیں۔ ایک برق سی لہرائی اور ہم دونوں نے ایک دوسرے کے ذہنوں کو پڑھ لیا۔ اگر ڈاکٹر پرکاش والی بات درست ثابت ہوتی تو پھر سو فیصد یہی ہوا تھا۔ اس کے کسی مقامی سہولت کار نے اس آڑ میں اپنا بدلہ چکایا تھا۔

مجھے یقین سا ہونے لگا۔ وہ سہولت کار زیادہ دیر چھپا نہیں رہ سکے گا۔ اس تک پہنچنے کا مطلب ڈاکٹر پرکاش تک پہنچنا تھا۔

تھوڑی دیر میں مذکورہ گارڈ کو بے ہوشی کی حالت میں ڈاکٹر ہدایت علی کی کوٹھی میں بڑی رازداری سے پہنچا دیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب، اس کے ساتھ مصروف ہو گئے تو ہم نے اجازت چاہی۔

باہر نکلتے ہوئے اے ایس پی نے کہا۔ ''میرے کرنے کو بہت سا کام ہے جو کام اپنے ذمے لیا ہے تم نے، اس کی جلد سے جلد کوئی پروگریس دو۔''

میں نے کہا۔ ''شام تک بہت کچھ سامنے آجائے گا۔''

اے ایس پی کو جلدی تھی۔ مجھے ڈراپ کیے بغیر ہی وہ اپنی جیپ میں نکل گیا۔ میں نے دوبارہ آن لائن ٹیکسی پکڑی اور اپنے گھر والی بلڈنگ میں آگیا۔ وہاں سے اپنی گاڑی لے کر میں نے اپنے آفس کا رخ کیا۔

☆☆☆

میں آفس پہنچا تو وہاں صرف فائزہ اور آفس بوائے موجود تھے۔ میں نے گزشتہ رات سے لے کر اب تک کے واقعات کا خلاصہ اسے بتایا تو وہ خاصی متفکر نظر آنے لگی۔ اب تک اس نے خاصا کام کیا تھا۔ تینوں کیسوں کی فائلز اور ایک رپورٹ اس نے مرتب کر لی تھی۔

دیگر تمام آفس ممبران اور صائم کے دوستوں کو اس نے ریستورانز والے کام پر لگا دیا۔ ساتھ ہی اس نے مجھے خبر دی کہ گاڑی ''بازیاب'' ہو گئی تھی مگر اسے مکمل طور پر جلا دیا گیا تھا۔ یقیناً گلزاری ملک کے حواریوں نے اپنی جھنجلاہٹ اور غصہ اس گاڑی پر نکالا تھا۔

میں نے تینوں کیسز والی رپورٹ دیکھی۔ ایک کیس 302 یعنی قتل عمد کا تھا۔ اس کیس میں، میں وکیل صفائی تھا۔ میری محنت اس کیس میں کام آئی تھی۔ میرے موکل کو سیشن کورٹ سے ملنے والی سزائے موت۔ ہائی کورٹ میں جسٹس آغا نے عمر قید میں تبدیل کر دی تھی۔ اس کیس میں مخالف وکیل میرا سب سے بڑا پیشہ ورانہ حریف بیرسٹر شعیب خان تھا۔

عمر قید پانے والا میرا موکل ابھی جیل میں ہی تھا۔ رپورٹ کے ساتھ فریقین کی فہرست تھی۔ اس کیس میں یقیناً ایک پارٹی کے لیے میرے علاوہ جسٹس آغا بھی ناپسندیدہ شخص تھا مگر یہ زمیندار اور دشمن دار لوگ تھے۔ عدالتیں ان کے لیے نئی چیز نہیں تھیں۔ محض اپنے خلاف جانے والے فیصلے کو لے کر ایک جسٹس اور نامور وکیل کے خلاف کوئی کارروائی، ان کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتی تھی۔ خاص طور پر جو دونوں واقعات پیش آئے تھے، وہ ان کے کیلبر سے بہت آگے کی بات تھی۔

میں نے پہلے کیس کے فریقین کو مشکوک لسٹ سے خارج کر دیا۔

دوسرا کیس ایک کمرشل پلاٹ پر قبضے کا تھا۔ چچا اور بھتیجے کے درمیان تصادم ہوا تھا۔ دونوں طرف سے کچھ افراد زخمی ہوئے تھے۔ بھتیجے پر ناجائز اسلحے کی سنگین دفعات بھی

تھیں۔ میں، بھتیجے کی ہائی کورٹ سے ضمانت کروانے میں کامیاب رہا تھا۔ بعدازاں دونوں فریقین میں، میرے آفس میں ہی صلح نامہ ہو گیا تھا۔

اس کیس میں شفقت عطا نامی ایک نوجوان وکیل میرا مخالف تھا۔ اس کیس کو بھی میں نے خارج کر دیا۔ فائزہ، میرے سامنے بیٹھی، میرے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ۔ لے رہی تھی۔

تیسرے کیس کے مندرجات پر نظر ڈالتے ہی میرے دل کی دھڑکن بڑھنے لگی۔ یہ ایک جعلی ادویات ساز کمپنی کا مالک تھا جس پر انڈین جنسی ادویات کی اسمگلنگ کا اضافی کیس بھی تھا۔ میں، اس کا دفاع کرنے میں ناکام رہا تھا۔ جسٹس آغا نے اپیل کی سماعت کے دوران میں ڈرگ کورٹ سے ملنے والی سزا کو ناکافی قرار دیتے ہوئے اس کی سزا دو سال سے بڑھا کر پانچ سال کر دی تھی۔

اس کیس میں مخالف وکیل ایک دفعہ پھر بیرسٹر شعیب خان تھا۔

جعلی ادویات ساز کمپنی کے مالک کا نام آصف جلال تھا۔ انڈین جنسی ادویات کے ساتھ اس کا انڈیا سے لنک بھی ظاہر ہو رہا تھا۔ میں نے آصف جلال کے نام کے گرد سرخ پنسل سے دائرہ لگایا۔ ”اگر یہ شخص جیل سے رِہا ہو چکا ہے تو مطلوبہ شخص یہ ہو سکتا ہے لیکن اس کا نشانہ تو شعیب خان ہونا چاہیے تھا۔ میں نے تو اس کا دفاع کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی۔“ میں اُلجھ سا گیا۔

فائزہ نے سرخ دائرے پر نظر ڈالی۔ ”دفاع کرنے کی کوشش کی تھی نا...... دفاع کرنے میں کامیاب تو نہیں ہوئے تھے۔“ فائزہ نے ایک اہم نقطہ اٹھایا۔

میں نے کہا۔ ”پتا کرو، یہ جیل میں ہی ہے نا، کیس تو خاصا پرانا ہے۔“

فائزہ نے حساب لگایا اور بولی۔ ”جیل مینوئل کے مطابق سالانہ دو ماہ کی معافی ملتی ہے۔ پھر عیدین اور دیگر قومی تہواروں پر وفاقی اور صوبائی حکومت کی طرف سے سزا میں تخفیف ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے اس بندے نے اگر اچھے چال چلن کا مظاہرہ کیا ہے تو اسے رِہا ہوئے بھی کم از کم چھ ماہ تو ضرور ہو چکے ہوں گے پھر بھی میں پتا کرواتی ہوں۔“

فائزہ کی ایک کلاس فیلو کا شوہر مقامی سینٹرل جیل میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ تعینات تھا۔ اس نے بیٹھے بیٹھے فون گھمایا۔ تھوڑی دیر میں متعلقہ کے ساتھ غیر متعلقہ معلومات کا بھی ڈھیر لگ گیا۔

آصف جلال کو جیل سے رِہا ہوئے پانچ ماہ سے زائد ہو گئے تھے۔ اس کے ساتھ بہت افسوسناک واقعہ پیش آیا تھا۔ اس کی قید کے چوتھے سال میں اس کے گھر ڈکیتی کی خونی واردات ہوئی تھی۔ بدقماش ڈاکوؤں نے اس کی بیوی اور نوعمر بیٹی کے ساتھ اجتماعی زیادتی کی تھی۔ بعد میں اپنا جرم چھپانے کی کوشش کے طور پر پورے گھر کو آگ لگا دی تھی۔ ماں، بیٹی کے جسم مکمل طور پر جلنے سے بچ گئے تھے جس کے سبب ان کے ساتھ زیادتی کی تصدیق ممکن ہو سکی تھی۔

اس واقعے کے بعد آصف جلال نیم پاگل سا ہو گیا تھا۔ اکثر وحشت کے عالم میں وہ سلاخوں سے سر ٹکراتا تھا اور نظامِ انصاف، وکلا، ججز کے بارے میں بدکلامی کرتا تھا۔

قید کے آخری چند مہینوں میں اسے چپ سی لگ گئی تھی۔ خاموشی سے بیٹھا خلا میں تکتا رہتا تھا۔ اسی حالت میں ہی ایک دن اس کی رہائی کا پروانہ آ گیا۔

فائزہ کی کلاس فیلو کا شوہر کئی سال سے سینٹرل جیل میں تعینات تھا۔ ڈکیتی والے واقعے کے بعد اسے، آصف جلال سے ہمدردی سی ہو گئی تھی۔ اس نے آصف جلال کا علاج کروانے کی بھی مقدور بھر کوشش کی تھی۔ اس غیر متعلقہ معلومات نے ایک اور گانٹھ کھول دی تھی۔

دل میں انتقام کی شدید ترین آگ لیے وہ جیل سے رِہا ہوا تھا۔ اپنے تئیں وہ جن لوگوں کو اپنے گھر بار کی تباہی کا ذمے دار سمجھتا تھا وہ، ان کے خلاف کچھ بھی کر سکتا تھا۔ اپنے گریبان میں جھانکنے کا یقیناً اسے خیال بھی نہیں آیا ہوگا۔ خود اس نے محض مالی فائدے کے لیے نہ جانے کتنے گھر اجاڑے تھے۔ جعلی ادویات کے سبب پتا نہیں کس کس نے سسک سسک کر جان دی ہو گی۔

اس کی فیملی کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا۔ بے شک وہ ظلم کی انتہا تھی مگر اسے بنیاد بنا کر وہ واقعی انڈینز کے لیے سہولت کاری کے ساتھ ساتھ اپنا بدلہ بھی چکا رہا تھا تو اس کی گردن شکنجے میں جکڑے جانے کے قابل تھی۔ میں نے کہا۔ ”فائزہ! اگر واقعی اب تک کے ہمارے مفروضے درست ہیں تو یہ بندہ، ہمارے خاندان کا قاتل ہے۔ ہمیں جلد سے جلد اس تک پہنچنا ہے۔“

فائزہ بولی۔ ”میرے خیال میں تو آصف جلال تک پہنچنا زیادہ مشکل نہیں ہے بلکہ مکروہ انڈین نیٹ ورک تک بھی ہم آسانی سے پہنچ سکتے ہیں۔“

میں بُری طرح چونکا۔ فائزہ کے چہرے پر آگاہی کی چمک تھی۔ ”یہ تو ماسٹر اسٹروک کھیلا ہے تم نے جانِ من۔ ذرا

جلدی سے اپنی پیاری زبان کو مزید حرکت دو۔"
وہ شرما گئی۔ آج جانے کتنے دنوں بعد میں رومینٹک ہوا تھا۔
وہ سرخ چہرے کے ساتھ بولی۔ "اگر آصف جلال والا مفروضہ درست ہے تو تم بیرسٹر شعیب خان کو مس کر گئے ہو۔ جب اس کی سزا بڑھانے والا جج، اس کا دفاع نہ کر پانے والا وکیل معتوب ٹھہر سکتے ہیں تو اس کی سزا کو کم ثابت کرنے والا وکیل کیسے بری الذمہ ہو سکتا ہے۔ اس کا اگلا ٹارگٹ بیرسٹر شعیب خان کی فیملی ہو سکتی ہے۔"
میں نے اس پر نظریں جمائیں۔ "آج یہ مقولہ درست ثابت ہوا ہے کہ ساری خوب صورت لڑکیاں بے وقوف نہیں ہوتیں۔" اس کا چہرہ مزید سرخ ہو گیا۔ اس نے پیپر ویٹ اٹھایا۔ "میں ماربیٹھوں گی تمہیں۔"
میں نے اس کے پیار بھرے غصے کی پروا نہ کرتے ہوئے اٹھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔ وہ چند لمحے کسمساتی رہی پھر خود سپردگی کے انداز میں میرے سینے میں سما گئی۔
صائم والے واقعے کے بعد آج دوبارہ سے مجھے زندگی خوب صورت لگنے لگی تھی۔
جذباتی لمحے گزر گئے۔ اپنے چہرے پر اتری قوسِ قزح چھپانے کے لیے وہ کچن میں کافی بنانے کے بہانے سے گھس گئی مگر مجھے آگے بڑھنے کا واضح ترین راستہ دکھا گئی تھی۔
میں نے اس کامیابی کی خبر فوراً اے ایس پی کو دی۔ اس نے مجھے یقین دلایا کہ تھوڑی ہی دیر میں شعیب خان کی ساری فیملی نگرانی کے ایک "ببل" میں آجائے گی۔
میں شعیب خان کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھا مگر اس کے ایک نوجوان بیٹے کو میں نے اکثر اس کے چیمبر میں دیکھا تھا۔ وہ، باپ سے حیرت انگیز مشابہت رکھتا تھا۔
ملنے والی کامیابی نے اے ایس پی کو بھی پُرجوش کر دیا تھا۔ شعیب خان کے نوجوان بیٹے کے حوالے سے میں نے اسے خاص توجہ کے لیے کہا۔
اے ایس پی نے کہا کہ وہ رات کا کھانا، میرے اور فائزہ کے ساتھ کھائے گا۔ فائزہ نے اس حوالے سے خاصا اہتمام بھی کر لیا تھا مگر ہم انتظار ہی کرتے رہ گئے۔ رات گیارہ بجے اے ایس پی کا میسج آگیا تھا کہ بے پناہ مصروفیت کی وجہ سے وہ کھانے کے لیے نہیں آسکتا۔ خاص طور پر فائزہ سے اس نے معذرت کی تھی۔
اگلا دن خاصی کامیابیاں لایا تھا۔ مفروضہ، حقیقت کا روپ دھار رہے تھے۔ اے ایس پی نے بتایا کہ ڈاکٹر رام پرکاش گزشتہ تین ماہ سے منظر سے غائب ہے۔ پچھلے دنوں اس کے ایک اسسٹنٹ کا بیان میڈیا پر آیا تھا کہ کورونا وبا کے سبب ڈاکٹر رام پرکاش مکمل طور سے سماجی دوری اختیار کیے ہوئے ہیں۔ ملنے، ملانے اور تقریبات کا سلسلہ فی الحال غیر معینہ مدت کے لیے موقوف تھا۔
اے ایس پی کو اب وفاقی ایجنسی کے وسائل دستیاب تھے۔ ایک دور کی ٹیم آصف جلال کے بھی تعاقب میں تھی۔ پتا چلا تھا کہ جیل سے رہائی کے بعد وہ آئس کا نشہ کرنے لگا تھا۔ اس وجہ سے اس نے حوالات کی ہوا بھی کھائی تھی۔ اس کے دیگر فیملی ممبران اس کے لیے بے حد پریشان تھے۔ تین ماہ پہلے اس نے اپنا ذاتی مکان اور کچھ وراثتی دکانیں بیچ دی تھیں۔ اس کے بعد سے وہ بھی منظر سے غائب تھا۔ سننے میں آیا تھا کہ وہ سری لنکا چلا گیا ہے۔
فون پر ہی اے ایس پی نے بتایا کہ گلزاری ملک کے فارم ہاؤس پر زبردست قسم کے ریڈ کا پلان تقریباً فائنل ہو چکا تھا۔ بیرسٹر شعیب خان والا کلیو ملنے کے بعد فی الحال ریڈ کے اس پلان کو موخر کر دیا گیا۔ ریڈ سے انڈین نیٹ ورک چوکنا ہو سکتا تھا۔
فائزہ کے بیرسٹر شعیب خان والے اندیشے کو اے ایس پی نے مزید وسعت دی تھی۔ آصف جلال کے خلاف کارروائی کرنے والے ڈرگ انسپکٹر، ڈرگ کورٹ کے جج اور اس کیس سے وابستہ وکلا اور ان کی فیملی کے گرد نگراں ببل بنایا جا رہا تھا۔
میں رات کو سونے کی تیاری کر رہا تھا جب اے ایس پی کا فون آ گیا۔ "نیچے آجاؤ، تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ اپنا بیریٹا بھی لے لینا۔" اس کے لہجے سے کسی مہم جوئی کی خوشبو آرہی تھی۔
میں نے کہا۔ "دو منٹ کے لیے اوپر ہی آجاؤ۔ گزشتہ رات فائزہ نے تمہارے لیے اچھا بھلا اہتمام کیا تھا۔ روبرو معذرت ہی کر لو۔"
"بھابی سے میں تفصیلی معذرت کر لوں گا فی الحال تم آجاؤ۔"
میں نے فائزہ کو آگاہ کیا تو وہ بھی ساتھ آنے کی ضد کرنے لگی۔ اسے بمشکل سمجھا بجھا کر میں نیچے آیا تو اے ایس پی اپنی سرکاری جیپ کے بجائے ایک پرانی سی مہران میں تھا۔ گاڑی کی عقبی سیٹ پر ایک سفری بیگ بھی پڑا ہوا تھا۔ اس کے برابر بیٹھتے ہوئے میری نظر بیگ پر پڑی تو میں نے

کہا۔ ”کسی سفر پر نکلنے کا ارادہ ہے کیا؟“
”زندگی ایک سفر ہی تو ہے۔“
میں نے اس کے چہرے پر نظر ڈالی۔ ”آج پتا چلا ہے کہ تم اے ایس پی کے ساتھ ساتھ فلسفی بھی ہو۔“
وہ ہنسا پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ ”معاملات خاصے پُراسرار جا رہے ہیں۔“
میں نے کہا۔ ”پُراسرار تو تم بھی کم نہیں ہو، یاد ہے میرے چند جذباتی الفاظ کو لے کر تم نے مجھے قانون کے دائرے میں رہنے کے لیے ایک چھوٹا سا لیکچر پلا دیا تھا اور خود میں نے تمہیں لوگوں کی دیواریں پھلانگتے ہوئے پکڑ لیا تھا۔“
وہ ایک دفعہ پھر ہنسا۔ ”اس فقرے میں تصحیح کریں جناب، دیوار بے شک میں نے پھلانگی تھی مگر پکڑا میں نے جناب کو تھا۔“
اس طرح کی ہلکی پھلکی گفتگو نے ہمارے درمیان بے تکلفی کو خاصا بڑھا دیا تھا۔ گاڑی مین ہائی وے پر چڑھی تو میں چونکا۔
”لگتا ہے دوبارہ گرین ٹاؤن کی طرف کوئی دیوار پھلانگنے کا ارادہ کر لیا ہے تم نے۔“
”ہاں۔“ اس نے اعتراف کیا۔ ”یہی تو بتانے جا رہا تھا کہ معاملات خاصے پُراسرار جا رہے ہیں۔ گلزاری ملک بھی گزشتہ کئی ہفتوں سے غائب ہے۔ اس کا موبائل بھی مکمل خاموش جا رہا ہے۔ اس کا ایک خاص کارندہ جو اس کی غیر موجودگی میں سارے معاملات چلا رہا ہے، وہ بھی جیسے فارم ہاؤس میں مقید ہو کر رہ گیا ہے۔ باہر نکلنے کا نام ہی نہیں لے رہا۔ انڈیا میں وہ ملعون ڈاکٹر رام پرکاش بھی دو، تین مہینوں سے ہی منظر سے غائب ہے۔ آصف جلال بھی اتنے ہی عرصے سے اوجھل ہے۔ صائم اور سرمد میں جو تبدیلی آئی تھی وہ بھی اتنے ہی عرصے میں آئی تھی۔ پزل کے ان ٹکڑوں کو درست جگہ پر بٹھائیں تو ایک بڑی واضح سی تصویر بنتی ہے۔“
میں نے کہا۔ ”تو پھر تصویر بنالی ہے تم نے؟“
”یہی سمجھ لو، مجھے اب تمہارے اور فائزہ بھابی کے علاوہ بھی کچھ بہترین دماغ میسر ہیں۔“
میں نے جلدی سے اس کی بات کاٹی۔ ”یار! یہ فائزہ کے سامنے کہیں اُسے بہترین دماغ نہ قرار دے بیٹھنا، نہیں تو بڑا مسئلہ ہو جائے گا۔“
”کیوں...... کیسا مسئلہ؟“ اس نے مجھے حیرت سے دیکھا۔
”فارغ اوقات میں جو وہ کچن میں گھسی رہتی ہے۔ مزے مزے کے کھانے بناتی ہے۔ بہترین دماغ بھلا یہ سب کہاں کرتے ہیں، مجھے بھوکا مرواؤ گے یار تم۔“
وہ کھل کر ہنسا۔ ”او کے، میں خیال رکھوں گا۔ مستقبل قریب میں، میں بھی ان کھانوں سے محروم نہیں ہونا چاہتا۔“
اس دفعہ ہماری مشترکہ ہنسی کی آواز خاصی بلند تھی۔
اے ایس پی دوبارہ اصل ٹریک کی طرف آیا۔
”آصف جلال کے انڈیا میں مبینہ رابطے تھے۔ یہاں سے وہ سری لنکا نکل گیا۔ وہاں سے انڈیا جانا اس کے لیے مشکل نہیں۔ اسی طرح ”آئس“ کا گڑھ بھی انڈیا ہی ہے۔ گلزاری ملک بھی دیگر منشیات ڈیلرز کی طرح اس انتہائی منافع بخش آئٹم کی طرف راغب تھا۔ قصور بارڈر اور ہارون آباد بارڈر کی طرف گلزاری ملک کی خاصی آمد و رفت تھی۔ یہ بات عین ممکن ہے کہ اس کا بارڈر پار رابطہ ہو۔ دوسرا رخ دیکھیں تو انڈین ایجنسیاں جرائم پیشہ افراد کو اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کرنے کا وسیع تجربہ رکھتی ہیں اور ایسے افراد کو مہارت سے استعمال کرتی ہیں۔
خوب صورت لڑکیوں کا استعمال بھی ان کا آزمودہ ہتھکنڈا ہے۔ ہماری ایجنسیوں کے پاس ایک خاص انڈین گروپ کا ڈیٹا ہے۔ جسے انہوں نے ”شیلا گروپ“ کا نام دیا ہے۔ اس گروپ کی انچارج ایک لڑکی ہے۔ جس کے ویسے تو کئی نام ہیں مگر اسے شیلا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ شیلا، یہاں اور افغانستان میں اپنے گروپ کی لڑکیوں کے ساتھ مردوں کو ٹریپ کر کے اور انہیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتی رہی ہے۔ ایجنسیاں اُس کے پیچھے ہیں۔ ابھی تک وہ ہاتھ نہیں آئی۔
ہم نے جو تصویر بنائی ہے۔ اس کے مطابق ڈاکٹر رام پرکاش کو اپنے مکروہ تجربے کے لیے یقیناً اپنی حکومت کی بھرپور حمایت اور اعانت حاصل ہوگی۔ ڈاکٹر پرکاش کو یقیناً شیلا یا اس جیسی صلاحیت کے حامل کسی اور گروپ کے ساتھ پاکستان میں لانچ کیا گیا ہے۔
مقامی سہولت کار کے طور پر گلزاری ملک اور آصف جلال جیسے لوگ انہیں میسر ہیں۔ یہاں آصف جلال کا مبینہ کردار سامنے آ رہا ہے۔ سینے میں انتقام کی بھیانک آگ لیے اس نے تجربے کے لیے ایسے افراد کا انتخاب کیا جو اس کے خیال میں اس کی تباہی و بربادی کے ذمے دار تھے۔ میں نے بار بار مبینہ کا لفظ اس لیے استعمال کیا ہے کہ حقیقت

کے قریب تر ہونے کے باوجود یہ ابھی تک مفروضہ ہی ہے۔“

میں نے ستائشی انداز میں کہا۔ ”تصویر تو مکمل کر دی ہے تم نے۔ اب ارادہ کیا ہے؟“

”دیوار پھلانگنے کا۔“ اس نے شریر انداز میں کہا۔

”پہلا تجربہ بھول گئے ہو؟“ میں نے بھی اسی کا انداز اپنایا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”پہلے میں اکیلا تھا۔ آج پوری ٹیم ہے جو جدید آلات سے لیس ہے۔ پھر تم بھی میرے ساتھ ہو۔ ممکن ہے کہیں ٹکریں مارنے کی ضرورت پڑ جائے۔“

ایک دفعہ پھر ہم مشترکہ طور پر ہنسے۔

اے ایس پی نے مزید کہا۔ ”گلزاری ملک کا خاص کارندہ...... فارم ہاؤس سے باہر نکل ہی نہیں رہا۔ نہیں تو اسے باہر ہی سے اُچک لیتے ہم، اسی کی خبر لینے کے لیے فارم ہاؤس میں گھس گئے۔ آگے بڑھنے کا کوئی راستہ نہیں مل رہا اس لیے یہ رسک لے رہے ہیں۔ اس سے انڈین نیٹ ورک کے چوکنا ہونے کا خطرہ ہے۔“

میں نے کہا۔ ”تم بھول رہے ہو، تم ایک دفعہ پہلے بھی دراندازی کر چکے ہو۔ انڈینز ممکن ہے، چوکنا ہو چکے ہوں اس لیے بھرپور ریڈ ہی بہتر آپشن تھا۔“

وہ بولا۔ ”تمہاری بات میں وزن ہے مگر یہ بھی تو ممکن ہے۔ انہوں نے مجھے کوئی چور، اچکا ہی سمجھا ہو۔ ان کے اس خیال کو اس بات سے بھی مزید تقویت ملی ہو گی کہ اس کے بعد کسی ادارے کی طرف سے کوئی ردِعمل نہیں آیا۔ انہوں نے اپنی ”کالی بھیڑوں“ سے بھی اندرونِ خانہ کی خبریں لی ہوں گی۔ ہر طرف سے انہیں 'سب اچھا ہے' کی رپورٹ ملی ہوگی۔“

”تمہارا یہ قیاس ممکن ہے، درست ہی ہو۔“

اے ایس پی نے مزید کہا۔ ”آج کی ہماری کارروائی انتہائی خفیہ ہے۔ عین ممکن ہے ہماری کارروائی کی کسی کو کانوں کان خبر ہی نہ ہو اور ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں۔“

”آمین!“ میں نے صدقِ دل سے کہا۔ یہ سارا معاملہ اب میری ذات سے نکل کر ملک و قوم اور قومی سلامتی سے جڑتا نظر آ رہا تھا اور قومی سلامتی کے لیے میرے جذبات بھی وہی تھے جو ہر محبِ وطن پاکستانی کے ہو سکتے تھے۔

گرین ٹاؤن تک اے ایس پی نے مجھے بہت اچھے طریقے سے بریف کر دیا تھا۔ میں آنے والے سنسنی خیز لمحوں کے لیے بے حد پُرجوش تھا۔ اے ایس پی نے بتایا کہ گلزاری ملک کے فارم ہاؤس کے ہم دیوار ایک دوسرے فارم ہاؤس میں اس کی ”نئی ٹیم“ موجود تھی۔ اس فارم ہاؤس کے مکین کہیں گئے ہوئے تھے۔ ٹیم فارم ہاؤس میں موجود تھی کہ اچانک مکینوں کی واپسی ہو گئی۔ جس کے سبب انہیں ”مہمان“ بنانا پڑا تھا۔ فارم ہاؤس میں موجود گارڈ پہلے ہی مہمان بنایا جا چکا تھا۔ مکینوں میں ایک باپ اور اس کی دو جوان بیٹیاں تھیں۔

ہم ابھی دور تھے کہ اے ایس پی کے آپریٹس پر اس کی ٹیم ممبر کی کال آ گئی۔ ”سر! ابھی ابھی کوئی فارم ہاؤس کی پچھلی دیوار پھلانگ کر بھاگا ہے۔ غالباً کوئی وارداتیا تھا جو فارم ہاؤس کو خالی پا کر واردات کی نیت سے اندر گھسا ہوا تھا۔“

”تم لوگوں نے پہلے فارم ہاؤس کو کلیئر نہیں کیا تھا؟“ اے ایس پی کا لہجہ سخت ہوا۔

”سمجھ نہیں آ رہی سر، نہ جانے وہ کہاں چھپا تھا۔ ہم نے ایک ایک کونا کلیئر کیا تھا۔“

”اس کے پیچھے کوئی گیا ہے؟“

”جی سر، مختیار کو دوڑایا ہے۔“

اے ایس پی کی پیشانی پر سلوٹیں نمایاں تھیں۔

”مہمانوں کی کیا پوزیشن ہے؟“

”میرے سامنے بیٹھے ہیں اور ناراض نظروں سے گھور رہے ہیں۔“

”اوکے، میں بھی پہنچ رہا ہوں۔“ اے ایس پی نے رابطہ منقطع کر دیا۔

میں نے کہا۔ ”یہ دیواریں پھلانگنے والا اب اور کون آ گیا ہے؟“

”بظاہر تو کوئی چور اُچکا ہی تھا۔ ممکن ہے ہماری کارروائی کے بعد اندر گھسا ہو اور مکینوں کی موجودگی کا شبہ ہونے پر بھاگ نکلا ہو۔ شاید اسے گارڈ کی وہاں موجودگی کا پتا نہیں تھا۔“

”یہی ہوا ہوگا، ورنہ تمہارے آدمیوں نے پہلے سب جگہ کو دیکھا تھا۔“

اے ایس پی سر ہلا کر رہ گیا۔

مذکورہ فارم ہاؤس کا دروازہ ہمارے لیے خاموشی سے کھل گیا۔ اے ایس پی نے عقبی نشست پر رکھا بیگ باہر

نکال کر اسے کھولا اور ایک سیاہ لباس اور نقاب میری طرف بڑھایا۔ ”یہ پہن لو۔“

گیٹ سے متصل ایک چھوٹا سا کمرا تھا جو یقیناً گارڈ کے لیے مختص تھا۔ میں نے اس کمرے میں... جا کر لباس تبدیل کر لیا۔ نقاب ماسک ٹائپ کا تھا۔ اسے بہ وقتِ ضرورت منہ پر چڑھایا جا سکتا تھا۔ میں باہر نکلا تو اے ایس پی پہلے ہی لباس تبدیل کر چکا تھا۔

ایک نقاب پوش کی رہنمائی میں ہم ایک وسیع و عریض ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ یہاں صوفوں کے درمیان ایک بڑا سا الیکٹرک ہیٹر جل رہا تھا۔ ایک بڑے صوفے پر دو لڑکیاں آڑھی ترچھی بیٹھی تھیں۔ ان میں سے ایک قدرے سانولی تھی۔ جس کے گھنے بالوں نے بے ترتیب ہو کر اسے اور بھی پُرکشش بنا دیا تھا۔ دوسری صاف رنگت کی اور تیس سال سے زیادہ کی لگتی تھی۔ اس کے بال شہد رنگ کے تھے۔ غالباً ڈائی کیے تھے۔ ان دونوں کے ہاتھ اور پاؤں مخصوص چوڑی پٹی والی ٹیپ سے جکڑے ہوئے تھے۔ ٹیپ کا ایک ایک ٹکڑا ان کے ہونٹوں پر بھی چپکا ہوا تھا۔ دوسرے صوفے پر ایک پچاس سال سے اوپر کا شخص ان لڑکیوں جیسی حالت میں پڑا ہوا تھا۔

اس شخص کا جسم بھاری تھا۔ بھوؤں اور سر کے سیاہ رنگے بال کانٹوں کے مانند نظر آ رہے تھے۔ چشمے کے پیچھے اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں تھیں جبکہ لڑکیوں کی آنکھوں میں واضح ناراضگی تھی۔

ایک سیاہ پوش ہاتھوں میں چھوٹی نال کی رائفل تھامے ان کے قریب الرٹ کھڑا تھا۔ اندر داخل ہونے سے پہلے ہم دونوں نے چہرے پر نقاب چڑھا لیے تھے۔

صوفوں کے درمیان رک کر اے ایس پی نے نرم آواز میں کہا۔ ”میں معذرت خواہ ہوں۔ آپ کو کچھ دیر یہ تکلیف برداشت کرنا پڑے گی۔ آپ کے ہمسائے میں منشیات فروشوں کا گڑھ ہے۔ ہم ذرا اُن کی خبر لینے جا رہے ہیں۔ امید کرتا ہوں۔ ہمارے چلے جانے کے بعد بھی آپ ہمارے حوالے سے اپنی زبان بند رکھیں گے۔“

باپ کی آنکھوں کا خوف تیزی سے کم ہوا۔ اُس نے اثبات میں زور زور سے سر ہلا کر اپنے تعاون کا یقین دلایا۔ لڑکیوں کی آنکھوں میں بھی اطمینان اتر آیا تھا۔

اس فیملی کو مزید تسلی تشفی دے کر ہم اس ڈرائنگ روم سے باہر نکل آئے۔ باہر آتے ہی میں نے کہا۔ ”عجیب بات ہے۔ لڑکیاں کہیں سے بھی بہنیں نہیں لگتیں اور باپ میں بھی ان کی ذرا مشابہت نہیں ہے۔“

اے ایس پی نے میری ہاں میں ہاں ملائی۔ ”مجھے بھی عجیب سا لگا ہے۔“

اس دوران ہم ایک اور کمرے میں داخل ہوئے۔ یہ بیڈروم تھا۔ ہر چیز قیمتی مگر بکھری ہوئی تھی۔ کہیں بھی ترتیب اور صفائی نظر نہیں آ رہی تھی۔ یقیناً یہ بیڈروم لڑکیوں کا تھا۔ زنانہ ملبوسات اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔

اس کمرے میں بھی ایک سیاہ پوش موجود تھا۔ اس کے منہ پر نقاب نہیں تھا۔ وہ ایک دبلا پتلا اور خوبرو نوجوان تھا۔ وہ کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے پڑی منقش میز پر لیپ ٹاپ کھلا تھا۔ نوجوان کی پتلی پتلی انگلیاں میز پر رکھے ایک جوائے اسٹک ٹائپ کے آلے پر حرکت کر رہی تھیں۔

ہمیں دیکھ کر نوجوان نے اٹھنے کی کوشش کی۔ اے ایس پی نے جلدی سے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر یہ کوشش ناکام بنا دی۔ ”اس کی ضرورت نہیں ہے۔ کیا خبر ہے؟“

نوجوان نے لیپ ٹاپ کی اسکرین پر نظر ڈالی۔ میں بھی قریب چلا گیا۔ لیپ ٹاپ کی اسکرین پر ایک وسیع و عریض عمارت کا لائیو منظر نظر آ رہا تھا۔ میں نے غور کیا تو مجھ پر انکشاف ہوا کہ اسکرین پر نظر آنے والا منظر گلزاری ملک کے فارم ہاؤس کا تھا۔ یقیناً انتہائی بلندی پر کوئی جدید ترین ڈرون موجود تھا جس میں لگے جدید اور نائٹ وژن کیمرے سارے فارم ہاؤس کو واضح طور پر دکھا رہے تھے۔

نوجوان نے جوائے اسٹک جیسے آلے کو حرکت دی۔ ایک کیمرے نے زوم کرنا شروع کر دیا۔ جلد ہی ایک کتا نظر آیا جو اطمینان سے بیٹھا تھا۔ رفتہ رفتہ نوجوان نے چند اور حصے بھی زوم کر کے دکھائے۔

دیوار کے اس پار سے مخصوص کیمیکل سے آلودہ گوشت کے پارچے پھینکے گئے تھے جن پر جھپٹنے والے رکھوالی کے دونوں کتے اپنی سونگھنے کی حس کھو بیٹھے تھے۔ تین گارڈز رائفلیں کندھوں سے لٹکائے گشت کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک مسلسل سگریٹ پھونک رہا تھا۔ گشت پر مامور ایک گارڈ اس طرف بھی آ نکلتا تھا جہاں ہم موجود تھے۔ درمیان میں صرف مشترکہ دیوار تھی جس پر خاردار تار لگی ہوئی تھی۔

فارم ہاؤس میں زیادہ تر شیڈ نما عمارتیں تھیں۔ یہ یقیناً جانوروں، پرندوں کے شیڈ اور گودام وغیرہ تھے۔ دو منزلہ جدید قسم کی رہائشی عمارت عین وسط میں تھی۔ جس کے آگے

لان اور پچھلی طرف باغ تھا۔ باغ کے پودے ابھی زیادہ بڑے نہیں ہوئے تھے۔

فارم ہاؤس کے گیٹ کے پاس اندر کی طرف بھی کرسیوں پر دو گارڈز بیٹھے ہوئے تھے۔ مکمل جائزہ لینے کے بعد اے ایس پی نے ڈرون آپریٹر نوجوان سے کہا۔ ''ہمارے لیے آنکھوں کے فرائض تم انجام دو گے۔ میں ہر پل تم سے رابطے میں رہنا چاہتا ہوں۔''

نوجوان نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنے قدموں میں پڑے ایک بیگ پر جھک گیا۔ تھوڑی دیر میں اس کے ہاتھوں میں سیاہ رنگ کی بلیوٹوتھ ٹائپ کی ہینڈ فری کا ایک جوڑا نظر آرہا تھا۔ اس نے ایک پیس اے ایس پی کی طرف بڑھایا۔ ''اسے کان میں لگا لیں۔'' ساتھ ہی اس نے کوئی بٹن دبایا۔ ہینڈ فری پر بلیو رنگ کا ننھا سا بلب اسپارک کر کے بجھ گیا۔

اے ایس پی نے بلیوٹوتھ کان میں لگا لی۔ نوجوان نے دوسرا پیس آن کر کے اپنے کان میں لگایا اور دھیمی آواز میں کہا۔ ''آپ مجھے سن رہے ہیں سر؟''

''ہاں واضح طور پر۔'' اے ایس پی نے بھی مدھم آواز میں جواب دیا۔

نوجوان بولا۔ ''ان دونوں سیٹس کی موثر رینج 2 کلو میٹر ہے۔ یہ بھی ڈرون سے ہی منسلک ہیں۔''

''یہ بہت اچھا ہو گیا۔'' اے ایس پی نے نوجوان کے کندھے پر تھپکی دی اور ہم باہر نکل آئے۔

مشترکہ دیوار کے ساتھ ایک دوسرے سے ملا کر دو پورٹیبل جدید قسم کی سیڑھیاں لگی ہوئی تھیں۔ جن کے ساتھ کھڑے دو سیاہ پوش تاریکی کا ہی حصہ نظر آرہے تھے۔ قریب پہنچنے پر انہوں نے ہمیں سلام کیا۔ میرے اب تک اندازے کے مطابق اے ایس پی ہی اس سیاہ پوش ٹیم کا لیڈر تھا۔

ڈرون آپریٹر کی طرف سے گرین سگنل ملتے ہی ہم دونوں آگے پیچھے ایک سیڑھی پر چڑھ گئے۔ ایک سیاہ پوش دوسری سیڑھی پر چڑھا اور ہاتھ میں پکڑے کٹر سے خاردار تار کی نیچے والی لائن کاٹ دی۔

ہم دونوں باری باری پہلے دیوار پر لیٹے اور پھر دوسری طرف لٹک کر نیچے کود گئے۔ کودتے ہی سامنے ایک نیچی چھت والا شیڈ نظر آرہا تھا۔ بے آواز قدموں سے دوڑ کر ہم نے اس شیڈ کی اوٹ لے لی۔

سیڑھی پر موجود سیاہ پوش نے بے حد تیزی کے ساتھ کٹی ہوئی خاردار تار کے دونوں سرے تھام کر فولادی تار سے ایک عارضی جوڑ لگا دیا۔ کٹنے والی تار میں واضح جھول تو تھا مگر اس ابر آلود رات میں اس جھول کو محسوس کرنے والا کوئی نہیں تھا۔

ڈرون آپریٹر نے بتایا کہ ایک گارڈ اس طرف آرہا ہے۔ اب تک جو ٹائمنگ نوٹ کی گئی تھی، اس کے مطابق یہ گارڈ کا معمول کا گشت تھا۔

اے ایس پی نے مجھے آگاہ کیا۔ ہم شیڈ کی جڑ میں زمین پر لیٹ گئے۔ شیڈ کے اندر سے مرغیوں کے کڑکڑانے کی آوازیں آرہی تھیں۔

ہماری نظریں اسی طرف تھیں جہاں سے گارڈ کو آنا تھا۔ جلد ہی گارڈ ہماری نظروں میں آگیا۔ وہ ڈھیلے ڈھالے قدموں سے اپنے معمول کی ڈیوٹی پوری کر رہا تھا۔ چکر لگا کر وہ واپس چلا گیا۔

ہم تیزی سے حرکت میں آئے۔ پہلے ایک سوئمنگ پول کے اندر تھوڑی دیر کے لیے ہم نے اوٹ لی۔ سوئمنگ پول سردیوں کے آف سیزن کے سبب خشک پڑا تھا۔

یہاں ہمیں بے حد احتیاط کی ضرورت تھی۔ ڈرون آپریٹر نے بتایا کہ رکھوالی کا ایک کتا زیادہ دور نہیں ہے۔ کتوں کے سونگھنے کی حس بے شک تھوڑی دیر کے لیے ختم کی جا چکی تھی مگر کتوں کے کان بھی بہت تیز ہوتے ہیں۔ معمولی سے کھٹکے پر وہ اس طرف آسکتے تھے۔

سوئمنگ پول سے نکل کر ہم اس باغ تک پہنچ گئے جو رہائشی عمارت کے عقب میں تھا۔ اس دفعہ امرود کے قدِ آدم پودوں کے عقب میں ہم نے اوٹ لی تھی۔ سامنے ہی رہائشی عمارت کا عقبی برآمدہ نظر آرہا تھا۔ وسیع و عریض برآمدے میں لان چیئرز کا بے ترتیب ڈھیر پڑا ہوا تھا۔ رہائشی عمارت کے دائیں طرف خاصے فاصلے پر فارم ہاؤس کی بیرونی دیوار کے ساتھ مجھے تعمیراتی لکڑی کا ڈھیر نظر آیا۔ جس پر خوب روشنی تھی۔ میں نے مدھم آواز میں کہا۔

''یہ ڈھیر اتنا اونچا تو نہیں ہے کہ اس پر چڑھ کر خاردار تاروں کے اوپر سے کودا جاسکے۔''

اے ایس پی نے بھی مدھم آواز میں جواب دیا۔ ''صحیح کہہ رہے ہو، میرے یہاں سے بھاگ نکلنے کے سبب اس ڈھیر کی بلندی کم کی گئی ہے اور روشنی کا اضافی بندوبست بھی کیا گیا ہے۔''

''یعنی ایمرجنسی میں بھاگنے کا یہ راستہ اب بند ہے۔''

اے ایس پی دھیرے سے ہنسا۔ ''فکرمند ہونے کی

ضرورت نہیں۔ جب گدھے کے سائز کا کُتا، تمہارے پیچھے بھاگے گا تو دیوار پھلانگنے کے لیے تمہیں لکڑیوں کے ڈھیر کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی۔''

''کیوں، کُتا کیا مجھے کندھوں پر بٹھا کر دیوار پار کروائے گا؟''

میرے جلے بھنے انداز پر اس نے بہ مشکل ہنسی روکی اور مصنوعی سنجیدگی سے بولا۔ ''عین ممکن ہے آخر تم مہمان ہو عزت مآب گلزاری ملک صاحب کے۔''

نوک جھوک کا سلسلہ ابھی جاری رہتا۔ ڈرون آپریٹر نے بتایا کہ ایک گارڈ اس طرف آرہا ہے۔

میں نے کہا۔ ''میرے خیال سے برآمدہ زیادہ محفوظ رہے گا۔''

اے ایس پی نے ڈرون آپریٹر سے پوچھا۔ ''گارڈ کتنی دور ہے؟''

دوسری طرف سے جو فاصلہ بتایا گیا، وہ میں سن نہیں سکا تھا۔

اے ایس پی، مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''نکلو، برآمدے کی طرف۔''

اگلے ہی پل ہم بے آواز انداز میں دوڑے اور لمحوں میں عقبی برآمدے میں پہنچ گئے۔ یہاں اوٹ لینے کو بہت کچھ میسر تھا۔

تھوڑی دیر میں گارڈ بھی ہماری نظروں میں آگیا۔ یہ دوسرا گارڈ تھا جو چین اسموکر تھا۔ اس وقت بھی سگریٹ اس کے ہونٹوں میں دبا ہوا تھا۔

راؤنڈ پورا کر کے وہ گارڈ بھی کسی اور طرف نکل گیا۔

اے ایس پی نے برآمدے میں کھلنے والے دروازے کے ساتھ کان لگا دیا۔ تھوڑی دیر وہ سن گن لینے کی کوشش کرتا رہا پھر دھیمی آواز میں بولا۔ ''میں دروازہ کھولنے جارہا ہوں، چوکس رہنا۔''

پہلی دفعہ میں نے بیریٹا ہاتھ میں تھام لیا۔

اے ایس پی نے اپنے سیاہ ٹراؤزر کی جیب میں سے ایک ماچس کی ڈبیا کے سائز کا جدید ترین ''لاک کٹر'' نکالا۔ یہ ایک ننھے سے پسٹل کی شکل کا تھا۔ فرق اتنا تھا کہ اس کی نال کی جگہ ایک باریک برما سا لگا ہوا تھا۔

اے ایس پی نے وہ برما چابی والے سوراخ میں داخل کر کے ٹریگر مسلسل دبائے رکھا۔ گڑگڑاہٹ کی واضح آواز ابھری۔ سناٹے میں یہ آواز توقع سے زیادہ بلند تھی۔

ڈرون آپریٹر کی جانب سے کچھ بتایا گیا۔ اے ایس

انقلاب

میں نے ایک فوڈ چین کے مینیو میں دیکھا کہ میرے لیے چکن نگٹس موزوں تھے۔ وہ چھ، نو یا بارہ کی تعداد میں خریدے جاسکتے تھے۔

میں نے کاؤنٹر پر نوعمر لڑکے سے کہا۔ ''نصف درجن نگٹس دے دو۔''

اس نے معذرت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''سر! ہم صرف چھ، نو اور بارہ دیتے ہیں... نصف درجن نہیں مل سکتے۔''

''ٹھیک ہے... پھر چھ دے دو۔'' میں نے دل ہی دل میں اس انقلاب کا ماتم کرتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

مسز ڈکا اپنا کریڈٹ کارڈ بار بار کمپیوٹر ڈرائیو میں ڈال اور نکال رہی تھیں اور سخت الجھن کا شکار تھیں۔ اتفاقاً میں پہنچ گئی۔ وہ اسی افتاد میں گرفتار رہیں تو پتا چلا کہ وہ انٹرنیٹ پر آن لائن خریداری کررہی تھیں۔ اسکرین پر کریڈٹ کارڈ نمبر مانگا جاتا اور وہ اپنا کریڈٹ کارڈ سلاٹ میں اسی طرح ڈال دیتیں جیسے اے ٹی ایم مشین میں ڈالا کرتی تھیں۔ ان کا ''انٹرنیٹ شاپنگ'' کا شوق پورا نہیں ہورہا تھا۔

☆☆☆

خاتون کو گاڑی کے قریب افسردہ اور پریشان دیکھ کر میں رک گیا اور مدد کی پیشکش کی۔

انہوں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ ''گاڑی کا ریموٹ کئی دنوں سے گڑبڑ کررہا تھا۔ اب اچانک جواب دے گیا ہے۔ گاڑی کے دروازے نہیں کھل رہے۔ مکینک بہت دور ہے۔ گاڑی چھوڑ کر بھی نہیں جاسکتی۔''

میں نے ریموٹ سمیت کی چین لی اور چابی سے دروازہ کھولا تو خاتون کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

''اب کہیں بھی رک کر ریموٹ کا سیل بدلوالیں۔''

لاہور سے افشین کا تعاون

پی نے تیزی سے دروازے کا ہینڈل گھمایا۔ ہینڈل تھوڑا سا نیچے ہو کر رک گیا۔ اے ایس پی کی سراسیمہ آواز ابھری۔

"کتا اس طرف آرہا ہے۔"

میں نے فوراً کھڑے ہو کر برآمدے کے ایک ستون کی آڑ لی۔ بیریٹا بالکل تیار تھا۔ اے ایس پی نے قدرے زور سے ہینڈل گھمایا۔ اس دفعہ دروازہ کھل گیا۔ اس کی تیز سرگوشی ابھری۔

"آجاؤ۔"

اگلے ہی پل ہم دروازے کے اندر تھے۔ تاریکی میں دروازہ بند کر کے ہم دروازے کے ساتھ لگ گئے تھے۔ یہی وقت تھا جب کتا وہاں پہنچا تھا۔ وہ دھیرے سے بھونکا مگر اس کی آواز میں جارحانہ پن نہیں تھا۔ اگر اس کی سونگھنے کی حس ٹھیک کام کر رہی ہوتی تو اجنبی بو پا کر اس نے آسمان سر پر اٹھالینا تھا اور ہمارا یہاں پوشیدہ رہنا ناممکن ہو جاتا۔

ہم بھی سننے کی حس کے سہارے باہر کتے کی موجودگی کا اندازہ لگا رہے تھے۔ کسی طرف سے بلیوں کے لڑنے کی آواز آئی۔ بھاری "دھپ دھپ" کی آواز سنائی دی۔ کتا بھونکتا ہوا اس طرف لپک گیا۔

ہماری آنکھیں تاریکی میں دیکھنے کی تھوڑی دیر میں عادی ہو گئیں۔ یہ کوئی گہری تاریکی نہیں تھی۔ دور سیڑھی پر روشنی کا انعکاس محسوس ہو رہا تھا۔ ہم ایک وسیع لاؤنج میں تھے۔ جو خوب آراستہ تھا۔

اے ایس پی کے پاس پنسل ٹارچ بھی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم نے نیچے کا سارا جائزہ لے لیا۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ سارے کمرے خالی پڑے تھے۔

اس دوران ڈرون آپریٹر نے اے ایس پی کو بتایا کہ فارم ہاؤس سے نکل کر بھاگنے والے کو ایک خالی پلاٹ میں گھیر لیا گیا تھا۔ اے ایس پی نے مجھے بھی اس بارے میں آگاہ کر دیا۔

ہم محتاط انداز میں لاؤنج کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر کی منزل پر آ گئے۔ ایک دروازے کے عقب سے خراٹوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اسے چھوڑ کر ہم نے باقی کمروں کا جائزہ لیا۔ نیچے کی طرح وہ بھی خالی پڑے تھے۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ یہی خراٹوں والا ہی گلزاری ملک کا خاص کارندہ یا نائب شمروز خان تھا۔

اے ایس پی نے دھیرے سے دروازے پر زور ڈالا۔ دروازہ بے آواز طریقے سے کھلتا چلا گیا۔ محفوظ ماحول اور کڑے پہرے میں بے خبر سوئے ہوئے شمروز خان نے دروازہ بند کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ ورنہ ہمارے لیے مشکل ہو جاتی۔ کٹر سے لاک کاٹنے کی آواز سے اندیشہ تھا کہ شمروز خان جاگ جاتا۔

دبیز قالین والی اس شاندار خواب گاہ میں خوابناک سی نیلگوں روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ سامنے ہی بیڈ پر ایک کیم شحیم پینتیس سالہ شخص ایرانی کمبل لپیٹے بے خبر سو رہا تھا۔ پورا کمرا اس کے خراٹوں سے گونج رہا تھا۔ اے ایس پی نے ٹراؤزر کی دوسری جیب سے چھوٹے سائز کی باڈی اسپرے جیسی نقرئی کلر کی بوتل نکالی اور قریب جا کر اس شخص جو شمروز خان ہی تھا، کی ناک کے قریب اسپرے کر دیا۔

نیند کی حالت میں ہی شمروز خان کو چھینک سی آئی۔ وہ بری طرح سے کسمسایا۔ میں تیار تھا۔ کمبل کے اوپر سے ہی میں نے اسے جکڑ لیا۔ اے ایس پی نے مزید اسپرے کیا۔ شمروز خان کے حلق سے ڈری ڈری سی خاصی بلند آواز برآمد ہوئی پھر اس کا تنا ہوا جسم ڈھیلا پڑنے لگا۔

تھوڑی دیر میں اس کی سانسوں کی رفتار قدرے مدھم پڑ گئی اور خراٹوں کا آہنگ بھی تبدیل ہو گیا۔ اس کی نیند بے ہوشی میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اس کے جسم کا تناؤ ختم ہوتے ہی میں نے اسے چھوڑ دیا۔

تھوڑی ہی دیر میں ہم نے مل کر اس کے ہاتھ پاؤں، چوڑی ٹیپ سے جکڑ دیے۔ ایک ٹکڑا اس کے ہونٹوں پر بھی چپکا دیا۔

شمروز خان خاصا کیم شحیم شخص تھا۔ ظاہری وضع قطع سے بھی وہ خاصا دبنگ شخص لگتا تھا مگر اس وقت بے ضرر کیچوے کے مانند ہمارے سامنے بے بس پڑا تھا۔

میں نے دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ کھڑکیوں وغیرہ کے شیشے بھی دیکھ لیے۔ وہ بند پڑے تھے۔ اس کے علاوہ پوری رہائشی عمارت خالی تھی۔ شمروز خان تھوڑی بہت چیخ و پکار کرتا بھی تو اس کی سننے والا کوئی نہیں تھا۔

اس دفعہ اے ایس پی نے اپنی جیب سے ڈراپر جیسی ایک چھوٹی سی شیشی نکالی۔ بے ہوش پڑے شمروز خان کا سر پیچھے کی طرف جھکاتے ہوئے ڈراپر سے چند قطرے اس کی ناک میں ٹپکائے۔ دو منٹ کے انتظار کے بعد اس نے شمروز خان کے رخساروں پر تھپڑ مارنے شروع کر دیے۔

رفتہ رفتہ شمروز خان حواس میں واپس آنے لگا۔ ہوش میں آنے پر اپنے سامنے دو نقاب پوش دیکھ کر اس کی آنکھوں میں زردی اتر آئی۔ اس نے جسم کو حرکت دینے کی

کوشش کی تو محض کسمسا کر رہ گیا۔ اے ایس پی نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ ''اس کی زبان کھلواؤ۔''

ایک موت کا سوداگر میرے سامنے تھا۔ میرا دل اس کے لیے رحم سے قطعی عاری تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ مجھے اپنے کام کی کوئی چیز نظر نہیں آئی۔ ایک خیال آنے پر میں باتھ روم سے بلیچ کی بوتل اٹھا لایا۔ اے ایس پی ڈرون آپریٹر سے مدھم آواز میں گفتگو کر رہا تھا۔ اس نے دلچسپی سے میری طرف دیکھا۔

میں نے بلیچ کی نصف سے زائد بوتل شمروز خان کے جسم پر انڈیل دی۔ وہ اپنی جگہ کسمسایا۔ میری حرکت کی اسے سمجھ نہیں آئی تھی۔ کمرا بلیچ کی ناگوار بدبو سے بھر گیا تھا۔

میں نے شمروز خان کے سینے پر پاؤں رکھا۔ ''گلزاری ملک کہاں ہے؟''

اس کا کرخت چہرہ بے تاثر رہا۔ میں نے کہا۔ ''بلیچ نے تمہارے جسم کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچایا لیکن یہ اگر آنکھوں میں چلا جائے تو ہمیشہ کے لیے اندھا ہو جانا یقینی ہے۔'' بوتل میں نے اس کی آنکھوں کے آگے لہرائی۔ اس دفعہ اس کے چہرے پر خوف کا تاثر نمایاں ہوا۔

میں نے رسک لینے کا فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔ ''پورا فارم ہاؤس ہماری مٹھی میں ہے۔ تمہارے منہ سے ٹیپ ہٹا رہا ہوں۔ شور مچانے کا شوق ہے تو پورا کرلو۔'' یہ کہہ کر میں نے ایک جھٹکے سے اس کے منہ سے ٹیپ ہٹا دی۔

میں، اس کے ردِعمل کے لیے تیار تھا۔ وہ شور مچانے کی کوشش کرتا تو میرے ہاتھ اس کی گردن سے زیادہ دور نہیں تھے مگر اس کی ضرورت نہیں پڑی۔ وہ، میرے جھانسے میں آ گیا۔

''کک...... کون ہو تم لوگ؟''

میں نے پاؤں کا دباؤ اس کے سینے پر بڑھایا۔ ''سوال صرف میں کروں گا...... کہاں ہے گلزاری؟''

''مم...... مجھے معلوم نہیں۔ ملک صاحب اپنی نقل و حرکت کے بارے میں کسی کو نہیں بتاتے۔''

میں نے ٹیپ کا ٹکڑا دوبارہ اس کے منہ پر چپکا دیا۔ میرا ہاتھ حرکت میں آیا اور اس کے چہرے کا نصف حصہ بلیچ سے بھر گیا۔ وہ ذبح ہوئے جانور کی طرح تڑپنے لگا۔ میں ایک طرف ہٹ گیا۔

اے ایس پی نے مجھے اَپ ڈیٹ دی۔ ''بھگوڑا، عمارتوں سے گھرے ایک پلاٹ میں محصور ہو گیا ہے۔ اس کے پاس اسلحہ بھی ہے۔ خاصی فائرنگ بھی کی ہے اس نے۔ فاصلہ زیادہ ہے۔ فائرنگ کی آواز ہم تک نہیں پہنچی۔''

میں نے پوچھا۔ ''اب کیا چل رہا ہے وہاں؟''

''فائرنگ کے سبب پولیس بھی وہاں پہنچ گئی ہے۔ میرے لوگوں نے معاملہ سنبھال لیا ہے۔ جلد ہی وہ ہماری گرفت میں ہوگا۔''

میں دوبارہ شمروز خان کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کی بلیچ سے آلودہ آنکھ سرخ تر ہو گئی تھی اور اس پر سوجن بھی تیزی سے غالب آ رہی تھی۔

میں نے بلیچ والی بوتل سیدھی کی تو ایسے محسوس ہوا جیسے شمروز خان کو دل کا دورہ پڑ گیا ہے۔ وہ بُری طرح سے تڑپنے لگا اور اپنا چہرہ کارپٹ کی طرف کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے پاؤں سے زور لگا کر اس کا چہرہ اپنی طرف گھمایا۔ وہ مچلنے لگا۔ اس کے تاثرات نے بتایا کہ وہ منہ کھولنے کے لیے آمادہ ہے۔ میں نے کہا۔ ''زبان کھولنے کا ارادہ ہے یا اندھا ہونے کا؟''

شمروز خان نے بے حد تیزی سے اثبات میں سر ہلایا۔

میں نے اُس کے منہ سے ٹیپ ہٹائی تو وہ گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ اس کی متاثرہ آنکھ مکمل طور سے بند ہو گئی تھی۔ دوسری آنکھ میں دنیا جہان کا خوف سمایا ہوا تھا اور یہی آنکھ جیسے بلیچ کی بوتل سے چپک کر رہ گئی تھی۔

''کہاں ہے گلزاری؟'' میں نے اپنا سوال دہرایا۔

''ملک صاحب ہارون آباد گئے ہوئے ہیں۔'' اس نے زبان کھول دی۔

''وہاں کا کوئی پتا ٹھکانا؟''

''وہاں کا معروف ترین زمیندار ہے خدا بخش ٹوانہ۔ ملک صاحب اسی کے نہر والے ڈیرے پر ہیں۔''

''وہاں کیا کر رہا ہے اتنے دنوں سے؟''

''مم...... میں نہیں جانتا۔ چند دن پہلے تک تو وہ اپنے ڈیفنس والے بنگلے میں تھے۔ انہیں کورونا ہو گیا تھا۔''

یہ نئی اطلاع تھی۔ ہم گلزاری کے پُراسرار طور پر غائب ہو جانے کو کچھ اور سمجھتے رہے تھے۔ وہ تو کورونا کے سبب خود ساختہ قرنطینہ میں تھا۔ ممکن تھا کورونا والا جھوٹ ہو۔ ڈیفنس والی کوٹھی کا حدود اربعہ پوچھ کر میں نے بوتل لہرائی تو وہ اضطراری کیفیت میں چیخ اٹھا۔ یہ چیخ کمرے اور آس پاس تک ہی محدود رہی تھی۔

''بکواس کر رہے ہو، اس کم بخت کو کورونا تھا تو اس کے نمبرز کیوں بند جا رہے تھے۔ اب بکواس کی تو دوسری

آنکھ سے بھی جاؤ گے۔"

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔" وہ گھگھیایا۔"ان کا ایک نمبر تو ہے نہیں۔ پتا نہیں تم کن نمبروں کی بات کررہے ہو۔ وہ، ایک خاص نمبر سے مسلسل میرے ساتھ رابطے میں رہے ہیں۔ بے شک میرا موبائل دیکھ لو۔ ان کا جو بھی ممکنہ علاج تھا، وہ خفیہ طور پر معروف ڈاکٹر صال اعوان کرتے رہے ہیں۔ ان سے بھی تصدیق کرسکتے ہو۔" اندھے ہوجانے کے خوف سے اس کی زبان خوب چل رہی تھی۔

میں نے اے ایس پی کی طرف دیکھا۔ اس نے آنکھوں کی زبان میں کہا کہ ضروری تو نہیں ہمارا ہر مفروضہ ہی درست ہو۔ میں دوبارہ شمروز خان کی طرف متوجہ ہوا۔ "یہ ممکن نہیں کہ تمہیں معلوم نہ ہو کہ وہ ہارون آباد میں کیا کررہا ہے؟" میں نے بوتل اس کے چہرے کی طرف جھکائی۔

وہ چیخا۔"اِسے ہٹاؤ، بتاتا ہوں۔"

"یہ نہیں ہٹے گی، جلدی بتاؤ۔"

"انڈیا سے کچھ دوست آرہے ہیں یا اُن کو واپس جانا ہے۔ مجھے صرف اتنا معلوم ہے۔"

یہ نئی خبر بے حد سنسنی خیز تھی۔ ممکن تھا ڈاکٹر رام پرکاش وغیرہ اب واپسی کے لیے پر تول رہے ہوں۔ ایسا تھا تو ہمارے پاس وقت بے حد کم تھا۔ وہ لوگ نہ جانے روانگی کے کس مرحلے میں تھے۔

میں نے اندھیرے میں تیر چلایا۔"انڈیا سے جو لوگ پہلے آئے تھے، وہی تو واپس نہیں جارہے؟"

"مجھے معلوم نہیں۔ ملک صاحب ہر بندے کو اس کے معاملات تک ہی محدود رکھتے ہیں۔ جو میں نے بتایا ہے۔ وہ بھی میں نے اُس وقت کچھ الفاظ اتفاقاً سن لیے تھے جب وہ ٹوانہ صاحب سے فون پر بات کررہے تھے۔" اس کا لہجہ گواہ تھا۔ وہ جو کہہ رہا تھا، سچ کہہ رہا تھا۔

اے ایس پی نے میرے کان کے قریب سرگوشی کی۔ "اب اس کا منہ بند کردو۔"

میں نے ٹیپ کا ٹکڑا دوبارہ شمروز خان کے منہ پر چپکا دیا۔

اے ایس پی بولا۔"ہمارے پاس ٹائم بالکل نہیں ہے۔ یہ صرف موت کا سوداگر نہیں بلکہ ملک دشمن بھی ہے۔ قانونی ضابطے پورے کرنے میں نہ صرف ٹائم لگے گا۔ بلکہ عین ممکن ہے اثر و رسوخ اور پیسے کے بل بوتے پر یہ بچ بھی جائے۔ اِسے ماردو۔" اس نے اپنا سائیلنسر لگا پسٹل میری طرف بڑھایا۔

یہ مکالمہ شمروز خان نے بھی سنا تھا۔ وہ بُری طرح سے مچلنے اور تڑپنے لگا۔

میں نے آج تک کسی کی جان نہیں لی تھی۔ یہ موقع بھی آگیا تھا۔ میں نے تڑپتے شمروز خان کے سینے پر پسٹل کی نال رکھ کر عین اُس کے دل میں گولی اتار دی۔

وہ چند لمحے تڑپ کر ساکت ہوگیا۔

ہم جس راستے سے گئے تھے، اسی سے واپس آگئے۔ پورٹیبل سیڑھی کے ذریعے ہم دوسری طرف اتر گئے۔ خاردار تار کا جوڑ دوبارہ سے لگا دیا گیا۔

اسی دوران اطلاع آگئی کہ بھگوڑا قابو آگیا تھا۔ اسے ایک خاص اسٹیشن پر منتقل کیا جارہا تھا۔

فارم ہاؤس کے مکینوں کے ہاتھ، پاؤں کھول کر اور ان سے ایک دفعہ پھر معذرت کرکے ہم نے فارم ہاؤس چھوڑ دیا۔

اس دفعہ میں اور اے ایس پی ایک دوسری گاڑی میں تھے۔ جسے ڈرائیور چلا رہا تھا۔ فارم ہاؤس سے نکلنے سے پہلے ہم نے لباس دوبارہ سے تبدیل کرلیے تھے۔

ہمارا رخ اب اس خاص اسٹیشن کی طرف تھا جہاں بھگوڑے کو منتقل کیا جارہا تھا۔ اس سے پوچھ گچھ بھی ضروری تھی۔

سفر کے دوران اے ایس پی مسلسل فون پر مصروف رہا تھا۔ یک طرفہ گفتگو سے مجھے اندازہ ہورہا تھا کہ رینجرز کی بھاری جمعیت ہارون آباد میں خدا بخش ٹوانہ کی رہائش گاہ اور ڈیرے وغیرہ کو گھیرنے والی ہے۔

میرے موبائل پر فائزہ کے کئی میسج آچکے تھے۔ وہ، میری وجہ سے خاصی پریشان تھی۔ میں نے کال کرکے اُسے تسلی دی کہ میں بالکل خیریت سے ہوں۔

تھوڑی دیر میں ہم چھاؤنی کی صاف ستھری سڑکوں پر تیزی سے رواں تھے۔ ہماری منزل ایک دور افتادہ اور الگ تھلگ عمارت تھی۔

ایک سیاہ پوش کی رہنمائی میں ہم عمارت کے ایسے حصے میں داخل ہوئے جہاں آمنے سامنے چار وسیع و عریض لاک اَپ تھے۔ تین لاک اَپ غیر آباد تھے۔ چوتھے میں سوٹ میں ملبوس ایک دراز قد، کلین شیو شخص سلاخیں تھامے کھڑا تھا۔ اس کا سوٹ مسلا ہوا تھا اور لمبے بالوں کی اس پونی سی باندھ رکھی تھی۔

شناسائی کی ایک طاقتور لہر اٹھی اور مجھے بہا کرلے

گئی۔ میرا پورا جسم سنسنا اٹھا تھا۔ میرے سامنے آصف جلال کھڑا تھا۔ جسے ہم اب تک ڈھونڈنے میں ناکام رہے تھے۔

یقیناً اس نے بھی مجھے پہچان لیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں میرے لیے نفرت ہی نفرت تھی۔

میں نے اے ایس پی سے کہا۔ ''یہی وہ لعنتی آصف جلال ہے۔ انڈینز کا سہولت کار......'' ساتھ ہی میرے دماغ میں دھماکا سا ہوا اور فارم ہاؤس کے بند تھے ہوئے مکینوں کی صورتیں سامنے آگئیں۔ جو کہیں سے بھی ایک فیملی کے نہیں لگتے تھے۔ میں چلایا۔

''ان تینوں باپ، بیٹیوں کی خبر لو...... وہ لوگ وہ نہیں ہیں جو ہم سمجھتے رہے ہیں۔'' اے ایس پی کا دماغ بھی اس نقطے کی طرف چلا گیا۔ جس نے میرے دماغ میں دھماکا کیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں، ہم آندھی اور طوفان کے مانند واپس گرین ٹاؤن کی طرف اُڑے جا رہے تھے۔

حسبِ توقع چڑیاں سارا کھیت چگ کر اُڑن چھو ہو چکی تھیں۔ فارم ہاؤس بھائیں، بھائیں کر رہا تھا۔ تینوں باپ، بیٹیاں غائب تھے۔

اگلے ایک گھنٹے میں بہت کچھ واضح ہو گیا۔ انٹرنیٹ پر ڈاکٹر رام پرکاش کی تصویریں دیکھتے ہی پتا چل گیا کہ ان نام نہاد بیٹیوں کا باپ...... ڈاکٹر رام پرکاش ہی تھا۔ اس نے داڑھی اور مونچھیں صاف کروادی تھیں مگر پہچانا جا رہا تھا۔

شہد رنگ بالوں والی لڑکی پر پورا شبہ تھا کہ وہ شیلا تھی۔

اے ایس پی اپنے بال مٹھیوں میں جکڑ کر بیٹھ گیا تھا۔ ان تینوں کی تلاش کے لیے قانون نافذ کرنے والے تمام اداروں کو متحرک کر دیا گیا تھا۔

ہم دوبارہ آصف جلال کی طرف آگئے۔ بلاشبہ یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ ہم جن مفروضوں پر کام کر رہے تھے۔ وہ بالکل درست تھے۔ آصف جلال کے سبب ہی مجھ پر قیامت ٹوٹی تھی۔ مگر نہ جانے کیا بات تھی میرے سینے میں اس کے لیے خون کی وہ پیاس نہیں تھی جو میں پہلے محسوس کر رہا تھا۔ شاید اس کی فیملی کے ساتھ ہونے والے سانحے کے سبب میرے دل میں اس کے لیے نرم گوشہ پیدا ہو گیا تھا۔

میں نے اے ایس پی سے کہا۔ ''معاملہ اب کھل چکا ہے۔ انڈینز نہ صرف چوکنا ہو چکے ہیں بلکہ ہاتھ سے چکنی مچھلی کے مانند نکل بھی گئے ہیں تو کیوں نا گلزاری کے فارم ہاؤس پر شمروز خان کی لاش دریافت ہونے سے پہلے ریڈ کر دیا جائے۔ موت کے ان سوداگروں کا کچھ تو زور ٹوٹے گا۔''

اے ایس پی پُرجوش ہو گیا۔ ''یہ خوب تجویز دی ہے تم نے...... ریڈ کے ساتھ، ساتھ صبح تک گلزاری اور اس کا ہارون آباد والا نیٹ ورک بھی گرفت میں ہوگا۔ ان کی بیخ کنی بہت ضروری ہے۔ یہ لوگ رفتہ، رفتہ ملکی سلامتی کے لیے بھی خطرناک ہوتے جا رہے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''تم، ریڈ کو حتمی شکل دو...... میں، آصف جلال پر کام کرتا ہوں۔ ممکن ہے اس سے کچھ ایسا معلوم ہو جائے جس سے ہم مفرور انڈینز تک پہنچ سکیں۔''

وہ اپنے فون پر مصروف ہو گیا اور میں، اس کے ایک ماتحت کے ساتھ ایک دفعہ پھر آصف جلال کے سامنے کھڑا تھا۔

میں نے سلاخوں کے قریب رکتے ہوئے کہا۔ ''تیرا کھیل ختم ہو گیا ہے آصف! آسان موت چاہتا ہے تو ہمارے ساتھ تعاون کر۔''

''میرا کھیل تو اسی وقت ختم ہو گیا تھا جب تیری عدم توجہی اور کمزور دلائل کے سبب جج نے میری سزا بڑھائی تھی۔ تیرے اور اس جج کے ساتھ تو حساب برابر ہوا۔ موقع ملا تو کچھ اور لوگوں سے بھی حساب کتاب کروں گا۔ موت کی مجھے ذرا بھی پروا نہیں ہے۔ تجھے جو کرنا ہے کر لے۔'' آصف جلال نے بے خوفی سے کہا۔ اس کی آنکھوں میں دیوانگی کی چمک تھی۔ ان الفاظ کے ساتھ ہی اس نے اپنا جرم بھی کھلے لفظوں میں قبول کر لیا تھا۔

اُس نے آنکھیں...... میری آنکھوں میں گاڑیں۔ ''اپنوں کے کٹنے کا درد میری طرح تو نے بھی محسوس کیا ہے...... بتا...... کیسا لگا؟'' اس کے لہجے میں زہر ہی زہر بھرا تھا۔

میں نے خود پر قابو رکھتے ہوئے کہا۔ تیری خود ساختہ عدالت نے میرے اور جسٹس آغا کے بارے میں بہت غلط فیصلہ کیا ہے۔ میں اپنے گریبان میں جھانکتا ہوں تو تیرے کیس کے حوالے سے کوئی دانستہ غلطی یا کوتاہی نظر نہیں آتی۔ تو، میرے پورے خاندان کا قاتل ہے۔ میں چھوڑوں گا نہیں تجھے......'' سینے میں بھڑکنے والی آگ کے سبب میری آنکھیں بھی جلنے لگی تھیں۔ ''تو ذرا اپنے گریبان میں جھانک...... جعلی ادویات کے دھندے سے تو نے کتنوں کے گھروں کے چراغ بجھائے ہیں۔ ڈاکٹر رام پرکاش جیسے لوگوں کا آلہ کار بن کر تو اب لاکھوں گھروں کے چراغ بجھانے نکلا ہے۔ لعنت ہے تیری انتقامی سوچ

پر......"

وہ چیخا۔ "ہاں، میں اس سارے معاشرے کو برباد کر دوں گا...... یہ معاشرہ...... تم سب قاتل ہو۔ میری بیوی اور معصوم بچی کے تم سب قاتل ہو۔ میں کسی کو بھی نہیں چھوڑوں گا۔" وہ مکمل طور سے دیوانگی کے غلبے میں نظر آرہا تھا۔ "مجھے تو معمولی جرم میں جیل کی چاردیواری میں چن دیا گیا تھا۔ میری بیوی اور بچی کے قاتل کہاں ہیں؟ تمہیں معلوم ہے یقیناً آج بھی وہ آزاد فضاؤں میں دندناتے پھر رہے ہیں۔ ایک ڈاکٹر رام پرکاش پکڑا گیا ہے تو کیا ہوا...... ابھی اور کئی ڈاکٹر رام پرکاش ہیں۔ اس معاشرے پر جلد ہی ایک قیامت آئے گی۔ اس کا نام "زوبیا" ہوگا۔ تم لوگ درندوں کے مانند ایک، دوسرے کو نوچو گے۔ اپنے ہی بچوں کو تم کاٹ کھاؤ گے۔"

وہ بجھ رہا تھا۔ ڈاکٹر رام پرکاش وغیرہ ہماری تحویل میں ہیں۔ اس لیے وہ مکمل طور پر کھل گیا تھا۔ اس کی لاف زنی سن کر میرا خون کھول اٹھا۔ میں نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ ایک پرانی سی الماری کے پٹ کھلے ہوئے تھے۔ اس میں زبان کھلوانے کے کچھ اوزاروں کے ساتھ مجھے بیس بال کا ایک بیٹ بھی نظر آگیا۔ میں اسے نکال لایا۔

"لاک اپ کا دروازہ کھولو!"

خاموش کھڑے اے ایس پی کے ماتحت نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر تذبذب دیکھ کر میرا پارا چڑھ گیا۔

"سنا نہیں تم نے...... کیا بکواس کی ہے میں نے؟" ماتحت نے جلدی سے آگے بڑھ کر لاک اپ کا دروازہ کھول دیا۔

آصف جلال میرے ارادوں کو بھانپ گیا تھا مگر اس کے چہرے پر خوف کی کوئی علامت نظر نہیں آئی تھی۔

"ڈاکٹر رام پرکاش اور دونوں لڑکیاں کہاں ہیں؟" میں صرف اس پر ہاتھ اٹھانے کا جواز بنا رہا تھا۔ ورنہ مجھے یقین تھا کہ وہ اس بارے میں نہیں جانتا تھا۔

وہ، میرے مقابل آگیا۔ "میں جانتا بھی ہوتا تو نہ بتاتا۔" اس کی آنکھوں کی دیوانگی آمیز چمک دوچند ہوگئی تھی۔

میرا ہاتھ حرکت میں آیا۔ بیس بال کا بیٹ پوری قوت سے اس کے سینے پر لگا۔ وہ ڈکراتا ہوا الٹ کر گرا۔

اگلے دو منٹ میں، میں نے اسے دھنک کر رکھ دیا۔ اس کے منہ سے خون جاری ہو چکا تھا۔ ہاتھوں کی انگلیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ ٹانگوں پر بھی شدید ضربات آئی تھیں۔ وہ گھٹری بنا وحشت ناک انداز میں چیخے جا رہا تھا۔

میں بھی شاید دیوانگی کی حدود کو چھونے لگا تھا۔ میں جب بھی اسے ضرب لگا کر کہتا۔ "بتاؤ کہاں ہے ڈاکٹر رام پرکاش؟"

وہ اس حالت میں بھی خودسری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہتا۔ "نہیں بتاؤں گا۔"

میں شاید اسے جان سے مار ڈالتا مگر اس دوران اے ایس پی کے تین، چار ماتحت اندر گھس آئے تھے، انہوں نے بہ مشکل مجھے قابو کیا تھا۔

☆☆☆

اس ہنگامہ خیز رات کا اختتام ہوا تو موت کے سوداگروں پر کڑی ضرب لگ چکی تھی۔ ہارون آباد والا گلزاری ملک کا پورا سیٹ اپ برباد ہو گیا تھا۔ اس کے درجن بھر سے زائد کارندوں کے علاوہ بھارت سے آنے والی "آئس" کی بھاری کھیپ بھی پکڑی گئی تھی۔

تشدد کی چکی میں پستے ہوئے گلزاری ملک نے بھارت میں اپنے رابطوں اور ان کے لیے سہولت کاری کا اعتراف کر لیا تھا۔

ڈاکٹر رام پرکاش وغیرہ کا واپسی کا ارادہ بن رہا تھا۔ ان کی بحفاظت واپسی اور اس خدمت کے صلے میں ملنے والی آئس کی بڑی مقدار کی وصولی کے لیے وہ کم بخت ہارون آباد میں انتظامات میں مصروف تھا۔

مقامی زمیندار خدا بخش ٹوانہ بھی اس مکروہ دھندے میں ملوث نکلا تھا۔ تحقیقات کا دائرہ وسیع تر ہوتا جا رہا تھا۔

گلزاری ملک نے جو ڈاکٹر رام پرکاش وغیرہ کے ممکنہ دو ٹھکانوں کے بارے میں معلومات دی تھی، ان پر چڑھائی کی تیاریاں مکمل تھیں۔

گرین ٹاؤن والے فارم ہاؤس پر ریڈ کے خاطر خواہ نتائج نہیں ملے تھے۔ وہاں سے معمولی مقدار میں آئس اور چرس کے علاوہ کچھ نہیں ملا تھا۔ البتہ گرفت میں آنے والے افراد سے زوردار قسم کی تفتیش چل رہی تھی۔ امید تھی کہ ملنے والی معلومات کے سہارے گلزاری ملک کے اس سیٹ اپ کو بھی برباد کیا جا سکتا تھا۔

دوسری طرف شوبی اور آئمہ کو بھی کامیابی ملی تھی مگر اب اس کامیابی کی پہلے جیسی اہمیت نہیں رہی تھی۔

دو مختلف ریستورانز کے سی سی ٹی وی فوٹیج کے ریکارڈ میں صائم اور سرمد علیحدہ، علیحدہ دو لڑکیوں کے ساتھ دیکھے

گئے تھے۔ صائم، سانولی رنگت اور گھنے بالوں والی لڑکی کے ساتھ، ساتھ اور سرمد شہد رنگ بالوں والی کے ساتھ۔ یہ دونوں لڑکیاں ڈاکٹر رام پرکاش کی مبینہ بیٹیاں ہی تھیں۔ اس فوٹیج کے ملنے کے بعد یہ بات یقینی طور پر ثابت ہوگئی تھی کہ دونوں لڑکوں کو ان حرافہ لڑکیوں کے ذریعے ہی ٹریپ کیا گیا ہے۔

دو دن گزر گئے تھے۔ ڈاکٹر رام پرکاش وغیرہ کے حوالے سے ہم سب تقریباً مایوس ہو چکے تھے۔ گلزاری ملک کے بتائے دونوں ٹھکانوں سے بھی ان کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔

میں نے اور اے ایس پی نے آخری دفعہ پھر آصف جلال سے پوچھ گچھ کی تھی مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات ہی رہا تھا۔

آصف جلال کی مناسب مرہم پٹی کردی گئی تھی۔ ہم، اس کے لاک اَپ سے باہر نکلے تو وہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا تھا۔

اے ایس پی نے اپنا خاموش پسٹل میری طرف بڑھایا۔ ”یہ ہمارے لیے بیکار ہے، جسٹس آغا صاحب بھی اجازت دے چکے ہیں۔ تمہاری فیملی کا بھی یہ قاتل ہے۔ اپنے سینے کی آگ ٹھنڈی کرلو......“

یہ مکالمہ آصف جلال نے بھی سنا تھا۔ اس نے سر اٹھایا۔ اس کی زرد آنکھیں زندگی سے عاری محسوس ہو رہی تھیں۔ عجیب سی بیگانگی تھی ان آنکھوں میں...... وہ زندگی اور موت سے بے پروا نظر آتا تھا۔ وہ شاید ہوش وحواس کی سرحدوں سے دور نکل گیا تھا۔

میں نے پسٹل تھام کر اس کی آنکھوں کے درمیان کا نشانہ لیا۔ اس نے آنکھیں جھپکائیں نہ اس کے چہرے پر موت کا زرد خوف نمودار ہوا۔

میں نے ہاتھ جھکا لیا۔ ”نہیں، میری فیملی کا اصل قاتل یہ نہیں کوئی اور ہے۔ وہی قاتل اب اس ملک وقوم میں ایک قیامتِ صغریٰ برپا کرنا چاہتے ہیں...... میں گولی ماروں گا تو انہیں ماروں گا۔ یہ تو اپنی ہی آگ میں جلتا ہوا جذبات سے عاری انسان ہے۔ میں پہلے اس کی معصوم بچی اور بیوی کے سفاک قاتلوں کو ڈھونڈ کر اس کے سامنے لاؤں گا۔ اس کے بعد اس کا فیصلہ کریں گے۔“

آصف جلال کے بے تاثر چہرے پر ڈھیرے سے گداز نمایاں ہوا۔ اگلے ہی پل وہ پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگا۔ اسے روتا چھوڑ کر ہم باہر نکل آئے۔

اس خفیہ اسٹیشن کے انچارج نے ہمیں چائے کے لیے روک لیا تھا۔ ہم ابھی انچارج کے آفس میں ہی تھے کہ ایک ماتحت نے آکر بتایا کہ قیدی...... عاصم صاحب سے ملنا چاہ رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جلدی آؤ، پہلے ہی بہت دیر ہوگئی ہے۔“

ہم چائے چھوڑ کر لاک اَپ کی طرف بھاگے۔ میرے ساتھ دوڑتے ہوئے اے ایس پی نے کہا۔ ”تمہاری رحم دلی اور انسانیت کے درد نے یقیناً اس کے گرد جمی برف پگھلا دی ہے۔ ضرور وہ کوئی خاص بات جانتا ہے جو ہمیں ڈاکٹر رام پرکاش تک پہنچا سکتی ہے۔ اس کے ساتھ پوری طرح سے نرمی سے پیش آنا۔“

”بے فکر رہو۔“

ہم لاک اَپ والے حصے میں داخل ہوئے تو آصف جلال سلاخوں سے لگا کھڑا تھا۔ آنسوؤں کے ساتھ اس کے اندر کی نفرت اور کدورت بہہ کر باہر نکل گئی تھی۔ وہ ایک بدلا ہوا شخص نظر آرہا تھا۔

مجھ پر نظر پڑتے ہی بولا۔ ”واقعی تم میری بچی اور بیوی کے قاتلوں کو ڈھونڈو گے؟“

”ہاں......“ میں نے پورے عزم سے کہا۔ ”اور میرا وعدہ ہے تم سے ان قاتلوں کے گلے میں پھندا یا انہیں اپنے ہاتھوں سے گولی تم ماروں گا۔“ میرے پختہ عزم نے میرے لہجے کو بڑی توانائی عطا کردی تھی۔ جس کا نتیجہ تیزی سے سامنے آیا۔

آصف جلال کے بے آواز بہنے والے آنسوؤں میں تیزی آگئی۔ وہ بدلے ہوئے انداز میں بولا۔ ”یہ بات ہے تو پھر میں بھی تمہاری مدد کرسکتا ہوں۔ مجھے اندازہ ہے کہ ڈاکٹر رام پرکاش وغیرہ کہاں ملیں گے۔“ یہ الفاظ نہیں...... توانائی کی ایک لہر تھی جس نے پل بھر میں تازہ دم کردیا۔

اے ایس پی بولا۔ ”یہ تمہارا اس ملک وقوم پر احسان ہوگا۔“

آصف جلال نے سنی اَن سنی کردی۔ ”میں، ان لوگوں کے ساتھ ہی رہ رہا تھا۔ جس وقت تم لوگ فارم ہاؤس میں گھسے تو میں ایک پرچھتی پر پڑے کباڑ کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ وہ لوگ کچھ دنوں کے لیے کہیں گئے ہوئے تھے۔ اتفاق سے میرا موبائل چارج نہیں تھا۔ جس کے سبب میں ان لوگوں کو ہوشیار نہیں کرسکا۔ اور وہ تمہارے ہتھے چڑھ گئے۔ اس وقت میں سمجھا تھا کہ ہمارا کھیل ختم ہوگیا ہے، میں موقع پاکر وہاں سے نکل بھاگا تھا۔“

ہمیں اس کی کہانی سے زیادہ ڈاکٹر رام پرکاش وغیرہ تک پہنچنے کی فکر تھی۔ مگر اسے ٹوکنا بھی مناسب نہیں تھا، قسمت سے تو وہ بولنے پر آیا تھا۔

آصف جلال رواں تھا۔ ”بعد میں اندازہ ہوا کہ بے شک تم لوگ ہمارے پیچھے تھے مگر تمہارا ہدف اس وقت گلزاری ملک تھا۔ فارم ہاؤس کو تم محض استعمال کے لیے وہاں گھسے تھے۔ اس طرح تم نے اپنے ہاتھوں سے ہی ان لوگوں کو آزاد کر دیا۔ جن کے لیے اب سر پٹختے پھر رہے ہو۔“

اے ایس پی خاموش نہ رہ سکا۔ ”فارم ہاؤس سے نکل کر وہ کہاں گئے ہیں؟“

آصف جلال بولا۔ ”میں یہ تو نہیں جانتا مگر ایک دن میں نے انہیں مارواڑی زبان میں باتیں کرتا سنا تھا۔ یہ بھارت کی ایک مشکل علاقائی زبان ہے۔ ان کے خیال میں وہاں ان کی زبان کو سمجھنے والا کوئی نہیں ہے۔ مگر میں نے بھارت کی خاصی خاک چھانی ہے۔ میں اس زبان کو تھوڑا بہت سمجھتا ہوں۔ وہ لوگ باتیں کر رہے تھے کہ ہارون آباد کی طرف کوئی گڑبڑ ہوئی تو وہ لوگ تھر پار کر سے مونا باؤ کی طرف نکل جائیں گے۔ سیٹھ چندی مل سارے انتظام کر لے گا۔ میرے خیال میں وہ تھر پار کر کی طرف نکلے ہیں۔“

مجھے وہیں چھوڑ کر اے ایس پی وہاں سے تیزی سے روانہ ہو گیا۔

میرے دل میں آصف جلال کے لیے ہمدردی جڑ پکڑ چکی تھی۔ میں بہت دیر اس کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرتا رہا۔

میرے اندازے کے عین مطابق اس نے اپنی بیوی اور بچی کے درندہ صفت قاتلوں کو ڈھونڈنے کی بھرپور کوشش کی تھی مگر ناکام رہا تھا۔

اس نے مزید بتایا کہ سری لنکا میں چند دن گزار کر وہ بھارت چلا گیا تھا۔ وہاں غیر قانونی جنسی ادویات تیار کرنے والے ایک دوست نے اسے کچھ لوگوں سے ملوایا۔ ان لوگوں کے توسط سے وہ ڈاکٹر رام پرکاش تک پہنچ گیا۔ اور ان کے ساتھ ہارون آباد کی طرف سے بارڈر پار کر کے پاکستان آ گیا۔ ڈاکٹر رام پرکاش وغیرہ کی جعلی شناختی دستاویزات بھی اسی نے تیار کروائی تھیں۔

آصف جلال کا ان لوگوں سے معاہدہ تھا کہ بھیانک تجربے کے لیے وہ جن افراد کو منتخب کرے گا، انہیں ہی ٹریپ کیا جائے گا۔ اس طرح اس نے اپنی دشمنی نکالی تھی۔

بھیانک تجربے کے حوالے سے اس نے بتایا کہ ڈاکٹر رام پرکاش نے زوبیا نام کا ایک جرثومہ اپنی لیبارٹری میں تیار کیا تھا۔ جو انسان کے ذہن کو متاثر کر کے اس میں خون ریزی اور قتل و غارت کے جذبات کو ابھارتا تھا۔

یہ جرثومہ ابھی ابتدائی اسٹیج پر تھا۔ یہ ان لوگوں پر بہتر نتائج دیتا تھا جو آئس کی لت میں مبتلا ہوتے تھے۔ جس کے سبب ان کا مدافعتی نظام پہلے سے ہی بے حد کمزور ہوتا تھا۔

ڈاکٹر رام پرکاش ابتدائی تجربات سے بے حد خوش تھا۔ وہ جلد از جلد واپس بھارت جا کر اس جرثومے پر مزید کام کرنا چاہتا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ اس جرثومے کو وائرس کی شکل دی جائے اور اس کا شکار بننے والے ضروری نہیں کہ آئس استعمال کرتے ہوں۔

وہ اکثر کہتا تھا کہ جلد ہی دنیا اس کی مٹھی میں ہو گی۔ ”زوبیا“ کے بعد دنیا کورونا وغیرہ کو بھول جائے گی۔ وہ جس ملک و قوم پر چاہے گا زوبیا کا عذاب مسلط کر دے گا۔ انسان حیوان بن کر اپنوں کو ہی کاٹ کھائے گا۔

میں نے ڈاکٹر رام پرکاش کے مکروہ عزائم پر لعنت بھیجی اور وہاں موجود ایک ماتحت کو آصف جلال کی صحت اور خوراک سے متعلق ہدایات دے کر باہر آ گیا۔

☆☆☆

کھوکھرا پار حساس علاقہ تھا۔ یہاں حساس اداروں کا جاسوسی کا وسیع نیٹ ورک تھا۔ یہ بات فوراً ہی علم میں آ گئی کہ کھوکھرا پار کے بڑے زمیندار سیٹھ چندی مل کی حویلی میں چار نئے مہمان آج ہی آئے ہیں۔ جن میں دو لڑکیاں، ایک نوجوان لڑکا اور ایک پچاس پچپن سال کا شخص ہے۔

مقامی یونٹ نے رینجرز کی بھاری نفری کے ساتھ سیٹھ چندی مل کی حویلی کو گھیر لیا اور سب افراد کو لاؤڈ اسپیکر پر باہر آنے کے لیے کہا۔

سب افراد باہر آ گئے مگر وہ چاروں مہمان باہر نہیں آئے تھے۔ رینجرز حویلی میں داخل ہوئی تو مہمان خانے سے ان پر فائرنگ شروع ہو گئی۔

مہمان خانے کو گھیر لیا گیا۔ فائرنگ کے تبادلے میں نوجوان لڑکا...... جس کا تعلق سکھر سے تھا اور وہ بھارتیوں کے لیے سہولت کاری کر رہا تھا۔ ہلاک ہو گیا۔ لڑکیوں نے بھی دستیاب اسلحے سے خوب مقابلہ کیا تھا۔ ان میں سے ایک ہلاک ہوئی اور دوسری زخمی حالت میں گرفتار ہوئی تھی۔ ڈاکٹر رام پرکاش کو زندہ گرفتار کرنے کی مقدور بھر کوشش کی گئی مگر اس نے زہریلا کیپسول چبا کر خودکشی کر لی۔

میں نے اس واقعے کی ریکارڈنگ دیکھی تھی۔ چونکہ ہم اتنی جلدی کھوکھرا پار نہیں پہنچ سکتے تھے اس لیے اس کارروائی میں ہمارا کوئی حصہ نہیں تھا۔

ڈاکٹر رام پرکاش کی لاش کو کیمرے سے قریب سے شوٹ کیا گیا۔ اس کے منہ سے جھاگ بہہ رہے تھے۔ اور وہ اپنے تمام تر ناپاک عزائم کے ساتھ اس دارِ فانی سے کوچ کر گیا تھا۔

ڈاکٹر رام پرکاش کی لاش سمیت اداروں کے پاس خاصے ثبوت تھے۔ اس معاملے کو اقوام متحدہ اور عالمی ادارۂ صحت کے سامنے اٹھانے کا فیصلہ ہوا تھا۔ اس سلسلے میں دیرینہ دوست چین نے بھرپور مدد و اعانت کا یقین دلایا تھا۔

☆☆☆

اس واقعے کو سات دن گزر چکے تھے۔ آج اتوار تھا۔ میں کچھ ضروری سامان لے کر آیا تو فائزہ تیار ہو چکی تھی۔ ہمیں اے ایس پی طارق سیال کی دعوت پر جانا تھا۔

جدید تراش خراش کے پنک ریڈ سوٹ میں وہ کسی اور ہی جہاں کی مخلوق لگ رہی تھی۔ ہم رنگ لپ اسٹک نئی قسم کے اسکارف سے جھانکتے بال...... میں ایک ٹک اسے دیکھے گیا۔

میرے انداز سے وہ پہلے شرمائی پھر شوخ ہوئی۔ ''کیا دیکھ رہے ہیں؟''

''دیکھ نہیں رہا...... کچھ سوچ رہا ہوں۔''

''کیا؟'' اس نے اٹھلا کر پوچھا۔

''ہمیں جلد شادی کر لینی چاہیے۔ تمہیں دیکھ کر صبر نہیں ہو رہا۔'' میں اس پر جھپٹا تو وہ طرح دے گئی۔

''صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے جناب! اور شادی ہم اپنے پیاروں کی پہلی برسی کے بعد کریں گے۔''

اس فقرے نے جذبات کی ساری گرمی ہوا کر دی۔ دل بے نام سی اداسی سے بھر گیا۔

فائزہ کو فوراً ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ کیا یاد کروا بیٹھی ہے۔ وہ آ کر میرے گلے سے لگ گئی۔ میں نے خود کو سنبھالا۔ وہ لمحوں میں رو کر آنکھوں کا میک اَپ خراب کر بیٹھی۔

میں نے اس کا ہاتھ چوم کر کہا۔ ''آؤ چلتے ہیں، تمہارا نیا نویلا بھائی انتظار کر رہا ہوگا۔'' ایک، دوسرے کا ہاتھ تھامے ہم لفٹ سے نیچے اتر آئے۔ اے ایس پی طارق سیال کے ساتھ ہمارا تعلق بڑی تیزی سے بے حد اپنائیت والا ہو گیا تھا۔

وہ اور فائزہ ایک ہی گلاس سے دودھ پی کر ''دودھ شریک'' بہن، بھائی بن گئے تھے۔ طارق کا تعلق جھنگ کی معروف صنعت کار فیملی سے تھا۔ اس نے باقاعدہ لڑ جھگڑ کر اور ناراض رہ کر فائزہ کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ اس کا تحفہ قبول کر لے۔

یہ تحفہ ایک نئی گاڑی کی شکل میں تھا۔ ہم اس گاڑی میں بیٹھ کر ایک فائیو اسٹار ہوٹل پہنچے۔ خوشگوار ماحول میں کھانا کھایا گیا۔

کھانے کے بعد طارق کے چہرے پر ایک قسم کی سنجیدگی نمودار ہوئی۔ وہ بولا۔ ''اس کیس میں تم لوگوں نے دیکھا ہے کہ ملک دشمنوں کو ہر جگہ سہولت کار آسانی سے میسر ہیں۔ موت کے سوداگر ہر طرف دندناتے پھر رہے ہیں اور قانون ہر جگہ بااثر افراد کے سامنے پسپا نظر آتا ہے۔ بہت سی جگہوں پر ضابطے ہمارے ہاتھ باندھ دیتے ہیں اور ہم ہاتھ ملتے رہ جاتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''کہنا کیا چاہتا ہے یار......! صاف لفظوں میں بتا۔''

وہ لحظہ بھر سوچتا رہا پھر بولا۔ ''میری خواہش ہے کہ ایک چھوٹی سی خفیہ ٹاسک فورس یا ٹیم بنائی جائے۔ جس کے ممبر ایسے لوگ ہوں جن کے لیے ملک و قوم کے لیے جان دینا اور لینا کوئی معنی نہ رکھتا ہو۔ یہ فورس ہر قسم کے ضابطوں اور بندشوں سے ماورا ہو۔ جہاں قانون بے بس ہو جائے۔ ضابطے ہاتھ باندھ ڈالیں۔ وہاں یہ فورس حرکت میں آئے اور مطلوبہ نتائج حاصل کر لے۔''

فائزہ نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ ''میں اس ٹاسک فورس کی ممبر شپ کے لیے درخواست دے رہی ہوں۔'' اس کے لہجے کا عزم اس کے چہرے پر بھی نمایاں تھا۔

طارق نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ میں نے بھی ان کے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھا۔ ''میں بھی تم لوگوں کے ساتھ ہوں بلکہ میرے پاس تو اس ٹاسک فورس کے لیے ایک کیس بھی ہے۔''

''کون سا کیس......؟'' فائزہ نے پوچھا۔

''آصف جلال کی بیوی اور معصوم بچی کا کیس...... درندے ابھی تک قانون کی گرفت میں نہیں آئے۔'' ان دونوں کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ وہ، مجھ سے سو فیصد متفق تھے۔

ہم تینوں وہاں سے اٹھے تو ایک نیا عزم و ولولہ ہمارے ساتھ تھا......

❖❖❖

سرورق کی دوسری کہانی

بھول تماشا

ایچ اقبال

یادوں کے نقوش اَن مٹ ہوتے ہیں... ذہن و دل میں پتھر کی طرح پیوست ہوکر رہ جاتے ہیں... مگر وہ مجروح شخص بھی عجیب دوراہے پر کھڑا تھا... اس کے ذہن کی سلیٹ پر کوئی نام نہیں لکھا تھا... ہر نقش کہیں کھو چکا تھا... اس پر یاسیت کی کیفیت طاری تھی... ایسی حالت میں لمحوں اور گھنٹوں کا احساس ختم ہوجاتا ہے۔ بستر پر پڑے انتظار کا ہر لمحہ گھنٹوں کا احاطہ کرتا محسوس ہوتا... گردشِ حالات کے شکار ایک ایسے ہی شکاری کی داستانِ حیات... صید و صیاد ایک ہی صورتِ حال سے دوچار تھے...

لمحہ بہ لمحہ پُرتجسس رنگ بدلتی کہانی کے دلچسپ اتار چڑھاؤ

سر پر لگنے والی ضرب بہت شدید تھی۔ خون خاصا بہہ گیا تھا۔ جب اسپتال میں ہوش آیا تو اسے دنیا کی ہر بات یاد تھی لیکن یہ وہ بھول چکا تھا کہ اُس کا نام کیا ہے؟ اس کا ماضی بھی اندھیرے میں گم تھا۔ یہ بات بھی یاد نہیں تھی کہ وہ کیسے زخمی ہوا تھا۔ جن باتوں کا احساس تھا، وہ یہ کہ اس کے سر میں خاصی تکلیف تھی۔

اُسے ہوش میں آتا دیکھ کر ایک نرس بڑی تیزی سے باہر گئی اور جب واپس لوٹی تو اس کے ساتھ ایک ڈاکٹر بھی تھا جس کی عمر پچاس ساٹھ سال کے لگ بھگ ہوسکتی تھی۔

''ہیلو!'' ڈاکٹر نے اس کے سرہانے آکر مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم اپنا نام بتانا پسند کرو گے؟''

زخمی اس کا منہ تکتا رہا۔ اسے اپنا نام یاد نہیں تھا تو بتاتا کیسے؟

''تم زخمی کیسے ہوئے تھے؟'' ڈاکٹر نے دوسرا سوال دہرایا۔

وہ اب بھی خاموشی سے ڈاکٹر کا منہ تکتا رہا۔

ڈاکٹر اب بھی مسکراتا رہا۔ ''یہ بتانا ضروری ہے کہ تمہارا نام کیا ہے، تمہارا گھر کہاں ہے، تم زخمی کیسے ہوئے تھے؟''

لیکن جواب میں خاموشی۔

اب ڈاکٹر کے چہرے پر سنجیدگی اُبھری۔ دونوں نرسیں بھی قریب کھڑی اُن کی باتیں سن رہی تھیں۔

''کیا تم کسی بات کا جواب نہیں دینا چاہتے؟'' ڈاکٹر بولا۔

''مجھے یاد نہیں ہے، مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔'' زخمی کے منہ سے کپکپاتی ہوئی آواز نکلی۔

''اوہ!'' ڈاکٹر کے چہرے کی سنجیدگی بڑھ گئی۔

''میں اسپتال کیسے آیا؟'' زخمی نے پوچھا۔

''تو یہ تم جانتے ہو کہ تم اسپتال میں ہو؟''

''ہاں، یہ میں جانتا ہوں۔ میں جو زبان بول رہا ہوں، وہ یاد ہے مجھے۔ آپ ڈاکٹر ہیں۔ یہ نرسیں ہیں لیکن مجھے یہ نہیں معلوم کہ یہ کون سا اسپتال ہے اور کس شہر میں ہے۔''

''یہ یاد ہے کہ تم کس ملک کے شہری ہو؟''

''یہ تو یاد ہے۔ میں نے کہا نا، مجھے اور سب کچھ یاد ہے۔ میں پاکستان کا شہری ہوں لیکن یہ معلوم نہیں کہ میں کس شہر میں ہوں۔''

''کیا تمہیں یہ بھی یاد ہے کہ پاکستان کے ایک شہر کا نام کراچی ہے؟''

''ہاں، یہ مجھے یاد ہے۔''

''تمہارا گھر کراچی میں ہے یا کسی اور شہر میں؟''

''یہ مجھے یاد نہیں...... اوہ...... اوہ...... اِن سوالوں نے تو میرے سر کا درد بڑھا دیا۔ دماغ پر زور نہیں ڈالا جا رہا ہے۔'' اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

نرسوں کے چہرے سپاٹ رہے لیکن ڈاکٹر کی سنجیدگی بڑھ گئی۔ وہ چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر اس نے ایک نرس سے کچھ کہا۔ نرس نے فوراً ایک انجکشن بنایا اور زخمی کے لگا دیا۔

''بظاہر تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ اسے آرام کی سخت ضرورت ہے۔'' ڈاکٹر نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔ ''اس کے سر میں کافی تکلیف ہوگی۔ دماغ پر زور پڑنے سے تکلیف میں اضافہ ممکن ہے۔''

نرسوں نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

ڈاکٹر کمرے سے نکل آیا۔ وہاں چند پولیس والے موجود تھے۔ ان میں ایک آفیسر بھی تھا جس نے ڈاکٹر سے پوچھا۔ ''کیا اب اُس کا بیان لیا جا سکتا ہے؟''

''میں نے اس سے چند سوال کیے تھے۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ''اگر وہ میرے سوالوں کا جواب دے دیتا تو میں سمجھتا کہ وہ پولیس کو بیان دینے کے قابل ہے۔ وہ میرے سوالوں کا جواب نہیں دے سکا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سر پر آنے والی ضرب نے اس کی یادداشت کو نقصان پہنچایا ہے۔ میں نے اسے نیند کا ہلکا سا انجکشن دے دیا ہے۔ وہ چار پانچ گھنٹے سوتا رہے گا۔ اس کے سر کی تکلیف کم ہو جائے تو ممکن ہے کہ اس کی یادداشت بھی کام کرنے لگے۔''

''یادداشت۔'' پولیس آفیسر نے زیرِلب کہا پھر بولا۔ ''یہ تو معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ کون ہے اگر آپ اس کی انگلیوں کے نشانات لے کر ہمیں دے دیں۔ نادرا سے اس کے بارے میں معلومات ہو سکتی ہیں۔''

''یہ کام تو ابھی ہو سکتا ہے۔''

''تو کر دیجیے۔''

ڈاکٹر کمرے میں واپس چلا گیا۔ اس کی واپسی میں دیر نہیں لگی۔ اس نے ایک سادہ کاغذ پولیس آفیسر کی طرف بڑھا دیا۔

''شکریہ ڈاکٹر۔''

''کیا پولیس ابھی یہیں رہے گی؟''

''دو کانسٹیبل تو رہیں گے اور ہاں، کیا آپ شبہ کر سکتے ہیں کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ یعنی اس کی یادداشت......''

''ابھی اس کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ میں کل تک کچھ اندازہ لگا لوں گا۔ اگر واقعی اس کی یادداشت چلی گئی ہے یا جزوی طور پر متاثر ہوئی ہے تو پھر اسے ڈاکٹر اسلم دیکھیں گے۔ وہ سائیکاٹرسٹ ہیں۔''

پولیس آفیسر نے سر ہلا دیا۔

''مجھے اب کچھ اور مریضوں کو دیکھنا ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ اس وقت شام ہو رہی تھی۔ زخمی کو دو گھنٹے بعد ہوش آیا تھا۔

☆☆☆

سب انسپکٹر ثاقب نے موبائل پر ایک بینک منیجر سے رابطہ کیا اور اپنا تعارف کرانے کے بعد اس سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ ممکن نہیں تھا کہ بینک منیجر اس ملاقات سے گریز کرتا۔

بیس منٹ بعد ہی ثاقب، منیجر کے کمرے میں تھا جس نے اس کا استقبال بڑے تپاک سے لیکن کسی قدر پریشانی سے کیا۔

''آپ کچھ ٹھنڈا پینا پسند کریں گے یا......''

''کچھ نہیں۔ ثاقب نے اس کی بات کاٹ دی۔'' کسی تکلف کی ضرورت نہیں۔ آپ کے چہرے سے پریشانی ظاہر ہو رہی ہے۔ اسے ختم کیجیے۔ میں آپ کے لیے کسی پریشانی کا سبب بن کر نہیں آیا۔ بس چند سوال کرنے ہیں آپ سے۔''

''فرمایئے۔''

''آپ کی برانچ میں شبانہ نام کی کوئی لڑکی کام کرتی ہے؟''

''جی ہاں اور بھی کئی لڑکیاں ہیں۔''

''میں شبانہ کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہوں۔ کیا وہ اس وقت برانچ میں ہے؟''

''جی ہاں۔''

''کل سے آج تک اس میں کوئی فرق آیا ہے؟''

''جی ہاں، آج وہ خاصی پریشان ہے۔ میں نے بھی اس کی پریشانی محسوس کی تھی۔ پوچھا بھی تھا اُس سے...... دراصل کل سے اس کا شوہر غائب ہے۔ اس کا موبائل فون بھی بند مل رہا ہے۔ اسی کی وجہ سے پریشان ہے۔''

''ہوں۔'' سب انسپکٹر ثاقب نے نظریں جھکا کر چند سیکنڈ سوچا پھر بولا۔ ''آپ کو اگر کوئی اعتراض نہ ہو تو میں اس سے بات کرنا چاہوں گا۔''

''ضرور کیجیے، قانون سے تعاون کرنا تو ہر شہری کا فرض ہے۔ اسے اُلجھن ضرور ہوگی کہ پولیس تک بات کیسے پہنچی......''

''آپ بہانہ کر دیجیے گا۔'' ثاقب نے کہا۔ ''مثلاً یہ کہ آپ سے میری جان پہچان ہے۔ میں آپ سے ملنے آیا تھا تو اپنی برانچ کی ایک لڑکی کا ذکر آپ نے مجھ سے کیا اس لیے میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''بہتر! میں اُسے بلواتا ہوں۔'' منیجر نے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''ٹھیک ہے لیکن کیا مجھے یہ جاننے کا حق نہیں کہ آپ اس سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟''

''حق تو خیر نہیں ہے آپ کو لیکن میں آپ کو بتائے دیتا ہوں۔'' ثاقب نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''دراصل اس کا شوہر زخمی اور بے ہوشی کی حالت میں ایک مضافاتی سڑک کے نشیب میں ملا تھا۔ اب وہ اسپتال میں ہے لیکن وہ سر کی چوٹ کی وجہ سے اپنی یادداشت وقتی طور پر یا ہمیشہ کے لیے کھو بیٹھا ہے۔''

ثاقب کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی منیجر کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ ثاقب کے خاموش ہوتے ہی وہ بولا۔ ''تو میرا خیال صحیح تھا نا کہ اس کے ساتھ نہ جانے کیا واقعہ پیش آیا ہو اس لیے اسے رپورٹ کرانی چاہیے۔''

''پولیس کو اس کی انگلیوں کے نشانات کی وجہ سے اس کے شوہر سلطان کے بارے میں معلوم ہو سکا۔ اس کے گھر گئے تو وہ مقفل ملا۔ پڑوس کے ایک صاحب سے معلوم ہوا کہ اس فلیٹ میں سلطان اپنی بیوی شبانہ کے ساتھ رہتا تھا اور یہ کہ شبانہ اس بینک میں کام کرتی ہے۔ صبح سے اس کے شوہر کو تو نہیں دیکھا گیا لیکن شبانہ کو دیکھا گیا تھا۔ اسے اس وقت دیکھا گیا ہوگا جب وہ یہاں آنے کے لیے اپنے گھر سے روانہ ہوتی ہوگی۔ یہ خاص تفصیل ہے جو میں نے آپ کو بتا دی لیکن آپ اسے فی الحال کچھ نہ بتایئے گا بلکہ...... میں اس سے تنہائی میں ملنا چاہتا ہوں پلیز آپ بُرا نہ مانیے گا۔''

''آپ کو اندیشہ ہے کہ میں اسے بتا نہ دوں۔'' منیجر نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''یہ بات نہیں۔'' ثاقب بولا۔ ''میں آپ کو اس کے سوالات سے بچانا چاہتا ہوں۔ وہ آپ سے ضرور پوچھے گی کہ اس سے پوچھ گچھ کرنے کے لیے پولیس یہاں کیوں پہنچ گئی۔

''ٹھیک ہے۔ میں اسے یہیں بلوا لیتا ہوں۔'' منیجر نے ریسیور اٹھایا۔

پانچ منٹ بعد جو بیس بائیس سالہ لڑکی منیجر کے کمرے میں آئی، وہ شبانہ ہی ہو سکتی تھی جو ثاقب کو دیکھ کر چونکی۔

''شبانہ، یہ سب انسپکٹر ثاقب ہیں۔'' منیجر نے اس سے کہا۔ ''پرانی شناسائی ہے۔ آج مجھ سے ملنے آ گئے تھے۔ مجھ سے رہا نہ گیا اور میں ان سے تمہاری پریشانی کا ذکر کر بیٹھا۔ اب یہ تم سے تنہائی میں کچھ بات کرنا چاہتے ہیں۔''

''لیکن......'' شبانہ کے لہجے میں احتجاج تھا۔ ''جب میں نے رپورٹ ہی نہیں کرائی تو......''

''سمجھنے کی کوشش کرو۔'' منیجر نے اس کی بات کاٹی۔ ''ممکن ہے کہ یہ تمہیں کوئی مفید مشورہ دے سکیں...... میں نے اشفاق سے کہا ہے کہ وہ کچھ دیر کے لیے اپنا کیبن خالی کر دے۔ تم وہاں بیٹھ کر ان سے باتیں کر لو۔ یہاں یوں مناسب نہیں کہ ایک اہم اکاؤنٹ ہولڈر مجھ سے ملنے کے لیے آنے ہی والے ہیں۔ ان کے سامنے وہ باتیں مناسب نہیں ہوں گی۔ سمجھ رہی ہو نا؟''

''جی۔'' شبانہ نے طویل سانس لی۔

منیجر نے چپراسی کو بلا کر اس سے کہا۔ ''ان دونوں کو اشفاق صاحب کے کیبن تک پہنچا دو۔''

''آیئے سر۔'' چپراسی نے ثاقب سے کہا۔

چپراسی کی رہنمائی میں ثاقب اور شبانہ کیبن میں پہنچ گئے۔

ثاقب بولا۔ ''ابھی آپ کے منیجر سے معلوم ہوا کہ آپ کسی پریشانی سے دوچار ہیں۔''

''انہیں یہ بات آپ کو نہیں بتانا چاہیے تھی۔''

''آپ کی ہمدردی میں ایسا کیا انہوں نے...... سوچا ہو گا کہ شاید میرا مشورہ آپ کے لیے قابلِ قبول ہو۔ وہ کسی طرح آپ کو پریشانی سے نجات دلانا چاہتے ہیں۔ شاید اس کا ایک سبب یہ بھی ہو کہ ورکر کی پریشانی سے کام بھی ڈسٹرب ہوتا ہے دفتر کا۔''

''لنچ کا وقت گزر چکا ہے۔ ان سے پوچھیے، کیا میں نے بینک کے کسی کام میں غلطی کی ہے۔''

''بہرحال آپ پریشان تو ہیں۔''

''میں آپ سے بہت صاف صاف بات کروں گی۔ میری پریشانی کو غلط محسوس کیا جا رہا ہے۔ میں دراصل اُلجھن کا شکار ہوں اور اُلجھن یہ نہیں ہے کہ وہ غائب ہو گیا۔ اُلجھن یہ ہے کہ وہ واپس نہ آ جائے۔''

سب انسپکٹر کے چہرے پر تعجب کا تاثر ابھرا۔

''عجیب بات کہی ہے آپ نے...... کیا آپ دونوں کے تعلقات خوش گوار نہیں تھے؟''

''ایک دن کے لیے بھی خوش گوار نہیں رہے۔'' شبانہ نے سرد لہجے میں کہا۔ ''شادی کے دوسرے ہی دن مجھے اُس کی اوقات معلوم ہو گئی تھی۔ دھوکے باز تھا۔''

''ایسا تھا تو آپ دونوں کی شادی کیسے ہو گئی تھی؟''

''اب میں بیان دے رہی ہوں تو سبھی کچھ بتا دوں گی۔'' شبانہ نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''میرے والد خاصے آسودہ حال شخص ہیں جو اپنی دوسری بیوی کی انگلیوں پر ناچتے ہیں کیونکہ وہ نوجوان ہے۔ اس نے زیادہ عمر کے انسان سے شادی ہی اس لیے کی ہے کہ عیش کی زندگی گزار سکے۔''

''تو آپ کی والدہ؟ یعنی ان کی پہلی بیوی؟''

''ان کا انتقال ہو چکا ہے۔'' شبانہ کی آواز بھرّا گئی۔ ''فیروزہ ہی کی وجہ سے میں اس شادی کی مصیبت میں پڑی ہوں۔ فیروزہ میرے والد کی دوسری بیوی کا نام ہے۔''

''وہ کیسے؟''

''وہ چاہتی تھی کہ میں راستے سے ہٹ جاؤں تو وہ سارے گھر کی مالک بن سکے اور جو چاہے کرے۔ میری شادی میں بنیادی کردار اسی کا ہے۔''

''آپ کے والد اس معاملے میں بھی کچھ نہیں بولے؟''

''وہ بھی دھوکا کھا گئے۔ میں نے ابھی بتایا نا کہ وہ بہت بڑا دھوکے باز تھا۔ اس کا ایک دوست ہے رضوان نام ہے۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ رہتا ہے۔ کسی اچھی جگہ ملازم ہے۔ میرے لیے سلطان کا رشتہ رضوان کی ماں ہی لائی تھیں۔ رضوان اور اس کی ماں شریف نظر آتے ہیں۔ گھر بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔ رضوان کی ماں نے سلطان کو اپنے مرحوم بھائی کا بیٹا بتایا تھا۔ اچھا خاصا گھر اور شریف لوگ سمجھ کر میرے والد نے فیروزہ کی بات مان لی تھی۔''

''سلطان کو بھی شریف سمجھا تھا انہوں نے؟''
''وہ اچھا خاصا اداکار بھی ہے۔ بہت مسکین بن کر آیا تھا ہمارے سامنے۔ بس مجھے وہ پہلی ہی نظر میں اچھا نہیں لگا تھا۔''
''تو آپ نے انکار کیوں نہیں کیا؟''
''شاید میں اپنے باپ کی بہت سعادت مند بیٹی ہوں، ان کی بات، ان کی خواہش ٹال نہیں سکی۔''
''تو اس کی شرافت کا بھرم کیسے کھلا؟''
''ہماری پہلی رات رضوان کے گھر میں گزری تھی۔ دوسرے دن اس نے مجھے ایک معمولی فلیٹ میں لا پھینکا اور بتایا کہ یہ ہے ہمارا اصلی گھر! میرے تو پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اتنے گھٹیا انداز کی زندگی میں نے نہیں گزاری تھی۔ زیورات اور کپڑے وغیرہ بھی مانگے تانگے کے تھے یا کرائے کے تھے۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہاں کرائے پر کپڑے ملتے ہیں یا نہیں۔ وہ سب واپس چلے گئے۔ میرے پاس صرف وہ کپڑے رہ گئے جو مجھے میرے والد نے دیے تھے۔ جہیز میں جو کچھ دیا تھا، وہ رضوان کے گھر پر تھا جو اس نے دوسرے ہی دن بیچ دیا۔''
''وہ خود کیا کام کرتا تھا؟''
''دس ماہ کی شادی شدہ زندگی میں مجھے کبھی نہیں معلوم ہوسکا کہ وہ کیا کام کرتا تھا لیکن شادی کے دو تین ماہ بعد مجھے اندازہ ہوا کہ وہ چھوٹے موٹے جرائم تو کرتا ہی ہوگا۔''
''یہ اندازہ کیسے ہوا؟''
''اس کے کچھ دوست آتے تھے، اس سے ملنے۔ دو ایک بار میں نے ان کی سرگوشیاں سن لی تھیں۔''
''ملازمت آپ کب سے کر رہی ہیں؟''
''شادی کے دو مہینے بعد ہی کر لی تھی جبکہ میرے سان گمان میں بھی نہ تھا کہ شادی کے بعد نوکری کروں گی۔ بس شوق میں ڈگری لے لی تھی۔''
''تو ایسی کیا مجبوری آپڑی کہ ملازمت کرنی پڑی؟''
''کبھی اسے پیسوں کی ضرورت ہوتی تھی تو کہتا تھا کہ اپنے باپ سے مانگ کر لاؤ۔ میں ایسا نہیں کرتی تھی تو وہ بدتمیزی سے پیش آتا تھا۔ ایک بار تو اس نے مجھے تھپڑ بھی مار دیا تھا۔ اسی لیے میں نے ملازمت کی تھی۔ تنخواہ میں سے کچھ بچا کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیتی تھی۔''
''آپ کے والد کو معلوم نہیں یہ باتیں؟''
''سب باتیں بتا کر میں انہیں دکھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ بس یہ بتا دیا تھا کہ دراصل رہتی کہاں ہوں۔ اس طرح انہیں سلطان کی دھوکے بازی کا علم ہو گیا تھا۔ انہوں نے مجھے اشارہ دیا تھا کہ میں طلاق یا خلع لے لوں لیکن اس پر فیروزہ چراغ پا ہو گئی تھی۔ ویسے میں خود بھی یہ قدم نہیں اٹھانا چاہتی تھی۔ جو کچھ قسمت میں تھا، وہ بھگتنا چاہتی تھی۔''
''میں نام بھول گیا۔ فیروزہ، یعنی آپ کی سوتیلی ماں؟''
''ماں نہ کہیے اُسے۔'' شبانہ نے تلخی سے کہا۔ ''میرے والد کی دوسری بیوی کہیے۔''
''ہوں، اب آپ رپورٹ کیوں نہیں کرنی چاہتیں؟''
''میں تو چاہتی ہوں کہ اب وہ غائب ہی رہے۔ میں نے کسی سے سنا تھا کہ ایک خاص عرصہ گزر جانے کے بعد نکاح فسخ ہو جاتا ہے۔ یہ ہو جائے تو مجھے نجات مل جائے گی۔ طلاق کا داغ بھی نہیں لگے گا۔''
''وہ واپس آسکتا ہے۔''
''ہاں آتو سکتا ہے لیکن آپ نے تو بڑے یقین سے کہا ہے۔''
''جی ہاں، دراصل میں اسی کے بارے میں تحقیقات کر رہا ہوں۔''
''کیوں؟'' شبانہ چونکی۔ ''میں نے تو کوئی رپورٹ نہیں کرائی۔''
''وہ ایک اسپتال میں ہے۔ ایک مضافاتی سڑک پر زخمی حالت میں ملا تھا۔ کسی راہ گیر نے دیکھا تھا تو پولیس کو اطلاع دی تھی۔''
''لعنت۔'' شبانہ نے جیسے بے اختیار کہا۔
''آپ کے خیال میں اس کے ساتھ یہ حادثہ کیسے پیش آسکتا ہے؟''
''میں کیا بتا سکتی ہوں...... شاید کسی سے لڑ بھڑ گیا ہو۔ پولیس نے اس سے نہیں پوچھا؟''
''وہ کچھ بتانے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔''
''بہت زیادہ زخمی ہے؟''
''نہیں، لیکن اس کے سر پر شدید چوٹ آئی ہے جس سے وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا ہے۔''
''بن رہا ہوگا۔'' شبانہ نے نفرت سے کہا۔ ''پولیس کو کچھ بتانے سے بچنا چاہتا ہوگا۔''
''میں نے ابھی محسوس کیا ہے کہ آپ کچھ پریشان ہو گئی ہیں۔''
''ہاں۔'' شبانہ نے اعتراف کیا۔ ''یہ میرے لیے

پریشانی ہی کی بات ہے کہ وہ ٹھیک ہو کر واپس آجائے گا۔ کاش وہ اس جھگڑے میں مر ہی جاتا۔''

''میں ایک تدبیر آزمانا چاہتا ہوں۔ آپ میرے ساتھ اس کے پاس چلیں۔ آپ کو اچانک اپنے سامنے دیکھ کر اس کے چہرے کے تاثرات بدل سکتے ہیں اگر وہ اداکاری کر رہا ہے۔ اداکاری کرنے والے اچانک ذہنی جھٹکے پر اپنے تاثرات پر قابو نہیں رکھ پاتے۔ اسے گمان ہی نہیں ہوگا کہ آپ اچانک اس کے سامنے پہنچ جائیں گی۔''

''وہ مر ہی جاتا تو اچھا تھا اور آپ مجھے اس کی لاش کی شناخت کے لیے لے جاتے...... کاش!''

''میرا خیال ہے کہ آپ مجھ سے تعاون کریں گی۔''

شبانہ نے کچھ سوچا اور پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

آدھے گھنٹے بعد ہی سب انسپکٹر ثاقب، شبانہ کو ساتھ لے کر اسپتال پہنچ گیا اور ڈاکٹر سے ملا۔

''کیا پوزیشن ہے ڈاکٹر صاحب؟'' ثاقب نے پوچھا۔

''کوئی تبدیلی نہیں آئی۔'' ڈاکٹر نے شبانہ پر ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر جواب دیا۔ ''آج ایک سائیکاٹرسٹ ڈاکٹر نے اس سے ایک گھنٹے تک سوالات کرنے کے بعد اس نے کوئی حتمی رپورٹ تو نہیں دی لیکن خیال ظاہر کیا ہے کہ یادداشت کھونے کا معاملہ درست ہی معلوم ہوتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ کسی طرح اس کے ماضی کی چھان بین کی جائے یا اس کے جاننے والے اس کے سامنے لائے جائیں تو جو ذہنی جھٹکا لگے گا، وہ اس کی یادداشت واپس لا سکتا ہے۔ اسی سلسلے میں اس پر غور کیا گیا ہے کہ کل کے اخبارات میں اس کی تصویر دے دی جائے اور ٹی وی چینلز سے بھی نشر کروائی جائے۔''

''مناسب اقدامات سوچے ہیں آپ نے ڈاکٹر...... اسی سلسلے کا ایک تجربہ ہم اس وقت بھی کر سکتے ہیں۔ یہ تو میں نے آپ کو فون پر بتا دیا تھا کہ اس شخص کا نام سلطان ہے۔ اب آپ ان سے ملیے۔ یہ ہیں شبانہ سلطان۔''

ڈاکٹر نے چونک کر شبانہ کی طرف دیکھا۔ شبانہ کا چہرہ تاثرات سے عاری رہا۔

''یہ تو بڑا اچھا ہوگا...... آئیے۔'' ڈاکٹر نے اپنی میز کے پیچھے سے نکلتے ہوئے کہا۔ ''ہم ابھی انہیں سلطان کے کمرے میں لے چلتے ہیں۔''

پھر سلطان کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے ڈاکٹر بولا۔ ''ماہر نفسیات نے سلطان کو ایک لیپ ٹاپ مہیا کروایا ہے۔ اس سے کہا گیا ہے کہ وہ گوگل پر پاکستانی مردوں کے نام دیکھے۔ اپنا نام دیکھ کر اس کے ذہن میں ہلچل ضرور مچ سکتی ہے۔''

''یہ بھی مناسب قدم ہے۔'' ثاقب نے اس کی تائید کی۔

''آپ کے شوہر کل سے غائب ہیں۔'' ڈاکٹر نے شبانہ سے کہا۔ ''آپ کو اس سلسلے میں کوئی تشویش نہیں تھی؟''

''یہ ایک دوسری کہانی ہے ڈاکٹر صاحب!'' ثاقب بول پڑا۔ ''آپ پھر کسی وقت جان لیجیے گا۔''

''اس میں بھی کوئی کہانی ہے۔'' ڈاکٹر نے زیرِ لب دہرایا۔

ثاقب کچھ نہیں بولا۔ شبانہ تو اب تک خاموش ہی رہی تھی۔

وہ تینوں سلطان کے کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ نیم دراز حالت میں لیپ ٹاپ اپنی رانوں پر گھٹنے کے سہارے رکھے اسی پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ ان تینوں کی آہٹ سن کر اس نے ان کی طرف دیکھا۔

ثاقب اس وقت پورے انہماک سے سلطان کے چہرے پر نظر جمائے ہوئے تھا۔

سلطان نے شبانہ کو بھی دیکھا لیکن اس کے تاثرات میں رمق برابر تغیر نہیں آیا جو ثاقب کے لیے مایوس کن تھا۔

''کیوں ڈاکٹر صاحب؟'' سلطان بولا۔ ''کیا اب کسی پرائیویٹ سائیکاٹرسٹ کی خدمات حاصل کی گئی ہیں؟ یہ میں اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ ان خاتون کے جسم پر ڈاکٹر کا لباس نہیں ہے۔''

''یہ سائیکاٹرسٹ نہیں ہیں، کوئی اور ہیں۔ سوشل ورکر ہیں۔ مریضوں کو دیکھنے آتی رہتی ہیں۔ اس وقت تمہیں دیکھنے چلی آئیں۔''

سلطان نے سر کو خفیف سی جنبش دی اور ثاقب کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ ''کیا پولیس کو میرا بیان لینے کی اجازت دے دی گئی ہے جبکہ میں کسی کو کچھ بھی نہیں بتا سکتا۔''

''یہ بھی فی الحال تمہیں بس دیکھنے آگئے ہیں۔'' ڈاکٹر نے کہا پھر پوچھا۔ ''گوگل پر پاکستانی مردوں کے نام دیکھے؟''

''کافی دیکھ چکا ہوں۔ ابھی تک تو کوئی نام دیکھ کر میرے ذہن کو ذرا بھی جھٹکا نہیں لگا۔''

''دیکھتے رہو۔'' ڈاکٹر نے کہا اور پھر وہاں موجود نرس کو کچھ ہدایات دینے لگا۔

شبانہ اس دوران میں بھی بالکل چپ رہی تھی لیکن مسلسل سلطان کی طرف دیکھتی رہی تھی۔

جب وہ تینوں اس کمرے سے نکلے تو ڈاکٹر بولا۔ ''بیوی کو اچانک دیکھ کر بھی اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں آیا۔ شاید وہ واقعی اپنی یادداشت کھو چکا ہے۔''

''وہ بہت عیار ہے ڈاکٹر صاحب!'' شبانہ پہلی بار بولی۔

ڈاکٹر چونکا اور اس نے سوالیہ نظروں سے ثاقب کی طرف دیکھا۔

''بتاؤں گا کسی وقت۔'' ثاقب نے اس سے کہا۔ ''اب ہمیں اجازت دیجیے۔''

اسپتال سے باہر آکر ثاقب نے شبانہ سے کہا۔ ''میں آپ سے بھی کچھ معلوم کر چکا ہوں، تاہم کوئی خاص بات یاد آئے تو مجھ سے رابطہ کیجیے گا۔ یہ میرا کارڈ ہے۔'' اس نے اپنا کارڈ شبانہ کو دیا اور بولا۔ ''اب آپ کہاں جائیں گی؟ جہاں آپ چاہیں میں آپ کو ڈراپ کر سکتا ہوں۔''

ثاقب کے پاس پولیس کار تھی۔

شبانہ بولی۔ ''اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو مجھے میرے فلیٹ تک چھوڑ دیجیے۔ بینک کا وقت ابھی باقی ہے لیکن منیجر صاحب نے دن بھر کی ہی چھٹی دے دی تھی۔''

''آیئے۔'' ثاقب کار کی طرف بڑھا۔

شبانہ کا چہرہ اب بھی سپاٹ نظر آرہا تھا۔

''سلطان کو دیکھ کر آپ نے کیا محسوس کیا؟'' ثاقب نے کار چلاتے ہوئے پوچھا۔

''افسوس ہوا تھا مجھے۔'' شبانہ نے جواب دیا۔

''اس کی یادداشت کھو جانے کے باعث؟''

''نہیں۔'' شبانہ نے جواب دیا پھر کچھ رک کر بولی۔ ''اسے زندہ دیکھ کر افسوس ہوا تھا۔ جس سے بھی اس کا جھگڑا ہوا تھا اس نے اسے جان سے مار دیا ہوتا تو اچھا تھا۔ میں آپ کے ساتھ اس کی لاش کی شناخت کے لیے آتی۔''

''اتنی فیڈ اَپ ہو چکی ہیں آپ اس سے؟''

''آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔''

''ہوں۔'' ثاقب نے سر ہلایا پھر پوچھا۔ ''اپنے والد کو تو خبر دے دی ہوگی آپ نے؟''

''ابھی تک تو نہیں دی۔ کھانا کھا کر اُن سے ملنے جاؤں گی تو بتا دوں گی۔''

''رہیں گی اپنے فلیٹ ہی میں؟''

''جی ہاں، جب تک کوئی صورتِ حال قطعی طور پر سامنے نہ آجائے فلیٹ ہی میں رہوں گی۔ اگر ڈاکٹرز اس کی یادداشت واپس لانے میں کامیاب ہو گئے تو الگ صورتِ حال ہوگی اور اگر نا کام ہی رہے تو بھی میں اپنے والد کے گھر نہیں جاؤں گی۔ کرائے پر کوئی دوسرا مناسب سا فلیٹ لے لوں گی۔ مناسب تنخواہ ہے میری، والد صاحب سے بھی کسی ضرورت کے تحت مدد مل ہی جائے گی۔''

ثاقب نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

فلیٹ میں پہنچ کر شبانہ بستر پر گر سی پڑی۔ وہ تکان محسوس کرنے لگی تھی۔ اس کے دماغ میں یہ سوال ڈنک مار رہا تھا کہ اگر سلطان کی یادداشت واپس آگئی تو کیا ہوگا؟

☆☆☆

شام کا وقت تھا جب سب انسپکٹر ثاقب نے سلطان کے دوست رضوان کے فلیٹ کی کال بیل بجائی۔

''فرمایئے۔'' پشت سے آواز آئی۔

ثاقب نے مڑ کر دیکھا۔ وہ ایک جوان العمر قبول صورت نوجوان تھا۔ اس کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر عورت بھی تھی جو سفید ساڑی میں خاصی باوقار دکھائی دے رہی تھی۔

''اس فلیٹ میں رضوان صاحب رہتے ہیں نا؟'' ثاقب نے پوچھا۔

''جی میں ہی رضوان ہوں۔''

''میں سب انسپکٹر ثاقب۔''

''وہ تو آپ کی وردی سے ظاہر ہے لیکن پولیس کو مجھ سے......''

''کیا ہم بیٹھ کر بات نہیں کر سکتے؟''

''ضرور۔'' رضوان نے کہا اور چابی سے ہضمی قفل کھولتا ہوا بولا۔ ''یہ میری والدہ ہیں۔ ان کی طبیعت کچھ خراب تھی اس لیے میں انہیں ڈاکٹر کے پاس لے گیا تھا۔'' اس نے دروازہ کھول کر اندر قدم رکھا اور لائٹ جلائی۔ ''آیئے امی۔'' اس نے عورت کو مخاطب کیا تھا۔

''خیریت تو ہے بھائی؟'' رضوان کی ماں نے ثاقب سے پوچھا۔

''جی کوئی ایسی خاص پریشانی کی بات نہیں۔''

''پولیس والوں کو گھر کے دروازے پر دیکھ کر ڈر ہی لگتا ہے۔'' رضوان کی ماں نے فلیٹ میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

ثاقب اس کے پیچھے اندر داخل ہوا۔

"آپ اپنے کمرے میں جا کر آرام کیجیے امی۔" رضوان نے کہا۔ پھر ثاقب سے بولا۔ "تشریف رکھیں۔ اگر آپ کچھ جلدی آجاتے تو بس کال بیل بجاتے رہتے، کوئی جواب نہیں ملتا۔"

"کوئی ملازم نہیں ہے؟" ثاقب نے معقول طرز پر سجے ہوئے ڈرائنگ روم پر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"ملازم تو دو ہیں لیکن میاں بیوی ہیں۔ چھٹی کرنی ہوتی ہے تو دونوں ہی کرتے ہیں۔ ان کے گاؤں میں کوئی موت ہوگئی ہے اس لیے دو دن سے غیر چھوڑیں۔ میں یہ جاننے کے لیے بے چین ہوں کہ پولیس کو میرے گھر پر دستک دینے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟"

رضوان کی ماں ڈرائنگ روم سے جاچکی تھی۔

"آپ کے کوئی دوست ہیں جن کا نام سلطان ہے؟" ثاقب نے پوچھا۔

"اوہ۔" رضوان نے طویل سانس لی۔ "تو شبانہ نے رپورٹ کرا ہی دی۔ کل رات گئے اس کا فون آیا تھا۔ بتا رہی تھی کہ سلطان صبح سے غائب ہے۔"

"آپ شبانہ کو کب سے جانتے ہیں؟"

"سلطان سے اس کی شادی ہی اس واقفیت کا سبب ہے۔"

"گویا آپ شبانہ کو پہلے سے نہیں جانتے تھے؟"

"قطعی نہیں۔ صرف سلطان کو جانتا تھا۔ اس سے کسی تقریب میں ملاقات ہوئی تھی۔ یہ مجھے یاد نہیں کہ تعارف کس نے کرایا تھا۔ پھر سلطان خود ہی مجھ سے قریب ہوتا چلا گیا۔ آفس بھی آجاتا تھا۔ اس کا رونا یہ رہتا تھا کہ دنیا میں اس کا کوئی نہیں ہے اس لیے تنہا زندگی گزارتے گزارتے عاجز ہو چکا ہے۔ مختصر یہ کہ وہ شادی کرنا چاہتا تھا لیکن اس کی مشکل یہ تھی کہ وہ اکیلا تھا۔ خود اپنا رشتہ لے کر کہیں نہیں جا سکتا تھا۔ مجھے اس پر کچھ ترس آیا تو میں نے اسے اپنی والدہ سے ملا کر اس کا مسئلہ بتایا۔ والدہ نے اس سے پوچھا، کیا کوئی لڑکی اس کی نظر میں ہے؟ اس نے محبت سے شبانہ کا نام لے دیا۔ اس کے کوائف بھی بتا دیے۔ اب میری والدہ کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ کسی اجنبی لڑکے کے لیے کہیں رشتے کے لیے کیسے جائیں...... دو ایک دن سوچ بچار میں گزر گئے۔ اس دوران میں سلطان نے مجھے چائے پر بھی بلایا۔ اپارٹمنٹ شان دار تھا اس لیے میں نے یقین بھی کرلیا کہ اس کے حالات اچھے تھے۔"

"شبانہ سے تو مجھے معلوم ہوا ہے کہ......"

"آپ کو صحیح معلوم ہوا ہوگا لیکن میں بھی غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔ اگر آپ میری پوری بات سن لیں تو سب سمجھ میں آجائے گا۔"

"کہیے۔" ثاقب نے طویل سانس لی۔

"مختصر یہ کہ میں نے کسی طرح اپنی والدہ کو منا لیا کہ وہ سلطان کو اپنا کوئی قریبی عزیز بتا کر رشتہ لے کر جائیں۔ اگرچہ میری والدہ خاصی سمجھ دار ہیں لیکن انہوں نے میری بات مان ہی لی۔ اس طرح یہ رشتہ طے پا گیا۔ سلطان کی ایک خواہش یہ بھی تھی کہ اس کی برات ہمارے ہی گھر سے جائے اور ایک رات بھی وہ یہیں گزارے تو اسے خوشی ہوگی کہ وہ دنیا میں اکیلا نہیں ہے۔ شادی ہونے تک اس نے بار بار یہاں آکر والدہ کی چاپلوسی کر کر کے انہیں شیشے میں اتار لیا تھا۔ اسی لیے والدہ اس کی بات مان گئیں اور اس نے شبانہ کے ساتھ پہلی رات ہمارے ہی گھر میں گزاری۔ دوسرے دن وہ شبانہ کو لے کر چلا گیا۔ ایک گھنٹے بعد ہی واپس آکر وہ جہیز بھی لے گیا جو اسے شادی میں ملا تھا۔ وہ تو چند دن بعد شبانہ مجھے سرِراہ ملی تو اس نے مجھ پر شدید غصے کا اظہار کیا۔ بات چلی تو مجھ پر کھلا کہ سلطان تو بہت بڑا فراڈ تھا۔ اس کے بعد میں اس اپارٹمنٹ پر گیا جہاں اس نے میری دعوت کی تھی۔ وہ مجھے مقفل ملا۔ پاس پڑوس کے لوگوں نے بتایا کہ وہ تو عرصے سے بند پڑا ہے۔ بس ایک دن کے لیے کچھ ملازم قسم کے آدمی آئے تھے جنہوں نے اپارٹمنٹ کی صفائی کی اور فرنیچر وغیرہ لا کے وہاں سیٹ کیا تھا۔ پاس پڑوس کے لوگوں نے سمجھا کہ اب کوئی وہاں رہنے آئے گا۔ ایک دن دو سوٹڈ بوٹڈ نوجوان وہاں ایک دو گھنٹے کے لیے آئے بھی تھے لیکن اس کے بعد سے وہ اپارٹمنٹ بند ہی پڑا ہے۔"

"یعنی اس اپارٹمنٹ کے سلسلے میں بھی کوئی فراڈ ہوا ہے؟"

"یقینی طور پر۔"

"آپ اس اپارٹمنٹ کا پتا بتا سکتے ہیں؟"

رضوان نے پتا بتایا۔ ثاقب نے اپنے موبائل میں فیڈ کرلیا۔

رضوان بولا۔ "آپ چاہیں تو تنہائی میں میری والدہ کا بیان بھی لے سکتے ہیں۔ وہ میرے ایک ایک لفظ کی تصدیق کریں گی۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔" ثاقب کھڑا ہوگیا۔

"مجھے اور میری والدہ کو شبانہ سے بے حد ہمدردی

ہے۔ ایک اعتبار سے میں اور میری والدہ شبانہ کو اس کھائی میں گرانے کے ذمے دار ہیں۔"

"ہوتا ہے۔ ایسا ہو جاتا ہے کسی وقت کہ انسان نادانستگی میں کسی کا آلۂ کار بن جاتا ہے۔" ثاقب نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھادیا۔

"ارے باتوں میں آپ سے پوچھنا ہی بھول گیا کہ آپ چائے پینا پسند کریں گے یا کولڈ ڈرنک؟"

"اس تکلف کی ضرورت نہیں۔"

رضوان اُسے چھوڑنے دروازے تک آیا۔

☆☆☆

سلطان نے سائیکاٹرسٹ کو کمرے میں آتے دیکھ کر لیپ ٹاپ بند کر دیا۔ ویسے بھی اس کے سر میں درد ہونے لگا تھا نام پڑھتے پڑھتے۔

"کوئی نتیجہ نکلا؟" سائیکاٹرسٹ نے لیپ ٹاپ کی طرف اشارہ کیا۔

"بس دو نام ہیں جن کو دیکھ کر دماغ میں تھوڑی سی ہلچل ہوئی تھی۔"

سلطان کو اس وقت تک بتایا نہیں گیا تھا کہ پولیس اس کا نام معلوم کر چکی ہے۔

"وہ نام کیا ہیں؟"

"ایک نام تو سفیان ہے۔" سلطان نے جواب دیا۔ "دوسرا نام اتفاقاً نظر میں آیا تھا۔ وہ تو کسی عورت کا نام معلوم ہوتا ہے، آصفہ۔"

"ہاں۔" سائیکاٹرسٹ نے اثبات میں سر ہلایا۔ "یہ نام کسی مرد کا تو نہیں ہوسکتا۔"

سلطان خاموش رہا۔ سائیکاٹرسٹ نے اس کے بتائے ہوئے نام اپنے پاس نوٹ کر لیے۔ اس کی دانست میں سفیان کے نام پر سلطان کے دماغ میں یوں ہلچل ہوئی تھی کہ وہ اس کے اصل نام سے ملتا جلتا تھا۔ آصفہ کے نام پر اس کی دماغی ہلچل کا سبب سامنے نہیں تھا۔

سائیکاٹرسٹ بولا۔ "آپ سے کہا گیا تھا کہ آپ اپنا ماضی یاد کرنے کی کچھ کوشش تو کریں۔"

"کی ہے۔" سلطان نے طویل سانس لے کر کہا۔ "اور ایک عجیب بات محسوس ہوئی۔"

سائیکاٹرسٹ بڑی توجہ سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

سلطان کچھ رک کر سوچتا ہوا بولا۔ "مجھے کچھ یوں محسوس ہوا ہے جیسے میں کسی کے ساتھ زیادتی کا مرتکب ہوتا رہا ہوں۔"

"کوئی ایسی زیادتی جسے جرم بھی کہا جاسکتا ہے؟"

"جرم۔" سلطان کے دماغ کو جھٹکا سا لگا اور اس کی سانس قدرے ناہموار ہوگئی۔

"ہاں، ہاں! سوچیے۔" سائیکاٹرسٹ جلدی سے بولا۔

اس وقت سلطان کے دماغ نے اس طرح کام کیا کہ اگر اس نے ماضی میں کوئی جرم کیا ہے تو اسے اس کا اظہار نہیں کرنا چاہیے۔ وہ اس کے لیے کسی پریشانی کا سبب بن سکتا تھا۔

"مجھے اس سے زیادہ کچھ یاد نہیں آرہا ہے۔" سلطان نے کچھ رک کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"اس سلسلے میں دماغ پر زیادہ زور نہ ڈالیے۔" سائیکاٹرسٹ نے کہا۔ "بس کسی وقت اس پر تھوڑا سا غور کر لیا کیجیے۔"

سلطان خاموش رہا۔

آدھے گھنٹے تک مختلف باتیں کرنے کے بعد سائیکاٹرسٹ نے اٹھتے وقت ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "آپ کو مخاطب کرنے کے لیے فی الحال فرض کر لیتے ہیں کہ آپ کا نام سفیان ہی ہے۔"

"جی۔"

سائیکاٹرسٹ چلا گیا۔ سلطان نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس سے کہا گیا تھا کہ وہ 'جرم' کے بارے میں دماغ پر زیادہ دباؤ نہیں ڈالے لیکن اب اس کی کیفیت یہی تھی کہ دماغ میں ایک بھونچال سا آ گیا تھا۔

جرم...... جرم...... جرم......!

کیا وہ کوئی جرائم پیشہ ہے؟ یہ سوال اُس کے دماغ پر ہتھوڑے کی طرح برسنے لگا اور اتنا برسا کہ وہ نڈھال ہو گیا اور پھر یک بہ یک چیخ اٹھا۔ "نرس۔"

نرس جلدی سے اس کے قریب آئی۔ "کیا ہوا؟"

"میرا سر درد سے پھٹ جائے گا۔ مجھے اس کی کوئی دوا دو۔"

"میں ابھی آئی۔" نرس نے کہا اور دوڑتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

واپسی پر اس کے ساتھ ڈاکٹر بھی تھا۔ اس وقت سلطان دونوں ہاتھوں سے اپنی کنپٹیاں دبا رہا تھا۔ چہرے پر بھی تکلیف کے تاثرات تھے۔

"سر میں درد؟" ڈاکٹر بولا۔

"شدید۔"

''مجھے ابھی بتایا گیا تھا کہ کسی بھی ایک معاملے پر اپنے دماغ پر آپ زیادہ زور نہ ڈالیں لیکن آپ نے غالباً ایسا ہی کیا تھا۔''

اس دوران میں ڈاکٹر کے اشارے پر ایک انجکشن تیار کرلیا گیا۔

''آپ کو ایک انجکشن دیا جارہا ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''آپ سو جائیں گے۔ جب اٹھیں گے تو درد نہیں ہوگا۔ میں بھی آپ کو یہ تاکید کرتا چلوں کہ کسی بھی معاملے میں دماغ پر زیادہ دباؤ نہ ڈالیں۔''

نرس نے سلطان کو انجکشن لگا دیا اور سلطان پر دھیرے دھیرے غنودگی طاری ہونے لگی۔ پوری طرح نیند کی گرفت میں جانے سے پہلے اس نے ڈاکٹر کی آواز سنی۔ ''کل آپ کی تصویر میڈیا پر آجائے گی۔ آپ کا کوئی نہ کوئی جاننے والا اسپتال سے ضرور رابطہ کرے گا۔''

اس کے بعد سلطان نیند کی آغوش میں جاچکا تھا۔

نیند میں اُس نے کئی چہروں کی جھلکیاں دیکھیں۔ ان میں دو تین لڑکیاں اور دو تین مرد تھے۔ ان مردوں میں سے ایک تو نہایت خطرناک قسم کا بدمعاش معلوم ہو رہا تھا۔ ایک لڑکی نے اسے ''پیٹرول ماسٹر'' کہہ کر مخاطب کیا تھا۔

پھر اس کی آنکھ صبح ہی کھلی۔ سر میں درد نہیں تھا۔ نرس نے اسے ناشتا کرایا اور اس کی طبیعت پوچھی۔

''اس وقت تو ٹھیک ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

ذرا دیر بعد ہی ڈاکٹر اسے دیکھنے آیا۔ اسی وقت اس کے سر کی ڈریسنگ بھی تبدیل کی گئی۔

''سر کی تکلیف کا کیا حال ہے؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

''بہت معمولی سی ہے۔''

''گڈ!'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''آج کے اخبارات میں آپ کی تصویر آچکی ہے۔ ٹی وی چینلز پر بھی دکھا دی گئی ہے۔ ضرور آپ کا کوئی جاننے والا آئے گا یہاں۔''

لیکن دوپہر تک کسی نے بھی اسپتال سے رابطہ نہیں کیا تھا۔

لنچ کے بعد سب انسپکٹر ثاقب ڈاکٹر سے ملنے آیا۔

''کیا پروگریس ہے ڈاکٹر صاحب؟'' اس نے پوچھا۔

''حیران ہوں۔'' ڈاکٹر نے تشویش سے کہا۔ ''اب تک کسی نے بھی اسپتال سے رابطہ نہیں کیا۔ کسی کا فون تک نہیں آیا۔''

ثاقب نے پوچھا۔ ''کیا وہ اس قابل ہوگیا ہے کہ اسے اسپتال میں رکھنا ضروری نہ ہو۔''

''آج شام تک اسے اسپتال سے اس شرط پر ڈسچارج کیا جاسکتا ہے کہ دو ایک دن تک کوئی اس کی دیکھ بھال کرنے والا ہو لیکن اسپتال سے وہ جائے گا کہاں؟''

''یہ میں بھی سوچ رہا ہوں۔ یہ خیال میرے ذہن میں اس لیے آیا کہ اگر وہ اسپتال کے علاوہ کہیں اور ہو تو کوئی اس سے ملنے آجائے شاید...... اب تک کسی کا نہ آنا ظاہر کرتا ہے کہ اس کا ماضی ٹھیک نہیں ہے۔ اس کے جاننے والے بھی ٹھیک لوگ نہیں ہوں گے۔ ایسے لوگ خود کو ایکسپوز کرنے سے گریز کرتے ہیں لیکن وہ کہیں اور رہے گا تو وہ لوگ چوری چھپے اس سے ملنے جاسکتے ہیں۔ کیا خود اسے تعجب نہیں کہ کسی نے بھی اس کے بارے میں اسپتال سے رابطہ نہیں کیا؟''

''یہ الجھن تو اسے ہوئی ہے۔ ابھی سائیکاٹرسٹ ڈاکٹر نے بھی اس سے ایک سٹنگ کی ہے۔''

''اس کا خیال ہے کہ اس کا نام سفیان ہے؟''

''ہاں، صرف خیال ہے، یقین نہیں ہے۔ ویسے آج ایک عجیب بات سامنے آئی ہے۔ نیند میں اس نے خواب میں کچھ چہرے دیکھے تھے۔ ان میں ایک شخص کچھ بدمعاش قسم کا تھا۔ اسے ایک لڑکی نے پیٹرول ماسٹر کہہ کر مخاطب کیا تھا۔''

ثاقب چونکا۔ ''پیٹرول ماسٹر؟''

''جی ہاں، کیا آپ کسی ایسے شخص کو جانتے ہیں جسے پیٹرول ماسٹر کہا جاتا ہو؟''

''میں چونکا اس لیے کہ پیٹرول ماسٹر جیسا نام کسی نے کیسے رکھ لیا۔''

''ہاں، نام تو عجیب سا ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ اس قسم کے نام جرائم پیشہ لوگ رکھ لیتے ہیں یا اس سے متعلقین افراد اسے یہ نام دے دیتے ہیں۔''

اسی وقت چپراسی کمرے میں آیا۔

''ڈاکٹر صاحب!'' اس نے کہا۔ ''ایک خاتون نے مریض کے کمرے کے بارے میں پوچھا تھا اسپتال کے ایک آدمی سے...... اسے کمرا تو نہیں بتایا گیا لیکن یہ مشورہ دیا گیا کہ وہ آپ سے مل لے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ سفیان کو جانتی ہے۔''

یہ خبر ثاقب اور ڈاکٹر، دونوں ہی کو چونکا دینے والی تھی۔

''وہ کہاں ہے؟'' ڈاکٹر نے جلدی سے پوچھا۔

''میں اُسے اپنے ساتھ لایا ہوں۔ وہ باہر انتظار

کررہی ہے۔‘‘
’’بھیجو اسے اندر۔‘‘
تھوڑی دیر بعد ایک خوب صورت عورت اندر آئی۔ وہ خاصی میک اَپ زدہ اور الٹرا ماڈرن معلوم ہوتی تھی۔ اس نے سرخ رنگ کا اسکارف جدید فیشن کے انداز میں لپیٹا ہوا تھا۔
’’بیٹھیں۔‘‘ ڈاکٹر نے اس سے کہا۔
وہ بیٹھ گئی اور بولی۔ ’’میں سفیان کو جانتی ہوں۔‘‘
’’کیسے جانتی ہیں؟‘‘ ثاقب سوال کر بیٹھا۔
’’میں اپنے بارے میں کوئی بات چھپانا نہیں چاہتی۔ میں ایک سوسائٹی گرل ہوں۔ سفیان کبھی کبھی میرے پاس آیا کرتے تھے۔‘‘
’’تو ان کا نام سفیان ہی ہے؟‘‘
’’میں نے اخبار میں یہی پڑھا ہے۔‘‘
’’آپ خود انہیں کس نام سے جانتی ہیں؟‘‘
’’مجھے انہوں نے کبھی اپنا صحیح نام نہیں بتایا۔ کبھی کچھ، کبھی کچھ...... میں نے شکایت بھی کی تو ہنس کر ٹالنے کی کوشش کی۔ ایک مرتبہ میں ان کے پیچھے ہی پڑ گئی تو وہ بڑی سنجیدگی سے بولے، ضد مت کرو۔ مناسب وقت پر تمہیں سب کچھ معلوم ہوجائے گا۔‘‘
’’ان سے آپ کے تعلق کی نوعیت؟‘‘
’’میں ابھی بتا چکی ہوں کہ میں ایک سوسائٹی گرل ہوں پھر بھی آپ مجھ سے تعلق کی نوعیت پوچھ رہے ہیں؟‘‘ وہ بڑے دبنگ انداز میں بول رہی تھی۔ ثاقب کی وردی سے وہ قطعی مرعوب نہیں ہوئی تھی۔
ثاقب نے یکا یک لفظ ’’آپ‘‘ کا تکلف برطرف رکھا اور بولا۔ ’’تم نے ابھی تک اپنا نام نہیں بتایا۔‘‘
’’الماس نام ہے میرا۔‘‘
’’کہاں رہتی ہو؟‘‘
الماس نے ایک ایسی عمارت کا نام بتایا جہاں کے اپارٹمنٹ خاصے مہنگے تھے۔
’’اس کا مطلب ہے، خاصی مال دار ہو؟‘‘
’’مال دار تو نہیں کہا جاسکتا لیکن میں مفلوک الحال بھی نہیں ہوں۔ کار بھی ہے میرے پاس۔‘‘
’’گویا تعلقات بھی اچھے خاصے لوگوں سے ہوں گے؟‘‘
’’یقیناً۔‘‘
’’لیکن ہماری تفتیش کے مطابق سفیان مال دار نہیں تھا۔‘‘
’’سفیان سے میرا تعلق پیسے کی بنیاد پر نہیں تھا۔ میں اسے پسند کرتی تھی۔‘‘
’’محبت؟‘‘ ثاقب نے کچھ تلخ لہجے میں کہا۔
’’اسے آپ جو نام دینا چاہیں، دیں۔‘‘
’’تمہارے اپارٹمنٹ میں وہ کتنی بار رہا؟‘‘
’’تعداد تو مجھے یاد نہیں...... گننے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔‘‘
’’کچھ اندازہ تو ہوگا؟‘‘
’’کم از کم دس بارہ مرتبہ تو رکا ہوگا وہ میرے گھر میں۔‘‘
’’اس وقت اسے نہیں معلوم کہ وہ کہاں رہتا تھا۔ آج اسپتال سے اسے ڈسچارج کیا جائے گا۔ کیا تم اسے اپنے گھر میں رکھ سکتی ہو؟‘‘
’’دل و جان سے۔‘‘
’’لیجیے۔‘‘ ثاقب، ڈاکٹر کی طرف متوجہ ہوا۔ ’’اب اس سلسلے میں تو آپ کو کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں۔‘‘
’’ہاں۔‘‘ ڈاکٹر نے کہا۔ ’’ان کی وجہ سے اب یہ سوچنے کی ضرورت نہیں رہی۔‘‘
’’شام کو ڈسچارج کیا جائے گا سفیان کو۔‘‘ ثاقب نے الماس سے کہا۔ ’’تم شام کو آکر اسے اپنے ساتھ لے جاؤ۔‘‘
’’وہ تو میں لے جاؤں گی لیکن اس وقت...... ابھی...... کیا میں اس سے نہیں مل سکتی؟ ہوسکتا ہے وہ مجھے پہچان لے۔‘‘
ثاقب نے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔
’’کوئی حرج نہیں ہے اس میں۔‘‘ ڈاکٹر نے کہا۔
’’ملوا دیتے ہیں انہیں سفیان سے۔‘‘
الماس کھڑی ہوگئی۔ وہ سفیان سے ملنے کے لیے بے چین تھی۔
اب ڈاکٹر بھی کھڑا ہوا۔ ’’آیئے۔‘‘ اس نے ثاقب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
وہ تینوں سفیان کے کمرے کی طرف چل دیے۔
’’تم کچھ اندازہ لگا سکتی ہو؟‘‘ ثاقب نے الماس سے پوچھا۔
’’کس بارے میں؟‘‘
’’بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے سفیان کو ڈھلان میں دھکیل کر ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی۔ اگر وہ چند گز آگے تک لڑھک جاتا تو دلدلی زمین میں جا گرتا اور

اس کی موت یقینی ہو جاتی۔"
"شکر ہے کہ وہ بچ گیا۔"
"میں یہی پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس کا جانی دشمن کون ہو سکتا ہے؟"
"میں اس کے جاننے والوں سے بھی واقف نہیں ہوں تو یہ کیسے کہہ سکتی ہوں کہ فلاں شخص اس کی جان کا دشمن تھا۔"
ثاقب چپ ہو گیا کیونکہ ڈاکٹر سفیان کے کمرے کا دروازہ کھول رہا تھا۔
سفیان آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ ان تینوں کی آہٹ سن کر اس نے آنکھیں کھولیں اور اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی۔
"لیٹے رہو۔" ڈاکٹر نے جلدی سے کہا۔
سفیان نے الماس پر اجنبیت سے نظر ڈالی اور بولا۔ "یہ بھی کوئی سوشل ورکر ہیں؟"
شبانہ کے بارے میں اسے یہی بتایا گیا تھا کہ وہ ایک سوشل ورکر ہے۔ اسی روشنی میں سفیان نے الماس کے بارے میں اظہارِ خیال کیا تھا۔
"یہ تمہاری دوست ہیں۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "الماس نام ہے اِن کا...... اخبار میں تمہاری تصویر دیکھ کر آئی ہیں۔"
الماس لپک کر سفیان کے قریب گئی اور بڑے پیار بھرے انداز میں اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔ "تم اب کیسا محسوس کر رہے ہو؟"
"میں ٹھیک ہوں۔" سفیان نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ "سر میں تکلیف بھی برائے نام ہے۔ تم میری دوست ہو تو مجھے میرے ماضی کے بارے میں بتاؤ۔ میرا دماغ اسی میں اُلجھا ہوا ہے۔"
"بتاؤں گی۔" الماس نے سر ہلایا۔
"تو بتاؤ۔" سفیان بے چین تھا۔
"ابھی زیادہ باتیں نہیں۔" ڈاکٹر بولا۔ "آج شام تمہیں ڈسچارج کر دیا جائے گا پھر کر لینا باتیں۔"
"میں کہاں جاؤں گا ڈاکٹر؟" سفیان نے کچھ پریشان ہو کر کہا۔ "میرے پاس نہ پیسا ہے، نہ کچھ اور...... مجھے بتایا گیا تھا کہ میرے پاس پرس یا اس قسم کی کوئی چیز نہیں تھی۔"
"شناختی کارڈ اور بن جائے گا۔ فی الحال تمہیں پیسوں کی بھی ضرورت نہیں ہے۔" ڈاکٹر نے کہتے ہوئے الماس کی طرف دیکھا۔
"جی ہاں۔" الماس بولی۔ "پیسے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔"
"دراصل......" ڈاکٹر نے سفیان سے کہا۔ "شام کو یہ تمہیں اسپتال سے اپنے گھر لے جائیں گی۔"
سفیان نے الماس کی طرف دیکھا۔
"یقیناً۔" الماس نے سفیان کا ہاتھ دبایا۔ "میں جب آؤں گی تو تمہارے لیے کچھ کپڑے اور ضروریات کا سامان بھی خریدتی لاؤں گی۔"
"خوش قسمتی ہے میری کہ مجھے میری ایک اچھی دوست نے پہچانا۔" سفیان نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔
الماس نے ڈاکٹر اور ثاقب کی موجودگی کی پروا کیے بغیر جھک کر سفیان کی پیشانی چوم لی۔
ڈاکٹر بولا۔ "اب اِن سے تمہاری ملاقات شام کو ہو گی۔"
"ہاں۔" ثاقب نے کہا۔ "اب سفیان کو آرام کرنے دیا جائے۔"
الماس اب بھی سفیان کا ہاتھ تھامے ہوئے تھی اور سفیان کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا۔
"چلیں الماس۔" ڈاکٹر نے کہا۔
"جی۔" الماس نے آہستگی سے سفیان کا ہاتھ چھوڑا۔
پھر وہ تینوں سفیان کے کمرے سے نکلے۔
ثاقب نے الماس سے کہا۔ "سفیان کے بارے میں کچھ جاننے یا سمجھنے پر مجھ سے ضرور رابطہ کرنا۔" ثاقب نے اپنا کارڈ اسے دیا۔
"یقیناً۔" الماس نے کہا۔
ثاقب ڈاکٹر کے پاس ہی رکا اور الماس چلی گئی۔

☆☆☆

تھوڑی دیر بعد سب انسپکٹر ثاقب بھی اسپتال سے نکلا۔ اس کے دماغ میں خیالات کا ہجوم تھا۔ اس نے اب تک جو وقت گزارا تھا، نہایت مصروف گزارا تھا۔ شبانہ کے والد اور اس کی دوسری بیوی سے گزشتہ رات ہی ملاقات کر لی تھی۔ فیروزہ چہرے ہی سے بڑی حرافہ معلوم ہو رہی تھی۔
"میں اپنی بیٹی کے لیے مغموم ہوں۔" شبانہ کے باپ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا مستقبل کیا ہوگا؟"
ثاقب نے انہیں بتا دیا تھا کہ سلطان پولیس کو کس حالت میں ملا تھا اور اب کس حالت میں ہے۔
"یہ افسوس ناک بات ہے کہ وہ اپنی یادداشت کھو

بیٹھا ہے۔'' فیروزہ نے اظہارِ خیال کیا تھا۔
''وہ مر ہی جاتا تو اچھا تھا۔'' شبانہ کے باپ نے زہریلے لہجے میں کہا۔
''ایسی بات تو نہ کریں آپ۔'' فیروزہ تڑخ کر بولی۔ ''آپ ہی کی بیٹی بیوہ ہو جائے گی۔''
شبانہ کا باپ بے بسی سے اُس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

☆☆☆

ثاقب کو ان دونوں سے بھی یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ سلطان کا جانی دشمن کون ہو سکتا ہے۔
ثاقب وہاں سے لوٹا تھا تو اس کی نظر میں فیروزہ کا کردار مشکوک ہو چکا تھا۔ شک تو خیر اسے شروع ہی میں ہو گیا تھا کیونکہ سلطان سے شبانہ کی شادی کے معاملے میں وہ بہت فعال رہی تھی۔
رضوان کے بارے میں بھی ثاقب نے سوچا تھا کہ شک کے دائرے سے اسے بھی باہر نہیں رکھنا چاہیے۔ ہو سکتا تھا کہ سلطان کے سلسلے میں اس کا بیان غلط ہو اور وہ جانتا ہو کہ سلطان کس قسم کا آدمی ہے اور اس نے یہ بات اپنی ماں سے چھپائی ہو۔
ان دونوں کے علاوہ ثاقب کی نظر میں شبانہ بھی مشتبہ تھی۔ سلطان کو ہلاک کرنے کا اس کے پاس جواز بھی تھا۔ سلطان کی حرکتوں سے وہ تنگ آ چکی تھی اس لیے اسے ہلاک کرنے کی کوشش کر سکتی تھی۔
اسپتال سے نکلنے کے بعد وہ سوچتا رہا کہ اسے اپنے محکمے کے آدمیوں کے ذریعے ان تینوں ہی کی نہیں بلکہ الماس کی نگرانی بھی کروانی چاہیے۔
ان سبھی کی بے خبری میں ثاقب نے اپنے موبائل سے ان کی تصویریں بھی لے لی تھیں جو اس نے اپنے دفتر پہنچ کر تین آدمیوں کے حوالے کیں۔
''الماس کا پتا کیا ہے سر؟'' ایک آدمی نے پوچھا۔
''شام کو جب وہ رضوان کو اسپتال سے لے جائے گی تو اس کا تعاقب کرنا، پتا معلوم ہو جائے گا۔''
''جی سر۔''
''اور ہاں...... پیٹرول ماسٹر کی کیا خبر ہے؟''
''ان دنوں کوئی ایسی واردات نہیں ہوئی کہ اس کی طرف شبہ جا سکے۔'' ایک ماتحت نے جواب دیا۔
''یہ تو مجھے بھی معلوم ہے۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ وہ آج کل کہاں رہ رہا ہے؟ اس کے ٹھکانے تو کئی ہیں نا؟''
''یہ تو معلوم کرنا پڑے گا صاحب کہ آج کل وہ کہاں رہتا ہے۔''
''ہوں...... اچھا خیر...... تم تینوں تو بس ان کاموں کو دیکھو جو میں نے تمہیں دیے ہیں۔ پیٹرول ماسٹر کا ٹھکانا میں کسی اور سے معلوم کرواؤں گا۔ اب تم لوگ جاؤ۔ ابراہیم کو بھیج دینا۔''
ابراہیم بھی ثاقب کا ماتحت ہی تھا۔ وہ آیا تو ثاقب نے اس سے بھی پیٹرول ماسٹر کے بارے میں استفسار کیا۔ جواب وہی ملا جو پہلے ماتحتوں سے مل چکا تھا۔
ثاقب نے کہا۔ ''معلوم کرو کہ وہ آج کل کہاں ہے...... سرِعام تو وہ بہت کم دکھائی دیتا ہے۔''
''میں زیادہ سے زیادہ کل تک معلوم کر لوں گا۔''
''اس کے علاوہ ایک کام اور...... ایک پتا لکھو۔''
ابراہیم نے کاغذ قلم سنبھال لیا۔
ثاقب نے اس اپارٹمنٹ کا پتا بتایا جہاں رضوان کے بقول سلطان نے اس کی دعوت کی۔ پتا لکھوانے کے بعد اس نے کہا۔ ''یہ معلوم کرنا ہے کہ اس اپارٹمنٹ کا مالک کون ہے؟''
''بہتر صاحب، یہ تو آسانی سے معلوم ہو جائے گا۔''
''بس۔'' ثاقب نے اس طرح کہا جیسے ابراہیم کو اپنے کمرے سے رخصت کرنا چاہتا ہو۔
ابراہیم چلا گیا۔
ثاقب نے کرسی کی پشت گاہ سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں اور اب تک کے سارے واقعات اس کے ذہن میں چکرانے لگے۔ اس کا تو اب اسے مکمل یقین ہو گیا تھا کہ سلطان اپنی یادداشت کے معاملے میں جھوٹ نہیں بول رہا تھا ورنہ اس کی زبان پر پیٹرول ماسٹر کا نام نہیں آتا۔
پیٹرول ماسٹر انڈر ورلڈ کے دو ایک اہم مجرموں میں سے ایک تھا۔ اس پر مقدمات تو کئی چل چکے تھے اور کئی چل رہے تھے لیکن سزا اسے ایک ہی بار ہوئی تھی۔ باقی مقدمات میں وہ بہت بڑے بڑے وکیل کر کے صاف بچ نکلا تھا۔ سزا بھی اسے بہت معمولی ہوئی تھی کیونکہ وہ معاملہ ہی اہم نہیں تھا۔ کسی جواز کے بغیر ثاقب کے ذہن میں یہ خیال تھا کہ اس معاملے میں پیٹرول ماسٹر کا کردار اہم ثابت ہو سکتا ہے۔

☆☆☆

شبانہ دفتر سے آ کر تھکے ہوئے انداز میں بستر پر لیٹی ہی تھی کہ اس کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ اس نے موبائل اٹھایا اور اس کے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ موبائل اسکرین پر اکبر کا نام چمک رہا تھا۔

شبانہ نے بے تابی سے کال ریسیو کی۔ ''ہیلو اکبر! کہاں تھے اتنے دن سے؟ کئی مرتبہ کال کر چکی ہوں۔'' وہ جذباتی ہوگئی۔

''میں نے وہ موبائل بند کر دیا تھا شبانہ۔'' بھرائی ہوئی سی آواز آئی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ تم مجھے فون کرو۔ بات کھل جانے کی صورت میں تمہاری گھریلو زندگی پر اثر پڑ سکتا تھا۔ وہ تو سلطان کے بارے میں اخبار میں پڑھ کر میں صبح سے ہی بے چین تھا کہ اب بھی تمہیں فون کروں یا نہ کروں۔ اس وقت مجھے خود پر اختیار نہیں رہا اور میں نے اپنے پرانے موبائل سے تمہیں کال کی۔''

''جہنم میں گئی میری گھریلو زندگی۔'' شبانہ نے کہا۔

''تم چھ ماہ میں واپسی کا وعدہ کر کے گئے تھے اور اب رابطہ کیا ہے تم نے مجھ سے؟''

''میں بتا دوں گا تمہیں سب کچھ۔''

''میں فوراً تم سے ملنا چاہتی ہوں۔ میرا پتا لکھو۔''

''لکھنے کی ضرورت نہیں، مجھے معلوم ہے۔''

''اچھا ٹھہرو...... میں آجاتی ہوں۔ تم اپنا پتا بتاؤ۔''

''میں اِس وقت کہیں اور ہوں۔ گھر پہنچنے میں ایک گھنٹا لگ سکتا ہے۔''

''تمہاری والدہ تو مجھے پہچانتی ہیں۔ میں وہاں پہنچ کر تمہارا انتظار کرلوں گی۔''

''وہاں اب کوئی نہیں ہے شبانہ۔'' ٹھنڈی سانس لے کر کہا گیا۔ ''تین مہینے پہلے والدہ کا انتقال ہو چکا ہے۔''

''اوہ...... سو سیڈ...... وہ بہت اچھی خاتون تھیں۔''

''موت کہاں دیکھتی ہے اچھے بُرے کو شبانہ...... اچھا ہو اگر تم اب اس موضوع پر مزید کوئی بات نہ کرو۔ میں زیادہ دکھی ہو جاتا ہوں۔''

''میں تمہارا دکھ بانٹنے کی کوشش کروں گی اکبر۔''

''لیکن سلطان کا......''

''نام نہ لو اُس منحوس کا...... کم بخت مر جاتا تو اچھا تھا۔ تم گھر پہنچو، میں ایک گھنٹے بعد آجاؤں گی۔''

اکبر نے پتا بتایا اور ایک آدھ رسمی بات کر کے رابطہ منقطع کر دیا۔

شبانہ بستر سے اٹھ کر ٹہلنے لگی۔ دفتر سے آتے وقت اس نے سوچا تھا کہ تھوڑی دیر آرام کر کے چائے بنائے گی لیکن اب اسے کسی چیز کی خواہش نہیں رہی تھی۔ اس کا بس چلتا تو وہ اُڑتی ہوئی اکبر کے پاس پہنچ جاتی۔

اکبر اس کا محبوب تھا۔ دونوں ایک ہی کالج میں پڑھے تھے۔ شبانہ ایک سال پیچھے تھی اس لیے اکبر نے گریجویشن پہلے کرلیا تھا۔ اس کے بعد بھی وہ چوری چھپے ایک دوسرے سے ملتے اور فون پر باتیں کیا کرتے تھے۔ شبانہ کے والد اور خود اکبر کی خواہش بھی یہ تھی کہ شبانہ بی اے کر لے تو وہ دونوں شادی کر لیں۔ اکبر کی ماں کو تو شبانہ بہت پسند تھی۔ اکبر کے والد بھی اس وقت زندہ تھے۔ ان کا اوسط درجے کا کوئی کاروبار تھا جس کے لیے انہیں کبھی کبھی چار چھ مہینے کے لیے باہر کے کسی ملک میں جانا پڑتا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد جب اکبر نے کاروبار سنبھالا اسی وقت اسے بیرونِ ملک جانے کی ضرورت پیش آئی۔

شبانہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ وہ دونوں چند ماہ کے لیے بچھڑ رہے ہیں تو وہ بے قرار ہوگئی لیکن اکبر کی کاروباری مجبوریوں کے سبب کہہ نہ سکی کہ اکبر باہر نہ جائے۔

''فون پر تو ہم بات کر سکیں گے نا اکبر؟'' اس نے کہا تھا۔

''یقیناً کر سکتے ہیں لیکن میں چاہتا ہوں کہ اس موقع پر ہم اپنی محبت کو آزمائیں۔ ایک دوسرے سے دور رہتے ہوئے دیکھیں کہ ہمارا دل کتنا تڑپتا ہے اور پھر کئی ماہ کی جدائی کے بعد جب ہم ملیں گے تو خوشی سے ہمارا کیا حال ہوگا شبانہ...... ذرا تصور کرو، کیسی بے پناہ خوشی حاصل ہوگی ہمیں۔''

شبانہ محبت کا یہ ''تجربہ'' کرنے کے لیے دل سے تیار نہیں تھی لیکن اکبر نے کسی نہ کسی طرح اسے آمادہ کرلیا تھا۔

''چار ساڑھے چار ماہ کی تو بات ہے میری جان۔'' اکبر نے کہا۔ ''اور پھر اس دورے سے ایک بہت بڑے فائدے کی امید ہے، بلکہ یقینی سمجھو اسے، پھر ہماری شادی بڑی دھوم دھام سے ہو سکے گی۔ ابھی تو میرے حالات ایسے نہیں ہیں کہ زیادہ اخراجات کرسکوں۔ اس وقت تک تم امتحان بھی دے چکی ہوگی اور یقیناً پاس ہو جاؤ گی۔ تمہارا ریکارڈ ہے کہ کبھی فیل نہیں ہوئیں۔''

اس قسم کی باتوں کے بعد اکبر چلا گیا تھا۔

امتحان کے بعد نتیجہ بھی آگیا۔ اتنے دن ضبط کرنے کے بعد شبانہ سے برداشت نہیں ہوسکا۔ وہ بے چین ہوگئی کہ اپنے سیکنڈ ڈویژن میں آنے کی خبر اکبر کو دے لیکن اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ اس ملک میں اکبر کا فون نمبر کیا تھا۔ اگر وہ چاہتا تو شروع ہی میں شبانہ کو کسی طرح اپنا وہاں کا نمبر بتا سکتا تھا لیکن وہ وہی کرنے پر تُلا ہوا تھا جو اس نے شبانہ کو سمجھایا تھا۔

''خیر! شبانہ نے اپنے دل کو سمجھایا تھا، اب زیادہ سے زیادہ پندرہ ہی دن تو اور رہ گئے ہیں۔ اکبر نے کہا تھا کہ وہ ساڑھے چار ماہ میں تو ضرور آجائے گا۔

لیکن وہ پندرہ دن کئی مرتبہ گزر گئے اکبر نہ آیا۔ شبانہ بے چین ہوکر بار بار اکبر کی والدہ کے پاس جاتی۔

''کام کچھ بڑھ گیا ہوگا۔'' اکبر کی والدہ اسی قسم کا جواب دیا کرتی تھیں لیکن شبانہ نے محسوس کیا تھا کہ وہ اس سے کچھ چھپا رہی تھیں۔ وہ عموماً مغموم ہی نظر آتی تھیں۔

شبانہ کو ایک کھٹکا سا ہوا۔ کہیں اکبر نے وہاں کسی مال دار سے شادی نہ کرلی ہو جس کا علم اکبر کی والدہ کو ہو چکا ہو جس کی وجہ سے وہ مغموم رہنے لگی تھیں اور اس قسم کی بات شبانہ کو بھی نہ بتانا چاہتی ہوں۔

اس خیال سے شبانہ بہت روئی لیکن رونے سے حالات بدل نہیں جاتے۔ اسی دوران میں سلطان کا رشتہ آگیا۔ اس کے والد اپنی نئی بیوی کی انگلیوں پر ناچنے لگے تھے۔ اس کے دباؤ کی وجہ سے انہوں نے شبانہ پر دباؤ ڈالا۔ اکبر کی طرف سے مایوس ہو جانے کے بعد اس نے باپ کی بات مان لی اور ایک نہایت تکلیف دہ زندگی گزارنے لگی۔ اس نے اکبر کے گھر جانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ والدہ کو کبھی فون بھی نہیں کیا تھا اور نہ انہوں نے اس سے فون پر رابطہ کیا تھا۔

اور اب اچانک اکبر کی کال آگئی تھی۔ وہ کچھ افسردہ بھی معلوم ہوا تھا۔

شبانہ وقت سے چند منٹ پہلے ہی اس کے گھر پہنچ گئی۔ اکبر بھی آچکا تھا۔ ان کی ملاقات میں وارفتگی تھی۔

''کب آئے ہو تم؟'' شبانہ نے بے چینی سے پوچھا۔

''اور فون پر تم نے سلطان کی بات کیوں کی تھی؟''

''مجھے آئے ہوئے چار ماہ گزر چکے ہیں شبانہ...... آتے ہی مجھے تمہاری شادی کا علم بھی ہوگیا تھا۔ میں آتے ہی تمہیں فون کرتا لیکن شادی کی بات سن کر میں نے یہ قدم نہیں اٹھایا۔ میں تمہاری گھریلو زندگی میں رخنہ نہیں ڈالنا چاہتا تھا لیکن چھان بین کرنے سے مجھے یہ علم ہوگیا تھا کہ تم اپنی یہ شادی شدہ زندگی خوش گوار انداز میں نہیں گزار رہی ہو۔ اس کے باوجود میں تم سے رابطہ نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن سلطان کے بارے میں خبر سن کر مجھ سے رہا نہ گیا۔''

''تمہارے بر وقت نہ آنے اور کوئی اطلاع نہ ملنے کے باعث میں شادی پر مجبور ہوگئی۔ تمہاری والدہ مجھے کچھ بتاتی نہیں تھیں لیکن مغموم نظر آتی تھیں۔ اس سے میں نے یہ سمجھا کہ تم نے وہاں کسی مالدار اسامی سے شادی کرلی۔ اسی وجہ سے والدہ مغموم رہنے لگی تھیں۔''

''اور اس سے تم نے یہ سمجھ لیا کہ میں نے شادی کرلی ہوگی۔'' اکبر نے افسردگی سے کہا۔

''تو پھر تمہیں دیر کیوں ہوگئی؟ اور اتنی دیر؟''

''اسی بزنس میں ایک مخالف پارٹی نے مجھے ایک جعلی کیس میں پھنسوا دیا تھا۔ میں کئی ماہ جیل میں رہا لیکن آخرکار عدالت نے مجھے باعزت بری کردیا۔ میں نے امی سے کہا تھا کہ وہ تمہیں یہ بات نہ بتائیں۔ تمہیں صدمہ ہوگا۔ میں تمہیں اپنے باعزت بری ہونے کے آرڈر بھی دکھا سکتا ہوں۔''

اکبر نے اپنا بریف کیس کھولنا چاہا۔

''کیا کررہے ہو؟'' شبانہ نے اسے روکا۔

''کاغذات، آرڈر نکال رہا ہوں۔ کاپی ہے اس کی۔''

''ضرورت نہیں مجھے وہ دیکھنے کی، کیا میں تمہاری زبان پر یقین نہیں کروں گی؟''

''لیکن میرا انتظار نہیں کرسکیں۔''

''کاش میں تمہارے حالات سے باخبر ہو جاتی۔''

''سلطان جیسے شخص کو تم نے قبول کیسے کرلیا؟''

''غم اور مایوسی کی حالت میں تھی۔'' شبانہ نے جواب دیا اور پھر تفصیل سے۔۔۔ سب کچھ بتا دیا۔

سننے کے بعد اکبر نے ٹھنڈی سانس لی اور بولا۔ ''جو کچھ ہوگیا، اس پر اب ماتم کرنے سے کیا حاصل؟''

''وہ اپنی یادداشت کھو چکا ہے۔''

''یادداشت واپس بھی آسکتی ہے، وہ زیرِ علاج ہے۔''

''تو پھر میں اُس سے طلاق کا مطالبہ کروں گی یا خلع......''

''اس کے ساتھ تمہاری زندگی جس طرح گزر رہی تھی، اسے تم نے کیسے برداشت کیا؟ تمہیں پہلے ہی یہ قدم اٹھالینا چاہیے تھا۔''

''میری...... میرا مطلب ہے ڈیڈی کی دوسری بیوی فیروزہ اس میں رکاوٹ رہی۔ ڈیڈی اس کے دباؤ میں ہیں۔ وہ مجھے سمجھاتے تھے کہ اس قسم کا اقدام اپنی ذات پر داغ لگانے کے مترادف ہے۔ شوہر سے اس قسم کی علیحدگی لڑکی کی زندگی کو بہت زیادہ متاثر کرتی ہے۔''

اکبر ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔

''میری زندگی مسلسل کرب بن چکی ہے اب۔'' وہ کچھ توقف سے بولا جبکہ اس دوران میں شبانہ اپنے آنسوؤں میں ڈوبی آنکھیں خشک کرتی رہی۔

''میں تمہاری زندگی کو اس کرب سے نکالوں گی۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

''اس کے لیے ایک طویل انتظار کرنا ہوگا۔ اس کی یادداشت نہ جانے کب واپس آئے۔ طلاق یا خلع کی صورت تو تبھی بنے گی۔''

''اگر اس کی یادداشت جلد واپس نہ آئی تو میں عدالت سے رجوع کر سکتی ہوں۔ کہا جاسکتا ہے کہ میں اپنی زندگی اس شخص کے لیے کیوں برباد کروں جو غیر معینہ مدت کے لیے یادداشت کھو چکا ہے۔''

''اس کے لیے خاصا انتظار کرنا پڑے گا۔ زیادہ مدت کے بعد ہی عدالت اس بارے میں کوئی فیصلہ کر سکے گی۔ ویسے میں قانون سے واقف نہیں ہوں۔ کوئی وکیل ہی حتمی طور پر بتا سکتا ہے کہ یہ قدم کتنے عرصے بعد اٹھایا جاسکتا ہے۔''

''چند دن گزر جائیں تو میں کسی وکیل سے رابطہ کروں گی۔''

''نہیں، تم مت کرنا۔ میں ملوں گا کسی وکیل سے۔''

''اب میں تم سے زیادہ دن تک دور نہیں رہ سکتی۔ جی تو یہ چاہ رہا ہے کہ اسی وقت سے تمہارے ساتھ رہنا شروع کردوں۔''

''شادی سے پہلے یہ قطعی مناسب نہیں ہوگا۔''

ان دونوں نے آمنے سامنے بیٹھ کر باتیں کی تھیں۔ اب شبانہ یک لخت اٹھی تو اکبر بھی یہ جاننے کے لیے جلدی سے اٹھا کہ وہ کیا کرنا چاہتی ہے۔ شبانہ اچانک اس سے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اکبر کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے تھے۔ اس نے شبانہ کو رونے سے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ چاہتا ہوگا کہ شبانہ کے دل کا غبار اچھی طرح نکل جائے۔

آخر شبانہ کے آنسو خود ہی رکے لیکن سسکیاں رکنے میں بھی کچھ وقت لگا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہوگئی تھیں۔ اکبر نے اسے بٹھایا اور بولا۔

''میں تمہارے لیے کوئی ٹھنڈا مشروب لاتا ہوں۔''

''نہیں، میرے سر میں شدید درد ہو رہا ہے۔ ٹھنڈک سے اور بڑھ جائے گا۔''

''تو چائے یا کافی پی لو۔''

''کسی ہوٹل سے منگاؤ گے؟''

''نہیں، میں سب کچھ خود ہی کرتا ہوں۔ کچن میں سب کچھ ہے۔''

''تو مجھے وہاں لے چلو، میں بناؤں گی۔''

''آؤ۔''

شبانہ نے کچن میں کافی بنائی اور دونوں پھر ڈرائنگ روم میں آبیٹھے۔ شبانہ کا چہرہ اترا ہوا تھا۔

''کیا یہ ممکن ہے کہ اسے قتل ہی کرنے کی کوشش کی گئی ہو یا اتفاق بھی ہو سکتا ہے کہ وہ پیر پھسل جانے کی وجہ سے......''

''یہ ممکن نہیں۔'' شبانہ نے اس کی بات کاٹی۔ ''پولیس کو وہاں سے کوئی گاڑی نہیں ملی تھی۔ کیا سلطان وہاں تک پیدل گیا ہوگا؟''

''ہوں۔'' اکبر نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''نکتہ تو ہے یہ...... میں نے یہ بھی پڑھا ہے کہ وہ دلدلی زمین سے کچھ پہلے ہی رک گیا تھا۔ اگر دلدلی زمین میں گر جاتا تو اس کی موت یقینی تھی۔''

''کاش ایسا ہو جاتا۔''

''پولیس کے سامنے اس قسم کی کوئی بات نہ کر بیٹھنا۔ وہ لوگ تم پر ہی شبہ کرنے لگیں گے۔''

''میں شاید اس قسم کی کوئی بات پولیس سے کہہ بھی چکی ہوں۔''

''اگر ایسا ہو چکا ہے تو اچھا نہیں ہوا۔''

''مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔''

''مجھے تو ہے۔ میں تمہیں کسی پریشانی میں پڑتا کیسے دیکھ سکتا ہوں۔''

''پریشانی ہوگی تو وقتی ہوگی۔ مارنے والے اصل شخص تک پہنچنے کے بعد تو پولیس مجھے پریشان نہیں کرے گی۔''

اکبر پھر اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

''اب رات ہونے والی ہے۔'' وہ کچھ توقف سے بولا۔ ''کھانا میرے ساتھ ہی کھا کر جانا۔''

''میں اب بہت دیر تک رہوں گی تمہارے ساتھ...... اتنے عرصے بعد تو ملے ہیں۔''

شبانہ نے واقعی خاصا وقت اکبر کے ساتھ گزارا۔ محبت کے معاملے میں ماضی کی بہت سی یادیں تھیں جو اُن کی زبان پر آتی رہیں۔

ساڑھے گیارہ بج چکے تھے جب شبانہ نے کہا۔ ''اس

سے زیادہ دیر ہو گئی تو ٹیکسی نہیں ملے گی۔"

"ہاں اب دیر تو ہو گئی ہے لیکن ٹیکسی کی ضرورت نہیں۔ کار ہے میرے پاس۔ چلو، میں تمہیں چھوڑ آؤں۔"

☆☆☆

سب انسپکٹر ثاقب کو رات گئے ایک غیر متوقع خبر ملی۔

"میں نے اس کے بینک پر نظر رکھی تھی۔" دوسری طرف سے کہا جا رہا تھا۔ "جب وہ وہاں سے نکلی تو میں نے اس کا تعاقب کیا۔ وہ اپنے گھر ہی پہنچی تھی لیکن آدھے گھنٹے بعد پھر نکلی اور ٹیکسی کر کے روانہ ہو گئی۔ میں نے برابر اس پر نظر رکھی۔ اپارٹمنٹس کی ایک عمارت کے سامنے اس نے ٹیکسی چھوڑی اور اس عمارت کے ایک اپارٹمنٹ میں گئی۔ میں برابر اس کے پیچھے لگا رہا تھا۔ جب وہ اپارٹمنٹ میں چلی گئی تو میں نے آگے بڑھ کر دیکھا کہ اس اپارٹمنٹ کے دروازے پر اکبر زنجانی کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی۔"

"اپارٹمنٹ کا نام؟" ثاقب پوچھ بیٹھا۔

دوسری طرف سے اپارٹمنٹ کا نام بتایا گیا۔

"ہوں۔" ثاقب نے سر ہلایا۔ "آگے چلو۔"

"وہ وہاں خاصی رات تک رکی۔ شاید ساڑھے گیارہ بج چکے تھے جب وہ وہاں سے نکلی تو ایک جوان العمر شخص بھی اس کے ساتھ باہر نکلا۔ اس نے اپنی کار میں شبانہ کو اس کے فلیٹ تک پہنچایا۔ وہاں سے وہ کہاں گیا، یہ میں نہیں جانتا۔ مجھے تو شبانہ پر نظر رکھنی تھی۔"

"وہ اکبر زنجانی تھا؟"

"یہ تو میں ابھی نہیں کہہ سکتا صاحب۔"

"یہ بھی معلوم کرنا پڑے گا۔ اس کی ذمے داری کسی اور پر ڈالوں گا۔"

"میں نے موبائل سے ان دونوں کی کئی تصویریں لی ہیں، ایک مرتبہ تیز روشنی میں ان دونوں کے چہرے بھی تصویر میں صاف آ گئے ہیں۔"

"یہ تم نے بہت اچھا کام کیا۔ وہ تصویریں مجھے بھیج دو۔"

"ابھی بھیج دیتا ہوں۔ یہ بتایئے صاحب کہ میں کیا رات بھر شبانہ کے فلیٹ کے سامنے رکوں؟"

"اب تو ضروری ہو گیا ہے کہ اس پر ہر وقت نظر رکھی جائے لیکن تم اب تھک گئے ہو گے۔ تمہاری جگہ لینے کے لیے میں کسی اور کو بھیجتا ہوں۔"

"میں انتظار کرتا ہوں صاحب۔"

ثاقب نے رابطہ منقطع کر کے کسی اور سے رابطہ کیا اور اسے شبانہ کے فلیٹ پر پہنچنے کی ہدایت کی۔

جو تصویریں شبانہ اور نامعلوم شخص کی تھیں، وہ بھی اسے موبائل پر مل گئیں جنہیں اس نے بہت غور سے دیکھا۔ شبانہ کا ساتھی خاصا وجیہہ تھا۔

یہاں سے معاملہ شاید آگے بڑھے، وہ لیٹ کر سوچنے لگا، ایک شادی شدہ عورت کا اتنی رات گئے تک کسی کے اپارٹمنٹ میں رہنا کوئی بے معنی بات نہیں تھی۔

اسی شام ثاقب کو یہ رپورٹ بھی مل چکی تھی کہ جس اپارٹمنٹ میں سلطان نے رضوان کی دعوت کی تھی، وہ داراب خان نام کے کسی شخص کا تھا۔

"معلوم کرو کہ یہ داراب خان کون ہے۔" ثاقب نے ہدایت دی تھی۔

پیٹرول ماسٹر کے بارے میں یہ اطلاع ملی تھی کہ وہ ان دنوں اپنے خاص علاقے ہی میں تھا اور وہ علاقہ خاصا بدنام تھا۔ وہاں رہنے والوں کی اکثریت جرائم پیشہ تھی۔

ثاقب کے دماغ میں یہ خیال گردش کرتا رہا کہ کیا اسے پیٹرول ماسٹر سے ملنا چاہیے؟

دماغ میں چکراتے ہوئے انہی خیالات کے ساتھ اسے نیند آ گئی۔

دوسرے دن بھی وہ اطلاعات ہی کا منتظر رہا۔ ابھی کوئی ایسی بات اس کے علم میں نہیں تھی کہ اسے خود حرکت میں آنا پڑتا۔

ایک مرتبہ اسپتال کے ڈاکٹر سے بھی فون پر بات ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ سلطان کو الماس اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ سلطان اس کے ساتھ خوشی خوشی گیا تھا۔ ڈاکٹر کے خیال کے مطابق الماس کے حسن پر سلطان کی رال ٹپکی پڑ رہی تھی۔

اس کا مطلب تھا کہ سلطان عیاش طبع بھی تھا۔

دوپہر کے بعد اسے اطلاع ملی کہ داراب خان ایک اچھا خاصا بزنس مین تھا جسے دو ایک مرتبہ پیٹرول ماسٹر کے علاقے میں جاتے ہوئے دیکھا جا چکا تھا۔

"گڈ۔" ثاقب نے سوچا، اب پیٹرول ماسٹر سے ملنے کا جواز تو ملا۔

اطلاعات کے انتظار میں بستر پر پڑے پڑے اور سوچتے سوچتے وہ بور ہو گیا تھا۔ اس نے فوراً کار نکالی اور پیٹرول ماسٹر کے علاقے کی طرف روانہ ہو گیا حالانکہ اس کے علم میں تھا کہ اگر پولیس کا کوئی آدمی اس علاقے میں جاتا تو اسے روکا ضرور جاتا تھا۔

یہی ثاقب کے ساتھ بھی ہوا۔ اس کی کار علاقے میں ڈیڑھ فرلانگ سے زیادہ آگے نہیں گئی تھی کہ چار آدمی اچانک سامنے آگئے۔ ثاقب کو بریک لگانے پڑے۔

ان میں سے ایک آدمی تیزی سے ڈرائیونگ سیٹ کے پاس آکر بولا۔ ''کدھر جاتا مسٹر؟ پتا نہیں یہ کس کا علاقہ ہے؟''

''معلوم ہے۔'' ثاقب نے سکون سے کہا۔

''تو یہ نہیں معلوم کہ اس علاقے میں پولیس والوں کا داخلہ بند ہے؟''

''میں وردی میں نہیں ہوں۔''

''اس سے کیا ہوتا ہے...... پولیس کا آدمی تو پولیس کا آدمی ہے۔ تم کو یہ سارا علاقہ جانتا ہے۔ واپس جاؤ۔ جدھر جانا ہے، کسی اور راستے سے جاؤ۔''

''لیکن میں تمہارے ہی علاقے میں آیا ہوں۔''

''کیوں؟'' تیوری چڑھا کر پوچھا گیا۔

''پیٹرول ماسٹر سے ملنا ہے۔'' ثاقب کے سکون میں فرق نہیں آیا۔

''کیا بولا؟'' اس آدمی کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

''پیٹرول ماسٹر سے ملنا ہے۔''

''اے بھائی!'' وہ اپنے باقی ساتھیوں کی طرف دیکھ کر بلند آواز سے بولا۔ ''یہ پولیس والا صاحب ہمارے ماسٹر سے ملنے آیا ہے۔''

ان تینوں میں کھچڑی پکنے لگی، پھر وہ بھی کار کے پاس آگئے۔

''کیوں ملنا ہے؟'' ایک نے پوچھا۔

''یہ میں تمہارے ماسٹر ہی کو بتاؤں گا۔ اُسے اطلاع دے دو کہ میں اُس سے ملنا چاہتا ہوں۔ تم سبھی کے پاس موبائل تو ہوں گے۔''

وہ چاروں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

''اطلاع دے دو۔'' ثاقب نے پھر کہا۔ ''نہیں دو گے تو تمہیں ماسٹر کی ڈانٹ سننی پڑے گی۔ معاملہ کچھ ایسا ہی ہے۔''

ان چاروں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو کچھ اشارے کیے پھر ان میں سے ایک اپنی جیب سے موبائل نکال کر کار سے کچھ دور جانے لگا۔ ایک جگہ رک کر اس نے موبائل پر کوئی نمبر ملایا۔ ثاقب سکون سے بیٹھا رہا۔ اس نے انجن بند کر دیا تھا۔

موبائل پر بات کرنے والا ایک منٹ سے بھی کم وقت میں لوٹا۔ اُس کے چہرے پر کچھ حیرت کا تاثر تھا۔ وہ قریب آتے ہی بولا۔

''حکم ملا ہے کہ انہیں عزت کے ساتھ ان کی پارٹی میں بھیج دیا جائے۔ انہیں خوشی ہوگی کہ پولیس والے بھی ان کی سالگرہ میں شریک ہوں گے۔''

''سالگرہ ہے آج تمہارے ماسٹر کی؟'' ثاقب بول پڑا۔

''ہاں، زور کا جشن منایا جا رہا ہے۔'' جواب دیا گیا پھر اس نے اپنے دو ساتھیوں سے کہا۔ ''انہی کی کار میں بیٹھ کر انہیں وہاں پہنچا دو۔''

ثاقب نے انجن اسٹارٹ کیا۔

دونوں آدمیوں میں سے ایک پچھلی نشست پر اور دوسرا ڈرائیونگ سیٹ کے برابر میں بیٹھ گیا۔

ثاقب نے انجن تو اسٹارٹ کر دیا تھا لیکن کار فوری طور پر حرکت میں لانے کے بجائے جیب سے موبائل نکال کر اپنے ایک ماتحت سے رابطہ کیا۔

''سنو!'' اس نے کہا۔ ''میں اس وقت پیٹرول ماسٹر سے ملنے جا رہا ہوں۔ ہوں بھی اسی کے علاقے میں...... اپنے تمام ساتھیوں سے کہہ دو کہ مجھے آدھے گھنٹے تک فون نہ کریں۔ کریں گے بھی تو جواب نہیں ملے گا۔ میں اپنا فون بند کر رہا ہوں۔''

''ٹھیک ہے صاحب...... شاید آپ کہنا چاہتے ہیں کہ ایک گھنٹے کے بعد بھی فون پر آپ سے رابطہ نہ ہو تو ہم حرکت میں آجائیں۔''

''ہاں۔'' ثاقب نے کہا اور رابطہ منقطع کر کے موبائل بند کیا اور جیب میں ڈالنے کے بعد کار حرکت میں لایا۔

کوئی دو میل چلنے کے بعد ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے کہیں ڈرم بج رہے ہوں۔ کچھ اور آگے بڑھنے پر انگریزی موسیقی کی مدھم آواز بھی سنائی دی۔ جیسے جیسے کار آگے بڑھتی رہی، وہ آوازیں بھی قریب آتی چلی گئیں۔

''مجھے بڑا افسوس ہے کہ آج ہماری ڈیوٹی باہر لگائی گئی ہے۔'' پچھلی نشست پر بیٹھا ہوا آدمی بولا۔

''مجھے بھی اچھا نہیں لگ رہا ہے۔'' ثاقب کے قریب بیٹھے ہوئے آدمی نے کہا۔ ''ماسٹر کی سالگرہ کی پارٹی بہت شاندار ہوتی ہے۔''

یہ بات ثاقب پہلے بھی سن چکا تھا کہ اس دن پیٹرول ماسٹر کی سالگرہ منائی جا رہی ہے۔ اپنے علاقے میں بھی وہ

اسی لیے تھا ورنہ پتا لگنا مشکل ہو جاتا کہ وہ ان دنوں کہاں قیام پذیر ہے۔اس کا کوئی ایک ٹھکانا نہیں تھا۔

آخر ایک دو منزلہ لیکن خاصے بڑے مکان کے سامنے ثاقب سے کار روکنے کے لیے کہا گیا۔

ڈرم وغیرہ کی آوازیں اسی مکان سے آرہی تھیں۔

''تم بس میرے ساتھ چل پڑو۔'' ثاقب کے ساتھ بیٹھے ہوئے آدمی نے کہا۔ ''تمھاری کار کی حفاظت میرا ساتھی کرے گا۔'' پھر وہ دروازہ کھول کر کار سے اتر گیا۔

ثاقب کو یہ دیکھ کر عجیب سا لگا کہ وہاں دس بارہ کاریں اور بھی کھڑی تھیں۔

''یہ گاڑیاں کس کی ہیں؟'' ثاقب بے اختیار پوچھ بیٹھا۔

''ماسٹر کے خاص مہمانوں کی۔'' جواب ملا۔

ثاقب کے قیاس کے مطابق وہ ''خاص مہمان'' شاید شہر کے معززین ہی میں سے ہوں جنھیں 'نام نہاد معززین' کہا جا سکتا تھا۔ ثاقب ایسے کئی افراد کو جانتا تھا جو کالے دھندوں میں ملوث تھے۔ اسی لیے یہ امکان بھی تھا کہ انھیں اپنے معاملات میں پیٹرول ماسٹر کے تعاون کی ضرورت پیش آتی ہو۔

ثاقب کو ایک ایسے ہال میں پہنچایا گیا کہ وہ اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس علاقے کے کسی مکان میں اتنا شاندار ہال بھی ہوگا جس کی چمکتی ہوئی شفاف دیواروں پر نہایت خوب صورت پھول بوٹے ہلکے رنگوں میں بنائے گئے تھے۔ ہال میں چاروں طرف کرسیاں لگی ہوئی تھیں جن کے بیش قیمت ہونے میں کوئی شبہ ہی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ انھی کرسیوں میں دس بارہ کے قریب زرنگار کرسیاں تھیں جن میں سے ایک کرسی باقی کرسیوں سے قدرے بلند اور خاصی شاندار بھی تھی۔ پیٹرول ماسٹر اسی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ ثاقب نے اسے اس لیے پہچان لیا کہ اس کی تصویریں اخبارات میں متعدد بار چھپی تھیں۔

باقی کرسیوں پر جو ''معززین'' تھے، ان میں سے بھی کئی ثاقب کے لیے اجنبی نہیں تھے۔

ہال کے وسط میں ایک خاصا بڑا دائرہ تھا جہاں آرکسٹرا اپنا کام دکھا رہا تھا۔ اس کی آوازیں چاروں طرف کی دیواروں سے لگا کر رکھے گئے بڑے بڑے اسپیکرز پر گونج رہی تھیں۔ اس دائرے کے گرد ایک درجن لڑکیاں نیم عریاں حالت میں رقص کر رہی تھیں اور کچھ لڑکیاں مہمانوں کو شراب سرو کر رہی تھیں۔

صرف پیٹرول ماسٹر کی کرسی کے آگے ایک مائیکروفون لگا ہوا تھا اور اس کا کنکشن بھی اسپیکرز سے تھا کیونکہ جب وہ بولا تو اس کی آواز ان اسپیکرز پر بھی سنائی دی۔

ثاقب نے ہال میں قدم رکھا ہی تھا کہ اسپیکرز پر پیٹرول ماسٹر کی آواز سنائی دی۔ ''اسٹاپ آرکسٹرا۔''

فوراً ہال میں سناٹا چھا گیا۔

جو آدمی ثاقب کو لے کر آیا تھا، وہ اب بھی اس کے ساتھ تھا اور اسے پیٹرول ماسٹر کی کرسی کی طرف لے جا رہا تھا۔

پیٹرول ماسٹر کی آواز پھر گونجی۔ ''پہلی مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ ہماری پولیس کے ایک افسر میری سالگرہ میں شرکت کے لیے آئے ہیں لہٰذا کوئی ایسی دُھن بجائی جائے جسے استقبالیہ دُھن کہا جا سکے۔''

فوراً ہی کسی جانب سے دو لڑکیاں آئیں جن کے ہاتھوں میں پھولوں سے بھرے ہوئے طشت تھے۔ وہ ثاقب کے قدموں میں پھول بکھیرنے لگیں۔

ثاقب تلملا سا گیا۔ اسے محسوس ہوا تھا جیسے اس کا مذاق اُڑایا جا رہا ہو لیکن وہ اس پر احتجاج نہیں کر سکتا تھا۔

وہ پیٹرول ماسٹر کے قریب پہنچ گیا۔ فوراً پیٹرول ماسٹر کے برابر میں بیٹھا ہوا ایک معزز اٹھا اور دوسری کرسی پر جا بیٹھا جو ابھی خالی ہی پڑی تھی۔

''خوش آمدید پولیس مین۔'' پیٹرول ماسٹر نے بظاہر بڑی گرم جوشی سے ثاقب کا استقبال کیا اور خالی کرسی کی طرف اشارہ کر کے بیٹھنے کے لیے کہا۔

ہال میں آرکسٹرا کا شور گونجنے لگا لڑکیاں پھر رقص کرنے لگی تھیں۔

''مجھے علم نہیں تھا کہ آج یہاں یہ ہنگامہ ہو گا۔'' ثاقب کو آرکسٹرا کی وجہ سے خاصی بلند آواز میں بولنا پڑا تھا۔ ''میں تم سے کچھ باتیں کرنے آیا ہوں۔''

''وہ بھی ہو جائیں گی پولیس مین! چند منٹ تو اس جشن کا مزہ لو۔''

اسی وقت ایک لڑکی قریب آئی اور اس نے ثاقب کو شراب پیش کی۔

''میں پیتا ہوں لیکن اس وقت نہیں پیوں گا۔'' ثاقب نے نفی میں سر ہلایا۔

''اس طرح تو میری میزبانی پر حرف آجائے گا

پولیس مین۔'' پیٹرول ماسٹر بولا۔ ''تھوڑی سی تو لو۔ بس ایک پیگ۔''

ثاقب کو طوعاً و کرہاً ایک پیگ لینا پڑا۔

ہال میں کئی وڈیو کیمرے بھی حرکت کررہے تھے جو اس ساری تقریب کی ویڈیو بنارہے تھے۔

''میں عجلت میں تھا۔'' ثاقب نے پیٹرول ماسٹر سے کہا۔

''اوہ پولیس مین!'' پیٹرول ماسٹر کو جیسے افسوس ہوا۔ ''میں چاہتا تھا کہ تم بیس بائیس منٹ تو لطف اندوز ہو۔ خیر! آؤ۔'' وہ کھڑا ہوا۔

پیٹرول ماسٹر ثاقب کو ہال کے عقب میں لے گیا۔ اس طرف خاصی چوڑی راہداری تھی جس کے اختتام پر ایک دروازہ نظر آرہا تھا۔

''تم نے ابھی تک ایک گھونٹ بھی نہیں لیا معزز پولیس مین۔'' پیٹرول ماسٹر نے ثاقب کے ہاتھ میں دبے ہوئے گلاس کی طرف اشارہ کیا۔

ثاقب نے ایک طویل سانس لی اور رک کر شراب کی ایک چسکی لی اور پیٹرول ماسٹر کے ساتھ پھر آگے بڑھنے لگا۔

''میں اپنے سیکریٹری سے بات کروں گا۔'' پیٹرول ماسٹر بولا۔ ''مجھے تو یاد نہیں کہ آج کل مجھ پر کوئی کیس چل رہا ہو جس کے لیے تم مجھ سے کسی قسم کی پوچھ گچھ کے لیے آئے ہو۔''

''میں تم سے کسی اور شخص کے بارے میں بات کرنے آیا ہوں۔'' ثاقب نے کہا۔

''اوہ!'' پیٹرول ماسٹر نے سامنے نظر آنے والا دروازہ کھولا۔

وہ دونوں آگے پیچھے دروازے کی دوسری جانب پہنچے۔ پیٹرول ماسٹر نے دروازہ بند کیا اور ہال کی طرف سے آنے والے شوروغل کی آواز بند ہوگئی۔

''یہ ساؤنڈ پروف کمرا ہے۔'' پیٹرول ماسٹر نے ایک صوفہ سیٹ کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

اس وسیع کمرے میں تین جانب صوفہ سیٹ لگے ہوئے تھے اور باقی سب کچھ آرائش کے لیے تھا۔

''بیٹھو پولیس مین!'' پیٹرول ماسٹر نے ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا اور اپنے ہاتھ میں دبے گلاس سے ایک گھونٹ لیا۔

ثاقب کو پیٹرول ماسٹر کا ''پولیس مین'' کہنا بھی گراں گزر رہا تھا لیکن وہ اُسے اس لیے برداشت کرتا رہا کہ ایک

اعتبار سے وہ پیٹرول ماسٹر کے قبضے میں تھا۔ اس نے ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”مجھے تم سے ایک شخص کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنی ہیں۔“

”وہی سفیان کا قصہ ہوگا۔“ پیٹرول ماسٹر نے کہا۔

”آج کل پولیس اسی شخص کی تلاش میں ہے جس نے سفیان کو دلدلی زمین کی طرف دھکا دیا تھا۔“

”تو تم سفیان کو جانتے ہو؟“

”بالکل نہیں، میں نے تو اس کے بارے میں بس اخبار میں پڑھا ہے یا ٹی وی کی خبروں میں سنا ہے۔“

ثاقب نے چند لمحے رک کر کہا۔ ”سفیان اس کا فرضی نام رکھا گیا ہے۔ اس کا اصل نام کیا ہے، یہ تو وہ خود بھی نہیں جانتا۔ میں تم سے ایک خاص شخص کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں جس کا ایک خوب صورت اپارٹمنٹ ہے۔“ ثاقب نے اپارٹمنٹس کا نام بھی بتایا۔ ”دس گیارہ ماہ قبل سفیان نے وہ اپارٹمنٹ استعمال کیا تھا۔“

پیٹرول ماسٹر کا چہرہ سپاٹ رہا۔ وہ بولا۔ ”کیا ہے تو کیا ہوا۔“

”لیکن وہ اپارٹمنٹ اس کا نہیں۔ اس نے وہ جگہ ایک اعتبار سے ناجائز طور پر استعمال کی تھی۔ ممکن ہے کہ اپارٹمنٹ کے مالک نے اسے اپنا اپارٹمنٹ استعمال کرنے کی اجازت دی ہو۔ اب سوچنا یہ پڑ رہا ہے کہ اس نے اجازت کیوں دی کیونکہ سفیان ماضی میں ایک معمولی آدمی تھا۔ اس اپارٹمنٹ کے مالک کا نام معلوم کر لیا گیا ہے۔ اسے داراب خان کہا جاتا رہا ہے۔ میں تم سے اسی داراب خان کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔“

”میں اس کے بارے میں کیا بتا سکتا ہوں...... میں اس نام کے کسی آدمی کو جانتا ہی نہیں۔“

”ایک اطلاع کے مطابق اسے تمہارے ساتھ دیکھا گیا ہے۔“ ثاقب نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

پیٹرول ماسٹر نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ”ہو سکتا ہے دیکھا گیا ہو۔ کیا وہ کوئی بزنس مین ہے؟“

”ہاں۔“

”تو ایسے لوگ مجھ سے ملتے ہی رہتے ہیں۔ میں ان سب کے نام یا چہرے یاد تو نہیں رکھ سکتا۔ تم نے ابھی میرے جن خاص مہمانوں کو دیکھا ہے، وہ بھی بزنس مین ہیں۔ انہیں اپنے کاموں کے سلسلے میں بعض اوقات میری مدد کی ضرورت پڑتی ہے۔ ان سب سے میری قربت ہے۔ اس لیے آج وہ اس پارٹی میں موجود ہیں۔ داراب خان بھی ایسے ہی کسی کام سے ملا ہوگا مجھ سے لیکن میں نے اسے لفٹ نہیں دی ہوگی۔ اگر دی ہوتی تو آج میرے خاص مہمانوں میں وہ بھی ہوتا۔“

اسی اثنا میں ثاقب نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ اپنے ماتحت کو فون کیے، اسے آدھا گھنٹا ہو چکا تھا لہٰذا اس نے جیب سے موبائل نکال کر ”آن“ کر دیا۔ اب اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ یہاں اب اس کے لیے خطرے کی کوئی بات نہیں ہے اور وہ خود ایسی کوئی بات کرنا نہیں چاہتا تھا جس سے کوئی غیر معمولی صورت حال پیدا ہو۔

موبائل جیب میں ڈال کر اس نے پیٹرول ماسٹر سے پھر کچھ کہنا چاہا تھا کہ اس کے موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔ اسے موبائل نکالنا پڑا۔ کال اس کے ایک ماتحت کی تھی جسے داراب خان کا پتا لگا کر اس کی نگرانی کرنی تھی۔

”صاحب!“ آواز آئی۔ ”اچھا ہوا کہ آپ نے فون آن کر لیا۔“

”کوئی خاص بات؟“

”جی صاحب...... میں نے داراب خان کے گھر کا پتا لگا لیا تھا۔ وہاں پہنچ بھی گیا تھا۔ میں نے یہ بھی معلوم کر لیا تھا کہ وہ اس وقت اپنے گھر پر نہیں۔ میں وہاں رک کر سوچنے لگا کہ اس کی نگرانی کرنے کے لیے اس کے آنے کا انتظار کرنا چاہیے۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ اس کی کار بنگلے کے پھاٹک پر آ کر رکی۔ ڈرائیور کے ساتھ وہ کار میں اکیلا ہی تھا۔ اس کی کار بند پھاٹک کے سامنے رکی ہی تھی کہ کسی جانب سے کار پر گولیوں کی بارش ہو گئی۔“

”اوہ!“ ثاقب بے اختیار کھڑا ہو گیا۔

”جی صاحب۔“ آواز آئی۔ ”کار بری طرح چھلنی ہو گئی۔ اس میں ڈرائیور اور داراب خان دونوں مارے گئے۔“

”مائی گاڈ!“ ثاقب کے منہ سے نکلا۔

”میرے لیے اب کیا حکم ہے؟“

”کیا پولیس وہاں پہنچ گئی؟“

”کسی بھی لمحے پہنچ سکتی ہے۔ فی الحال تو یہاں لوگوں کی بھیڑ لگ گئی ہے۔“

”وہیں رکو، میں تم سے تھوڑی دیر بعد بات کروں گا۔“ ثاقب نے کہا اور پیٹرول ماسٹر سے بولا۔ ”مجھے اب فوراً جانا ہوگا۔ میں بعد میں تم سے ایک بار پھر ملوں شاید۔“

''کیا کوئی بری خبر ملی ہے؟'' پیٹرول ماسٹر نے سادگی سے پوچھا۔

''کسی کے لیے وہ خبر اچھی بھی ہوسکتی ہے۔'' ثاقب نے پیٹرول ماسٹر کے چہرے پر نظر جما کر کہا۔ ''داراب خان کو قتل کردیا گیا ہے۔''

''ارے!''

ثاقب نے محسوس کیا کہ پیٹرول ماسٹر نے اپنے لہجے سے بے ساختگی ظاہر کرنے کی کوشش...... کی تھی۔

ثاقب کا دماغ فوری طور پر کسی حتمی نتیجے تک پہنچنے سے قاصر رہا۔

''اب تو......'' پیٹرول ماسٹر نے کہا۔ ''تفتیش کرنے میں دشواری بڑھ جائے گی۔''

''شاید آسانی ہی ہو جائے...... مجھے میری کار تک پہنچوادو۔''

پیٹرول ماسٹر نے فوراً ہی کار لانے کا حکم دیا۔

اندرونی دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے ثاقب یہ نہ دیکھ سکا کہ پیٹرول ماسٹر کے ہونٹوں پر استہزائیہ مسکراہٹ تھی۔

ثاقب نے اپنی کار میں بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کرنے سے پہلے موبائل پر اس شخص سے رابطہ کیا جس نے داراب خان کے مارے جانے کی خبر دی تھی۔

''اب کیا پوزیشن ہے؟'' ثاقب نے پوچھا۔

''پولیس ابھی ابھی پہنچی ہے۔ ایمبولینس بھی ہے۔''

''تم اسپتال تک ایمبولینس کے ساتھ جانا۔ تصدیق ضروری ہے کہ داراب خان مر چکا ہے۔''

''رائٹ صاحب!''

ثاقب نے موبائل بند کر کے جیب میں ڈالا اور کار اسٹارٹ کی۔

راستے میں اسپتال کے بارے میں اطلاع مل گئی۔ ثاقب نے کار کا رخ تیزی سے اس طرف کردیا۔ وہ اسپتال پہنچ گیا۔

''بیس گولیاں لگی ہیں اس کے جسم میں۔'' ڈاکٹر نے بتایا۔ ''آپریشن شروع کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ وہ زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ کا مہمان ہے۔ سانس اکھڑ رہی ہے۔''

ثاقب کے اصرار پر اسے زخمی داراب کے پاس لے جایا گیا۔

''داراب...... داراب......!'' ثاقب نے زور سے پکارا۔

داراب کی آنکھیں ذرا سی کھلیں، پھر بند ہوگئیں۔

ثاقب نے اس کے اپارٹمنٹ کی عمارت کا نام لے کر کہا۔ ''وہ تم نے سلطان کو کیوں دیا تھا؟''

داراب خان کے ہونٹ ذرا سے کھلے۔ اس نے شاید کچھ کہا تھا لیکن اس کی آواز سنائی نہیں دی۔

ثاقب نے اپنا سوال دہراتے ہوئے اپنا کان داراب کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

''بہت مدھم سی آواز سنائی دی۔ ''وہ...... وہ...... پے......'' اور پھر ایک ہچکی۔

''ختم ہوگیا۔'' ڈاکٹر نے طویل سانس لی۔

ثاقب بھی طویل سانس لے کر کمرے سے نکل آیا۔ اس کے دماغ میں داراب خان کے آخری دو حرف گونجتے رہے۔ ''پے''۔

اگر وہ اپنا جملہ مکمل کر پاتا تو شاید ''پیٹرول ماسٹر'' کہتا......

☆☆☆

الماس دھیمی آواز میں موبائل پر کہہ رہی تھی۔ ''وہ ابھی واش روم میں گیا ہے۔ مجھے تو بڑی حد تک یقین آگیا ہے کہ وہ اداکاری نہیں کررہا ہے...... وہ واقعی اپنی یادداشت کھوچکا ہے۔''

''پھر بھی اس کی حرکات وسکنات اور باتوں پر کڑی نظر رکھو۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔

''ٹھیک ہے ماسٹر۔'' الماس نے کہا۔

دوسری طرف سے سلسلہ منقطع کردیا گیا۔

الماس موبائل ایک طرف رکھ کر بستر پر سیدھی لیٹ گئی جیسے آرام کررہی ہو۔ اس کے جسم پر برائے نام لباس تھا۔ سلطان کی خواہش تھی کہ وہ اتنے ہی کم لباس میں رہا کرے۔

سلطان واش روم سے نکلا اور بستر کے قریب آکر الماس پر چھا جانے والے انداز میں گرا۔ وہ بلا کا اُلوالہوس تھا اور الماس بھی اسے مایوس نہیں کررہی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں بستر پر لیٹے لیٹے باتیں کرنے لگے۔

''وعدہ کرو الماس! تم مجھے کبھی نہیں چھوڑو گی۔'' سلطان نے کہا۔

''کتنی بار لوگے یہ وعدہ؟'' الماس ہنسی۔

''جب جب تم قریب ہوگی۔'' سلطان نے مسکراتے

ہوئے کہا۔

''مجھے تو ڈر ہے کہ تم ہی مجھے بھول جاؤ گے۔''

''کیوں؟ میں کیوں بھول جاؤں گا؟''

''یادداشت چلی جانے کے باعث تم اپنا ماضی بھول گئے ہو۔ جب یادداشت واپس آجائے گی تو تم آج کی باتیں بھول جاؤ گے۔''

سلطان سوچ میں پڑ گیا پھر یکا یک بولا۔ ''ہم اپنی بہت سی سیلفیز بنا لیتے ہیں ابھی۔''

''اس سے کیا ہوگا؟''

''تم مجھے وہ تصویریں دکھا کر یہ سب کچھ یاد دلانا۔''

''ضروری تو نہیں کہ اس سے تمہیں سب کچھ یاد آجائے۔''

''امکان تو ہے۔''

''میں تمہیں تمہاری کچھ تصویریں دکھاؤں؟''

''کون سی تصویریں؟''

''تمہارے ماضی کی۔''

''ہیں تمہارے پاس؟'' سلطان نے بے چینی سے پوچھا۔

''ہاں۔''

''دکھاؤ۔''

الماس جلدی سے اٹھی اور ایک الماری سے ایک چھوٹا سا البم نکال لائی۔ سلطان کے برابر میں لیٹ کر اس نے البم کھولا اور تصویریں دکھائی شروع کیں۔ اس میں صرف سلطان کی تصویریں بھی تھیں اور ایسی تصویریں بھی جن میں وہ کسی مرد یا کسی عورت کے ساتھ تھا۔ عورتیں مختلف تھیں جن میں الماس بھی تھی۔

ایک تصویر دیکھ کر سلطان چونکا۔

''یہ کون ہے؟'' اس نے بے اختیار پوچھا۔

''پہچان رہے ہو تم اسے؟ نام یاد آیا اس کا؟''

''دراصل خواب میں دیکھا تھا میں نے اسے۔'' سلطان نے بتایا۔ ''گروپ فوٹو ہے، لڑکیاں بھی ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ ان میں سے کس لڑکی نے اس شخص کو پیٹرول ماسٹر کہہ کر مخاطب کیا تھا۔''

''خواب میں؟''

''ہاں۔''

''تمہیں یاد نہیں آیا کہ تم اس سے کب ملے تھے؟''

''نہیں۔''

جواب سنتے وقت الماس نے بہت غور سے سلطان کی طرف دیکھا تھا لیکن اسے کوئی ایسا تاثر نہیں ملا جس سے وہ سمجھ سکتی کہ سلطان جھوٹ بول رہا ہے۔

''اب آگے چلتے ہیں۔'' الماس نے ورق پلٹا۔

''اوہ، یہ!'' یہ الفاظ سلطان کے منہ سے شبانہ کی تصویر دیکھ کر نکلے تھے۔

''اسے جانتے ہو؟'' الماس نے جلدی سے پوچھا۔

''ہاں۔''

''کیسے؟'' الماس چونکی۔

''یہ کوئی سوشل ورکر ہے۔ ڈاکٹر نے مجھے بھی بتایا تھا جب میں اسپتال میں تھا۔ یہ مختلف اسپتالز میں مریضوں کو دیکھنے جاتی ہے۔ مقصد یہی ہوگا کہ مریضوں کی دلجوئی کر سکے۔ ڈاکٹر صاحب ہی اسے میرے کمرے میں لائے تھے۔ وہ پولیس آفیسر بھی تھا ان کے ساتھ۔''

جواب سن کر الماس کو مایوسی ہوئی۔ ابتدا میں اسے خیال آیا تھا کہ سلطان نے اسے اپنی بیوی کی حیثیت سے پہچانا ہے۔ اس نے مایوس ہو کر ورق الٹ دیا۔

''تم بتاتی جاؤ کہ یہ لوگ کون ہیں جن کے ساتھ میں ہوں۔''

''میں خود بھی ان میں سے بہت کم کو جانتی ہوں۔ یہ البم مجھے پولیس آفیسر نے دی ہے۔'' الماس نے جھوٹ بولا۔ ''مقصد یہی ہو سکتا ہے کہ ان تصویروں کے ذریعے تمہیں تمہارا ماضی یاد دلانے کی کوشش کی جائے۔''

دراصل وہ البم اسے پیٹرول ماسٹر نے مہیا کیا تھا۔ خود اس نے وہ تصاویر کہاں کہاں سے جمع کی تھیں، یہ الماس نہیں جانتی تھی۔

''تم جن کو جانتی ہو، ان کے بارے میں تو بتاؤ۔'' سلطان نے کہا۔

الماس نے اسے دو تصویریں دکھائیں جو کسی ایک ہی لڑکی کی تھیں۔ سلطان ان کے ساتھ تھا۔

''اس کا نام ریٹا ہے۔ یہ اینگلو انڈین ہے۔'' الماس کے لہجے میں نفرت تھی۔ ''میں نہیں جانتی کہ اس کالی کلوٹی لڑکی سے تم کیوں ملتے تھے۔ اس کے معاملے میں تم سے میرا جھگڑا ہوتا رہتا تھا۔ تم مجھے منا تو لیتے تھے لیکن تم نے اس سے ملنا نہیں چھوڑا تھا۔''

''اچھا۔'' سلطان کا لہجہ سپاٹ تھا۔

''کچھ یاد نہیں آیا؟''

''نہیں۔''

الماس نے البم کی سب تصویریں دکھا دیں لیکن

سلطان نے پیٹرول ماسٹر کے علاوہ کسی کی بات نہیں کی۔
الماس بولی۔ ”مجھے یہی ڈر ہے کہ تمہاری یادداشت واپس آگئی تو تم مجھے بھی بھول جاؤ گے۔“
”تو کوشش کرو کہ میری یادداشت واپس نہ آئے۔“ سلطان نے ہنس کر کہا اور الماس کو خود سے لپٹا لیا۔

☆☆☆

کال بیل کی آواز سن کر شبانہ اپنے فلیٹ کے دروازے کی طرف بڑھی۔ اسے خیال آیا تھا کہ وہ سلطان کا کوئی دوست ہو شاید...... اکبر سے تو اس نے کہہ دیا تھا کہ وہ اس کے فلیٹ پر کبھی نہ آئے۔ وہ خود ہی اس سے ملنے جاتی رہتی تھی۔
”کون؟“ اس نے دروازہ کھولنے سے پہلے پوچھا۔ وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ سلطان کا کوئی دوست ہوگا تو وہ دروازہ نہیں کھولے گی اور اسے کسی طرح ٹال دے گی لیکن باہر سے آنے والی آواز سن کر وہ چونک گئی۔
”سب انسپکٹر ثاقب فرام اسپیشل برانچ۔“ جواب ملا تھا۔
اس جواب نے شبانہ کو پریشان کر دیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب ثاقب اس کے فلیٹ پر آیا تھا۔ اس نے دروازہ کھول دیا۔
”آپ پریشان ہوگئی ہیں۔“ ثاقب مسکرا کر بولا۔
”پریشان؟ ہرگز نہیں...... میں حیران ہوئی ہوں بس...... آپ میرے گھر پہلی بار آئے ہیں نا...... تشریف لائیے۔“ وہ ایک طرف ہٹ گئی۔
ثاقب کے اندر آنے کے بعد اس نے دروازہ بند کیا۔
”میں آپ کے چند منٹ سے زیادہ نہیں لوں گا، اگر آپ سچ سچ بتا دیں گی۔“ یہ ثاقب نے اس وقت کہا جب ایک صوفے پر بیٹھ چکا تھا اور شبانہ اس کے سامنے کے صوفے پر بیٹھ گئی۔
شبانہ استفہامیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔
”ایک تصویر دکھانا چاہتا ہوں آپ کو۔“ ثاقب نے جیب سے ایک لفافہ نکالتے ہوئے کہا۔ شبانہ کی نظریں لفافے پر جمی ہوئی تھیں۔ جس کا بھاری پن ظاہر کر رہا تھا کہ اس میں تصویر کے علاوہ بھی کچھ ہوگا۔
”اِن صاحب کے بارے میں آپ کیا بتا سکتی ہیں؟“ ثاقب نے لفافے سے نکالی ہوئی ایک تصویر شبانہ کی طرف بڑھائی۔ تصویر ہاتھ میں لیتے ہی شبانہ کو یوں لگا جیسے اس کے دماغ پر کسی وزنی چیز کی ضرب لگی ہو۔
وہ تصویر اکبر کی تھی۔
شبانہ کی نظر تصویر پر رہی لیکن چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ اس کا وہ ہاتھ بھی کانپنے لگا جس ہاتھ میں تصویر تھی۔
ثاقب بولا۔ ”آپ کی حالت بتا رہی ہے کہ آپ ان صاحب کو جانتی ہیں۔“
”جی!“ شبانہ کی آواز گھٹی گھٹی سی تھی۔
”اکبر نام ہے نا ان کا؟“
”جی۔“
”ان کے بارے میں مجھے تفصیل سے بتائیے۔“
”یہ...... یہ تصویر...... آپ کو کہاں سے...... کہاں سے ملی؟“ شبانہ نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔
”میں اس کا سیدھا سا جواب بھی دے سکتا ہوں لیکن پھر آپ کچھ اور سوال کریں گی اس لیے میں آپ کو صاف صاف بتا دوں کہ ہم پولیس والے جس معاملے کی تفتیش کرتے ہیں، اس معاملے سے متعلق ہر شخص پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ ان کی نقل و حرکت کی نگرانی کی جاتی ہے۔ اسی طرح کسی معاملے کی تہ تک پہنچا جا سکتا ہے۔ آپ کی نگرانی بھی کی گئی تھی اس لیے یہ صاحب ہماری نظر میں آگئے۔ ان کے بارے میں تفتیش بھی جاری ہے۔ آپ کی ان کے ساتھ بہت سی تصویریں لی گئی ہیں جو اس لفافے میں ہیں۔“
شبانہ کے تنفس کی رفتار بڑھ گئی تھی۔ وہ کچھ توقف سے دھیمی آواز میں بولی۔ ”کیا آپ کا خیال ہے کہ سلطان کو وہاں میں نے دھکا دیا تھا؟“
”اگر مجھے اس کا یقین ہوتا یا مجھے اس کا ثبوت مل گیا ہوتا تو اس وقت ہماری حراست میں ہوتیں۔ ابھی تو بس نگرانی کر کے معاملے کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ تمام متعلقہ افراد پر ہماری نظر ہے۔ ہمیں معلوم کرنا ہے کہ ان میں سے وہ کون ہے جس نے سلطان کو دھکا دیا۔ اسی نگرانی کی وجہ سے ایک نیا کردار ہمارے سامنے آیا۔ میں انہی صاحب کی بات کر رہا ہوں جن کی تصویر آپ کے ہاتھ میں ہے۔ مجھے بتائیے کہ یہ کون ہیں اور آپ کا ان سے میل جول کیا معنی رکھتا ہے؟“
شبانہ کی نظر تصویر پر جم گئی۔
ثاقب بولا۔ ”میں آپ کے سچے جواب کا منتظر ہوں۔“
”میں اکبر سے محبت کرتی تھی کالج کے زمانے سے

اور اب بھی کرتی ہوں۔'' شبانہ نے نظریں جھکائے جھکائے بولنا شروع کیا اور سارے معاملات من وعن بیان کردیے۔

''گڈ۔'' ثاقب نے کہا۔ ''مجھے خوشی ہے کہ آپ نے سچ بولا۔ ہمیں بھی اپنی تفتیش سے یہی معلوم ہوا ہے اور آپ کے محبوب اکبر صاحب نے بھی یہی بیان دیا ہے۔''

شبانہ چونکی۔ ''آپ اکبر سے مل چکے ہیں؟''

''میں ابھی ان کا بیان لے کر ہی آپ کے پاس آیا ہوں۔ میرا ایک آدمی اس وقت بھی اکبر صاحب کے ساتھ ہے۔ میں نے وہ آدمی وہاں اس لیے چھوڑا ہے کہ میرے وہاں سے آتے ہی اکبر صاحب آپ کو فون کر کے یہ سب کچھ بتا نہ سکیں اور آپ کو بتادیں کہ انہوں نے کیا بیان دیا ہے۔ اب یہ بات سامنے آگئی ہے کہ آپ دونوں کے بیان میں کوئی فرق نہیں۔''

''کیا اب بھی ہماری نگرانی کی جائے گی؟''

''میں اس سوال کا جواب نہیں دوں گا۔ یہ تو حالات پر منحصر ہے کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ آپ تصویر مجھے واپس کر دیں۔''

شبانہ نے تصویر اُس کی طرف بڑھادی۔

''اب میں اجازت چاہوں گا۔'' ثاقب نے تصویر لے کر کہا اور کھڑا ہوگیا۔ ''کار میں بیٹھ کر میں اپنے آدمی کو ہدایت کردوں گا کہ اب اسے اکبر صاحب کے پاس رکنے کی ضرورت نہیں۔''

شبانہ خاموش بیٹھی رہی۔ شاید اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ ثاقب کو قاعدے سے رخصت کرنے دروازے تک جائے یا نہ جائے۔ اس کا دماغ شدید انتشار کا شکار تھا۔

ثاقب خود ہی اس کے فلیٹ سے نکل آیا۔

انجن اسٹارٹ کرنے سے پہلے اس نے اکبر کے گھر فون کرنا چاہا لیکن اس سے پہلے ہی اس کے موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے کال ریسیو کی۔

''صاحب!'' دوسری طرف سے کہا گیا۔ ''الماس کے گھر میں خفیہ کیمرے لگوانا بہت مفید ثابت ہوا ہے۔ ایک بات تو یہ کہ الماس نے فون پر کسی کو ماسٹر کہہ کر مخاطب کیا تھا اور کہا تھا کہ سلطان کی یادداشت واقعی چلی گئی ہے۔''

''فون پیٹرول ماسٹر کو کیا تھا؟'' ثاقب نے تیزی سے پوچھا۔

''دوسری طرف سے بولنے کی آواز ریکارڈ نہیں ہوئی ہے لیکن اس کا ماسٹر کہنا تو اسی طرف اشارہ کرتا ہے۔''

''اور کوئی بات؟''

دوسری طرف سے جو اور باتیں بتائی گئیں ان میں سب سے اہم بات ایک اینگلو انڈین لڑکی ریٹا کا نام تھا۔

ثاقب نے کہا۔ ''میں خود یہ ساری ریکارڈنگ دیکھوں گا لیکن فوری طور سے تمہارا کام یہ ہوگا کہ کسی طرح اس لڑکی ریٹا کا پتا چلاؤ۔ زیادہ امکان یہی ہے کہ وہ بھی کوئی سوسائٹی گرل ہوگی۔''

''میں کوشش کرتا ہوں صاحب!''

''بس۔'' ثاقب نے سلسلہ منقطع کیا اور پھر موبائل پر اس آدمی سے رابطہ کیا جسے اکبر کے پاس چھوڑ آیا تھا۔

☆☆☆

داراب خان کے قتل کے سلسلے میں آس پاس سے چند مشتبہ افراد گرفتار کیے گئے تھے۔ ان میں سے بیشتر کو پوچھ گچھ کے بعد رہا کردیا گیا تھا لیکن دو آدمی اب بھی پولیس کی حراست میں تھے۔ حراست میں کیا تھے، انہیں ایک پولیس اسٹیشن کی حوالات میں ٹارچر کا نشانہ بنایا جارہا تھا۔ ان کے بارے میں یقین کیا گیا تھا کہ وہ پیٹرول ماسٹر کے آدمی تھے۔ اس یقین کی وجہ یہ تھی کہ ان دونوں کو کئی بار اس عدالت میں دیکھا گیا تھا جہاں پیٹرول ماسٹر پر ایک مقدمہ چلا تھا اور معمولی نوعیت کے کیس کی وجہ سے پیٹرول ماسٹر کو سزا بھی معمولی ملی تھی۔

ثاقب شام کے وقت اس پولیس اسٹیشن کے انچارج سے ان کے بارے میں گفتگو کر ہی رہا تھا کہ ایک گہرے سانولے رنگ کی لڑکی اجازت لیے بغیر چق اٹھا کر کمرے میں داخل ہوئی۔

''کون ہو تم؟'' ایس ایچ او نے ڈپٹ کر کہا۔ ''اور بغیر اجازت اندر کیسے آگئیں؟''

''داراب خان کے قتل کے معاملے میں گرفتار ہونے والے دو آدمیوں کو یہیں رکھا گیا ہے نا؟'' اس نے ایس ایچ او کی ڈانٹ نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

ایس ایچ او اور ثاقب چونک گئے۔

''تم کون ہو؟'' ثاقب نے پوچھا۔

لڑکی نے اسے نظر انداز کردیا اور سوالیہ نظروں سے ایس ایچ او کی طرف دیکھتی رہی۔ ثاقب کو اس نے ایک عام آدمی سمجھ کر نظر انداز کیا ہوگا کیونکہ وہ اس وقت وردی میں نہیں تھا۔

''جواب نہیں دیا آپ نے؟'' لڑکی نے ایس ایچ او سے کہا۔

''تم نے بھی میری بات کا جواب نہیں دیا ہے۔''

ایس ایچ او بگڑے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''اب یہ بھی بتاؤ کہ تمہیں ان دونوں آدمیوں سے کیا...... میرا مطلب ہے، ان آدمیوں سے تمہارا کیا تعلق؟''

''میں اس بارے میں صرف ایک آدمی سے بات کرنا چاہتی ہوں۔'' لڑکی نے کہا اور پھر بولتی چلی گئی۔ ''میں چند دن سے شہر میں نہیں تھی۔ آج ہی آئی ہوں۔ اخبارات میں سب کچھ پڑھ تو لیا تھا لیکن کسی وجہ سے فوراً نہیں آسکتی تھی۔ وہ کیس جس آفیسر کے پاس ہے، میں اسی سے ملنا چاہتی ہوں۔''

ایس ایچ او نے ثاقب کی طرف دیکھا کیونکہ وہ معاملہ بھی ثاقب ہی کے ہاتھ میں تھا کیونکہ داراب خان کی نگرانی کروانا چاہتا تھا۔

ثاقب غائر نظروں سے لڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا جس کی عمر اٹھائیس سال کے قریب ہوسکتی تھی۔ وہ شلوار قمیص میں تھی لیکن دیسی عیسائی معلوم ہوتی تھی۔ اسے دیکھ کر ثاقب کے ذہن میں ریٹا کا خیال آچکا تھا جس کی تصویر الماس نے سلطان کو دکھائی تھی۔

''تم اس آفیسر سے کیوں ملنا چاہتی ہو؟'' ثاقب نے پوچھا۔

''مجھے ایس ایچ او صاحب سے بات کرنے دو۔'' لڑکی نے اسے پھر نظر انداز کیا اور ایس ایچ او سے بولی۔ ''کسی بھی طرح میرا پیغام اس تک پہنچایا جائے۔ میں فوری طور پر سوچ نہیں سکی تھی کہ میں اس آفیسر تک کس طرح پہنچ سکتی ہوں۔ ہاں یہ معلوم ہوگیا تھا کہ اس معاملے کے دو آدمیوں کو یہاں...... اس پولیس اسٹیشن میں رکھا گیا ہے۔ میں اسی خیال سے یہاں آئی ہوں کہ یہاں سے مجھے اس آفیسر کے بارے میں کچھ معلوم ہوسکتا ہے۔''

''تمہارا نام ریٹا تو نہیں ہے؟'' ثاقب پوچھ بیٹھا۔

اس مرتبہ لڑکی چونکی۔ ''تم کون ہو؟ تمہیں میرا نام کیسے معلوم ہوگیا؟''

''میرا تعلق بھی اسی محکمے سے ہے۔'' ثاقب نے سخت لہجے میں کہا۔ ''تمہیں اس آفیسر کا نام نہیں معلوم؟''

''اخباروں میں تو سب انسپکٹر ثاقب کا نام ہے۔''

''سب انسپکٹر ثاقب کو بھی تمہاری تلاش ہے۔''

''کیوں؟'' وہ حیرت سے بولی۔

اس مرتبہ ثاقب نے ایس ایچ او سے کہا۔ ''میں ان محترمہ کو ثاقب صاحب سے ملانے لے جانا چاہتا ہوں۔''

ایس ایچ او نے غور سے ثاقب کی طرف دیکھا، پھر دھیمی آواز میں بولا۔ ''ٹھیک ہے۔''

ثاقب کھڑا ہوگیا۔ ''چلو۔''

وہ ایس ایچ او کے سامنے ریٹا سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''اس طرف چلو۔'' ثاقب نے کہا۔ ''ادھر کھڑی ہے میری کار۔''

''کار تو میری بھی ہے یہاں۔''

''فی الحال اسے بھول جاؤ۔ تمہاری بات سننے کے بعد تمہیں یہاں واپس پہنچا دیا جائے گا۔''

ریٹا نے دو ایک لمحوں کے لیے کچھ سوچا اور پھر ثاقب کے ساتھ اس کی کار کی طرف چل پڑی۔

کار چلاتے ہوئے ثاقب نے کہا۔ ''ہمیں کار میں بیٹھے بیٹھے باتیں کرنی ہیں۔''

''لیکن......'' ریٹا تیزی سے بولی۔ ''مجھ سے تو کہا گیا تھا کہ......''

''ٹھیک ہی کہا گیا تھا۔'' ثاقب نے کہا اور جیب سے اپنا کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

''آ...... آ...... آپ۔'' ریٹا ہکلا گئی۔

''ہاں، میں ہی سب انسپکٹر ثاقب ہوں۔''

''آئی ایم سوری! میں آپ کو نہ جانے کیا سمجھتی رہی۔''

''بھول جاؤ وہ باتیں جو تھانے میں ہوئی تھیں۔ اس موضوع پر آؤ کہ تم مجھ سے کیوں ملنا چاہتی تھیں۔''

''مجھے معلوم ہے کہ جن دو آدمیوں کو گرفتار کیا گیا ہے، وہ پیٹرول ماسٹر ہی کے آدمی ہیں لیکن وہ زبان نہیں کھولیں گے۔ وہ جانتے ہیں کہ اگر انہوں نے کچھ بتایا تو پیٹرول ماسٹر ان کے بال بچوں تک کو آگ میں ڈلوا دے گا۔ وہ ایسا ہی سفاک ہے۔ اس کے خلاف بات کرنے والے کسی شخص کے بال بچے نہ ہوں تو ان کے دیگر متعلقین کا بہت بُرا حشر ہوتا ہے۔''

''تم یہ سب کچھ کیسے جانتی ہو؟''

''میرا تعلق بھی پیٹرول ماسٹر کے گینگ سے ہے۔''

''اوہ۔''

''میں اُس کے خلاف کئی ثبوت مہیا کرسکتی ہوں۔''

''تمہیں کوئی خوف نہیں ہے ماسٹر کا؟''

''اب بالکل نہیں رہا۔''

''تم اس کے لیے کیا کرتی تھیں؟''

''جو اس کے گینگ کی دوسری لڑکیاں کرتی ہیں۔ اُن

کے ذریعے وہ بڑے بڑے لوگوں کو پھانستا ہے اور پھر انہیں بلیک میل کرتا ہے۔ میری ظاہری حالت پر نہ جاؤ۔ جب میں اچھا اور چست لباس پہنتی ہوں اور میک اَپ کرتی ہوں تو کچھ اور ہی نظر آتی ہوں۔'' اس نے بڑی بے باکی سے کہا۔ ''الماس سے کہیں زیادہ پُرکشش ہوں میں۔''

''الماس کو بھی جانتی ہو؟''

''جب اُس کے گینگ کی ہوں تو کیسے نہیں جانوں گی۔''

''تم اس کے خلاف کیا ثبوت مہیا کر سکتی ہو؟''

''ریکارڈڈ باتیں۔'' ریٹا نے جواب دیا۔ ''کافی عرصے سے اس نے مجھے نظرانداز کرنا شروع کیا ہے اور تبھی سے میرے دل میں اس کے خلاف جذبات پیدا ہونے لگے تھے۔ اس کے قریب ہونے کی وجہ سے مجھے اپنے موبائل میں لوگوں سے اس کی باتیں ریکارڈ کرنے کا موقع ملتا رہا ہے۔ میں نے اس کے خلاف قطعی فیصلہ اس وقت کیا جب اس نے سلطان کے پاس الماس کو بھیجا جبکہ میں جانا چاہتی تھی۔ سلطان، الماس سے زیادہ میرا دیوانہ رہا ہے اور میں بھی اسے شدت سے چاہتی ہوں۔ سلطان کے پاس الماس کا جانا مجھ سے برداشت نہیں ہوا ہے۔ میں یقیناً اس کی یادداشت واپس لانے کی کوشش کرتی لیکن پیٹرول ماسٹر کو اس کی ہوا بھی نہیں لگنے دیتی کہ اس کی یادداشت واپس آ گئی ہے۔''

''پیٹرول ماسٹر کو سلطان سے اتنی دلچسپی کیوں ہے؟''

''سلطان اس کے لیے بہت کام کا آدمی ہے۔''

''وہ بھی اس کے گروہ سے تعلق رکھتا ہے؟'' ثاقب نے تیزی سے پوچھا۔

''تقریباً ایک سال سے۔''

''اس میں ایسی کیا بات ہے جو پیٹرول ماسٹر......''

''سلطان آوازوں کی نقل اتارنے کا ماہر ہے۔ کسی کو دس منٹ بھی سن لے تو اس کی آواز کی بہت پکی نقل اتار سکتا ہے، خواہ وہ کوئی لڑکی ہی کیوں نہ ہو۔''

''عورتوں کی آواز بھی بنا لیتا ہے؟''

''یہی کہا ہے میں نے ابھی۔''

''اس سے پیٹرول ماسٹر کیا فائدہ اٹھاتا ہے؟''

''بہت بڑے بڑے لوگوں کی آواز بنا کر اس سے ریکارڈ کروائی جاتی ہیں۔ پہلے اسے کسی لڑکی کے پھندے میں پھنسایا جاتا ہے اور پھر اس لڑکی سے اس کی گفتگو میں سلطان کی وہ آواز شامل کی جاتی ہے جو اس شخص کی ہوتی ہے۔''

''شبانہ کو بھی جانتی ہو؟''

''ہاں، وہ اس کی بیوی ہے۔ وہ ابتدا میں پیٹرول ماسٹر کا آلۂ کار بننے کے لیے تیار نہیں تھا لیکن ماسٹر اس سے مایوس نہیں ہوا تھا۔ مایوس ہوتا تو مروا دیتا اُسے۔ اس کا خیال تھا کہ دیر سویر سلطان کو اپنے قابو میں لے ہی آئے گا۔ یہ موقع اسے تب ملا جب سلطان نے اس سے یہ کہا کہ اگر ماسٹر کسی طرح اس کی شادی شبانہ سے کرا دے تو وہ اس کے گینگ میں شامل ہو جائے گا۔ سلطان کی مشکل یہ تھی کہ وہ اس وقت اچھے حالات میں نہیں تھا۔ شبانہ کے والدین اس کا رشتہ قبول نہیں کرتے اس لیے یہ ڈراما کیا جائے کہ سلطان کو ایک دولت مند اور اچھے گھرانے کا فرد بنا کر آگے بڑھایا جائے۔ اس رشتے کے لیے رضوان کا انتخاب کیا جس نے اپنی والدہ کے ذریعے......''

''رضوان بھی پیٹرول ماسٹر کا آدمی ہے؟'' ثاقب نے بات کاٹی۔

''ہاں۔'' ریٹا نے جواب دیا۔ ''لیکن یہ میرا قیاس ہے کیونکہ رضوان نے اس کے لیے اپنی والدہ کو استعمال کیا تھا جو بہت باوقار اور شریف عورت نظر آتی ہیں۔''

''میرا خیال تو یہ ہے کہ رضوان کا پیٹرول ماسٹر سے کوئی تعلق نہیں ہوگا کیونکہ اسے مرعوب کرنے ہی کے لیے اس نے داراب خان کا اپارٹمنٹ استعمال کیا تھا۔''

''اور وہ اپارٹمنٹ اسے ایک دن کے لیے دینے کے لیے پیٹرول ماسٹر ہی نے اس سے کہا تھا۔ وہ داراب خان جیسے بہت سے لوگوں کے کام آتا ہے اس لیے ان میں سے کوئی بھی اس کی بات ٹال نہیں سکتا۔ ماسٹر کے قریب ہونے ہی کی وجہ سے مجھے ان سب باتوں کا علم ہے۔ ماسٹر، داراب خان اور سلطان کی گفتگو کا ریکارڈ بھی ہے۔''

''تم وہ موبائل مجھے دینا چاہتی ہو؟''

''موبائل میں کچھ بھی نہیں ہے۔ میں نے سب ڈیلیٹ کر دیا ہے۔''

''تو پھر ریکارڈ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ یا یہ باتیں کر کے تم مجھے بے وقوف بنا رہی ہو۔''

''آپ نے میری پوری بات نہیں سنی۔ میں وہ سب ریکارڈنگ ایک اسپول پر منتقل کرتی رہتی تھی۔ اسپول ریکارڈر ہے میرے پاس...... یہ مجھے اس لیے کرنا پڑتا تھا کہ اتفاق سے ماسٹر نے میرا موبائل دیکھ لیا تو مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔''

''تم مجھے یہ سب کچھ بتا رہی ہو۔ اس کا علم ماسٹر کو بھی ہوسکتا ہے۔ اس صورت میں وہ تمہارا کیا حشر کرے گا، اس کی پروا نہیں ہے تمہیں؟''

''ہاں، اب مجھے کسی بات کی پروا نہیں ہے۔ اُس نے سلطان کو الماس کے حوالے کر دیا۔ یہ ایک بڑا زخم لگا ہے میرے دل پر! میں اس کا انتقام لینا چاہتی ہوں۔ ماسٹر کی اور اس کے گینگ کی تباہی چاہتی ہوں۔''

''وہ اسپول کہاں ہے؟''

''میرے گھر پر، وہ ایک بہت خفیہ جگہ پر ہے۔ میں وہ ساتھ لے کر چلنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔ ڈر یہ تھا کہ مجھے تمہارے ساتھ دیکھ کر ہی وہ مجھے ختم کرنا چاہے گا۔''

''یہ خطرہ کیا اس وقت نہیں؟''

''یقیناً ہے لیکن وہ اسپول تو محفوظ رہے گا۔'' ریتا نے کہا۔ ''میں اسپول آپ کو دینا چاہتی ہوں۔ اس ریکارڈنگ کی روشنی میں آپ اس کے خلاف ٹھوس ثبوت حاصل کر سکتے ہیں۔''

''تو کیا اسپول دینے کے لیے تم مجھے اپنے گھر لے جانا چاہتی ہو؟''

''نہیں۔ اس میں بھی مجھے خطرہ محسوس ہوگا۔ آپ مجھے اپنے گھر کا پتا بتا دیں اور فون نمبر بھی۔ میری کوشش ہوگی کہ میں بہت احتیاط سے آج رات ہی وہ آپ تک پہنچا دوں۔ فون نمبر اس لیے مانگ رہی ہوں کہ اگر کسی وجہ سے آج رات نہ پہنچا سکوں تو آپ کو اطلاع دے دوں۔ ارے! ہم تو واپس پولیس اسٹیشن پہنچ رہے ہیں۔''

''تم نے بتایا تھا نا کہ تمہاری کار وہیں کھڑی ہے۔ تو جب میں نے محسوس کیا تھا کہ ہماری گفتگو ختم ہونے والی ہے تو میں نے کار دوسرے راستے سے واپس موڑ لی تھی۔''

''ذہین آدمی ہیں آپ...... مجھے یقین ہے کہ ماسٹر کی تباہی آپ کے ہاتھوں ہی سے ہوگی۔''

''سلطان کو نشیب میں دھکا دیا گیا تھا۔ کیا ماسٹر یہ حرکت کر سکتا ہے؟''

''یہ میں نہیں کہہ سکتی کہ یہ حرکت اسی نے کروائی ہوگی لیکن اس کا امکان ضرور ہے۔ اسی لیے وہ چاہتا ہے کہ سلطان کی یادداشت کے سلسلے میں باخبر رہے۔ اگر سلطان کی یادداشت واپس آجاتی ہے تو وہ اس خیال سے اس کو مروا سکتا ہے کہ وہ بات کھول دے گا، بتا دے گا کہ اس طرح اسے ختم کرنے کی کوشش اس نے کسی سے کروائی تھی یا خود کی تھی۔''

''وہ تو اس کے کام کا آدمی تھا۔ وہ اسے ختم کرنے کی کوشش کیوں کرے گا؟''

''جب اس کا کوئی کارندہ اس کے ہاتھ سے نکلنے لگتا ہے تو وہ اسے ختم کرا دیتا ہے۔''

''ایک آخری بات اور......'' ثاقب نے پولیس اسٹیشن کے احاطے میں کار روکتے ہوئے کہا۔ ''سلطان اس کے لیے جو کام کرتا تھا، اس کا اسے ماسٹر سے خاصا معاوضہ ملتا ہوگا...... یا نہیں؟''

''جی ہاں ملتا تھا۔''

''تو پھر وہ اپنی بیوی پر پیسوں کے لیے دباؤ کیوں ڈالتا تھا؟''

''مجھے نہیں معلوم کہ وہ ایسا کرتا تھا۔''

''لیکن مجھے یہی معلوم ہوا ہے۔''

''تو اس کا سبب سلطان ہی سے معلوم ہوسکتا ہے اگر اس کی یادداشت واپس آجائے۔''

''ٹھیک ہے۔ اب تم جاؤ اپنی کار میں...... اور ہاں...... احتیاطاً مجھے اپنا پتا بتا جاؤ۔ شاید ضرورت پڑے۔''

ریتا نے اپنا پتا دیا اور کار سے اتر گئی۔

ثاقب نے انجن اسٹارٹ ہی رکھا تھا۔ اس نے کار موڑی اور پولیس اسٹیشن کے احاطے سے باہر نکل آیا۔ اب اس کی کار کا رخ اپنے گھر کی طرف تھا۔ دماغ میں خیالات گردش کر رہے تھے۔

اب اندھیرا پھیلنا شروع ہوگیا تھا۔ ثاقب رات کو اپنے گھر پر ہی رہنا چاہتا تھا۔ ریتا نہ جانے کس وقت آجاتی۔

گھر پہنچ کر اس نے اپنے ماتحتوں سے موبائل پر رپورٹس لینا شروع کیں۔ اسے معلوم ہوا کہ شبانہ اور اکبر آج بھی ملے تھے۔ شبانہ خود ہی اس کے اپارٹمنٹ گئی تھی۔

داراب کے جو آدمی حوالات میں تھے، انہوں نے اب تک زبان نہیں کھولی تھی۔

پیٹرول ماسٹر کے بارے میں کسی کو علم نہیں تھا کہ اب وہ کہاں ہوگا تاہم کسی نے اسے اس کے علاقے سے باہر نکلتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد وہ لاؤنج میں بیٹھ کر خبریں سننے کے لیے ٹی وی کھولنے ہی والا تھا کہ اس کے موبائل کی گھنٹی بجی۔

موبائل اسکرین پر ایک اجنبی نمبر دیکھ کر تو ثاقب کی پیشانی پر ایک سلوٹ پڑ گئی تاہم اس نے کال ریسیو کی۔

''ہیلو۔''
''کیا میں سب انسپکٹر ثاقب سے مخاطب ہوں؟'' دوسری طرف سے پوچھا گیا۔
''ہاں۔''
''میں نے آپ کے گھر کا پتا تو معلوم کرلیا تھا، البتہ فون نمبر معلوم کرنے میں تھوڑی سی دشواری ہوئی۔''
''اس میں کیا دشواری ہوئی؟''
''میں نہیں چاہتا تھا، کوئی یہ سوچے کہ میں آپ کا نمبر کیوں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔''
''اب فون کرنے کے مقصد کی طرف آجاؤ۔''
''میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں اور آج ہی رات ملنا چاہتا ہوں۔''
''تم ہو کون؟''
''یہ میں فون پر نہیں بتانا چاہتا۔ بس اتنا عرض کروں گا کہ میں جو چیز آپ کے حوالے کرنا چاہتا ہوں وہ آپ کے لیے بہت کام کی ہوگی۔''
''کس وقت آؤ گے؟''
''یہ بھی حتمی طور پر بتانا مشکل ہے۔ مجھے خیال رکھنا پڑے گا کہ مجھے کوئی آپ کے گھر میں جاتے نہ دیکھ سکے۔''
ثاقب کو بات کچھ پُراسراری لگی تاہم اس نے فیصلہ کیا کہ وہ فون کرنے والے کا انتظار کرے گا۔
دوسری طرف اُسے ریٹا کا بھی انتظار کرنا تھا۔

☆☆☆

''آج میں تمہیں بہت زیادہ پریشان دیکھ رہا ہوں۔'' اکبر نے کہا۔
شبانہ اسی کے اپارٹمنٹ میں تھی۔ وہ اکبر کی طرف دیکھنے لگی۔ دیکھنے کا انداز بھی نہایت پریشانی کا تھا۔
اکبر پھر بولا۔ ''تم انسپکٹر ثاقب کی وجہ سے پریشان ہو کیا؟''
شبانہ نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔
اکبر نے کہا۔ ''اس قسم کے معاملات میں یہ سب تو ہوتا ہے۔ پولیس ہر ایک سے پوچھ گچھ کرتی ہے۔ میں اچانک اُن کے سامنے آیا تھا اس لیے ان کا ہماری طرف فوری توجہ دینا فطری امر ہے۔''
''مجھے لگ رہا ہے کہ وہ ہم دونوں کو بہت زیادہ پریشان کریں گے۔ ابھی تو انہوں نے صرف پوچھ گچھ کی ہے۔''
''سچی بات تو یہ ہے شبانہ کے پریشانی مجھے بھی ہے۔'' اکبر نے سنجیدگی سے کہا۔ ''پولیس جواز ڈھونڈتی ہے واردات کا...... اور میرے بارے میں ایک جواز ہے پولیس کے پاس۔''
''وہ کیا؟'' شبانہ نے جلدی سے پوچھا۔
''تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ طویل عرصے باہر رہنے کے بعد واپسی پر مجھے معلوم ہوا کہ تمہاری شادی ہو چکی ہے لیکن تم اب بھی مجھ سے محبت کرتی ہو اور اپنے شوہر سے نالاں بھی ہو لہٰذا میں تمہیں اپنانے کے لیے سلطان کو قتل کر سکتا ہوں یا قتل کی کوشش کر سکتا ہوں۔''
''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' شبانہ تیزی سے بولی۔
''میں صحیح کہہ رہا ہوں شبانہ...... آنکھیں بند کر لینے سے بلی غائب نہیں ہوتی، کبوتر غائب ہو جاتا ہے۔''
شبانہ بے چین نظر آنے لگی۔
''اور یہی جواز تمہارے لیے بھی سوچا جا سکتا ہے۔'' اکبر پھر بولا۔ ''سلطان سے نجات حاصل کرنے اور مجھے پانے کے لیے تم بھی ایسا کر سکتی ہو یا مجھ سے کہہ سکتی ہو کہ میں کسی طرح سلطان کو ختم کر دوں۔''
شبانہ اس کا منہ تکتی رہ گئی۔
اکبر سوچتا ہوا ٹہلنے لگا۔
شبانہ بولی۔ ''تمہاری باتوں سے تو میرا سارا جسم شل ہونے لگا ہے۔'' اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔
''میں ایک اور پہلو سے بھی سوچ رہا ہوں۔'' اکبر نے کہا۔ ''پولیس جب کسی کیس میں ناکام ہونے لگتی ہے تو جس کی گردن پتلی دیکھتی ہے، اسی گردن میں پھندا ڈال دیتی ہے۔''
شبانہ سکتے کے سے عالم میں بیٹھی رہ گئی۔
''ایسی کسی صورتِ حال سے بچنے کی ایک صورت ہو سکتی ہے۔'' اکبر نے ٹہلتے ہوئے کہا۔ ''ہم دونوں کچھ دنوں کے لیے ملک سے چلے جائیں۔ پھر جب پولیس اصل مجرم کو پکڑ لے تو ہم واپس آجائیں۔ میرا کاروبار بنیادی طور پر تو یہیں ہے۔ میں اسے ہمیشہ کے لیے تو نہیں چھوڑ سکتا۔''
''لیکن...... لیکن ہم کہاں جائیں گے؟''
''ایک اور ملک کی نیشنلٹی ہے میرے پاس...... تمہیں اپنے ساتھ وہیں لے چلوں گا۔''
''میں نے کبھی بیرونِ ملک جانے کے بارے میں سوچا ہی نہیں تھا اسی لیے پاسپورٹ نہیں بنوایا۔''
''ارجنٹ پاسپورٹ بنوایا جا سکتا ہے۔ تم فوری طور

پر پاسپورٹ سائز کی تصویریں بنوالو۔ میں دیکھوں گا کہ یہ کام جلد از جلد کب تک ہو سکتا ہے۔"

"اب تو فوٹو اسٹوڈیوز بند ہو چکے ہوں گے۔" شبانہ نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ رات خاصی گزر چکی تھی۔

"کل کسی وقت بنوالینا لیکن بہت ہوشیاری سے کرنا ہوگا یہ کام...... پولیس کے آدمی یقینی طور پر ہماری نگرانی پر مامور ہوں گے۔ اگر تم کامیاب ہو گئیں تو سمجھو بازی جیت لی۔ پولیس عام طور پر کیس سے متعلق لوگوں کو پابند کر دیتی ہے کہ وہ اس شہر سے اس وقت تک نہیں جائیں گے جب تک کیس حل نہ ہو جائے لیکن اب تک پولیس نے مجھ پر یہ پابندی نہیں لگائی ہے۔ تم نے بھی مجھ سے اس کا ذکر نہیں کیا اس لیے میرا خیال ہے کہ تمہیں بھی پابند نہیں کیا گیا۔"

"مجھ سے یہ سب کچھ نہیں ہو سکے گا اکبر۔" شبانہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"میرا اندازہ بھی یہی ہے لیکن تمہیں ہمت کرنی ہوگی ورنہ اس کے لیے تیار رہو کہ پولیس ہماری پتلی گردنوں سے دور نہیں۔"

"میں تو پولیس کا سامنا کرنے سے بھی گھبراتی ہوں۔"

"تو پھر سوچ لو...... تم جیسا چاہو، ویسا ہی کیا جائے۔"

"مجھے سوچنا پڑے گا۔"

"آج رات ہی سوچ لو۔ چلو اب میں تمہیں چھوڑ آؤں۔ اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ پولیس پہلے ہی سے جانتی ہے کہ میں تمہیں چھوڑنے جاتا ہوں۔"

شبانہ کھوئے کھوئے سے انداز میں کھڑی ہو گئی۔

☆☆☆

ثاقب کو تیز روشنی بری لگتی تھی۔ سوتے وقت تو وہ یقیناً نائٹ بلب جلاتا تھا لیکن بعض اوقات سونے سے پہلے بھی تیز روشنی ختم کر دیتا تھا۔ نامعلوم شخص اور ریٹا کا انتظار کرتے کرتے اس نے اکتا کر نائٹ بلب کا سہارا لینا ہی چاہا تھا کہ کال بیل کی آواز سنائی دی۔ وہ اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ احتیاطاً اس نے ریوالور بھی اپنی جیب میں رکھ لیا تھا کیونکہ ملاقات ایک نامعلوم آدمی سے ہونی تھی۔ دروازے پر رک کر اس نے آئی گلاس سے باہر دیکھا۔ باہر کھڑے ہوئے شخص کی عمر تیس سال سے کچھ زیادہ بھی ہو سکتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا شاپنگ بیگ تھا۔ چہرے سے کسی قدر گھبراہٹ ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ اپنے اردگرد سے چوکنا نظر آ رہا تھا۔ ثاقب نے محسوس کیا کہ وہ اس شخص کو پہلے کہیں دیکھ چکا ہے۔

جیب میں ہاتھ ڈال کر ریوالور کے دستے پر گرفت کرتے ہوئے اس نے دروازہ کھول دیا۔

"میں نے آپ کو فون کیا تھا۔" آنے والے نے جلدی سے کہا۔

"اندر آ جاؤ۔ تم گھبرائے ہوئے نظر آ رہے ہو۔" ثاقب نے کہا۔

وہ جلدی سے اندر آ گیا۔ ثاقب نے اس پر نظر رکھتے ہوئے دروازہ بند کیا اور نووارد سے بیٹھنے کے لیے کہا۔

وہ بولا۔ "گھبرایا ہوا میں اس لیے ہوں کہ اگر پیٹرول ماسٹر کا کوئی آدمی مجھے دیکھ لے تو میرے لیے مصیبت ہو جائے گی۔ یہ اندازہ تو نہیں لگایا جا سکتا کہ میں آپ سے ملنے کیوں آیا ہوں لیکن......"

"اپنے آنے کا مقصد بیان کرو۔" ثاقب نے اس کی

جنریشن گیپ

مائیکل گھر میں ہر وقت اکھڑا اکھڑا اور برہم رہتا تھا۔ اس کے والدین اس کیفیت کو جنریشن گیپ کا نام دیتے تھے۔ ایک دن بات بڑھ گئی۔ نوجوان اپنے والدین کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ "یہ گھر قبرستان بن کر رہ گیا ہے، اب میں یہاں نہیں رہ سکتا... مجھے سنسنی، تفریح، تیز سواریاں، پیسا اور خوب صورت لڑکیوں کا ہجوم چاہیے جو یہاں نہیں مل سکتا... میں اس گھر سے جا رہا ہوں، ہمیشہ کے لیے۔ کوئی مجھے روکنے کی کوشش نہ کرے۔"

یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ چند قدم چلنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ اس کا باپ پیچھے چلا آ رہا ہے۔ وہ گردن گھما کر غرایا۔ "تم نے سنا نہیں... میں کہہ رہا ہوں کہ کوئی مجھے روکنے کی کوشش نہ کرے۔"

"تمہیں کون روک رہا ہے بیٹے!" باپ نے نرمی سے کہا۔ "ایک منٹ توقف کرو، میں بھی تمہارے ساتھ چل رہا ہوں۔"

محمد شاہان سعید کی عرق ریزی

بات کاٹتے ہوئے کہا۔
''میرا نام عاطف ہے۔ میں پروفیشنل فوٹوگرافر ہوں۔ وڈیو بھی بناتا ہوں۔''
''اوہ!'' ثاقب کو یاد آگیا کہ پیٹرول ماسٹر کی سالگرہ میں اس نے وڈیو بنانے والے جن افراد کو دیکھا تھا، یہ شخص انہی میں سے ایک تھا۔
''ہوں۔'' ثاقب نے سر ہلایا۔ ''مجھے یاد آگیا۔ میں نے تمہیں پیٹرول ماسٹر کی سالگرہ میں دیکھا تھا۔''
''لیکن یہ نہ سمجھیے گا کہ پیٹرول ماسٹر سے ہمارا کوئی خاص تعلق ہے۔ میرے جتنے بھی ہم پیشہ وہاں جاتے ہیں، وہ اس خوف سے جاتے ہیں کہ اگر نہ گئے تو وہ ہمیں کسی بھی پریشانی میں ڈال سکتا ہے۔''
''اب اپنے آنے کا مقصد تو بتاؤ......''
''میں اس لیے آیا ہوں کہ آپ داراب کے قتل کی تفتیش کررہے ہیں۔ ابتدا میں تو میں ہچکچاتا رہا کہ اس سلسلے میں پولیس سے رابطہ کرنا میرے لیے نقصان دہ ہوسکتا ہے لیکن آج میرے ضمیر نے مجبور کردیا کہ میں آپ سے رابطہ کروں اور آپ کو بتاؤں کہ داراب خان اس سالگرہ میں شریک تھا اور آپ کی آمد سے ذرا ہی پہلے وہاں سے بڑی عجلت میں رخصت ہوا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس سے جانے کے لیے پیٹرول ماسٹر نے کہا تھا۔ وہاں سے اس نے اپنے گھر ہی کا رخ کیا تھا جہاں پھاٹک پر اس کی کار پر گولیوں کی بوچھاڑ کی گئی اور وہ......''
''اس کا ثبوت ہے تمہارے پاس کہ وہ سالگرہ میں تھا؟''
''ثبوت نہ ہوتا تو میں شاید آپ سے نہ ملتا۔'' عاطف نے شاپنگ بیگ سے ایک ڈی وی ڈی نکال کر ثاقب کی طرف بڑھائی۔ ''آپ اس میں دیکھ سکتے ہیں کہ وہ وہاں تھا۔ جب آپ وہاں پہنچے تو جو کرسی خالی کرائی گئی، اس پر بیٹھا ہوا شخص داراب خان کی خالی کی ہوئی کرسی پر جا بیٹھا تھا۔''
ثاقب کی نظریں ڈی وی ڈی پر تھیں اور دماغ میں کچھ خیالات چکرانے لگے تھے۔ سالگرہ میں شامل داراب خان کی موجودگی کا ثبوت خاصے کام کی بات تھی۔
''ایک ڈیڑھ گھنٹے تو میں شاپنگ کرتا رہا تھا۔'' عاطف بولا۔ ''جب مجھے یقین ہوگیا کہ آس پاس کوئی ایسا آدمی نہیں ہے جس کو میں پیٹرول ماسٹر کا آدمی سمجھ سکوں، تب میں نے آپ کے گھر کا رخ کیا۔''
''قانون تمہارے اس تعاون کو یاد رکھے گا۔''
''میرا نام کہیں نہ آنے پائے۔'' عاطف نے گھبرا کر کہا۔
ثاقب جواب نہیں دے پایا تھا کہ اس کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ اس نے کال ریسیو کی جو ریٹا کی تھی۔
''میں راستے میں ہوں۔'' اس نے بتایا۔ ''دس منٹ میں آپ کے گھر پہنچ جاؤں گی۔ اس وقت آپ کے ساتھ کوئی اور تو نہیں ہوگا؟''
''نہیں۔''
''بس تو میں پہنچ رہی ہوں۔''
''ٹھیک ہے۔'' ثاقب نے رابطہ منقطع کیا اور عاطف سے بولا۔ ''مطمئن رہو۔ تمہارا نام کہیں نہیں آئے گا۔''
''شکریہ سر۔'' عاطف کھڑا ہوگیا۔ ''اب میں جاؤں گا۔''
''اپنا پتا دیتے جاؤ، شاید مجھے کسی باعث تم سے ملنا پڑے۔''
عاطف اسے اپنا پتا دے کر رخصت ہوگیا۔
ثاقب فوراً ڈی وی ڈی دیکھنا چاہتا تھا لیکن ریٹا کی آمد کے خیال سے اس نے عجلت سے کام نہیں لیا۔
دس منٹ سے بھی کچھ کم میں ریٹا آگئی۔ وہ اس وقت بھی بہت سادہ لباس میں تھی۔ کسی کو شک نہیں ہوسکتا تھا کہ وہ سوسائٹی گرل ہوگی۔
ایک سی ڈی اس نے ثاقب کے حوالے کی۔ ''یہ میں اسپول سے بنا کرلائی ہوں۔ اگر آپ اسپول ہی چاہیں گے تو وہ بھی لادوں گی۔''
''تمہیں ابھی عجلت تو نہیں ہے؟''
''چاہتی تو ہوں کہ جلد از جلد چلی جاؤں۔''
''میں یہ سی ڈی تمہارے سامنے سننا چاہتا ہوں۔ اس میں کوئی ایسی بات بھی ہوسکتی ہے جس کے لیے میں تم سے وضاحت چاہوں۔''
''یہ ضروری ہے تو میں رک جاتی ہوں۔''
ثاقب اسے اس کمرے میں لے گیا جہاں عاطف کی دی ہوئی ڈی وی ڈی بھی دیکھی جاسکتی تھی اور ریٹا کی سی ڈی میں جو کچھ تھا، وہ بھی سنا جاسکتا تھا۔
ثاقب نے پہلے ریٹا کی سی ڈی لگائی اور بہت توجہ سے سننا شروع کیا۔ جیسے جیسے کچھ اہم باتیں اس کے علم میں آتی رہیں، ویسے ویسے اس کا دورانِ خون تیز ہوتا رہا۔ وہ

بہت اہم باتیں تھیں جو ریٹا نے ریکارڈ کی تھیں۔ پوری سی ڈی سنتے ہوئے ثاقب نے ریٹا سے کسی قسم کی وضاحت نہیں چاہی۔ اس دوران میں ریٹا اس کا چہرہ تکتی رہی تھی۔

"جی؟" ریٹا نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"کسی وضاحت کی ضرورت نہیں۔" ثاقب نے کہا۔

"تم نے قانون کی غیر معمولی مدد کی ہے ریٹا...... بس ایک سوال کروں گا تم سے...... پیٹرول ماسٹر کی کچھ باتیں ایسی بھی تو ہوسکتی ہیں جو تم ریکارڈ نہ کرسکی ہو۔"

"دو تین باتیں ہیں لیکن میرے خیال میں وہ اہم نہیں ہیں۔"

"تمہارے خیال میں اہم نہ ہوں گی لیکن میرے لیے شاید کوئی بات اہم ہو۔"

"وہ میں بتادیتی ہوں۔" ریٹا نے کہا۔ "ایک تو مجھے شبہ ہے کہ اگر سلطان کی یادداشت واپس آگئی تو پیٹرول ماسٹر الماس کو ختم کرادے گا۔"

"اس شبے کی وجہ؟"

"مجھے وہ جملے یاد نہیں جو ماسٹر نے کہے تھے۔ بس نتیجہ اخذ کیا ہے میں نے کہ الماس اس کے کسی راز سے واقف ہوگئی تھی اور ...اس کے کسی راز سے واقف ہوجائے وہ اسے زندہ نہیں رہنے دیتا۔"

"الماس اس کے کس راز سے واقف ہے؟"

"یہ میں نہیں جانتی۔"

"تو اب تک اس نے الماس کو کیوں ختم نہیں کیا؟"

"شاید اس کا خیال ہو کہ سلطان کے معاملے پر نظر رکھنے میں الماس زیادہ کارآمد ہوسکتی ہے۔"

ثاقب نے دو ایک سوال کیے اور جواب میں اسے صرف یہ بات اہم معلوم ہوئی کہ الماس کی زندگی بھی کسی وقت خطرے میں پڑسکتی تھی۔

"اب تم جاسکتی ہو ریٹا۔"

"یہ سی ڈی آپ کے لیے مفید ثابت ہوئی؟"

"بہت زیادہ۔" ثاقب نے جواب دیا۔ "انہی باتوں کی بنا پر میں ماسٹر کے خلاف ٹھوس ثبوت حاصل کرلوں گا۔"

"اور پہلی مرتبہ ایسا ہوگا کہ اسے طویل عرصے کے لیے جیل جانا پڑے۔ یہ آپ کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہوگا۔ اب تک اس پر کوئی اتنا گہرا وار نہیں کرسکا ہے۔"

"ایک دو باتیں تو ایسی بھی ہوسکتی ہیں کہ اسے پھانسی ہی ہوجائے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔"

"اب میں تمہارے لیے بھی فکرمند ہوگیا ہوں۔"

"وہ کیوں سر؟"

"جب ان باتوں کی بنا پر میں اس کے خلاف ٹھوس ثبوت حاصل کرنا شروع کروں گا تو ہوسکتا ہے، اسے شبہ ہو کہ تم نے مجھے کچھ بتایا ہے۔"

"کچھ بھی ہو، مجھے پروا نہیں۔ میں ہر صورت میں انتقام لینا چاہتی تھی اس سے اور وہ میں نے لے لیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کامیاب ہوں گے اور شاید یہ آپ کی بہت بڑی کامیابی ہوگی۔ اب تک کوئی ماسٹر پر اس طرح ہاتھ نہیں ڈال سکا۔"

"تمہیں اپنی پروا ہو یا نہ ہو لیکن میں نہیں چاہوں گا کہ قانون کے تم جیسے مددگار کی زندگی خطرے میں پڑے۔"

"اس کے لیے آپ کیا کرسکتے ہیں؟"

"تم اپنی کار میں آئی ہو؟"

"میں یہ بے وقوفی کیسے کرسکتی تھی۔ اگر ماسٹر کا کوئی آدمی میری کار یہاں کھڑی دیکھ لیتا تو میری شامت آنے میں کوئی کسر نہیں رہ جاتی۔"

"ٹیکسی سے آئی ہو تو ٹیکسی سے ہی جاؤ گی۔"

"ظاہر ہے سر!"

"تمہیں اب پندرہ بیس منٹ اور رکنا پڑے گا۔"

"کیوں سر؟"

"ابھی جان لوگی۔" ثاقب نے کہا اور موبائل فون پر یکے بعد دیگرے دو آدمیوں کو رابطہ کرکے انہیں ریٹا کے سلسلے میں ہدایات جاری کیں پھر ریٹا سے کہا۔

"یہ دو آدمی پندرہ بیس منٹ میں یہاں پہنچ جائیں گے۔ میرے اپارٹمنٹ میں نہیں بلکہ نیچے سڑک پر...... تم جب ٹیکسی سے روانہ ہوگی تو وہ تمہارا تعاقب کریں گے اور تمہیں تمہارے گھر تک پہنچائیں گے۔ یہ سمجھو کہ وہ تمہارے باڈی گارڈ ہوں گے۔ ان کی ڈیوٹی بدلتی رہے گی۔ تم کوشش کرنا کہ اپنے گھر سے کم سے کم باہر نکلو۔"

"اور اگر کسی وقت ماسٹر طلب کربیٹھا؟"

"بخار یا کسی قسم کی بیماری کا بہانہ کرکے ٹال دینا۔ بس دو دن کی بات ہے۔ میں دو دن میں ماسٹر کا سارا کھیل ختم کردوں گا۔"

ریٹا سوچ میں ڈوب گئی۔

"گھبراؤ نہیں۔" ثاقب بولا۔ "میں تمہاری حفاظت

کا کچھ اور انتظام بھی کر سکتا ہوں۔"

"میں گھبرا نہیں رہی ہوں سر! میں تو یہ سوچنے لگی تھی کہ آپ میرے لیے اتنا کچھ کریں گے، میرے سان گمان میں بھی نہ تھا۔"

"جو لوگ قانون کی مدد کرتے ہیں، قانون ہر صورت میں ان کا پورا خیال رکھتا ہے۔"

"شکریہ سر!"

ریٹا کے جانے کے بعد ثاقب نے موبائل پر اپنے محکمے کے کچھ افراد کو دوسرے دن کے لیے کچھ کام سونپے، پھر لیٹ گیا۔ نیند تو ابھی اس کی آنکھوں سے دور تھی کیونکہ سی ڈی کی باتیں سننے کے بعد اسے خاصا سوچنے کی ضرورت تھی۔ اسے یہ بہت اہم معلوم ہو رہا تھا کہ ثبوت حاصل کرنے کے بعد اس علاقے میں پولیس ایکشن کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ پیٹرول ماسٹر کے آدمیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ ان کی وجہ سے بہت خوں ریزی ہو جاتی اس لیے وہاں فوجی آپریشن کروانے کی ضرورت تھی۔

سوچتے سوچتے اسے نیند آگئی۔ دوسرے دن اس کی آنکھ ذرا دیر سے کھلی اور اسے جگایا بھی موبائل کی گھنٹی نے۔

دوسری طرف سے اس کا ماتحت کہہ رہا تھا۔ "تھوڑی دیر قبل شبانہ نے ایک اسٹوڈیو سے پاسپورٹ سائز کی تصویریں بنوائی ہیں۔"

"اوہ!" ثاقب کی نیند بالکل کافور ہوگئی اور وہ اٹھ بیٹھا۔

"اب وہ کہاں ہے؟"

"میں اُس کا تعاقب کر رہا ہوں صاحب...... اندازہ ہو رہا ہے کہ وہ اکبر کے گھر کی طرف جا رہی ہے۔"

"مجھے اس کے بارے میں پوری طرح باخبر رکھو۔" ثاقب نے کہا اور اٹھ کر جلدی جلدی تیار ہوا، ناشتا کیا۔ اسی دوران میں اسے یہ اطلاع بھی مل گئی کہ شبانہ، اکبر کے گھر پہنچ چکی تھی۔

ثاقب نے فون پر شبانہ سے رابطہ کیا۔

"ثاقب بول رہا ہوں، سب انسپکٹر ثاقب۔"

"جی...... جی......"

"آپ نے ابھی پاسپورٹ سائز کی تصویریں بنوائی ہیں۔ کیا پاسپورٹ بنوا کر بیرونِ ملک جانے کا ارادہ ہے؟"

"جی...... جی وہ...... ابھی تو نہیں۔ بس سوچا کہ پاسپورٹ بنوا کے رکھ لوں۔ شاید کسی وقت اکبر کے ساتھ بیرونِ ملک جانا پڑے۔ دراصل اس کا کاروبار......"

"معلوم ہے مجھے۔" ثاقب نے اس کی بات کاٹی۔ "خیر...... پاسپورٹ آپ شوق سے بنوایئے لیکن فی الحال آپ اس ملک سے تو کیا، اس شہر سے بھی کہیں نہیں جائیں گی۔ میری یہ بات اکبر صاحب کو بھی بتا دیں۔"

"بہتر۔" شبانہ کی سانس کی رفتار کچھ تیز محسوس ہوئی تھی۔

ثاقب نے رابطہ منقطع کر دیا۔

☆☆☆

اگلے تین دن بہت مصروف گزرے لیکن ثاقب نے ان دنوں میں پیٹرول ماسٹر کے خلاف ٹھوس شواہد حاصل کر لیے۔

فوج سے ابتدا ہی میں رابطہ کر لیا تھا لیکن چوتھے دن اسے معلوم ہوا کہ ماسٹر اپنا علاقہ چھوڑ کر اپنے ایک بنگلے میں چلا گیا تھا۔

ثاقب نے سکون کی سانس لی۔ فوج کی مدد لینا اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا اور اب اس کی ضرورت بھی باقی نہیں رہی تھی۔ پولیس فورس سے ہی کام چل جاتا۔

ایکشن کے لیے اس نے تیسرے پہر کا انتخاب کیا۔ اسے اطلاع مل چکی تھی کہ ماسٹر کو اس بنگلے سے نکلتے نہیں دیکھا گیا تھا۔

پولیس نے اس علاقے کا محاصرہ کر لیا۔ انہیں ہدایت کی گئی تھی کہ جب ثاقب کی کار ماسٹر کے بنگلے میں داخل ہو جائے تو پولیس قریب آئے اور اس بنگلے کا محاصرہ کر لے۔

چار بجے تھے جب ثاقب نے اپنی کار اس بنگلے کے پھاٹک سے چند گز دور روکی پھر موبائل پر ماسٹر سے رابطہ کیا۔

"اوہو......" ماسٹر ثاقب کی آواز سن کر ہنسا۔ "پولیس نے میرے اس بنگلے کا بھی پتا لگا لیا؟"

"اگر پولیس ایک بار کسی کے پیچھے لگ جائے تو پھر اس کی نقل و حرکت پوشیدہ رہ نہیں سکتی۔"

"ابھی تم نے بتایا کہ میرے بنگلے سے ایک منٹ کے فاصلے پر ہو۔"

"ہاں۔"

"مقصد؟"

"تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ شاید تمہیں یاد ہو۔ سالگرہ کے دن...... میں نے تم سے کہا تھا کہ ہماری ملاقات دوبارہ بھی ہو سکتی ہے۔"

"مجھے یاد نہیں۔"

''خیر!'' ثاقب نے کہا۔ ''بس اِدھر سے گزر رہا تھا کہ تم سے ملنے کا خیال آیا لیکن یہ بھی سوچا کہ پہلے فون کر لوں۔ شاید تم مصروف ہو۔''

''ملاقات کا مقصد؟''

''دو تین باتیں معلوم کرنی تھیں۔''

''میں تمہیں آدھا گھنٹا دے سکتا ہوں۔ پھر مجھے کہیں جانا ہے۔''

''میں اتنا وقت بھی نہیں لوں گا۔''

''تو آجاؤ۔ میں تمہارے لیے چائے بنواتا ہوں۔''

ماسٹر بہت مطمئن زندگی گزار رہا تھا۔ اسے یہ غلط فہمی تھی کہ پولیس اس کے خلاف کوئی اہم ثبوت حاصل نہیں کر سکتی۔

ثاقب نے کار آگے بڑھائی اور بنگلے کے پھاٹک پر رک کر اس نے ہارن دیا۔ پھاٹک فوراً کھول دیا گیا۔ ماسٹر اس سلسلے میں ہدایت دے چکا ہوگا۔

ثاقب کو یقین تھا کہ اب پولیس تیزی سے آگے آکر بنگلے کا محاصرہ کرلے گی۔ سادہ لباس میں پولیس کا ایک آدمی بنگلے کے قریب ہی موجود تھا۔ اس نے فوراً موبائل پر کسی کو اطلاع دے دی ہوگی کہ ثاقب کی کار بنگلے میں داخل ہو چکی ہے۔

ثاقب نے کار پورٹیکو میں روکی۔ چند لمحے بعد وہ بریف کیس ہاتھ میں لیے کار سے اترا......

برآمدے میں پیٹرول ماسٹر خود کھڑا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی، تاہم وہ ثاقب کا استقبال کرنے کے لیے برآمدے سے نہیں اترا۔ خود ثاقب ہی کو برآمدے میں پہنچ کر اس سے بڑے دوستانہ انداز میں مصافحہ کرنا پڑا۔

''آؤ پولیس مین۔'' اس نے غالباً ڈرائنگ روم کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ''تم مجھ سے ملتے تو ہو بڑے دوستانہ انداز میں لیکن مجھے تمہارے تیور کچھ ٹھیک نظر نہیں آرہے ہیں۔''

''یہ تم نے کیسے سمجھ لیا؟''

''قیافہ شناسی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔''

کوئی خطرہ محسوس کر لینے کے باوجود ماسٹر بالکل مطمئن نظر آرہا تھا۔ اسے یقیناً یہ خوش فہمی تھی کہ اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

وہ ثاقب کو ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ وہاں قدم رکھتے ہی ثاقب چونکا۔ ایک صوفے پر ڈپٹی ہوم سیکریٹری بیٹھا تھا۔ وہ بھی ثاقب کو دیکھ کر چونکا۔ وہ ثاقب کو پولیس آفیسر کی حیثیت سے تو کیا، کسی بھی حیثیت سے نہیں جانتا تھا لیکن پولیس کی وردی تو اسے ثاقب کے جسم پر نظر آہی رہی تھی۔

''میرے دوست تقی عمر۔'' ماسٹر نے تعارف کرایا۔ ''اور یہ ہیں سب انسپکٹر ثاقب جو آج کل میرے بارے میں تحقیقات کررہے ہیں۔''

ثاقب نے تقی عمر سے مصافحہ کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ''آپ کی بھی کوئی گوٹ پھنسی ہوئی ہے ماسٹر سے؟''

تقی عمر جواب دینے کے بجائے ماسٹر کی طرف دیکھنے لگا۔

''یہ میرے صرف دوست ہیں۔'' ماسٹر نے کہا۔ ''میرے بہت سے معاملات کو سنبھالنا انہی کا کام ہوتا ہے۔''

''یعنی کیس خراب کروانا۔''

''بہت بول رہے ہو پولیس مین۔'' ماسٹر ہنسا۔

''میرا خیال ہے کہ ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔''

''یقیناً وقت خراب کرنا اچھی بات نہیں ہے۔'' ماسٹر نے سنجیدگی اختیار کی۔ ''وہ باتیں کرو جو تم کرنا چاہتے ہو۔ فون پر تم نے یہی کہا تھا۔''

''ہاں۔'' ثاقب نے کہا۔ ''میرا پہلا سوال تو داراب خان کے بارے میں ہے۔ تم نے بتایا تھا کہ وہ تمہاری سالگرہ میں نہیں آیا تھا؟''

''جو صحیح بات تھی، وہ میں نے بتادی تھی۔''

''ایک چیز دکھاتا ہوں تمہیں۔'' ثاقب نے بریف کیس کھول کر اس میں سے لیپ ٹاپ نکالا۔

اب ماسٹر کچھ زیادہ سنجیدہ نظر آیا۔ تقی عمر اُن دونوں کی شکلیں تکنے لگا۔

''یہ تصویریں تمہیں یقیناً پسند آئیں گی۔''

لیپ ٹاپ پر تصویریں دیکھ کر ایک لمحے کے لیے ماسٹر کے چہرے کا رنگ بدلا پھر اس نے ہنس کر کہا۔ ''ہاں...... یہ داراب خان کی تصویریں ہیں۔ وہ میری پچھلی سالگرہ میں آیا تھا۔''

''چلو میں مان لیتا ہوں کہ یہ پچھلی سالگرہ کی تصویریں ہیں۔'' ثاقب نے کہا اور پھر ایک چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر نکال کر آن کیا۔ اس میں کیسٹ لگا ہوا تھا۔ اس سے ماسٹر اور داراب خان کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ ساری باتیں ایک شخص کے قتل کے بارے میں تھیں۔

''خوب!'' ماسٹر کا لہجہ سرد ہوگیا۔

''سنتے رہو ماسٹر!'' ثاقب نے کہا۔ ''سترہ منٹ کی باتیں ہیں تم سے مختلف لوگوں کی۔'' ماسٹر چپ ہوگیا۔ ٹیپ ریکارڈر سے آوازیں آتی رہیں۔ ثاقب نے اس دوران میں بریف کیس سے کچھ فائلیں نکالیں۔

ٹیپ ریکارڈر چل ہی رہا تھا کہ ماسٹر کے موبائل پر ایک کال آگئی۔ شاید ایک ہی جملہ سنا اور اس کے چہرے کا رنگ اُڑا لیکن اسے فوری طور پر اپنے جذبات پر قابو پانے کا فن آتا تھا۔ موبائل بند کر کے اس نے ٹیپ ریکارڈر کی طرف توجہ دی۔ جو کیسٹ وہ سن رہا تھا، وہ ریٹا کی سی ڈی سے بنایا گیا تھا۔

''بہت خوب پولیس مین۔'' ماسٹر نے تالی بجائی۔ انہی چیزوں کی وجہ سے تم مجھے گرفتار کرنے آئے ہو۔ بنگلا پولیس نے گھیر رکھا ہے۔''

موبائل فون پر اسے اس کے کسی آدمی نے یہی اطلاع دی ہوگی۔

اس دوران میں ڈپٹی ہوم سیکریٹری کا چہرہ فق پڑ چکا تھا۔

''نہیں ماسٹر...... اس قسم کی ریکارڈنگ کوئی ثبوت نہیں ہوتی۔ اس ریکارڈنگ کی مدد سے میں نے تمہارے خلاف ٹھوس شواہد جمع کیے ہیں۔''

ثاقب نے اسے فائلیں دکھانی شروع کیں اور بولتا بھی گیا۔ ''عدالت ان میں سے کسی چیز کو مسترد نہیں کر سکتی اور نہ ڈپٹی صاحب تمہارے کسی کام آسکتے ہیں۔ اب بہتری اسی میں ہے کہ تم کوئی فساد کھڑا کرنے کے بجائے خود کو گرفتاری کے لیے پیش کر دو۔ ہتھکڑیاں میرے کوٹ کی جیب میں ہیں۔''

ماسٹر خاموشی سے سب کچھ دیکھتا اور ثاقب کی باتیں سنتا رہا اور اسی دوران میں اس نے جیب سے پائپ نکال کر اس میں تمبا کو بھرنا شروع کر دیا... جس وقت اس نے پائپ نکالنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا تھا، اسی وقت ثاقب کا ہاتھ بھی اپنے ریوالور تک پہنچ گیا تھا۔ اسے خیال یہی گزرا تھا کہ اپنی مکمل تباہی کے ثبوت دیکھ کر ماسٹر ریوالور نکالنا چاہتا تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' ماسٹر بڑے سکون سے بولا۔ ''یہ سب کچھ یہاں لا کر تم نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ تم مجھے دکھانے یہ لے تو آئے ہو لیکن واپس نہیں لے جاسکو گے۔''

''اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ یہ سب کچھ تو ڈپلی کیٹ ہیں۔''

''اچھا۔'' ماسٹر نے طویل سانس لیتے ہوئے پائپ جلایا۔ ''اب میں تم کو ایک ایسی چیز دکھانا چاہوں گا جس کے سامنے ان چیزوں کی کوئی اہمیت نہیں رہ جائے گی۔''

''ضرور دکھاؤ۔'' ثاقب کے لہجے میں طنز تھا۔

''وہ مجھے بیڈ روم سے لانی پڑے گی۔'' ماسٹر کھڑا ہوا۔

''نہیں ماسٹر۔'' ثاقب بھی کھڑا ہوگیا۔ ''میں تمہیں کسی بہانے فرار ہونے کا موقع ہرگز نہیں دوں گا۔''

یہ کہتے ہوئے ثاقب کا ہاتھ ہولسٹر کی طرف گیا ہی تھا کہ ماسٹر نے اپنا پائپ ثاقب کے منہ پر کھینچ مارا۔ جلتے ہوئے تمبا کو کا کچھ حصہ ثاقب کے منہ پر بکھر گیا۔ کئی جگہ جلن ہوئی۔ آنکھیں بھی متاثر ہوئیں لیکن اس جلن کے باوجود ثاقب نے سنبھلنے میں دیر نہیں لگائی لیکن اتنی دیر میں ماسٹر ایک اندرونی دروازہ کھول چکا تھا۔

شاید اس وقت اس کے پاس کوئی ہتھیار نہ ہو جس سے وہ ثاقب کو نشانہ بنا سکتا۔

ثاقب نے اس کے پیر پر گولی چلائی لیکن ماسٹر دروازے کی دوسری جانب نکل چکا تھا۔ ثاقب اس کے پیچھے دوڑا۔ ماسٹر کو دوسری طرف سے دروازہ بند کرنے کا شاید خیال ہی نہیں رہا تھا۔

ثاقب بھی دروازے سے اس طرف نکلا۔ وہ ایک راہداری تھی۔ راہداری کے آخر میں ایک دروازہ تھا۔ ماسٹر اس سے دوسری طرف جا رہا تھا۔ اس بار بھی ثاقب کی چلائی ہوئی گولی کارگر نہ ہو سکی۔ ماسٹر دوسری طرف نکل چکا تھا۔ ثاقب دوڑتا ہوا وہاں تک پہنچا لیکن دروازہ نہ کھول سکا۔ اس مرتبہ ماسٹر دوسری طرف سے دروازہ بند کرنا نہیں بھولا تھا۔

ثاقب نے شانے سے دروازے پر ٹکر ماری لیکن بے سود، دروازہ اتنا کمزور نہیں تھا کہ اس کے شانے کی ایک ٹکر سے کھل جاتا۔

اسی وقت وزنی جوتوں کی دھمک سنائی دینے لگی۔ محاصرہ کرنے والی پولیس فائرنگ کی آواز سن کر اندر گھس آئی تھی۔

''ہر طرف پھیل جاؤ۔'' ثاقب نے واپس ڈرائنگ روم میں قدم رکھتے ہوئے چیخ کر کہا۔ ''بچنے نہ پائے لیکن باہر سے بھی محاصرہ ختم نہ ہو۔''

تقی عمر اس وقت بھی ڈرائنگ روم میں تھا لیکن ایسی حالت میں جیسے سکتہ ہوگیا ہو۔

اسی وقت ثاقب کے موبائل پر کال آئی۔ محاصرہ

کرنے والوں میں سے کسی نے اطلاع دی کہ بنگلے کی چھت سے ایک ہیلی کاپٹر اُڑا ہے صاحب...... پیٹرول ماسٹر کی ایک جھلک دکھائی دی ہے۔ ہیلی کاپٹر تیزی سے اوپر اٹھ رہا ہے۔''

''شوٹ کر دو ہیلی کاپٹر کو۔'' ثاقب نے دانت پیس کر کہا۔

ثاقب، پیٹرول ماسٹر کو زندہ پکڑنا چاہتا تھا لیکن اب صورت حال ایسی ہو گئی تھی کہ ماسٹر کے فرار ہو جانے کا خدشہ تھا۔

باہر سے کسی رائفل کے فائر کی آواز سنائی دی اور پھر فضا میں ایک دھماکا ہوا۔

''چھٹی ہوئی۔'' ثاقب دانت پیستے ہوئے بڑبڑایا۔

☆☆☆

کار کی رفتار پہلے ہی تیز تھی۔ سلطان نے ایکسلریٹر مزید دبا دیا۔

''یہ تم پر ہیجان کیوں طاری ہو گیا ہے سفیان؟'' اس کے برابر میں بیٹھی ہوئی الماس خاموش نہ رہ سکی۔

''میں اس وقت جلد از جلد اس مقام تک پہنچنا چاہتا ہوں جہاں پولیس نے مجھے بے ہوشی کی حالت میں پایا تھا۔''

''کیوں؟ کیوں جانا چاہتے ہو تم وہاں؟''

''دیکھنا چاہتا ہوں وہ جگہ۔''

''مگر کیوں......؟ اور تمہیں کیا معلوم کہ وہ جگہ کہاں ہے؟''

''پولیس نے مجھے بتایا تھا۔ وہاں کی تصویریں بھی دکھائی تھیں۔''

''مجھے اس وقت تمہاری کسی بات کی کوئی تُک نہیں سمجھ آ رہی۔''

''مجھے اپنا ماضی کچھ کچھ یاد آنے لگا ہے۔''

الماس خاصی پریشان ہو گئی۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ فوری طور پر اس کی اطلاع پیٹرول ماسٹر کو دے لیکن سلطان کی موجودگی میں وہ یہ قدم نہیں اٹھا سکتی تھی۔

''میرا خیال ہے کہ اب ہم پہنچنے ہی والے ہیں۔'' سلطان بولا۔

''وہ جگہ دیکھ کر تمہیں سب کچھ کیسے یاد آ جائے گا؟''

''یہی تو دیکھنا ہے کہ مجھے یہ احساس کیوں ہوا۔''

''تمہیں یہ بھی یاد آ گیا کہ ماضی میں بھی تم میرے دوست تھے؟''

''ہاں، یہ یاد آ گیا ہے۔''

''اس کے علاوہ کچھ؟''

''اس جگہ پہنچ کر شاید وہ بھی یاد آ جائے۔''

الماس کے چہرے پر نظر آنے والی پریشانی اور بڑھ گئی۔

''پہنچ گئے ہم۔'' سلطان نے رفتار کم کرتے ہوئے کہا۔

الماس چپ رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس وقت کیا بولے۔ سلطان نے کار روک دی۔

''ہاں۔'' وہ بولا۔ ''یہی جگہ ہے وہ، مجھے یاد آ گیا۔'' اس نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ''تم بھی آؤ۔''

الماس اس کے علاوہ کیا کر سکتی تھی کہ سلطان کی بات مانے۔

''آؤ، آؤ۔'' سلطان نے کہتے ہوئے نشیب میں اترنا شروع کیا۔ وہ الماس کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھا اور وہ خاصی پریشان نظر آ رہی تھی۔

''وہ جگہ تلاش کرنے میں دقت نہیں ہو گی۔'' سلطان بولا۔ ''پولیس ایسی جگہ پر خاصا بڑا نشان بنا دیتی ہے۔''

سلطان کا خیال درست ثابت ہوا۔ وہ اس جگہ پہنچ گئے جہاں اس جگہ کے گرد موٹی لکیر کھنچی ہوئی تھی جہاں سلطان پایا گیا تھا۔

''دیکھا، میں نے کہا تھا نا۔''

''تو اب تمہیں کچھ اور یاد آیا۔'' الماس نے پوچھا۔

سلطان جواب دینے کے بجائے نشیب کی جانب دیکھنے لگا۔

''مجھے شاید سڑک سے ہی دھکا دیا ہو گا۔'' وہ بولا۔ ''اگر اس جگہ سے دھکا دیا جاتا تو میں اس دلدلی زمین ہی میں جا گرتا، کیا خیال ہے؟''

''شاید تم ٹھیک سمجھ رہے ہو؟''

اب سلطان سڑک کا جائزہ لینے لگا جہاں کار کھڑی کی گئی تھی۔ اس مضافاتی سڑک پر ٹریفک بہت کم ہوتا تھا۔ اس دوران میں وہاں سے صرف ایک گاڑی گزری تھی۔ ان لوگوں نے سلطان اور الماس کو بھی دیکھا ہو گا لیکن بس یہ سوچ کر گزر گئے ہوں گے کہ وہ ایک ایڈونچر پسند رومانی جوڑا ہے جو نشیب میں اترا ہے۔

''ہاں، اب کچھ اور بھی یاد آ رہا ہے۔'' سلطان بولا۔ ''وہ کوئی عورت تھی جس نے مجھے دھکا دیا تھا۔ مجھے موت کی سزا اس لیے دینا چاہی تھی ماسٹر نے کہ میں نے اس کی ایک

بات ماننے سے انکار کر دیا تھا۔"

"اس عورت کا چہرہ یاد آرہا ہے؟" الماس نے پوچھا۔

سلطان پھر سڑک کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ ایک جانب سے ایک کار آرہی تھی۔

"بڑی سفاکی سے مارنا چاہا تھا اُس نے۔" سلطان بولا۔ "ورنہ کسی جگہ گولی بھی ماری جاسکتی تھی۔"

"بات تو صحیح ہے تمہاری۔"

اس وقت کار سڑک پر ان کے سامنے سے گزر گئی تھی۔

"اب..... ہاں..... اب مجھے یاد آگیا۔" سلطان نے الماس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "وہ تم تھیں الماس۔"

"کک..... کیا....." الماس بوکھلا گئی۔ "میں تمہاری دشمن کیسے ہوسکتی ہوں؟"

"تمہیں بس پیٹرول ماسٹر کے حکم کی تعمیل کرنی تھی۔" سلطان نے سرد لہجے میں کہا۔ "ورنہ وہ تمہیں ختم کرادیتا۔"

الماس کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔

"آؤ..... سلطان نے اس کا ہاتھ پکڑا اور نیچے اترنے لگا۔

"تمہیں غلط یاد آرہا ہے سفیان۔" الماس کی آواز میں لرزش تھی۔

"ابھی معلوم ہوجائے گا۔"

"کیسے؟"

"ایسے۔" سلطان نے اسے کمر سے پکڑ کر اٹھالیا۔

"اب تم خود اعتراف کرلو ورنہ یہاں سے تمہیں دلدلی زمین میں پھینکنا میرے لیے مشکل نہیں ہوگا۔"

"میں مجبور تھی سفیان۔" الماس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"تم ماسٹر کی خادم ہو۔ آج میں نے ماسٹر سے تمہاری گفتگو بھی سن لی تھی۔ تم بہت دھیمی آواز میں بات کررہی تھیں۔ میں بس شرارتاً چپکے سے تمہارے عقب میں بالکل قریب آگیا تھا۔ میں نے ماسٹر کی دھیمی آواز سنی تھی۔ وہ تمہیں اپنے بنگلے کے بارے میں کوئی ہدایت دے رہا تھا جس کا نام اس نے شمالی کاٹیج رکھا ہے۔"

"میں پھر کہوں گی سلطان کہ میں تمہیں مارنا نہیں چاہتی تھی۔" الماس پہلے سے زیادہ روہانسی ہوگئی۔ "اور اگر تم مجھے ماردو گے تو ماسٹر بھی تمہیں نہیں چھوڑے گا۔"

سلطان حقارت سے ہنسا۔ "وہ اپنے انجام کو پہنچنے والا ہے۔ میں نے اس وقت ٹی وی کی خبروں کے چند جملے سنے تھے۔ پولیس نے شمالی کاٹیج پر آپریشن شروع کردیا ہے۔ اب ماسٹر کا انجام قریب ہے اور تمہارا ابھی ......"

سلطان نے اسے کمر سے تو پکڑ ہی لیا تھا۔ طاقتور بھی وہ خاصا تھا۔ اس نے الماس کو نشیب میں دلدلی زمین کی طرف اچھال دیا۔

الماس کی آخری چیخ بلند ہوئی اور پھر وہ سر کے بل دلدلی زمین میں جاگری۔ اگر پیروں کے بل گرتی تو پوری طرح دھنسنے میں اسے کچھ وقت لگتا۔ اس کا سر باہر رہتا تو اس کی چیخ پکار سڑک سے گزرنے والی گاڑی کے لوگ سن لیتے۔

سلطان سفاک نظروں سے دیکھتا رہا کہ کمر تک دلدلی زمین میں دھنسی ہوئی الماس اپنی ٹانگوں کو زور زور سے حرکت دے رہی تھی۔ یہ اس کے تڑپنے کا منظر تھا۔

سلطان نے سڑک کی طرف بھی نظر رکھی تھی کہ اگر وہاں سے کوئی گاڑی یہ منظر دیکھ کر رکے تو وہ اپنے بچاؤ کے لیے کیا کرے گا۔

جب الماس کے صرف پیر دلدلی زمین کے باہر حرکت کرتے رہ گئے تو سلطان مڑا اور تیزی سے اوپر چڑھنے لگا۔

سلطان نے سڑک پر پہنچ کر دلدلی زمین کی طرف دیکھا۔ الماس غائب ہوچکی تھی۔

"ٹٹ فار ٹیٹ۔" سلطان بڑبڑاتا ہوا کار میں بیٹھ گیا۔ انجن اسٹارٹ کرکے اس نے کار موڑی اور تیزی سے واپس روانہ ہوگیا۔ اب وہ جلد از جلد شمالی کاٹیج تک پہنچنا چاہتا تھا۔ پیٹرول ماسٹر کا انجام دیکھنے کی خواہش تھی اُسے۔

☆☆☆

ثاقب مایوس تو ہوا لیکن اسی وقت اسے اطلاع ملی کہ ہیلی کاپٹر کی تباہی سے چند لمحے ..... پہلے ماسٹر نے ہیلی کاپٹر سے چھلانگ لگادی تھی اور اب اس کا پیراشوٹ جنوب کی طرف جارہا تھا۔ ہوا کافی تیز تھی اس لیے پیراشوٹ بھی تیزی سے اس طرف جارہا تھا۔

"پیچھا کرو پیراشوٹ کا۔" اس نے حکم جاری کیا۔ "پیراشوٹ پر ہرگز گولی نہ چلانا۔ اب اسے زندہ ہی گرفتار کیا جاسکتا ہے۔ پیراشوٹ آخر کار زمین پر ہی اترے گا۔"

یہ حکم جاری کرنے کے بعد وہ خود بھی بڑی تیزی سے بھاگ کر بنگلے سے نکلا اور اپنی کار کی طرف لپکا۔

تقی عمر کی اسے پروا نہیں تھی جو اَب بھی ڈرائنگ روم میں بُت بنا بیٹھا تھا۔ اسے بعد میں بھی گرفتار کیا جاسکتا تھا۔

کار کا انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے ثاقب نے پیراشوٹ کو جنوب کی طرف پرواز کرتے دیکھا۔ ثاقب نے

کار تیزی سے دوڑا دی۔ وہ پیراشوٹ پر نظر جمائے ہوئے تھا جو کبھی کسی سڑک پر سے اور کبھی کسی عمارت کے اوپر سے گزرتا۔ ایسی صورت میں اس کا تعاقب سڑکوں ہی کے ذریعے کیا جاسکتا تھا۔

ٹی وی چینلز کو اس کی اطلاع نہ جانے کب اور کیسے ملی تھی کہ ان کی گاڑیاں بھی سڑکوں پر دوڑ رہی تھیں اور سارا منظر ٹی وی چینلز پر برابر دکھایا جا رہا تھا۔

ایک بار ثاقب کے ذہن میں آیا کہ وہ ایئر فورس یا سول ایوی ایشن سے رابطہ کرے لیکن پھر اس نے یہ خیال ذہن سے جھٹک دیا۔ کسی کی مدد لینے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ پیراشوٹ جہاں بھی اترتا، پولیس وہاں پہنچ ہی جاتی۔ ماسٹر بچ کر تو نکل ہی نہیں سکتا تھا۔

کچھ دیر میں شام ہونے والی تھی لیکن قیاس کیا جاسکتا تھا کہ یہ سنسنی خیز ڈراما اندھیرا پھیلنے سے پہلے ختم ہو چکا ہوگا۔

تعاقب کرنے والی گاڑیاں قریب ہوتی جا رہی تھیں لیکن پیراشوٹ ابھی خاصی بلندی پر تھا۔

اس طرف اپارٹمنٹس کی اونچی اونچی عمارتیں بھی تھیں اس لیے ثاقب کو اندیشہ ہوا کہ پیراشوٹ کسی عمارت سے نہ ٹکرا جائے۔

لیکن ایسا نہ ہوا۔

اور جو ہوا وہ توقع کے یکسر خلاف تھا۔ پیراشوٹ ایک اونچی عمارت کے قریب سے گزر... رہا تھا کہ اس پر گولیوں کی بارش ہوگئی۔ پیٹرول ماسٹر گولیوں سے چھلنی ہو جانے والے پیراشوٹ کے ساتھ زمین پر گرنے لگا۔

''یہ کس کی حماقت ہے؟'' ثاقب چیخ پڑا۔

لیکن نہ تو اس کے پاس مائیکروفون تھا نہ وہ موبائل میں چیخا تھا لہٰذا اس کی آواز کسی تک پہنچ ہی نہیں سکی تھی۔

جو کاریں آگے تھیں، ان میں سے کسی نے موبائل پر ثاقب کو اطلاع دی کہ گولیاں اس عمارت کی چھت سے چلائی گئی تھیں جس کے قریب سے پیراشوٹ گزر رہا تھا۔

''گھیر لو اس عمارت کو۔'' ثاقب نے حکم صادر کیا۔

پیٹرول ماسٹر ایک فٹ پاتھ پر اس طرح گرا تھا کہ اس کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئی تھیں۔ جسم پر بھی کچھ زخم آئے ہوں گے۔ پولیس کی گاڑیاں ایک کے پیچھے ایک اس کے قریب پہنچ گئیں۔ ٹی وی پر دکھایا جا رہا تھا کہ ماسٹر بُری طرح تڑپ رہا تھا۔

ان براہ راست نشریات کی وجہ سے سارے شہر میں ہی سنسنی پھیل گئی تھی۔

اس عمارت کا محاصرہ کر لیا گیا جس کی چھت سے پیراشوٹ پر گولیاں چلائی گئی تھیں۔ گولیاں چلانے والے کی تلاش میں پولیس کو تگ و دو نہیں کرنی پڑتی۔

وہ سلطان تھا۔ اسے فوراً گرفتار کر لیا گیا۔

دوسرے دن کے اخبارات اس سنسنی خیز ڈرامے کی رُوداد سے بھرے ہوئے تھے۔ ٹی وی چینلز سے وہ سب کچھ پہلے ہی نشر کیا جا چکا تھا۔ ماسٹر کے اس انجام کو سب انسپکٹر ثاقب کا بہت بڑا کارنامہ قرار دیا جا رہا تھا کیونکہ کئی برس سے پولیس اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکی تھی۔

اس دن ثاقب نے شبانہ کو فون کیا اور مسکرا کر کہا۔ ''اب آپ کسی بھی غیر ملک میں خوشی سے جاسکتی ہیں۔''

''وہ تو گھبراہٹ کا فیصلہ تھا جناب...... اب ہمیں کہیں نہیں جانا۔ میں آپ کو اس کارنامے پر مبارک باد پیش کرتی ہوں۔''

شبانہ کے ہاتھ سے اکبر نے فون لے لیا اور اس نے بھی ثاقب کو مبارک باد دی۔

ماسٹر اسپتال میں تھا اور اس کی ٹانگیں جوڑنے کے لیے آپریشن کیا جا رہا تھا۔ زخموں کی مرہم پٹی بھی کی گئی تھی۔

آخر وہ وقت آیا جب سلطان اور ماسٹر کے مقدمے عدالت میں آئے۔

عدالت میں سلطان نے وہی بیان دیا، جو وہ پولیس کو پہلے ہی دے چکا تھا۔

اپنی یادداشت کی واپسی اور الماس کے قتل کی رُوداد اس نے بیان کرنے کے بعد بتایا تھا کہ ماسٹر کا انجام دیکھنے کے لیے وہ شمالی کالمبج کی طرف آرہا تھا جب اس نے فضا میں پیراشوٹ دیکھا۔ دوربین آنکھوں سے لگائی اور ماسٹر کو پہچان لیا۔

پیراشوٹ کے رخ سے اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ کس عمارت کے قریب سے گزر سکتا ہے لہٰذا وہ تیزی سے عمارت کی چھت پر چڑھ گیا۔ اس نے عمارت کے سیکیورٹی گارڈ سے اس کی رائفل چھین لی تھی جس سے اس نے پیراشوٹ پر گولیاں چلائیں۔ اسے افسوس تھا کہ ماسٹر زندہ بچ گیا۔

کچھ عرصے مقدمات چلنے کے بعد سلطان کو طویل سزا سنائی گئی... اور جائداد ضبطی کے ساتھ پیٹرول ماسٹر کو پھانسی کی سزا دی گئی۔

دوسری طرف شبانہ اور اکبر شادی کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ شادی میں شرکت کا دعوت نامہ دینے کے لیے دونوں خود ثاقب کے گھر پہنچے......

❖❖❖